اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ جولائی ۱۹۴۱ء

جلد (۴۴) — نمبر (۱)

تصویر: وادیٔ کشمیر کا ایک منظر[1]

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۸ر

[1] اس تصویر کے لئے ہم جناب ایس حسن لطیف صاحب حیدرآبادی کے ممنون ہیں جنہوں نے ازراہِ عنایت اصل فوٹو بھیجا۔ "ہمایوں"

جہاں نما

قیصر ولیم ثانی

۴ جون ۱۹۴۱ء کو ڈورن میں ولیم ثانی سابق قیصرِ جرمنی کا انتقال ہو گیا۔ آخری وقت قیصر کے پاس اُس کی بی بی پرنسس ہرمائن کے علاوہ صرف اُس کی بیٹی ڈچس آف برنزوک، اُس کے پوتے پرنس فرانسس جوزف کی بی بی پرنسس ہنریٹا اور اُس کا پوتا پرنس لوئی فرڈینینڈ موجود تھے کیونکہ مرنے سے چند دن قبل جب قیصر روبصحت نظر آتا تھا اُس کے بیٹے اور بہت سے قریبی رشتہ دار مطمئن ہو کر چلے گئے تھے۔

قیصر نے اپنی وصیت میں ڈورن ہی میں دفن ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی جہاں وہ گزشتہ ۲۳ سال سے مقیم تھا۔ اُس کی وصیت یہ بھی تھی کہ اُس کی تدفین کے موقع پر صرف اُس کے خاندان ہی کے لوگ موجود ہوں۔ چنانچہ اہلِ خاندان کے علاوہ صرف جرمن حکومت کے نمائندوں نے اِس رسم میں شرکت کی۔ جرمنی کے آخری قیصر ولیم ثانی کے انتقال سے دنیا ایک ایسے شخص سے محروم ہو گئی ہے جو سابق جنگِ عظیم کے ذمہ دار کی حیثیت سے گزشتہ پچیس سال سے مؤرخین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور جس کی سیرت اور اعمال کے متعلق وہ اب تک کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے جہاں اُس سے شدید نفرت کرنے والوں کی کمی نہ تھی وہاں اُس کا انتہائی احترام کرنے والے بھی موجود تھے۔ یہ سوال بہت سے مباحثوں کی بنیاد بنا رہا ہے کہ قیصر خود گزشتہ جنگِ عظیم کا ذمہ دار تھا یا وہ اور لوگوں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔

بعض لوگ یہ عجیب و غریب خیال پیش کرتے ہیں کہ قیصر خبطِ کمتری کا شکار تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں ایک حادثے کے باعث اس کا بایاں بازو بیکار ہو گیا تھا۔ یہ لوگ اُس کی جنگجوئی کی خواہش کا تجزیہ اسی خبطِ کمتری کی بنیاد پر کرتے ہیں۔

ولیم ۲۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ایک قطعاً خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرے گا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کا نتیجہ اُس کے لئے غیر متوقع تھا۔ اُسے آخری لمحوں تک یہی یقین رہا کہ جنگ میں جرمنی کو ضرور فتح حاصل ہو گی۔

جرمنی کی شکست کے بعد ۱۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو قیصر جلاوطن ہو کر ہالینڈ چلا گیا۔ ڈورن (ہالینڈ) میں اُس کی زندگی ایک امیر زمیندار اور ایک شہنشاہ کی زندگی کا عجیب و غریب مجموعہ تھی۔ وہ درخت کاٹتا تھا۔ کثرت سے مطالعہ کرتا تھا۔ اور روز اپنی سوانحعمری لکھنے میں گھنٹوں مصروف رہتا تھا۔

قیصر نازی جرمنی کی ترقی کو بہت غائر نظروں سے دیکھتا تھا اور اگرچہ اُس نے کبھی اپنی رائے ظاہر نہ کی تھی مگر یہ سمجھا جاتا

ہے کہ وہ نازیوں کو جرمنی کا نجات دہندہ سمجھتا تھا۔ صرف یہودیوں کے معاملے میں اُسے نازیوں سے اختلاف تھا۔

جب جرمنی نے ہالینڈ پر قبضہ کر لیا تو اُن دنوں اس قسم کی اطلاعات پھیلی تھیں کہ قیصر واپس جرمنی چلا گیا ہے لیکن اِن اطلاعات میں مطلق صداقت نہ تھی۔ قیصر آخری وقت تک ڈورن میں رہا جہاں اُسے اپنی جاگیر میں آزادانہ نقل و حرکت کا اختیار تھا۔

مختصر سوانح عمری

فریڈرک ولیم وکٹر البرٹ سابق شہنشاہِ جرمنی و شاہ پرشیا ۲۷ جنوری ۱۸۵۹ء کو برلن میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ فریڈرک سوم تھا جو بعد میں قیصر بنا اور ماں انگلستان کی شہزادی وکٹوریا جو ملکہ وکٹوریہ کی بیٹی تھی۔ اس کی تعلیم کاسل جمنیزیم اور بون یونیورسٹی میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ ایک فوجی عہدے پر مامور ہوا نیز اُسے حکومت کے مختلف شعبوں کے متعلق تعلیم دی گئی۔

اپنے باپ کے انتقال پر ۱۵ جون ۱۸۸۸ء کو ولیم ثانی تخت نشین ہوا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں خدا کی طرف سے جرمنی کی حکومت پر مامور ہوں اور مجھے اختیار ہے کہ دوسروں کی رائے سے بے پروا ہو کر صرف اپنی رائے پر عمل کروں۔ اُس کے نزدیک خدا جرمنی کا آسمانی حلیف تھا۔ اُس کی مذہبی ذہنیت اور اقتدار و قوت کی خواہش میں ایک عجیب تضاد معلوم ہوتا تھا۔ ولیم ثانی کو مختلف فنون میں دلچسپی تھی مصوری، بت تراشی، موسیقی، شاعری، ڈراما، سیاسیات، فنِ خطابت، فنِ حرب غرض کہ اُس نے ہر فن کو سیکھنے کی کوشش کی۔

اس کے عہدِ حکومت کا سب سے پہلا اہم واقعہ یہ ہے کہ اس نے ۲۰ مارچ ۱۸۹۰ء کو اپنے قابل مشیر پرنس بسمارک کو معزول کر دیا۔ معزول کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ پرنس بسمارک کی رائے کے مطابق اشتراکیوں کے خلاف تعزیری قانون کی تجدید نہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے نہایت زوردار الفاظ میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ میں ہر قسم کی انقلابی شورشوں کو سختی سے دبا دوں گا۔

ولیم ثانی کے عہد میں جرمنی کی سلطنت میں بہت کچھ توسیع ہوئی اور کئی دُور دُور کے علاقے اِس میں شامل کئے گئے۔ اِس دوران میں اُس نے جرمنی کی فوج اور بحری بیڑے کو بہت کچھ طاقتور بنا دیا۔ فوج میں آخری سب سے بڑا اضافہ ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں کیل کینال کھولی گئی۔ ۱۸۹۶ء اور ۱۹۱۶ء کے درمیان بغداد ریلوے بنائی گئی اور قیصر نے ٹرکی سے دوستی پیدا کی۔ ٹرکی اور جرمنی کی یہ پرانی دوستی اب تک قائم ہے۔

قیصر کے عہدِ حکومت میں مزدوروں کے حقوق کی طرف بھی توجہ کی گئی اور مزدوروں کی حفاظت کے لئے بیمہ کی ایک عظیم الشان سکیم بنائی گئی لیکن اس قسم کی اصلاحات کے لئے قیصر کو زیادہ وقت نہ ملا اور جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ قیصر نے ان الفاظ کے ساتھ جنگ کا اعلان کیا کہ "میں جنگ نہ چاہتا تھا۔ میں امن قائم رکھنے کے لئے جو کام کرتا رہا وہ آج بالکل ضائع ہو گیا" کہا جاتا ہے کہ اگر قیصر واقعی امن پسند تھا تو پھر اُس کی خواہشِ امن پسندی اپنے مشیروں کی رائے سے مغلوب ہو گئی۔ جوں جوں جنگ بڑھتی گئی قیصر کی شخصیت پس منظر میں غائب ہوتی گئی۔ اِس دوران میں اُس کے صرف دو نمایاں کام نظر کے سامنے آتے ہیں (۱) ۱۹۱۶ء میں صلح کی پیشکش اور (۲) ۱۹۱۷ء میں استراع

کی قرارداد متعلقہ صلح کی مخالفت جنگ میں امریکہ کے شمول نے جرمنی کی حالت کمزور کردی۔ اِس پر پریزیڈنٹ ولسن کا یہ اعلان قیصر کی حکومت کے لئے بہت مضر ثابت ہُوا کہ وہ جرمنی کی موجودہ حکومت سے کسی قسم کا سمجھوتا نہیں کرسکتا۔ اِس پر قیصر نے آئینی وزارت قائم کی مگر یہ قدم بہت بعد از وقت اٹھایا گیا۔ چنانچہ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو قیصر فوج میں پناہ لینے کے لئے برلن سے رخصت ہوگیا۔ اِس کے بعد انقلاب آیا۔ ۳ر نومبر ۱۹۱۸ء کو اشتراکی وزراء نے قیصر کی سلطنت سے دست برداری کا مطالبہ کیا۔ ۹ر نومبر کو ہنڈنبرگ نے قیصر کو بتایا کہ فوج بھی اُس کی حمایت نہیں کرے گی۔ ولیم ثانی نے اعلان کیا کہ وہ قیصریت سے تو دست بردار ہوتا ہے لیکن وہ پرشیا کا بادشاہ رہے گا۔ اس پر اُس کو اطلاع دی گئی کہ اُس کا ہر دو حیثیتوں سے معزول ہونا ضروری ہے اور اُس کے لئے دوسرا کوئی چارہ کار نہیں۔ اِس پر اُس کے مشیروں نے اُسے ملک بدر ہونے کی رائے دی لیکن اُس نے ابتداء میں اِس رائے سے اتفاق نہ کیا۔ آخر جب اسے یہ معلوم ہُوا کہ فوج بھی جمہوری حکومت کی حمایت کررہی ہے تو وہ ہالینڈ کو روانہ ہوگیا جس کی سرحد پر پہنچ کر اُس نے اپنی تلوار ان الفاظ کے ساتھ ولندیزی پہرے دار کے حوالے کردی کہ "میں جرمن قیصر ہوں"۔ ایمرانجن (ہالینڈ) میں وہ کچھ عرصہ کاونٹ بینٹنک کا مہمان رہا۔ اِس کے بعد ۱۹۲۰ء میں اُس نے ڈورن میں ایک چھوٹا سا محل خرید لیا۔ اِس سے قبل اتحادیوں نے ہالینڈ کی حکومت سے قیصر پر مقدمہ چلانے کے لئے اُس کی تحویل کا مطالبہ کیا تھا لیکن حکومت نے یہ مطالبہ مسترد کردیا۔ چنانچہ اُس زمانے سے لے کر اب تک قیصر ڈورن ہی میں مقیم رہا۔ ابتدا میں اُس نے دوبارہ بادشاہت حاصل کرنے کے لئے منصوبے بنائے لیکن جب اُسے یہ معلوم ہُوا کہ شاہ پسند بھی اُس کی حمایت کے لئے تیار نہیں تو اس نے یہ خیال چھوڑ دیا۔

۱۱ر اپریل ۱۹۲۱ء کو قیصر کی ملکہ کا انتقال ہوگیا اور ۵ر نومبر ۱۹۲۲ء کو اُس نے پرنسس ہرمائن سے شادی کرلی۔ کہا جاتا ہے اُس کی سابق رعایا کو اس پر افسوس ہُوا۔

پرنسس ہرمائن اپنی کتاب "ڈورن کی زندگی" میں لکھتی ہے کہ قیصر نہایت اعلیٰ درجے کا شوہر اور دنیا کا سب سے زیادہ روشن دماغ انسان ہے۔ اپنی شادی کے تذکرے میں وہ لکھتی ہے کہ شادی کا باعث ایک ایسا خط ہُوا جو میرے ننھے بیٹے نے جلاوطن قیصر کو ازراہِ ہمدردی لکھا تھا۔ اِس خط کے وصول ہونے کے بعد قیصر نے ہمیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ یوں میں وہاں گئی اور وہاں سے رخصت ہونے سے قبل قیصر نے مجھے شادی کا پیغام دیا۔ چنانچہ میں نے اُس کی جلاوطنی اور رنج وغم میں حصہ دار بننے کے لئے اُس سے شادی کرلی۔ میرے دل کے کسی عمیق سے عمیق کونے میں بھی یہ امید نہ تھی کہ میں کسی دن آگسٹا وکٹوریا کا تاج زیبِ سر کروں گی۔

ایک اور مقام پر وہ لکھتی ہے کہ "شہنشاہ کی شخصیت عظیم الشان اور مسحور کن ہے۔ اُس کی برق پاش ہستی چکا چوند پیدا

کردیتی ہے۔ اُس کا دل گہرا لیکن پیچیدگی سے پاک ہے۔ اُس کی سیرت پہاڑ کی چوٹی پر کی جھیل کی طرح درخشاں ہے۔ قیصر حسِ ظرافت سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ نہایت تیز فہم اور نکتہ سنج ہے۔ وہ ایک ہی نظر میں ہر مسئلہ کی تہ تک پہنچ جاتا ہے اور ایک ہی لفظ میں اُس کا خلاصہ بیان کر سکتا ہے۔

خود پرنسس ہرائن کے متعلق قیصر اپنی یادداشت میں لکھتا ہے۔ کہ اُس نے اپنی پیشرو (آگسٹا وکٹوریا) کی اِس خواہش کو بے مثال طور پر پورا کر دیا ہے کہ "تمہیں ایک اور بیوی مل جائے جو تم سے محبت کرے اور تم پر مہربان ہو۔"

دنیا کے سمندر

	رقبہ مربع میلوں میں	اوسط گہرائی	زیادہ سے زیادہ گہرائی
بحرِ اوقیانوس	۳۴۰۰۰۰۰۰	۱۲۶۶۰ فٹ	۴۰۰۰۰ فٹ
بحرالکاہل	۷۱۰۰۰۰۰۰	۱۳۴۴۰ فٹ	۳۵۴۰۰ فٹ
بحرِ ہند	۲۸۰۰۰۰۰۰	۱۲۸۸۸ فٹ	۲۲۹۶۸ فٹ
بحرِ منجمد شمالی	۴۰۰۰۰۰۰	۳۸۴۰ فٹ	۱۳۱۲۰ فٹ
بحرِ منجمد جنوبی	۶۰۰۰۰۰۰		۱۳۹۳۲ فٹ

برِّ اعظم

	رقبہ مربع میلوں میں	اوسطِ بلندی	زیادہ سے زیادہ بلندی
یورپ	۳۰۰۰۰۰۰	۹۳۹ فٹ	۱۸۴۶۵ فٹ (کوہ البرز روس)
ایشیا	۱۷۲۰۰۰۰۰	۳۱۸۹ فٹ	۲۹۰۰۲ ” (ایورسٹ)
افریقہ	۱۱۵۰۰۰۰۰	۲۰۲۱ فٹ	۲۹۰۰۰ ” (کلیمن جارو)
آسٹریلیشیا	۳۰۰۰۰۰۰	۸۵۰ ”	۱۲۱۲۰ ” (مونٹ کوذریا)
شمالی امریکہ	۸۰۰۰۰۰۰	۱۸۸۸ ”	۲۰۴۶۴ ” (مونٹ میکنلے)
جنوبی امریکہ	۷۵۰۰۴۴	۲۰۷۸ ”	۲۳۰۸۰ ” (مونٹ ایکان کیگوآ)
خطۂ زمہریری جنوبی	۲۴۰۰۰۰۰		۱۲۷۶۰ ” (مونٹ ایری بس)

بیگم اکرام اللہ پی۔ایچ۔ڈی

ہمیں اِس اطلاع سے دلی مسرت ہوئی ہے کہ محترمہ شائستہ اختر بانو صاحبہ کو جو مسٹر حسان سہروردی کی صاحبزادی اور اکرام اللہ صاحب آئی سی ایس ڈپٹی سکرٹری سپلائی ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کی بیگم ہیں لنڈن یونیورسٹی کی طرف سے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی ہے۔

کچھ عرصہ ممدوحہ لندن میں سکول آف اورینٹل سٹڈیز (ادارۂ علوم مشرقیہ) میں مشہور مستشرق ڈاکٹر گریہم بیلی کے زیرِ نگرانی مطالعہ کرتی رہیں۔ اس کے بعد اُنہوں نے انگریزی میں اُردو ناول اور مختصر افسانہ کے ارتقا پر ۵۹۴ صفحات کا ایک بسیط مقالہ لکھا جس پر اُن کو یہ بلند پایہ ڈگری ملی۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ پہلی خاتون ہیں جن کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ کچھ عرصہ قبل ممدوحہ نے ہم سے ہمایوں کے گزشتہ پرچے نیز اُردو افسانوں اور تنقیدی ادب کی فہرست کتب منگائی تھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت کے غائر مطالعے کے بعد انہوں نے اپنا وہ علمی مقالہ تحریر فرمایا جس پر اُن کو یہ ڈگری ملی۔

ہم بیگم صاحبہ کی خدمت میں اہلِ اُردو کی طرف سے دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ وہ یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع کر کے اربابِ ذوق کو اُس سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔

شیخ محمد اکرام کی رحلت

شیخ احمد اکرام صاحب کے خط سے ہمیں یہ افسوسناک اطلاع ملی ہے کہ شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹرایٹ لاء ایڈیٹر "انیسِ نسواں" دہلی چار مہینے کی علالت کے بعد ۲۴ مئی ۱۹۴۱ء کو انتقال فرما گئے۔ اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعون۔

چالیس سال قبل جب شیخ عبد القادر صاحب نے مخزن جاری کیا مرحوم اُس کی ادارت اور دیگر انتظامات میں شیخ صاحب کے دستِ راست تھے۔ شیخ عبد القادر صاحب جب بیرسٹری کیلئے انگلستان تشریف لے گئے اس کے بعد شیخ محمد اکرام ایک عرصے تک "مخزن" کو مختارِ جزو و کل رہے اس عرصے میں انہوں نے مخزن کا معیار بہت خوبی سے قائم رکھا۔

مُلّا واحدی صاحب رسالہ "ادیب" دہلی میں شیخ محمد اکرام مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "اب مخزن سے زیادہ شاندار رسالے نکلتے ہیں لیکن مخزن سے پہلے مخزن جیسا رسالہ کوئی نہیں تھا۔ موجودہ طرز کے رسالوں کی ابتدا مخزن نے کی تھی۔ مخزن کے بعد جتنے رسالے نکلے ہیں حقیقۃً سب مخزن کے مقلد ہیں۔ مخزن کی بنیاد شیخ عبد القادر کے ہاتھوں پڑی تھی لیکن اُس کی عمارت کی تکمیل شیخ محمد اکرام صاحب کے ہاتھوں ہوئی اس لحاظ سے اُردو کے ہر رسالے کو شیخ محمد اکرام صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ اُردو کے ہر رسالے کو شیخ محمد اکرام صاحب سے ناقابلِ فراموش نسبت ہے۔۔۔۔۔۔ شیخ عبد القادر صاحب اور شیخ محمد اکرام صاحب ہم سب رسالے والوں کے استاد ہیں۔"

اُردو دنیا کو شیخ محمد اکرام صاحب کے انتقال سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ اُن کا رسالہ "انیسِ نسواں" جو ظاہری و معنوی محاسن کا مرقع تھا چند سال سے مسلمان خواتین کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا تھا۔ ہمیں مرحوم کی بیگم صاحبہ اُن کے صاحبزادوں اور دیگر متعلقین سے دلی ہمدردی ہے۔ مرحوم کا نام اُردو صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

حامد علی خاں

"تاریخِ اودھ اور نواب بہو بیگم"

جتنی دیر میں نے اودھ کے قدیم دارالسلطنت فیض آباد میں قیام کیا، مجھے وہاں کے تاریخی حالات معلوم کرنے کا بے حد شوق رہا۔ چنانچہ اس تجسّس کے دوران میں مجھے اس قابل خاتون کے حالات بہت دلچسپ معلوم ہوئے۔ افسوس ہے کہ اودھ کے علاوہ ہندوستان کے طول وعرض میں نواب بہو بیگم کو وُہ شہرت حاصل نہیں، جس کی وُہ مستحق ہیں۔ سچ پوچھئے تو اردو شاعری اور ادب کی سرپرستی کرنے اور مملکتِ اودھ نیز اردو علم وادب کی تاریخ بنانے میں "بہو بیگم" کا بہت حصّہ ہے ۔

بعض قارئین اس عجیب وغریب نسوانی نام (نواب بہو بیگم) پر متعجّب ہونگے، اور اُن کا یہ استعجاب دُرست بھی ہوگا کیونکہ دراصل یہ نام نہیں، بلکہ مملکتِ اودھ کی ایک ملکہ کا خطاب تھا ۔

اگلے وقتوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اودھ دراصل اجودھیا کی بگڑی ہوئی یا مختصر شکل ہے جہاں پہلے سورج بنسی خاندان کے راجا راج کرتے تھے۔ غالبًا یہ وسط ایشیا کے وہی آریا لوگ ہیں جو پہلے ہستناپور وغیرہ مقامات میں آباد تھے، اور پھر اُن کی اَولاد نے آہستہ آہستہ جنوبی ہند کی جانب بڑھنا شروع کیا، ہندوستان کے اِس حصّہ کا نام اُس زمانہ میں کوشل کے نام سے مشہور تھا۔ شہر اجودھیا بھی اسی مملکت کی راجدھانی تھا، اور اب اِس شہر کے کھنڈر فیض آباد سے دو تین میل کے فاصلے پر دریائے گھاگرا کے کنارے پائے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا آغاز راجہ اکشواکو نام سے ہوا تھا، اور کوئی ساٹھ راجاؤں کے حکومت کرنے کے بعد راجہ رام چندرجی کا باپ راجہ دسرتھ نام تخت پر بیٹھا۔

ایک انگریز مؤرخ نے رام چندرجی کے زمانے کو ایک ہزار سال قبل مسیح بتایا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو، اودھ کا علاقہ دہی قدیم مردم خیز خطّہ ہے، جس نے قدیم زمانے میں راجہ رام چندر ایسی برگزیدہ ہستیاں پیدا کیں، اور پھر مُسلم شاہانِ اودھ کے زمانے میں شاعرانِ باکمال اور مدبّرانِ بلند اقبال پیدا کئے ۔

مثل مشہور ہے کہ زمانہ ایک حالت پر کبھی قائم نہیں رہتا۔ جہاں پہلے اجودھیا میں شاہی محلّات تھے، وہاں صدیاں گزر جانے کے بعد اُن کی ٹوٹی پھوٹی نشانیاں یعنی کھنڈر باقی رہ گئے، جو اُس رفتہ وگذشتہ زمانے کی یاد اب بھی تازہ کرتے ہیں۔ دہلی میں جب سلطنتِ مغلیہ کا جنازہ اُٹھنے کو تھا، تو تیموری خاندان کی شام ہوتے ہی تاریخ نے اپنے واقعات کو پھر دُہرانا چاہا، اور وہ یُوں کہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں سلطنتِ مغلیہ کے حصّے بخرے جو ہونے شروع ہُوئے، تو جہاں دکن میں نظام الملک آصف جاہ نے ۱۷۲۲ء میں اپنی خودمختار حکومت قائم کرلی، وہاں اودھ میں نواب سعادت علی خاں نے بھی نادر شاہ کی لُوٹ

مار کے بعد ۱۷۳۲ء میں اپنی خود مختار "حکومتِ اودھ" کا اعلان کر دیا۔ اور اس طرح گویا وہ اودھ کے نوابوں کے خاندان کے بانی ہوئے۔ درحقیقت یہ بھی شہنشاہِ دہلی کے وزیرِ اعظم تھے، مگر جب وہاں کا رنگ بگڑتا دیکھا، تو وزارتِ عظمیٰ کو چھوڑ کر اپنی سلطنت کی عمارت الگ جا بنائی۔ اور اپنا دار الحکومت فیض آباد قرار دیا۔ اگرچہ اب یہ اپنی ریاست کے سیاہ و سفید کے مالک تھے، لیکن پھر بھی انہوں نے اصالتہً بادشاہ کا لقب اختیار نہ کیا تھا، اور فرمانروایانِ اودھ صرف نواب وزیر ہی کہلایا کرتے تھے نیز دہلی کے برائے نام بادشاہ کی طرف سے اُن کے لئے خطاب اور خلعتِ وزارت آیا کرتا تھا۔

اودھ کے سب سے پہلے نواب وزیر سعادت علی خاں فی الحقیقت ایران کے ایک شیعہ مذہب کے تاجر تھے، اور اپنی ذاتی محنت اور قابلیت کے زور سے سلطنتِ مغلیہ کی وزارتِ عظمیٰ کے جلیل القدر عہدہ تک پہنچے تھے، اور جب وہ ایک مرتبہ صوبۂ اودھ کے زرخیز علاقہ کے صوبہ دار (گورنر) مقرر کئے گئے، تو انہوں نے مستقل طور پر نہ صرف خود وہیں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا، بلکہ آئندہ نسل کے لئے بھی سلطنتِ اودھ کی بنیاد رکھدی۔ بالفاظِ دیگر اُن کے بعد اودھ کی صوبہ داری موروثی ہو کر رہ گئی۔ با ایں ہمہ قانونی طور پر ایک صوبہ دار گویا شہنشاہِ دہلی کا نائب ہوتا تھا، اور ہر صوبہ دار کے اختیارات گویا شاہِ دہلی کے تفویض کئے ہوئے ہوتے تھے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم اس مقالہ کی ہیروئن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ نواب بہو بیگم کا اصلی نام امۃ الزہرا بیگم تھا، یہ مؤتمن الدولہ نواب محمد اسحاق خاں شوستری کی بیٹی تھیں۔ اُس وقت دہلی میں روشن اختر محمد شاہ کے لقب سے سریر آرائے سلطنت تھے اور اُن دنوں ننھی نواب زادی امۃ الزہرا "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق بہت ذہین اور عقلمند تھی۔ اور بادشاہ محمد شاہ اس ننھی بچی کی عقل و فراست دیکھکر بہت خوش ہوتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو اپنی منہ بولی دختر یعنی پالک بیٹی بنا لیا تھا، اور جوان ہونے پر اس کی شادی نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ سے کرا دی۔ ظاہر ہے کہ اسے جہیز میں وہ کچھ ملا جو ہندوستان کے شہنشاہ کی بیٹی کے شایانِ شان ہو سکتا تھا، اور جب وہ سسرال یعنی فیض آباد پہنچی، تو اُس کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔ اب چونکہ یہ رواج عام ہے کہ جب سسرال کے گھر نئی دلہن آتی ہے تو اُس کے میکے کے نام کے علاوہ سسرال کی طرف سے دلہن کی خوبیوں اور صفات کے مطابق اُسے نئے خطاب سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس لئے امۃ الزہرا کو بھی سسرال کی طرف سے "بہو بیگم" اور "خاص محل" کے جلیل القدر خطابات ملے اپنی فرزانگی اور دانشمندی کی بدولت اُس نے بہت جلد سب لوگوں کے دل میں گھر کر لیا۔

اُدھر دہلی کی حالت روز بروز بگڑ رہی تھی۔ محمد شاہ کا رنگیلا پن تو مشہور ہی ہے، بقولِ "آزاد" ملک کا انتظام اُس نے امیروں اور وزیروں پر چھوڑا، اور خود ناچ رنگ اور شراب و کباب کی بدولت ایسا عیش و عشرت کے دریا میں ڈوبا کہ کسی بات کی بھی خبر نہ رہی۔ رعیت بھی پشتوں سے انعام و اکرام سے مالا مال ہوتی چلی آتی تھی۔ گھر گھر عیش و عشرت سے دن عید اور رات شبِ برات ہو گئی۔ "مہتاب باغ" اور "حیات بخش" کے باغوں کو سجا کر طلسمات کا نمونہ کر دیا۔ نہروں میں

نواڑے پڑے رہتے۔ بادشاہ اُن میں بیٹھتے۔ ناچ رنگ کے جلسے جمتے اور شراب کے دور چلتے۔ جب برسات آتی تو اُن کے ہاں بہار آتی قطب صاحب کے جنگل سبزے سے ہرے بھرے ہو جاتے، اور یہ شہر کو چھوڑ کر وہاں جا رہتے۔ حکم تھا کہ ابر سیاہ ہمارا نقیب ہے۔ جب گرجنے کی آواز آیا کرے، اُس وقت کمربندی ہو جایا کرے۔" ظاہر ہے کہ جہاں اہل دربار ایسے ایسے خیالات و حالات میں ہوں، وہاں ملک کے انتظام کا کیا ٹھکانا۔ اور تازہ گل یہ کھِلا کہ نادر شاہی لوٹ اور قتلِ عام نے دربارِ مغلیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس کی جڑیں کھوکھلی کر کے رکھدیں۔ چنانچہ اِس عالمِ بے کسی میں بہو بیگم کے بھائی بند رشتہ دار وغیرہ جو دہلی میں تھے وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور فیض آباد کا رُخ کیا۔ بہو بیگم نے ان کی نہ صرف خوب آؤ بھگت کی بلکہ اپنے دربار میں اعلیٰ ملازمتیں بھی دلوائیں۔ رفتہ رفتہ دہلی کے سب مصیبت زدہ لوگوں کا معمول ہو گیا کہ جب وہاں کے حالات بیحد پیچیدہ ہو جاتے تو وہ فیض آباد کا رُخ کرتے اور بہو بیگم کے دربار سے فیضیاب ہوتے۔ نیز بہو بیگم سب سے بھائیوں کی مانند سلوک کرتی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اُس کی فیّاضی اور سخاوت ضرب المثل بن گئی، اور آدھی دہلی اُٹھکر وہاں آگئی۔ بقول شخصے فیض آباد دہلی کا ایک محلہ بن کر رہ گیا +

اِس کے تھوڑی دیر بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بالکل ہی بکھر گیا۔ آئے دن لوٹ مار ہوتی رہتی۔ احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں نے شمالی ہندوستان کے لوگوں کا الگ ناک میں دم کر رکھا تھا۔ محمد شاہ کے بعد اُس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہُوا، مگر اُس کے وزیر نے اُسے اندھا کر دیا، اور جہاندار شاہ کا بیٹا عالمگیر ثانی کے خطاب سے ۱۷۵۴ء میں تخت پر بیٹھا، مگر ۱۷۵۹ء میں اُسی وزیر نے عالمگیر ثانی کو بھی قتل کر دیا۔ اور اس کے بعد اُسکا بیٹا عالی گوہر شاہ عالم ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا، اور اس زمانہ میں بادشاہت صرف نام کو رہ گئی۔ بادشاہ کبھی تو انگریزوں کے قبضہ میں تھا اور کبھی مرہٹوں کے اشاروں پر چلتا تھا۔ اس کس مپرسی کے عالم میں بھلا دہلی میں عوام الناس کا کون پرسانِ حال ہوتا۔ چنانچہ سب اہلِ کمال کا مجمع منتشر ہو گیا، اور بڑے بڑے نامی گرامی شعرائے کرام افکارِ معاش میں دہلی سے نکل کھڑے ہوئے اور اُن میں سے کئی فیض آباد پہنچ گئے۔ بہو بیگم کے بھائی نواب میرزا علی خاں اور اشرف علیخاں فغاں (جو احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے)، اور علامہ سراج الدین خاں آرزو، میر غلام حسین ضاحک، میرزا محمد رفیع سودا، میر سوز، میر ضیاءالدین ضیا، میر غلام حسن حسن، شیخ قلندر بخش جرأت وغیرہ فیض آباد آبسے، اور پھر فیض آباد کی سرزمین سے شیخ امام بخش ناسخ، خواجہ حیدر علی آتش، نواب سید محمد خاں رند اور (میر حسن کے بیٹے) میر مستحسن خلیق (جن کے بیٹے میر انیس مشہور مرثیہ گو ہیں) میر سلمان اور اُن کے بیٹے میر علیؔ اوسط رشک، امیر اللہ تسلیم وغیرہ پیدا ہوئے یا اُن آبا و اجداد وغیرہ کی پیدائش اور نشو و نما فیض آباد میں ہوئی، مگر پھر دارالسلطنت کے فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو جانے کے بعد سب اہلِ دربار اور شعرائے نامدار نے لکھنؤ آکر بود و باش اختیار کر لی۔ اِس ضمن میں فیض آباد سے لکھنؤ میں دارالسلطنت کے تبدیل ہونے کے اسباب و علل بعد میں بیان کئے جائیں گے۔ پہلے نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کے زمانہ کے (جبکہ فیض آباد

پایہ تخت تھا) واقعات مندرج کئے جاتے ہیں +

اُس زمانہ میں لکھنؤ کی حیثیت ایک معمولی قصبہ سے زیادہ نہیں تھی، اور فیض آباد میں سخنورانِ باکمال کا جمگھٹا تھا۔ مغلیہ خاندان کی سکونت کے باعث ایک محلہ مغلپورہ کہلانے لگا، جس میں شاعرِ باکمال خواجہ حیدر علی آتش پیدا ہوئے تھے۔ اور ہاں یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نواب بہو بیگم کے شوہرِ عالی قدر نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کے بھی کچھ حالات بیان کر دیئے جائیں جو تاریخِ ہند میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں +

ہندوستان کی تاریخ میں شجاع الدولہ کا نام سب سے پہلی مرتبہ اُس سلسلہ میں آتا ہے، جبکہ دہلی کے تخت پر عالمگیر ثانی متمکن تھا۔ اُن دنوں بنگالہ کے صوبہ سے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی خبریں شاہی دربار میں پہنچیں تو ۱۷۵۸ء میں بادشاہ کے سب سے بڑے لڑکے عالی گوہر نے (جو بعد میں شاہ عالم کے نام سے مشہور ہُوا) شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کو ساتھ لے کر بنگال پر حملہ کر دیا۔ وہاں پہنچ کر جب اُنکو معلوم ہُوا کہ میر جعفر اپنے ضمیر کے ساتھ اپنا وطن اور آقا شہنشاہ دہلی کا مفاد بھی انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے نیز انگریز اُس کے پشت پناہ ہیں، تو نواب وزیر شجاع الدولہ تو چپکے سے اودھ آگئے، اور شاہزادہ عالی گوہر انگریزوں کے افسر کلائیو سے ملا، جو شاہزادہ کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آیا اور کہتے ہیں کہ شاہزادہ کو کچھ تحائف بھی دیئے جس سے شاہزادہ بہت خوش ہُوا اور کلائیو کے حُسنِ اخلاق کی تعریف کرتا ہُوا واپس دہلی چلا گیا۔ میر جعفر کے بعد پھر میر قاسم بنگال کا نواب بنا۔ اور ۱۷۶۳ء میں پٹنہ کے مقام پر انگریزوں پر دھاوا بول دیا۔ جس میں کئی انگریز مارے گئے۔ اُدھر انگریز انتقام لینے کی غرض سے اس کی طرف بڑھے، مگر اب وہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کے پاس جا کر پناہ گزیں ہُوا۔ اب شاہزادہ عالی گوہر دہلی کے تخت پر شاہ عالم ثانی کے لقب سے متمکن ہو چکا تھا چنانچہ اس مرتبہ شجاع الدولہ، میر قاسم اور شاہ عالم تینوں مل کر ۱۷۶۴ء میں انگریزوں پر حملہ آور ہوئے اور بکسر کے مقام پر اِن مختلف طاقتوں کا مقابلہ ہُوا۔ اور انگریزوں کو فتح حاصل ہوگئی۔ میر قاسم تو فرار ہو گیا، مگر شجاع الدولہ اور شاہ عالم انگریزوں سے صُلح کے طالب ہوئے۔ چنانچہ یکم اگست ۱۷۶۵ء کو صُلحنامۂ الہ آباد مرتب ہُوا، جس کی رُو سے شجاع الدولہ کو پچاس لاکھ روپے تاوانِ جنگ انگریزوں کو دینے پڑے اور کورا اور الہ آباد کے ضلع جات اودھ سے نکال کر شاہ عالم کو دیئے گئے اور شاہ عالم ثانی سے انگریزوں نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی مالگذاری وصول کرنے کا استحقاق لے لیا۔ بالفاظ دیگر وہاں کے دیوان تو انگریز مقرر ہوگئے مگر برائے نام بادشاہ شاہ عالم ہی رہا، اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے قدم مستقل طور پر جم گئے جو آج بھی بدستور قائم ہیں +

اِس عہدنامہ کی رُو سے یہ بھی قرار پایا تھا کہ اگر اودھ پر مرہٹے یا کوئی دُوسری طاقت حملہ کرے تو انگریز نواب وزیر کی مدد کریں گے۔ اب ۱۷۷۲ء سے وارن ہیسٹنگز انگریزوں کا گورنر مقرر ہُوا۔ اُن دنوں انگریز اپنی بدنظمیوں کے سبب مالی مشکلات میں مبتلا تھے، اسلئے وارن ہیسٹنگز نے شاہ عالم ثانی سے کورا اور الہ آباد کے اضلاع چھین کر نواب وزیر

اودھ شجاع الدولہ کے ہاتھ پچاس لاکھ روپے کے عوض فروخت کر دیئے اور ساتھ ہی شجاع الدولہ نے وارن ہیسٹنگز سے یہ وعدہ کیا کہ اگر نواب وزیر اودھ کو علاقۂ روہیلکھنڈ کے روہیلوں سے لڑنے کی نوبت آئی تو وارن ہیسٹنگز اپنی انگریزی فوج سے اُس کی مدد کرے ؂

روہیلکھنڈ کا علاقہ اودھ کے شمال مغرب میں کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے، جس میں بریلی، نینی تال، مراد آباد المولڑا وغیرہ کے اضلاع شامل ہیں۔ اِس علاقہ کا رقبہ تقریباً بارہ ہزار مُربع میل ہے اور آبادی ساٹھ لاکھ سے اوپر ہو گی۔ مجھے اِس علاقہ کے مختلف مقامات مثلاً بریلی، مراد آباد، ہلدوانی اور کاٹھ گودام وغیرہ دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ یہ علاقہ زیادہ تر پہاڑی ہے اور اس کا باقی حِصّہ بھی پہاڑ کی قدمبوسی کرتا ہے۔ اور بہت زرخیز اور صحت افزا واقع ہُوا ہے۔ انگریزی صوبجاتِ متحدہ کا گرمائی مستقر اسی علاقہ کا ایک شہر نینی تال ہے۔ اور بہت سے نشیب و فراز ہونے کے سبب یہاں چھوٹی پٹڑی کی ریلوے ہے۔ جو روہیلکھنڈ کمایوں ریلوے کے نام سے مشہور ہے۔ اِس علاقہ میں بے حد گھنے جنگل پائے جاتے ہیں جن کے سبب سے اب یہ علاقہ لکڑی مہیّا کرنے کے لئے بہت مشہور ہے۔ اور تو اور کاٹھ گودام اور ہلدوانی جیسے شہروں کی وجہ تسمیہ ہی اِس امر کو ظاہر کرتی ہے یعنی ہلدوانی کے گرد و نواح میں ہلدو لکڑی بہت پائی جاتی ہے اور کاٹھ گودام لکڑی کا گودام ہے ؂

اِس علاقہ کے باشندے روہیلے دراصل کوہِ سلیمان کے افغانوں کی نسل سے ہیں، اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کیساتھ یہ بھی اِس علاقہ پر آکر قابض ہو گئے۔ یہ ایک بہت جبری اور تند خُو قوم کے فرد تھے۔ پورے علاقہ کا کوئی ایک حاکم نہ تھا، بلکہ کئی سردار مختلف حِصّوں پر گویا دھرنا مارے بیٹھے تھے۔ انہی روہیلوں کے ایک فرد غلام قادر (روہیلہ) نے شاہ عالم ثانی پر بے حد مظالم توڑے تھے۔ اُس نے اپنی تلوار کی نوک سے بادشاہ کی آنکھیں نکال کر اُسے اندھا کر دیا، اور حرم سرا کی بیگمات اور شاہزادیوں کو بھی بہت اذیّتیں پہنچائیں، اور اُن کی بے انتہا بے حُرمتی کی۔ المختصر کونسے جَور و ستم تھے جو اُس نے نہ ڈھائے اور پھر وہاں سے بھاگ نکلا۔ مگر بالآخر راستہ میں گرفتار کر لیا گیا اور اُس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے اور بڑے عذاب سے اُسے جہنم رسید کیا گیا۔ مگر اِس سے کیا ہوتا تھا، جو ہونا تھا سو ہو چکا تھا۔ شاہ عالم چونکہ خود شاعر تھا اور آفتاب تخلص تھا۔ اس لئے اس واقعہ کو ایک فارسی قطعہ میں نظم کیا جو نہایت دردانگیز ہے۔ اِس کا ترجمہ اردو اشعار میں بھی کیا گیا ہے، جس میں سے کچھ اشعار یہ ہیں:۔

"حادثہ کی اُٹھی آندھی جو مری خواری کو، دَم میں برباد کیا میری جہانداری کو
آنکھیں نکلیں تو ہُوا خوب کہ دیکھوں گا نہیں، غیر کے قبضہ میں اورنگ جہانداری کو
کی اُس افغاں بچہ نے شوکتِ شاہی برباد۔ کون پہنچے گا خُدا چھُٹ مری اب یاری کو
تھا جس افغاں بچہ کو دُودھ پلا کر پلا، بدلے اِس حق کے وُہ آیا مری غم خواری کو
نازنینیں مری ہمدم جو تھیں یاں ایک نہیں خِرمنِ مبارک محل اِس میری پرستاری کو

کوئی پہنچا دو خبر حال کی میرے کہ نظام۔ شاید آنکلے محبت سے خبرداری کو
آفتاب آج فلک نے کیا گر بے سر و پا، بخشے گا کل تجھے حق پھر تری سرداری کو"

ہمارے ترجمانِ حقیقت علامہ سر محمد اقبال مرحوم و مغفور نے بھی اسی غلام قادر روہیلہ پر اپنے سفرِ یورپ کے بعد ایک نہایت دردانگیز نظم لکھی تھی، جس میں اِس اندوہناک واقعہ کا نقشہ آنکھوں کے آگے پوری طرح کھنچ جاتا ہے۔ دل نہیں چاہتا کہ ایسے موزوں اور برمحل موقع پر اُس مشہور و معروف نظم کے چند اشعار یہاں درج نہ کئے جائیں:-

رُہیلہ کس قدر ظالم، جفا جُو، کینہ پرور تھا،
نکالیں شاہِ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے،
دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ستم گر نے
یہ اندازِ ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے،
بھلا تعمیل اس فرمانِ غیرت کُش کی ممکن تھی!
شہنشاہی حرم کی نازنینانِ سمن بر سے!
لرزتے تھے دلِ نازک، قدم مجبورِ جنبش تھے
رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدۂ تر سے
یونہی کچھ دیر تک محوِ نظر آنکھیں رہیں اُس کی،
کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بارِ مغفر سے،
کمر سے اُٹھ کے تیغِ جاں ستاں آتش فشاں کھولی،
سبق آموزِ تابانی ہوں انجم جس کے جوہر سے،
رکھا خنجر کو آگے، اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا،
تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشمِ احمر سے
بُجھائے خواب کے پانی نے اخگر اُس کی آنکھوں کے
نظر شرما گئی ظالم کی دردانگیز منظر سے،
پھر اُٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے،
"شکایت چاہئے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے
"مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی تکلف تھا
کہ غفلت دُور ہے شانِ صف آرایانِ لشکر سے،

"یہ مقصد تھا مراس سے کوئی تیمور کی بیٹی،
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے،
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیّت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے،

اُدھر قلعۂ دہلی میں تو ایک روہیلہ کی بدولت یہ حال ہُوا اور اِدھر روہیلکھنڈ میں اِس قوم کے بڑھتے ہوئے حوصلے مرہٹوں کے لئے خطرہ کا موجب بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ وُہ بھی اُن کو تباہ کرنے کی غرض سے وقتاً فوقتاً اُن پر حملے کو دیا کرتے تھے۔ چنانچہ مرہٹوں کی دستبرد سے بچنے کیلئے روہیلوں کا ایک سرگروہ حافظ رحمت خاں نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ سے مدد کا خواستگار ہُوا۔ اور ۱۷۷۲ء میں دونوں میں یہ عہدنامہ ہوگیا جس سے طے پایا کہ اگر مرہٹے روہیلکھنڈ پر حملہ کریں تو نواب اودھ ان کی امداد کرے۔ اور اگر وہ مرہٹوں کو روہیلکھنڈ سے نکال دے، تو روہیلے نواب وزیر کو چالیس لاکھ روپے دیں۔ ۱۷۷۳ء کے آغاز میں مرہٹوں نے روہیلکھنڈ پر حملہ کر ہی دیا، اور روہیلوں نے معاہدہ کے مطابق نواب وزیر سے امداد مانگی، اور اُس نے بھی مدد کے لئے فوج بھیجدی۔ مگر مرہٹے نواب قدیم کی فوج پہنچنے سے قبل ہی کسی وجہ سے بغیر لڑائی کئے واپس چلے گئے۔ مگر نواب وزیر نے حسبِ معاہدہ روہیلوں سے چالیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ مگر اب روہیلے ٹال مٹول کرنے لگے کہ روہیلے تو نواب وزیر کی فوج کی آمد سے قبل ہی واپس لوٹ گئے تھے اِس لئے اب روپیہ کا مطالبہ کیسا؟۔ اِس پر نواب شجاع الدولہ کو بہت غصّہ آیا۔ اور روہیلوں کو تباہ کرنے کے ارادہ سے انگریزوں سے فوجی امداد طلب کی، اور وعدہ کیا کہ وہی چالیس لاکھ روپے جو مجھے روہیلوں سے لینے ہیں، تم کو دے دوں گا۔ چنانچہ ۱۷۷۴ء میں انگریزی فوج کی مدد سے نواب شجاع الدولہ نے روہیلوں پر دھاوا بول دیا۔ اور بالآخر روہیلوں کو میراں پور کٹرہ کے مقام پر شکستِ فاش ہوئی۔ کئی ہزار روہیلے جلاوطن کر دیئے گئے۔ اور روہیلکھنڈ کا علاقہ مُلکِ اودھ کے ساتھ شامل کر دیا گیا جو آج بھی بدستور قائم ہے۔ صرف تھوڑا سا علاقہ روہیلوں کے ایک وفادار سردار کو دیا گیا جو ریاست رامپور کے نام سے مشہور ہے۔ اِس جنگ میں روہیلوں کا بہادر سردار حافظ رحمت خاں مارا گیا۔ اور کہتے ہیں کہ اِس فتح کے بعد نواب وزیر کی فوج نے روہیلوں پر بڑے مظالم کئے اور خوب لُوٹ مار مچائی۔ کئی گاؤں کے گاؤں جلا کر خاک سیاہ کر دیئے گئے۔ اِن بے پناہ مظالم میں انگریزی فوج کے سپاہی بھی بدنام ہونے سے نہ بچے، کیونکہ انہی کی بدولت روہیلوں پر یہ آفت آئی تھی۔ اِس واقعہ کی بابت مؤرخین کی رائیں بہت مختلف ہیں بعض تو یہ کہتے ہیں کہ نواب شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خاں کے بیٹوں کو اپنے پاس رکھا، جن میں ایک نواب محبت خاں بھی تھے، اور دربار لکھنؤ سے اِن کا وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا، اور وُہ ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر اور ادیب تھے، اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے اُنہیں نے سسّی پنّوں کا قصّہ نظم کر کے اِس کا نام "اسرارِ محبت" رکھا تھا۔ اور اُن کے کلام کا دیوان بھی موجود ہے۔

۱۷۷۵ء مطابق ۱۱۸۷ھ میں نوّاب شجاع الدولہ کا انتقال ہوگیا، اور یہ نامی گرامی ہستی فیض آباد میں "گلاب باڑی" نام کے ایک عظیم الشان باغ میں مدفون ہوئی، اور آج تک بدستور چاندی کے قدِ آدم کٹہرے میں فرمانروائے اودھ محوِ خواب ہے۔ اللہ، اللہ۔ یہ انجامِ ہستی اور بس ہمیشہ رہے نام اللہ کا ؛

شجاع الدولہ کی وفات کے بعد آصف الدولہ یحییٰ علی خاں ہزبر جنگ نوّاب اودھ ہوئے، یہ امۃ الزہرا نواب بہو بیگم کے بطن سے تھے۔ اودھ اور روہیلکھنڈ نیز الہ آباد وغیرہ کا زرخیز علاقہ ترکہ میں پایا تھا۔ مگر اُن میں باپ کا سا منچلا پن اور دانت و تدبر نیز والدہ کی سی فرزانگی تو کیا ہونا تھی، بلکہ ناقابلیّت کے ساتھ ساتھ اُن کے مزاج میں عیش پرستی بھی تھی۔ اور والدہ کی فیّاضی ہی ترکہ میں آئی تھی۔ چنانچہ دن رات اندھادھند دولت لٹانے لگے۔ زمامِ حکومت خواجہ سراؤں کے ہاتھ میں دے دی اور زمانہ شناس حریفوں نے اِس کا فائدہ اُٹھایا۔ نیز انگریزوں نے برضا و رغبت جونپور، بنارس، اور غازی پور کے تین سرسبز و شاداب اضلاع لے لئے۔ اب قدرتی طور پر اُن کی والدہ بہو بیگم" صاحبہ اُن کی اِن خفیف حرکات پر بہت ناخوش ہوئیں، اور اُن کے کاموں میں روک ٹوک کرنے لگیں۔ اب بھلا رنگیلے نوجوان نوّاب صاحب اِن پابندیوں کو کب برداشت کر سکتے تھے کیونکہ اُن کو دل کھول کر اپنے ارمان نکالنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ چنانچہ اس وجہ سے سات برس وہاں رہنے کے بعد بالآخر تنگ آکر ایک روز شکار کا بہانہ کرکے فیض آباد سے لکھنؤ آگئے، اور یہاں ہی مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اب لکھنؤ کے نصیب بھی جاگے۔ اودھ کا دار الخلافہ بجائے فیض آباد کے لکھنؤ بنایا۔ اور نئے محلسرا اور باغات اور بازار وغیرہ تعمیر کرلئے چونکہ خود شیعہ تھے، اِسلئے لکھنؤ میں اُن کے زمانے کی عمارتوں میں وہاں کا عالی شان امام باڑہ اب تک قائم ہے جو لکھنؤ میں فنِ تعمیر کے اعتبار سے لاثانی عمارت ہے اور اسے لوگ بہت دُور دُور سے دیکھنے کیلئے آتے ہیں۔ اِسے دہلی کے مشہور مہندس (انجینئر) کفایت اللہ خاں نے تعمیر کیا تھا۔ علاوہ ازیں اِس کا رومی دروازہ۔ باؤلی۔ مسجد۔ امام باڑہ کی لداؤ کی تین چھتیں اور بھول بھلیّاں وغیرہ دنیا کی عجیب و غریب عمارتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ اور ان سب کی تعمیر کا سہرا آصف الدولہ کے سر ہی ہے اور سچ پوچھئے تو موجودہ لکھنؤ کا سنگِ بنیاد انہی کا رکھا ہُوا ہے ؛

جیسا پہلے عرض کیا جاچکا ہے آصف الدولہ میں ناقابلیّت، عیش پرستی۔ اور دیگر بُری عادات تھیں۔ لیکن اُس میں ایک خوبی بھی تھی کہ اپنی والدہ بہو بیگم کی مانند وُہ بہت فیّاض و مخیّر بھی تھا۔ اِس واسطے ملک کے سب لوگ اُس سے بہت خوش تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ آج تک بھی لکھنؤ کے بازاروں کے دُکاندار نیک شگون کے طور پر آصف الدولہ کا نام لے کر صبح دُکان کھولتے ہیں، اور وہاں یہ فقرہ عام کہاوت بن کر رہ گیا ہے کہ "جس کو نہ دلائے مولا، اُس کو کیا دیں آصف الدولہ"۔

الغرض اُس نے لکھنؤ کے امام باڑہ اور دیگر عمارتوں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ کُل لاگت کا تخمینہ پچاس لاکھ کیا جاتا ہے صرف یہی نہیں، بلکہ نجفِ اشرف (ملکِ عراق) میں بھی ایک نہر جاری کرائی جو اُن کے نام پر نہرِ آصفی کہلاتی ہے۔ اور اِس بنا پر اُنکی سخاوت نہ صرف اودھ ہندوستان ہی میں زبان زدِ عام ہے بلکہ ملکِ عراق میں بھی اُن کی یادگار قائم ہے ؛

آصف الدولہ کے عہدِ حکومت کی ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ وہ دن رات عیش و آرام ہی میں ڈوبے رہتے تھے مگر چونکہ خود شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، اسلئے اپنے مذہبی خیالات و عقائد کی بہت تبلیغ و اشاعت کرتے رہتے تھے۔ اُس زمانہ میں ہندوستان میں ابھی بہت کم اہل تشیّع تھے، لیکن اب چونکہ ایک ملک کے فرمانروا ہی شیعہ تھے اس لئے لوگ کچھ تو "جیسا راجہ ویسی پرجا" کے مصداق، اور دوسرے آصف الدولہ کی سخاوت سے متأثر ہو کر، اور تیسرے اُن کی تبلیغ و اشاعت کی مساعی کے سبب ہزاروں کی تعداد میں شیعہ ہونے شروع ہو گئے۔ نواب آصف الدولہ کے نائب حسن رضا خاں بھی بہت مذہبی آدمی تھے۔ اور دوسرے اپنے آقا کو خوش کرنے کی غرض سے انہوں نے بھی لاکھوں آدمی شیعہ بنائے۔ شیعہ ہو جانیوالوں کو اعلیٰ منصب اور جاگیریں عطا ہوئیں۔ اور جنہوں نے باوجود ان تمام باتوں کے شیعہ مذہب قبول نہ کیا اور جنکی جاگیریں اور منصب مُغلیہ حکومت کے وقت سے بدستور چلے آتے تھے) ضبط کر لئے گئے۔ اِس سے پہلے سب مسلمانوں کی نمازِ جمعہ اور جماعت اکٹھی ہوتی تھی۔ مگر اب نواب آصف الدولہ نے شاہ علیؒ اکبر چشتی مودودی کے مشورہ اور ملّا محمّد علیؒ فیض آبادی کی تحریک سے اپنی الگ نماز و جماعت قائم کی۔ اور ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۳ رجب سنہ ۱۲۰۰ ہجری کو سید دیدار علیؒ نصیر آبادی کی اقتدا میں شیعوں کی الگ نماز ہوئی، جو اس کے بعد آج تک قائم ہے۔ مجتہدین کے ہاتھوں میں نائب امام کی حیثیت سے زمامِ مذہب دے دی گئی۔ اب اُن کی دیکھا دیکھی لوگوں نے اور بھی امام باڑے بنانے شروع کئے اور مذہب تشیّع کو بہت فروغ حاصل ہُوا ::

نوّاب آصف الدولہ ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر بھی تھے اور دُوسرے شعراء و ادباء کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔ جیسا پہلے لکھا جا چکا ہے، اُن کے والدِ بزرگوار شجاع الدولہ بھی فیض آباد میں شعرائے کرام کی حتی الامکان بہت قدردانی کرتے تھے۔ چنانچہ دہلی سے بہت سے شاعر نقلِ مکان کر کے فیض آباد مقیم ہو گئے تھے۔ مگر اب چونکہ حاکمِ وقت نوّاب آصف الدولہ لکھنؤ تشریف لے آئے تھے، اسلئے لازمی طور پر سب سخنورانِ ادب بھی لکھنؤ آ گئے۔ علاوہ ازیں دہلی کے بہت سے اور شعراء بھی مثلاً خُدائے سخن میر محمّد تقی میرؔ۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، میر انشاء اللہ خاں انشاؔ۔ جعفر علیؒ حسرتؔ۔ سعادت یار خاں رنگینؔ، شاہ نصیر الدین نصیرؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، میر ولی اللہ محبؔ، میر غلام حسینؒ برشتہؔ وغیرہ سینکڑوں شاعرانِ باکمال نے لکھنؤ آ کر سکونت اختیار کر لی۔ اور صرف اِسی پر اکتفا نہیں، بلکہ شاہ عالم ثانی کے ولی عہد میرزا جوان بخت بھی لکھنؤ آ گئے گو کچھ دنوں رہ کر بنارس چلے گئے۔ پھر ان کے بھائی میرزا سلیمان شکوہ آئے اور یہیں پڑے رہے۔ اُن کی وجہ سے بھی دہلی کے کئی بھولے بھٹکے لوگ وہاں آ کر جمع ہو گئے۔ اب ذرا سوچئے کہ جہاں ایسے ایسے باکمال لوگ ایک جگہ مجتمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی اِس زمین پر رشک آتا ہوگا۔ علم و فضل کے دریا گھر گھر بہنے لگے۔ ہر جگہ شعر و شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ دولت کی کچھ کمی نہ تھی۔ ہر طرف سے عیش و عشرت کی موجیں اُٹھنے لگیں اور گھر گھر شادیانے بجنے لگے بقول سحرؔ ؎

"بے فکری اور شاعری" مثل مشہور ہے۔ مگر ارباب فضل وکمال کی جدت پسند طبائع نے قدم اور بھی آگے بڑھائے۔ اردو زبان کی تراش خراش کر کے بدمزہ اور ناگوار الفاظ (جو پہلے زمانہ میں رائج تھے) حرف غلط کی طرح اُڑا دیئے گئے۔ بہت سی تراکیب اور جملے غیر فصیح قرار دیئے گئے، جسے آخر دہلی والوں کو بھی تسلیم کرنا پڑا۔ اس طرح آہستہ آہستہ لکھنؤ کی زباندانی کا سکّہ چار دانگ عالم میں بیٹھ گیا، اور اہلِ لکھنؤ نے دہلی والوں کی تقلید سے مکمّل آزادی حاصل کر لی۔ جس کے سبب آج تک دہلی اور لکھنؤ کی زبانوں کا باہمی مناقشہ چلا آتا ہے۔ لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ لکھنؤ جلد ہی اپنی بلند پردازی کے زور میں ایسے اوج پر پہنچ گیا جہاں آفتاب تارا بن گیا۔

صرف ایک زبان ہی پر کیا اکتفا ہے لکھنؤ کے بانکوں نے اُس زمانہ میں وضع قطع، لباس، پوشاک، خورد و نوش اور ماند و بود غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ میں تراش خراش کے نئے نئے انداز پیدا کر دیئے۔ گنبد نما دستار کی جگہ ہلکی اور نکیلی ٹوپی۔ جامہ دنیمہ کی جگہ چست شلوکہ۔ اور انگرکھے اور شلوار کی جگہ کلی دار غرارہ یا چوڑی دار پاجامہ۔ سلیم شاہی کی جگہ انی دار کفش یا بے ناک کا (لکھنوی) جوتا ــــ اسی طرح ہر چیز کو قیاس کر لو۔ ع ہر شے نئی، زمین نئی، آسماں نیا؛ کل دنیا نئی ہو گئی۔

اُس زمانہ کے شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنے سے دربار لکھنؤ کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ بانکے ٹیڑھے جوان طبیعتوں میں شوخی و رنگینی کیساتھ زبانوں میں طرآری اور ایجادوں میں انوکھے پن کے سبب عجیب و غریب مشاغل میں مبتلا تھے۔ مثلاً میر محمد تقی میر کے کلیات میں ایک مثنوی ہے جس میں اہل لکھنؤ کی مرغ بازی کا خاکہ اُڑایا ہے۔ نواب آصف الدولہ اُن دنوں سریر آرائے سلطنت تھے۔ اور اُن کو خود مرغ بازی کا بے حد شوق تھا، اسلئے لکھنؤ بھر میں گھر گھر اس کا چرچا تھا، اور ہفتہ میں دو بار شہر میں پالیاں ہوتی تھیں۔ چند شعر اِس مثنوی ہی کے ملاحظہ ہوں:-

"جمعہ منگل کو پالی کی ہے دھوم ـــ گلیوں میں روزِ حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش ـــ جسکو دیکھو ہے مرغ در آغوش
ایک کے منہ میں مرغ کی منقار ـــ ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
مرغ کی ایک پرفشانی ہے، ـــ اُن کی صد رنگ بد زبانی ہے
طُرفہ ہنگامہ طُرفہ صحبت ہے ـــ بعد نصف النہار رُخصت ہے"

قصہ مختصر، شاعروں کی قدردانی میں آصف الدولہ اپنے والدِ ماجد نواب شجاع الدولہ سے بھی چند قدم بڑھ کر تھے، میر سوز اِن کے استاد تھے۔ اُن کی خدمت جو کچھ کرتے ہوں گے وہ تو معلوم نہیں۔ مگر مرزا محمد رفیع سودا کو چھ ہزار روپے سالانہ کی جاگیر دی تھی۔ میر تقی میر کو تین سو روپے ماہوار دیتے تھے۔ علاوہ اس کے داد و دہش میں جب ادنیٰ ادنیٰ نغروں کو ہزاروں کا خلعت ملتا تھا تو اِن کا کیا پوچھنا۔

اِس تمام اثنا میں آصف الدولہ کی والدۂ ماجدہ یعنی نواب بہو بیگم کا قیام فیض آباد ہی میں رہا۔ اُن کی اپنی

جاگیر بہت بڑی تھی جو بجائے خود ایک ریاست تھی۔ علاوہ ازیں اُن کے پاس جواہرات کا ذخیرہ بھی بہت تھا۔ اور بہت سا مال و زر بھی تھا۔ ادھر آصف الدولہ تو غفلت و عیش پرستی اور فضول خرچی کے نشہ میں سرشار تھے۔ اور انگریزوں کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے ہاتھوں میں کٹھ پُتلی بنے ہوئے تھے۔ اب گورنر جنرل (وارن ہیسٹنگز) کو روپے کی ضرورت جو پیش آئی تو جھٹ نواب آصف الدولہ سے طلب کیا۔ مگر انہوں نے جواب دیا کہ ”میرے پاس کیا رکھا ہے۔ میں تو بالکل مجبور ہوں کیونکہ خزانہ کا تمام مال و دولت میری والدہ اور دادی بیگمات کے قبضہ میں فیض آباد پڑا ہے۔ اِس لئے پہلے اُن سے وہ تمام جاگیر و جائداد اور مال و زر مجھے دلایا جائے۔“

انگریزوں کو اِتنا معلوم ہُوا تو بس پھر کیا تھا۔ گورنر جنرل نے یہ تمام بے بہا دولت حاصل کرنے کی دُھن میں پہلے تو بیگمات کو حکم دیا کہ وہ تمام مال و دولت اُن کے حوالہ کر دیں۔ لیکن بیگمات نے قدرتی طور پر اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ انگریزوں کو اُن سے یہ مال و متاع حاصل کرنے کا کوئی استحقاق نہ تھا۔ اب وارن ہیسٹنگز نے بیگمات اودھ پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے راجہ بنارس رجیت سنگھ کی بغاوت میں امداد کی ہے۔ اِسی الزام کی بنا پر انگریزی فوج نے بیگمات کے محل سرا پر دھاوا بول دیا، اور بیگمات پر طرح طرح کی سختیاں کی گئیں، اور اُن کے خواجہ سراؤں کو، جنکے سپرد خزانہ تھا، سخت سے سخت ایذائیں دی گئیں اور اُن پر بے حد ظلم کئے گئے اور آخر کار اُن سے خزانہ چھین لیا گیا۔ اِس جابرانہ سلوک کا نتیجہ وارن ہیسٹنگز کے حق میں بہت بُرا ثابت ہُوا۔ چنانچہ جب وہ ۱۷۸۵ء میں اپنے وطن انگلستان پہنچا تو اُس پر پارلیمنٹ نے اِن مظالم و جرائم کی بنا پر بڑے زور و شور سے مقدمہ چلایا جو پُورے سات سال تک چلتا رہا۔ انگلستان کی تاریخ میں یہ مقدمہ بہت مشہور و معروف ہے۔ وہاں کے جادو بیان وکیلوں اور بیرسٹروں۔ مثلاً ایڈمنڈ برک، فاکس، اور شیریڈن نے اپنی پُوری قوت وارن ہیسٹنگز کے خلاف مقدمہ کی پیروی کرنے میں صرف کی مندرجہ بالا شدید جرم کے علاوہ اور کئی سنگین الزامات و اتہامات اُس پر عائد کئے گئے۔ کہتے ہیں کہ عدالت میں اِن الزامات کی پوری فہرست صرف پڑھ کر سنانے جانے میں پورے دس دن صرف ہوئے۔ اور پھر جب انگلستان کے مایۂ ناز وکیل مسٹر برک کی باری آئی، تو اُس نے وارن ہیسٹنگز کو جھوٹا ثابت کرنے میں انتہائی کوشش صرف کر دی۔ اور کئی دن تک لگاتار اُسکے خلاف بڑے زور و شور سے مقدمہ کی پیروی کرتا رہا۔ سحر طرازی، مبالغہ آمیزی اور فصاحت و بلاغت کی اُس نے خوب داد دی۔ اُس کے جواب میں مخالف وُکلاء منہ دیکھتے رہ گئے اور بقول کسے ”اُن کی زبانیں گونگی ہوگئیں“، سامعین کے انبوہ کے علاوہ خود ملزم یعنی وارن ہیسٹنگز پر مسٹر برک کی جادو بیانی کا اس قدر اثر ہُوا کہ اُسے بھی تسلیم کرنا پڑا کہ اگر برک کے پُر زور اور لاجواب دلائل کو صحیح مان لیا جائے تو وہ واقعی مجرم ہے۔ مقدمہ کی کارروائی سُننے کے لئے عدالت کے وسیع کمرہ میں عام لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ کہتے ہیں کہ کئی انگریز عورتیں (جو اس مقدمہ کی کارروائی دیکھنے کے لئے آئی ہوئی تھیں) برک کی ہنگامہ خیز اور محشر انگیز تقریر سُنکر ضبط نہ کر سکیں۔ اکثر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور متعدد عورتیں چیخ مار کر بیہوش

ہوگئیں۔ یہاں تک کہ مسٹر شیریڈن کی میم صاحبہ کو غشی کی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا۔ آخر کار برک نے اپنی آتش خیز تقریر کے خاتمہ پر اپنی پوری قوت سے اِس قدر چلا چلا کر کہا کہ دیوانِ عام کی چھت تک گونج اُٹھی۔ اُس کی تقریر کے آخری ٹکڑے کے چند فقروں کا ترجمہ ذیل میں ہے:۔

"میں مذکورہ سنگین و شدید جرائم کی بنا پر ملزم مسمّی وارن ہیسٹنگز کے خلاف استغاثہ دائر کرتا ہوں، کہ اُس نے حکومتِ برطانیہ سے غداری کی، اور انگریزوں کی عزت خاک میں ملا دی۔ نیز ہندوستان کے بے گناہ لوگوں پر بے پناہ مظالم توڑے۔ اُن غریبوں کے جائز حقوق کو پائمال کیا۔ اُن کے گھروں کو تباہ و برباد کر دیا۔۔۔۔ پس حق و انصاف اور صداقت و عدالت، عزت و آبرو اور شرافت و انسانیت کے نام پر میں دُہائی دیتا ہوں۔ کہ یہ شخص (مسمی وارن ہیسٹنگز) صرف ظالم و جابر اور غدار و دغاباز نیز سفاک و خونخوار ہی نہیں، بلکہ ہمارا اشد ید ترین دشمن بھی ہے"۔

دنیا جہان میں اِس انقلاب انگیز مقدمہ کے عظیم الشان دلائل کی مثال ملنا دُشوار ہے۔۔۔۔ وارن ہیسٹنگز پر بے قصور و بے گناہ "نواب بہو بیگم" کا صبر بُری طرح پڑا۔ اور اِس استغاثہ سے اُس کا ناک میں دم آگیا۔ مقدمہ کے اخراجات میں اُس کی تمام کمائی ہوئی دولت تباہ ہوگئی۔ بالآخر ایک ایک پائی اور کوڑی تک کے لئے محتاج ہو کر مرا، اور اس کی زندگی کے آخری ایام نہایت تلخی و پریشانی اور ذلت و خواری میں گزرے۔

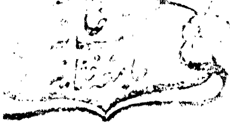
بہو بیگم کی حیات ہی میں اُن کے بیٹے نواب آصف الدولہ ۱۷۹۷ء مطابق ۱۲۱۲ھ ہجری میں استسقا کی بیماری سے انتقال کر گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں ایک کنیز کے لڑکے وزیر علیؒ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ اِن کی وفات پر وُہ تخت نشین ہوگیا۔ مگر وُہ قطعاً حکومت کے قابل نہ تھا۔ اِس لئے جلد ہی مُلک کا انتظام بگڑنے لگا۔ انگریزوں کے نئے گورنر جنرل کو جب یہ معلوم ہُوا نیز یہ سُنا کہ وزیر علی نواب آصف الدولہ کا بیٹا ہی نہیں ہے تو اُس نے فوج بھیجکر اُسے گدی سے اُتار دیا۔ اور نواب مرحوم کے ایک اور عزیز سعادت علی خاں کو اِس شرط پر تخت نشین کرا دیا کہ وُہ الہ آباد کا علاقہ انگریزوں کے حوالے کر دے اور چھہتر لاکھ روپے اُنکو سالانہ خراج دے۔

نواب سعادت علیؒ خاں کی تخت نشین ہوتے ہی ہوسِ زر بڑھ گئی۔ اُس کی یہ آرزو تھی کہ اگر بہو بیگم جلدی سے مر جائیں تو اُن کی باقی ماندہ ساری دولت بھی اُس کے قبضہ میں آجائے۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ بہو بیگم کا انتقال نواب سعادت علی خاں کے مر جانے کے بعد ہُوا، اور مرتے وقت وُہ ایک کروڑ روپے اور کچھ اوپر چھپن لاکھ کا وثیقہ سرکار کی تحویل میں دے کر دستاویز کر گئیں، کہ اُن کے اعزہ اور متوسلین کی جو تنخواہیں انہوں نے مقرر کر رکھی تھیں، وہ ہمیشہ جاری رہیں۔ چنانچہ اُن لوگوں کی اولاد اب تک اُس سے فائدہ اُٹھا رہی ہے۔

اب مملکتِ اودھ کی طاقت روز بروز کمزور ہونے لگی، اور نواب سعادت علی خاں کی مزید ناقابلیت و نااہلیت سے

فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے اُسکا آدھا ملک جس میں گنگا جمنا کی وادی کے اضلاع اور سرحدی علاقہ رُوہیلکھنڈ وغیرہ شامل تھا حاصل لیا بعد میں یہی علاقہ مُغلیہ حکومت کے بقیہ اضلاع کے ساتھ ملا کر صُوبۂ متحدہ (یو پی) بنا دیا گیا، اور اودھ کی شمالی سرحد میں کوہ ہمالیہ کی پہاڑیوں پہ انگریزی فوج بٹھا دی گئی جو آج تک رانی باغ اور الموڑہ وغیرہ میں بدستور قائم ہے۔ اب سلطنتِ اودھ میں باقی کیا رہ گیا۔ بچا کھچا علاقہ آخری تاجدارِ اودھ واجد علیؒ شاہ کے زمانہ میں لارڈ ڈلہوزی نے انگریزی سلطنت سے ملحق کر لیا، اور واجد علیؒ شاہ کو کلکتہ بھیج دیا +

عبدالحیٔ ایم۔ اے



غزل

مضطر ہے بہت میری طبیعت کئی دن سے
وُہ آئے نہیں بر سرِ تربت کئی دن سے

پھر حُسن کے جلووں نے اثر مجھ پہ کیا ہے
غالب ہے مرے دل پہ محبت کئی دن سے

پھر تیری جفاؤں کا گلہ چھوڑ دیا ہے
کرتا تھا مرا دل بھی ملامت کئی دن سے

ہاں باغ میں دیکھی تھی کبھی پھول کی پتّی
تکتی ہوں ترے لب کی نزاکت کئی دن سے

پھر چاک گریباں کو کیا میں نے خدایا!
پھر عشق ہے آمادۂ وحشت کئی دن سے

پھر آج درِ یار پہ سر جھک گیا میرا
اُن کو بھی تھی شیریںؔ یہی حسرت کئی دن سے

(سیّدہ شیریںؔ نقوی

جہانِ بہتریں

عالمِ بالا سے ایک آواز:

اہلِ پستی! عرش سے پائندگی حاصل کرو!
آؤ مہر و ماہ سے تابندگی حاصل کرو!
عرصۂ عالم کی رزم آرائیوں کو چھوڑ کر!
بزمِ قدرت سے سکونِ زندگی حاصل کرو!

فطرت کا پیام شاعر کے نام

اے امینِ رازہائے خاکدان و آسماں! — مجھ سے حاصل کر نشاطِ روح و اطمینانِ جاں!
تیرا مسکن وادی و کہسار کے دامن میں ہے — بجلیوں کی جلوہ گہ میں، رعد کے دامن میں ہے
کُنجِ عزلت سے نکل، پھیلے ہوئے میدان دیکھ — مرغزاروں میں خراماں ندیوں کی شان دیکھ
ذرّے ذرّے کی نگاہیں جانبِ افلاک ہیں — مدعائے شوق کے اظہار میں بیباک ہیں
یہ سماں، یہ ابر، یہ کالی گھٹا برسات کی — وہ پھٹے بادل سے ظاہر روشنی توراتؔ کی[1]
گھر سے باہر چل کے میدانوں کا عالم دیکھ لے، — اِس جہاں سے اُس جہاں کا ربطِ باہم دیکھ لے
آنکھوں آنکھوں میں بلاتے ہیں ستارے رات کے — دیکھ لے نکھرے ہوئے بادل بھری برسات کے

دیکھ لے شاعر بہارِ باغِ ہستی دیکھ لے
پتّے پتّے پر ہجومِ کیف و مستی دیکھ لے!

---

[1] تلمیح یہ عقیدہ یہود کہ نزولِ توراۃ کے وقت آسمان تیرہ و تار تھا۔ وحی آئی تو گھٹائیں چھٹ گئیں اور ماہِ کامل نمودار ہوا۔

شاعر

دوستی اور دشمنی کے سارے رشتے توڑ کر، شہر سے باہر چلا ہوں اپنا مسکن چھوڑ کر
جنگلوں میں جا کے اپنے دل کو بہلاؤں گا میں جستجوئے شاہدِ مقصود کو جاؤں گا میں!
گھر سے نکلوں گا ترے ارشاد کی تعمیل کو عشق کے نغمے سنانے جاؤں گا جبریل کو
لے کے نکلوں گا شبِ مہ میں جگر کے داغ کو، اس سے روشن تر کروں گا دشت و کوہ و راغ کو
اُس طرف پیشِ نظر ہوں گے مناظر طور کے میری پیشانی سے بہ نکلیں گے چشمے نور کے
فخر ہو گا چاند کو اپنی جبیں کے داغ پر اور مجھ کو اپنے سینے کے انوکھے باغ پر

چشمِ حیرت سے جہاں کو دیکھتا جاؤں گا میں،
پائے استحقار سے ہر شے کو ٹھکراؤں گا میں

بحرِ طوفاں لے کے اُٹھتا ہے شبِ مہتاب میں ڈوب جاتے ہیں سفینے گردشِ گرداب میں
صبح کے تاروں کی دُنیا رعشہ براندام ہے روشنی ہی روشنی کو موت کا پیغام ہے۔
جس کی تابانی کے آگے روئے انجم ماند تھا صبح تک بادل کا اک ٹکڑا ہے شب بھر چاند تھا
خاک اُڑتی دیکھتا ہوں کہکشاں کی راہ میں صبح تک یہ بھی نہ ہو گی دیدۂ آگاہ میں،
گل سراپا چاک ہیں، بلبل سراپا داغ ہے یہ کوئی بزمِ عزا ہے یا بہارِ باغ ہے؟

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ نہ کہنے دے مجھے!
رہنے دے اپنے خیالستاں میں رہنے دے مجھے!

سروش

پائے استغنا سے زنجیرِ تعلق توڑ دے اے مرے شاعر جہانِ رنج و غم کو چھوڑ دے
تیری دنیا گلشنِ رنگ و نوا سے دُور ہے تیری فطرت کی بلندی جلوہ گاہِ طور ہے۔
تیری دنیا آسمانِ حسن کے تاروں میں ہے اس جہاں سے دُور اُس دنیا کے نظاروں میں ہے
تیرے ارمانوں کی بستی لالہ زاروں کی سی ہے تیرے میخانوں کی مستی آبشاروں کی سی ہے
تیرے دم سے مسکراتے ہیں ستارے رات کے پھول ہیں بکھرے ہوئے یہ گلشنِ ظلمات کے
آسمانوں سے بھی ہے کچھ دور تیری سرزمین تیری دنیا میں فرشتے بھی پھٹک سکتے نہیں

مہر و مہ کی روشنی ہے تیری عشرت گاہ میں — بچھ رہا ہے کہکشاں کا فرش تیری راہ میں

کیوں گرا ہے پستیوں میں، آہ یہ کیا طور ہے
اے فلک پیما تری دنیا تو کوئی اور ہے

"اور بھی ہے اِک جہاں خوابوں کی منزل کے قریب — اس جہاں سے دور آنکھوں سے نہاں دِل کے قریب
اُس جہاں میں ایک ذرّہ بھی فنا ہوتا نہیں، — ایک پتہ بھی خزاں سے آشنا ہوتا نہیں
وہ جہانِ خاص اک دنیائے بے آزار ہے — ذرّہ ذرّہ جس زمیں کا مطلع الانوار ہے
پھول کھلتے ہیں وہاں شاداب رہنے کیلئے — ندّیوں کی رو ہیں گوہر بن کے بہنے کے لئے
عشق یکسر بے خبر ہے ہجر کے آزار سے — حسن بے پروا ہے شوقِ گرمیٔ بازار سے
بلبلوں کو خوفِ صیاد و خزاں ہوتا نہیں — باغ کے لٹنے سے خائف باغباں ہوتا نہیں
ذرّے ذرّے سے عیاں ہے شانِ صبحِ عید کی — ہر طرف پھیلی ہوئی ہے روشنی امّید کی

چاندنی ہی چاندنی، تنویر ہی تنویر ہے
دوسرا رُخ ہی نہیں ملتا، عجب تصویر ہے

شاعر

اے مرے پیغامبر تیری صدا سنتا ہوں میں — دل میں بسنے والی متوالی صدا سنتا ہوں میں
مجھ پہ ظاہر ہیں تری دنیا کے اسرارِ نہاں — میری آنکھیں دیکھتی ہیں باطنِ کون و مکاں،
جانتا ہوں تیری دنیا میں ہیں چشمے نور کے — بس رہے ہیں میری آنکھوں میں بھی جلوے طور کے
تیری دنیا کاہشِ آلام سے آزاد ہے — اُس جہاں میں اک نشاطِ جاوداں آباد ہے

وہ جہاں لیکن مذاقِ درد سے محروم ہے
میں وہاں خوش رہ نہیں سکتا یہ مجھے معلوم ہے

جانتا ہے تو مری ہستی سراپا درد ہے — اشک اشکِ خونفشاں ہے، آہ آہِ سرد ہے
میری فطرت میں ہے مضمر سوز و سازِ زندگی — اور میں ہوں مظہرِ رازِ دنیازِ زندگی
میری فطرت میں خوشی کے ساتھ شامل غم بھی ہے — نغمۂ شادی میں پنہاں نالۂ ماتم بھی ہے

وہ جہاں بے حس ہے لیکن لذّتِ آزار سے ۔۔۔ کیا ملیگا مجھکو ایسے گلشنِ بے خار سے ؛

جس گلستاں میں بہارِ بےخزاں کا دور ہو
اِس سے تسکینِ دلِ غم آشنا کس طور ہو ؛

جستجو ہے مجھ کو اک دنیائے نوایجاد کی ۔۔۔ ہو نہ کچھ تفریق جس میں شاد، اور ناشاد، کی
عالم بے شرق و غرب و بے شمال و بے جنوب ۔۔۔ ہوں جہاں اطرافِ عالم مثلِ مہر و مہ غروب
کوئی ماضی ہو نہ جس میں کوئی استقبال ہو ۔۔۔ وقت کی رفتار پابندِ زمانِ حال ہو
میری دنیا میں وطن ہو مہرِ عالمتاب کا، ۔۔۔ کوئی نقشہ ہو کسی دیکھے ہوئے سے خواب کا
عالمِ ناسوت میں لاہوت کے بھی رنگ ہوں ۔۔۔ عرشیوں کی زندگی میں فرشیوں کے ڈھنگ ہوں
زندگی ہو موت کی آغوش میں سوئی ہوئی ۔۔۔ موت آبِ چشمۂ ظلمات میں دھوئی ہوئی
روشنی ایسی کہ ظلمت کے بھی ڈیرے ساتھ ہوں ۔۔۔ چاندنی راتوں میں بھی گھرے اندھیرے ساتھ ہوں
بجلیاں مستور ہوں قلبِ شبِ دیجور میں ۔۔۔ موسیٰ و فرعون گم ہوں جلوہ گاہِ طور میں
ہلکا ہلکا ہو اندھیرا، دھندلی دھندلی روشنی ۔۔۔ ایک ہی نکتے سے پیدا حسن بھی ہو عشق بھی
امتزاجِ خوب و زشت و بیش و کم ہو اس طرح ۔۔۔ نور و ظلمت کی ہو آمیزش شفق جس طرح
بزمِ عشرت میں تمیزِ میکش و ساقی نہ ہو ۔۔۔ خالق و مخلوق میں فرقِ دوئی باقی نہ ہو
قرب ہو اتنا کلیم و جلوہ سازِ طور میں ۔۔۔ فرق مشکل ہو انا الحق اور انا المنصور میں
جب وہ منزل میری آنکھوں پر عیاں ہو جائیگی ۔۔۔ مجھ پہ ظاہر ایک دنیائے نہاں ہو جائیگی

روحِ عالم بن کے عالم میں سما جاؤں گا میں
اپنی ہستی کا نشاں ہر چیز میں پاؤں گا میں

عبد الحمید

ایک خط

(ـــــ کے نام)

تم کہتے ہو زندگی تلخ کام ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا تم اپنی ساری قوتِ فکر کو اس کے تاریک پہلو پر مرکوز کر دینے سے تلخی کے عنصر کو کم کر دینے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟ تم جانتے ہو کہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ پھر اپنی زندگی کی تلخیوں میں مزید اضافہ کیوں کر رہے ہو؟ فلسفے اور منطق کی باتیں چھوڑو۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا انکار کوشش کے باوجود ناممکن ہے کہ زندگی ـــــ ایک حساس انسان کے لئے ـــــ دکھوں کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا چکر ہے بشرطِ صرف احساس کی ہے۔ یوں بے شرم ہو جائیں تو کوئی دکھ دکھ ہی نہ معلوم ہو مگر مصیبت تو یہ ہے کہ اب بے شرم ہونا بھی مشکل ہے۔ کوئی کب تک اپنے آپکو دھوکا دے؟ تم کہو گے کہ میں بھی تو زندگی کے متعلق تمہارے ہی زاویۂ نگاہ کی تائید کر رہا ہوں۔ بڑی حد تک میں تم سے متفق ہوں۔ کبھی کبھی میں بھی غم واندوہ کے ہجوم سے گھبرا کر جی ہار بیٹھتا ہوں۔ بارہا بچوں کی طرح ـــــ بلکہ یہ کیوں نہ کہوں کہ تمہاری طرح ـــــ رویا ہوں۔ ایسے موقع بھی آئے جب دنیا والوں سے تنگ آکر خدا کے وجود ہی سے انکار کر دیا ـــــ انکار کرنا پڑا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں تمہیں ایک مسلسل ذہنی عذاب میں مبتلا دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم قدرت کی پیدا کی ہوئی مصیبتوں پر اپنے ہاتھوں مزید اضافہ نہ کرو۔ سمجھ لو کہ زندگی ایک مسلسل اذیت ہے جسے بہرحال برداشت کرنا ہے۔ پھر اسے مسکراتے ہوئے جھیلنے کی کوشش کیوں نہ کرو؟ مجھے اعتراف ہے کہ میں خود اب تک اِس کوشش میں ناکام رہا ہوں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم یہ کوشش ہی ترک کر دیں؟

میں جانتا ہوں کہ روپیہ بڑی چیز ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے میں دولت کی "جہانگیری" کا قائل نہیں تھا۔ مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ سماج میں روپے کے بغیر ہر چیز بیکار ہے۔ اگر تمہارے پاس روپیہ نہیں تو تمہاری شرافت۔ قابلیت اور شخصیت کی قطعاً کوئی قیمت نہیں پڑیگی۔ کوئی تمہاری ان خوبیوں کی طرف توجہ ہی نہ کریگا لیکن تم کئی ایسے آدمیوں کو جانتے ہو جو اگرچہ انسانوں کے گھر پیدا ہوئے ہیں لیکن ان کے سر میں گدھے کا دماغ ہے جہاں تک شرافت کا تعلق ہے خود انہیں اپنے متعلق قطعاً اس قسم کا کوئی حسن ظن نہیں لیکن اس کے باوجود ان کی قابلیت کے چرچے ہیں۔ ان کی شرافت کا شہرہ ہے اسلئے کہ ان کے پاس روپیہ ہے تم کہتے ہو کہ روپے کے بغیر بڑا آدمی بننا ناممکن ہے۔ میں کہتا ہوں کہ روپے کے بغیر آدمی بننا ناممکن ہے دولت کے بغیر موجودہ سماجی نظام کے ماتحت انسانیت کی تکمیل ناممکن ہے۔ لیکن کیا اس نظام کے آگے

سر جھکا دیں؟ کیا اندر ہی اندر جلتے رہیں اور زبان پر فریاد تک نہ لائیں؟ میں کہتا ہوں کہ ہم اس نظام کے خلاف بغاوت کریں گے —— مقدور بھر بغاوت —— میں چپ چاپ یہ ظلم سہنے کے حق میں نہیں۔ گھُٹ کے مرجانا میرے نزدیک ذلیل ترین موت ہے۔ میں سماج کے اس گھناؤنے پہلو کی طرف دیکھتا ہوں تو اپنی تمام مصیبتوں کے باوجود مسکراتا ہوں —— انتہائی حقارت کے ساتھ مسکراتا ہوں۔ اور پھر اس کے خلاف آواز بلند کرتا ہوں۔ یہ آواز نحیف ہے اور کمزور کیونکہ سماج نے میرا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ کبھی کبھی یہ آواز میرے اپنے کانوں تک ہی محدود رہتی ہے لیکن میں احتجاج ضرور کرتا ہوں۔ دولت کی "جہانگیری" کا اعتراف لیکن اسے چپ چاپ برداشت کر لینا ناممکن!

دولت کی اس غلط تقسیم نے ہزاروں نوجوانوں کی روح سلب کر لی۔ ہم اسے جائز کس طرح تسلیم کر لیں؟ اس لئے کہ سماج اس کی پشت پر ہے؟ سماج کی تو عمارت ہی دولت کی اس غلط تقسیم پر کھڑی ہے۔ اس لئے کہ جھوٹے مذہب کے جھوٹے ٹھیکیدار خدا کی رضا پر سر جھکانے کو کہتے ہیں؟ خدا کی رضا کبھی یہ نہ تھی۔ یہ لوگ خدا کو بدنام کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کی اپنی ٹھیکیداری اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ غریبوں کو توکل کی تلقین کرنے والوں کی حرص کے شرمناک مظاہرے کس نے نہیں دیکھے؟

تمہیں رحم آتا ہے اس نوجوان لڑکی پر جس نے پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لئے اپنا جسم بیچ ڈالا اور تم اس سے نفرت کرتے ہو مجھے بھی اس لڑکی پر رحم آتا ہے لیکن میں اس سے نفرت نہیں کرتا تمہیں اپنے رہنماؤں پر کیوں رحم نہیں آتا؟ تم اپنے لیڈروں سے کیوں نفرت نہیں کرتے؟ اس لڑکی نے صرف اپنا جسم بیچا۔ تمہارے رہنما ساری قوم کا سودا کرتے ہیں۔ تم اس لڑکی کے وجود کو انسانیت کے نام پر ایک دھبّا سمجھتے ہو۔ لیکن اس کے گناہوں کا اپنے لیڈروں کی خدمات سے مقابلہ کرو۔ اس نے اپنے حسن کے دام کھرے کئے۔ اس کا آوارہ مزاج گاہک خود چل کر اس کے پاس آیا۔ رات کی تاریکیوں میں —— لوگوں سے چھپ چھپا کر —— گناہ کی جنس بیچی گئی۔ تمہاری سماج کو کیا نقصان پہنچا؟ اور اگر پہنچا بھی تو اس میں اس لڑکی کا کیا قصور؟ تمہاری سماج کا وہ معزز فرد —— جو اس کے بستر سے اُٹھ کر دوستوں میں واپس جائے گا تو ایک معزز شہری سمجھا جائے گا —— کیوں اس کے پاس آیا تھا؟ کیا وہ اُسے بلانے گئی تھی؟ اب اس لڑکی کا —— اس حسن فروش فاحشہ کا موازنہ اپنے رہنماؤں سے کرو۔ دن دہاڑے۔ روزِ روشن میں سب کے سامنے تمہاری قوم فروخت کی جاتی ہے —— سستے داموں —— اکثر اوقات کوڑیوں کے مول —— بعض اوقات بھرے مجمع میں ملّت کا نیلام ہوتا ہے لیکن تم اس بدکار لڑکی سے نفرت کرتے ہو اور اپنے پاکباز اور مخلص لیڈر کا جلوس نکالتے ہو۔ اس کے نام کے نعرے لگاتے ہو۔ ایک نے صرف جسم بیچا —— اور وہ بھی اپنا جسم —— دوسرے نے پوری قوم بیچ ڈالی —— ایک سے نفرت! دوسرے کی پرستش!! یہ کہاں کا انصاف ہے؟

تم کہتے تھے اس لڑکی نے چند ٹکوں کیلئے اپنی خودی بیچ ڈالی۔ تم غلط سمجھے۔ اس لڑکی نے خودی نہیں بیچی۔ صرف اپنا گورا اور گداز جسم بیچا۔ مجھے خود اس کوچہ میں سے گزرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن میں اکثر ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے عمر کا بہترین حصّہ یہیں گزار دیا۔ وہ بتلاتے ہیں کہ بازاری عورت روح نہیں بیچتی۔ صرف جسم بیچتی ہے۔ [illegible] کے کوچے سے صرف ایک مرتبہ تم بھی گزر گئے ہو۔ کیا وہاں خودی بکتے

نہیں دیکھی؟ یثربی روایات کو زندہ کرنے کا دعوی کرنے والوں کا بس چلے تو خود یثرب کو بیچ ڈالیں۔ خودی کی حفاظت کی تلقین صرف میرے تمہارے جیسے لوگوں کے لئے ہے۔ لیڈر کی شخصیت ان باتوں سے بہت بالاتر ہے لیکن کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ قیامت کے دن لیڈر کا کیا حشر ہوگا؟ وہ تسبیح پھیرتا ہے۔ قران کی تلاوت کرتا ہے۔ سنا ہے عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ صبح کی نماز قضا ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود لیڈر کے انجام کا تصور کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُس دن قران کی تلاوت۔ صبح کی نمازیں اور اولی الامر کی اطاعت اس کے کسی کام نہ آئیگی۔ ملت کے زخم پکاریں گے کہ اِس شخص نے قوم کے خون سے دنیوی جاہ کی کھیتی سینچی ہے ——— اور یہ لڑکی جس سے تم نفرت کرتے ہو تھوڑی سی سزا کے بعد خدا کے رحم کی مستحق سمجھی جائے گی۔

تم نالاں ہو لوگوں کی ریاکاری سے۔ لیکن ریاکاری تو ہماری معاشرت کا ایک جزو بن چکی ہے۔ یہ تو نئی تہذیب کا ایک ضروری عنصر ہے۔ تمہیں شکوہ ہے کہ احباب بظاہر دوستی کا اظہار کرتے ہیں لیکن اپنے دل میں تمہاری نیک نامی سے جلتے ہیں۔ تمہیں ترقی کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ تمہاری عزت ہوتے دیکھ کر انہیں دکھ ہوتا ہے۔ لیکن تمہارے کڑھنے سے کیا ان کی اصلاح ہو جائیگی؟ یہ توقع عبث ہے۔ ناحق دل کو ایک اور روگ لگا رہے ہو۔ تمہاری جوانی بے داغ۔ تمہاری روح عفیف۔ تمہاری محبت پاک۔ تمہارا خلوص مسلّم لیکن یہ لوگ تمہاری ان خوبیوں کو کیوں دیکھیں؟ مجھ سے پوچھو تو ان کے نزدیک تمہارے سب سے بڑے نقائص یہی ہیں۔ اگر تم میں یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو کون تم سے حسد کرتا؟ اگر تم ایک سعید روح۔ ایک پاکباز نوجوان۔ ایک مخلص دوست نہ ہوتے تو کسی کو تم سے جلنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ملمّع آمیز دوستیوں کا گلہ نہ کرو کیونکہ تقریباً سبھی دوستیاں ملمّع کی محتاج ہیں۔ کس کس کا گلہ کرو گے؟ مزے سے سب کچھ دیکھتے جاؤ۔ دوستوں کی باتیں سنتے رہو۔ ان میں خلوص ڈھونڈنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ مہذب لوگ عام طور پر خلوص سے بہت کم سروکار رکھا کرتے ہیں اور ہمارے سبھی دوست ماشاء اللہ مہذّب ہیں۔

تم جھوٹ سے سخت متنفر ہو۔ لیکن اِس کا کیا علاج کہ باقی دنیا تم سے متفق نہیں۔ خود مجھے تم سے اتفاق نہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ایک ہفتہ جھوٹ نہ بولوں تو کم از کم دس آدمیوں سے لڑائی ہو جائے۔ آخر اعلائے کلمۃ الحق کا ٹھیکہ ہمیں نے تو نہیں لے رکھا۔ اقرار کوئی نہیں کرتا مگر سب مہذب آدمی جھوٹ بولتے ہیں۔ دروغِ مصلحت آمیز فارسی کی ایک بڑی خوبصورت ترکیب ہے۔ گنوار جھوٹ بولتا ہے تو سادہ جھوٹ لیکن مہذب آدمی کبھی سادہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اسکا جھوٹ ہمیشہ دروغِ مصلحت آمیز ہوتا ہے۔ عام طور پر وہ سفید جھوٹ بولتا ہے اور اکثر اوقات بالکل غیر ضروری جھوٹ۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے دل کو یہی تسکین دیتا ہے کہ میں کوئی گناہ تھوڑا ہی کر رہا ہوں میں تو محض دروغِ مصلحت آمیز سے کام لے رہا ہوں۔

تم ہی بتاؤ اگر میرے جیسا کوئی شخص کسی لمبی داڑھی یا اونچے طرّے سے ملے تو کیا کرے؟ سچ بولے؟ لمبی داڑھیوں اور اونچے طرّوں کے متعلق میرے خیالات تمہیں معلوم ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مذہب اور قوم کے نام پر مذہب اور قوم کو بیچ کھایا۔ داڑھی کا ایک ایک بال اور طرّے کا ایک ایک تار یتیموں۔ بیواؤں اور غریبوں کے خون سے رنگین ہے۔ بظاہر یہ خون نظر نہیں آتا۔ لیکن اِس کے وجود سے خود داڑھی اور طرّے کو بھی انکار نہ ہوگا۔ مگر حرام کی دولت۔ رشوت کے روپے اور

غصب کے مال سے ایک عظیم الشان مکان بنا کر اس کے ماتھے پر "ھٰذا من فضل ربی" لکھ دینے۔ یا زیادہ سے زیادہ ایک حج کر آنے کے بعد دنیا کے ساتھ داڑھی اور طرّے کی عاقبت بھی سنور جاتی ہے۔ وہ حاجی نہیں الحاج کہلاتا ہے۔ ذرا بوڑھا ہو جائے تو ہر وقت ہاتھ میں تسبیح رکھتا ہے۔ لیکن داڑھی کی سفیدی کے ساتھ ساتھ دل کی سیاہی بڑھتی جاتی ہے۔ قویٰ بڈھے ہوتے جاتے ہیں اور ہوس جوان۔ سب جانتے ہیں کہ داڑھی کی آڑ میں کیا ہو رہا ہے؟ لیکن سچ کون بولتا ہے؟ اگر کوئی سچ بولتا تو یہ داڑھیاں اور طرّے کبھی تمہاری انجمنوں کے صدر۔ تمہاری مساجد کے متولی اور تمہارے اوقاف کے ناظم نہ بننے پاتے۔

پھر ان طرّوں اور داڑھیوں کی اولاد باداکی چھوڑی ہوئی دولت کے سوا اور سب کچھ بھول جاتی ہے۔ تمہیں اور مجھے اور تمہاری اور میری طرح کے لاکھوں انسانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم طرّوں اور داڑھیوں کی اولاد نہیں۔ ہمارے باپ ــــ نے ملّت فروشی نہ کی۔ غریبوں کا گلا نہ کاٹا۔ یتیموں کا حق نہ مارا۔ رشوت کے روپے سے حج نہ کیا۔ حرام کی کمائی سے مسجد نہ بنائی ـــــ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے لئے مزدوروں کے خون سے پیدا کی ہوئی دولت نہ چھوڑی۔ طرّوں کی اولاد آج اشتراکیت کی علمبردار ہے۔ مساوات کا دم بھرتی ہے۔ مزدوروں کے لئے آنسو بہاتی ہے۔ ذرا سوچو تمہاری اس سماج میں سچ کیلئے کہاں گنجائش ہے؟ طرّے کا بیٹا موٹر میں بیٹھ کر تانگے والوں کے پاس جاتا ہے اور انہیں ہڑتال کرنے پر اکساتا ہے۔ موٹر کو ایک طرف کھڑا کر کے ان کے جلسے میں دھواں دھار تقریر کرتا ہے۔ تھوڑی دور تک انکے جلوس کیساتھ بھی چلتا ہے لیکن پھر اپنی موٹر میں سوار ہو کر مال کے کسی پرتکلف ہوٹل میں آبیٹھتا ہے اور کسی اور طرّے کی اشتراکی بیٹی کے ساتھ ملکر شراب پیتا ہے۔ ایسے لوگوں سے کیا سچ بولو گے؟ بات بات پر اپنے دادا کا ذکر کرنے والے۔ قدم قدم پر اپنی امارت جتانے والے سچی بات سننے کی تاب ہی کہاں رکھتے ہیں؟

تم بیزار ہو اس زندگی سے جس میں ذہنی اذیتوں کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹنے پاتا۔ تمہیں اس مقام سے نفرت ہے جس کی اساس دولت کی غلط تقسیم پر ہے۔ تم اس سماج سے متنفر ہو جہاں ایک نوجوان لڑکی پیٹ کے ہاتھوں اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہے۔ تم اس معاشرت سے نالاں ہو جہاں دوست ریاکاری سے کام لیتے ہیں۔ تم اس دنیا سے بھاگنا چاہتے ہو جہاں انسان جھوٹ بولے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس بیزاری اور اس نفرت کا ردّعمل کیا ہے؟ سوچتے رہنا؟ کڑھتے رہنا؟ روتے رہنا؟ ـــــ اور سب کچھ برداشت کرتے رہنا؟ ـــــ یہ ہے تمہارا نسخہ؟ یہ ہے تمہارا علاج؟ یہ بزدلی ہے۔ کم ہمتی ہے۔ میں نے مانا کہ تمہارے کمزور بازوؤں میں سماج کا گلا گھونٹنے کی قوت نہیں۔ لیکن تمہارے دل میں یہ خواہش تو ہو۔ طرّے اور داڑھی کی روح کو "ہوائے زر و سیم" کھا گئی اور تمہاری روح کو ـــــ خدا بچائے!

حمید نظامی

توحیدِ مجازی

مرا ذوقِ نظر اُن کے تصور کا بنا سانچا
انہیں دیکھا انہیں سمجھا انہیں پرکھا انہیں جانچا

انہیں کی یاد سے وابستہ میری زندگی ساری
خیال آرا انہیں سے خواب میرا میری بیداری

کبھی میرے تصور میں وہ میٹھی نیند سو جائیں
کبھی اک خاص عالم میں نظر افروز ہو جائیں

انہیں پر حصر کیا ہے اُن سے نسبت جس نے بھی پائی
بنا میرا خیالِ حُسن رس اُس کا تماشائی

کبھی وہ خوابگاہِ ناز یکسر جگمگاتی ہے
نگاہِ خواب آلود ان کی جس میں مُسکراتی ہے

کبھی وہ حجلۂ زرتار شان اپنی دکھاتا ہے
جہاں حُسنِ تبسم ریز رنگ اپنا جماتا ہے

کُھلا ہر مظہرِ خوبی پہ ان کا حسنِ تام اچھا
سکوت اچھا کلام اچھا خرام اچھا قیام اچھا

انہیں کو منتخب میں نے کیا ہے خوش جمالوں میں
وہی میری نگاہوں میں وہی میرے خیالوں میں

رہیں مُمتاز سب سے سیر میں بھی خوبیاں ان کی
بچھی جاتی ہیں اُنکی رہ میں خود ہمجولیاں ان کی

نظر آئے نہ کیونکر باغ کا باغ اُن کے قابو میں
مہارت کی ہے پیدا انکی خوش چشمی نے جادو میں

اِسی جادو سے ہے میرے دماغ و دل کا یہ عالم
"حیات آبادِ عرفاں" میں وہی وہ ہیں مرے ہمدم

جُدا ان کے تصور سے نہ دل میرا نہ جاں میری
یہ توحیدِ مجازی ہے حقیقی ترجماں میری

علی منظور

جھوٹا دل

پوچھا یہ دل سے میں نے "گزرتی ہے کسطرح؟"
اور دل نے یہ کہا۔
"شاداب سیب سُرخ ہو بُستاں میں جس طرح"
لیکن یہ جھُوٹ تھا!

(ماخوذ)

بیگانگی!

چُرا لیتا ہے آنکھیں
مرے غم سے تبسّم
گزر جاتے ہو یونہی
مرے نزدیک سے تم!——

سعید احمد اعجاز

جدید شاعری کے چند نمونے

پچھلے دنوں "حلقۂ اربابِ ذوق" نے زیرِ صدارت میاں بشیر احمد صاحب ایک مشاعرہ منعقد کیا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اِس میں موجودہ شعراء کی صرف وہ نظمیں پڑھی گئیں جن میں زبان، طرزِ ادا، یا تخیّل کے لحاظ سے کوئی جدت تھی۔ اِس مشاعرے کی بعض نظمیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ جناب صاحب جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، فراق گورکھپوری حامد علی خاں، عبدالحمید عدم، محمد دین تاثیر، اور آرزو لکھنوی وغیرہم کی نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ عدمِ گنجائش کی وجہ سے سب نظمیں شائع نہیں ہو سکتیں۔ نئی نظموں میں زبان کی لغزشیں نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔ "ہمایوں"

اُونچا مکان

بے شمار آنکھوں کو چہرے میں لگائے ہوئے اِستادہ ہے تعمیر کا اک نقشِ عجیب،
اے تمدن کے نقیب!
تری صورت ہے مہیب،
ذہنِ انسانی کا طوفان کھڑا ہے گویا؛
ڈھل کے لہروں میں کئی گیت سنائی مجھے دیتے ہیں، مگر
اُن میں اک جوش ہے بیداد کا، فریاد کا اک عکسِ دراز
اَور الفاظ میں افسانے ہیں بے خوابی کے،
کیا کوئی روحِ حزیں
ترے سینے میں بھی بیتاب ہے تہذیب کے رخشندہ نگیں؟
گھٹ کے لہریں ترے گیتوں کی مٹیں، مجھ کو نظر آنے لگا
ایک تلخابہ کسی بادۂ بدرنگ کا اک ٹوٹے ہوئے ساغر میں،
نشۂ مے سے نظر دھندلی ہوئی جاتی ہے،
رات کی تیرہ فضا کیوں مجھے گھبراتی ہے؟

رات کی تیرہ فضا میں تری آنکھوں کی چمک مجھ کو ڈرا سکتی نہیں ہے، میں تو
اِس سے بھی بڑھ کے اندھیرے میں رہا کرتا تھا،
اور اُس تیرگیٔ روح میں رخشاں تھے ستارے دُکھ کے،
اور کبھی بھول میں، ہر نجمِ درخشاں سے لپک اُٹھتے تھے شعلے سکھ کے،
جیسے روزن سے ترے تان لپکتی ہوئی پھیلاتی ہے بازو اپنے
جذب کر لیتا ہے پھر اُس کو خلاء کا دامن،
یاد آنے لگے تنہائی میں بہتے ہوئے آنسو اپنے،
وہی آنسو، وہی شعلے سکھ کے،
لیکن اک خواب تھا، اِک خواب کی مانند لپک شُعلوں کی تھی،
مری تخئیل کے پر طائرِ زخمی کے پروں کی مانند
پھڑپھڑاتے ہوئے بیکار لرز اٹھتے تھے،
مرے اعضاء کا تناؤ مجھے جینے ہی نہ دیتا تھا، تڑپ کر، یکبار
جستجو مجکو رہائی کی ہُوا کرتی تھی،
مگر افسوس کہ جب درد دوا بننے لگا مجھ سے وہ پابندی ہٹی،
اپنے اعصاب کو آسودہ بنانے کے لئے
بھول کر تیرگیٔ روح کو میں آ پہنچا
اِس بلندی کے قدم میں نے لئے
جِس پہ تو سینکڑوں آنکھوں کو جھپکتے ہوئے استادہ ہے۔
ترے بارے میں سنا رکھی تھیں لوگوں نے مجھے
کچھ حکایاتِ عجیب
میں یہ سنتا تھا ترے جسمِ گرانبار میں بستر ہے بچھا
اور اک نازنین لیٹی ہے وہاں تنہائی
ایک پھیکی سی تھکن بن کے گھسی جاتی ہے
ذہن میں اُس کے، مگر وہ بیتاب
منتظر اِس کی ہے پردہ لرزے

پیرہن ایک ڈھلکتا ہوا بادل بن جائے
اور دَر آئے اک اَن دیکھی، انوکھی صورت،
کچھ غرض اُس کو نہیں ہے اِس سے
دل کو بھاتی ہے، نہیں بھاتی ہے
آنے والے کی ادا ــــــ
اُس کا ہے ایک ہی مقصود، وُہ استادہ کرے
بحرِ اعصاب کی تعمیر کا اِک نقشِ عجیب
جس کی صورت سے کراہت آئے
اور وہ بن جائے نزا مدِمقابل پل میں
ذہنِ انسانی کا طوفان کھڑا ہو جائے
اور وہ نازنیں بے ساختہ، بے لاگ، ارادے کے بغیر
ایک گرتی ہوئی دیوار نظر آنے لگے
شب کے بے روح تماشائی کو۔
بھول کر اپنی تھکن کا نغمہ
مختصر لرزشِ چشم در سے
ریگ کے قصر کی مانند سبکسار کرے۔
بحرِ اعصاب کی تعمیر کا اک نقشِ عجیب
ایک گرتی ہوئی دیوار کی مانند لچک کھا جائے۔
یہ حکایات مرے ذہن میں اک بوئے خراماں بن کر
جب کبھی چاہتی تھیں رقص کیا کرتی تھیں،
اور اب دیکھتا ہوں سینکڑوں آنکھوں میں تری
ایک ہی چشمِ درخشاں مجھے آتی ہے نظر،
کیا اِسی چشمِ درخشاں میں ہے شعلہ سُکھ کا؟
ہاتھ سے اپنے اب اِس آنکھ کو بس بند کیا چاہتا ہوں۔

"میراجی"

دریچے کے قریب

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
محملِ خواب کے اِس فرشِ طربناک سے جاگ
لذّتِ شب سے ترا جسم ابھی چُور سہی
آمری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو!
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنّا کا خیال آتا ہے۔
سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ، جنوں خیز نگاہیں اپنی،
صبح کے نور سے شاداب سہی،
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے

. . . .

اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملّائے حزیں
ایک عفریت، اُداس!
تین سو سال کی ذلّت کا نشاں
ایسی ذِلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی!

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پنہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنّات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں۔

ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک "دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل،
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے!
ان میں مفلس بھی ہیں، بیمار بھی ہیں۔
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں!
ایک بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں!
بھوک کا شاہسوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے!
اور اسی شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شبِ عیش گذر جانے پر
بہرِ جمع خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
چرخِ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ سہی،
مسجدِ شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالمِ رخصت میں شفق چومتی ہے۔

ن۔م۔ راشد

پشیمانی

موت کا راگ نفیری پہ بجاتی اُٹھی،
لُو، جُھلستی ہوئی لُو،
اُٹھی،

بڑھی،
ریت پر جیسے دھواں اُڑتا ہو۔
سرسراہٹ سی درختوں میں ہوئی،
پتّے مرجھا گئے،
گرنے لگے،
وہ اُن کے کھڑکنے کی صدا ـــــــ میرے خدا!
لُو کے ہمراہ بڑھے؛
موت کے ناچ کا نکلا تھا جلوس!
چونک کر جاگ اُٹھے صحنِ چمن میں طائر،
آشیانوں سے جُدائی انہیں منظور نہ تھی۔
سہم کر اُٹھے، اُڑے، اُڑ کے وہیں آن گرے،
اُن کی وہ آخری فریادِ کناں آہ و بکا ـــــــ میرے خُدا!
اک گھٹاٹوپ اندھیرے میں جھکائے ہوئے سر
ہاتھ آنکھوں پہ رکھے،
بیٹھی ہے غمگین، اُداس، مجبور،
پہلو میں افسردہ خموشی کو لئے،
سانس رُکنے لگا،
خون جمنے لگا،
بیکلی ڈھونڈتی پھرتی تھی پناہ،
رینگتا رینگتا خوف آیا ـــــــ سسکتا ہوا سانپ!
بیکلی کانپ اُٹھی،
خوف جھپٹ کر اُٹھا ـــــــ بیکلی نزع میں تھی،
مجھ کو بچا ـــــــ میرے خدا!
تیرگی کانپی،
فضا لرزی،

کھلی کرنوں کی راہ،

روحیں جو وسعتِ آفاق میں آوارہ سی تھیں،

ڈھونڈتی پھرتی تھیں منزل اپنی،

پھڑپھڑاتے ہوئے پر اپنے اُٹھیں،

اور ہواؤں میں بڑھیں

سامنے جنتِ گم گشتہ نظر آتی تھی۔

تصدق حسین خالد

برادرِ نسبتی

میں شاد ہوں اپنے بھائیوں سے تو مجھ سے راضی ہیں میرے بھائی
پھُپھیرے بھائی، خلیرے بھائی، ممیرے بھائی، چچیرے بھائی

پھُپھیرے بھائی کو دیکھتا ہوں پھپھی کی آتی ہے یاد صورت
وہی تکلم، وہی تبسم، وہی محبت، وہی عنایت

خلیرے بھائی نے یاد مجھ کو دلایا گزرا ہوا زمانہ
وہ میری خالہ کا آ کے ہنسنا، وہ میری اماں کا مسکرانا

میں جیسا ہوں دادھیال سے خوش اسی طرح ننھیال سے خوش
چچیرے بھائی کے حال سے خوش، ممیرے بھائی کی چال سے خوش

کشیدہ خاطر نہیں ہے کوئی میں اِن کا شیدا وہ مجھ پہ مائل
جو سب کے سب رشتہ دار خوش ہیں شگفتہ ہیں باہمی وسائل

کیا ہے قانون اور شریعت نے قائم اور ایک تازہ رشتہ
جدید یہ رشتہ دار میرے لئے محبت کا ہے فرشتہ

یہ نیک انسان حقیقی بھائی میری شریکِ حیات کا ہے
برادرِ نسبتی کا دلکش اضافہ کس درجہ جانفزا ہے

برادرِ نسبتی اِدھر خوش مری شریکِ حیات اُدھر خوش
خوش اِنسے ہنس بول کر ہوں میں بھی غرض ہے اسوقت گھر کا گھر خوش

جدید یہ ارتباط ہوگا نئے نئے رابطوں کا حامل
اسی طرح پھیلتے رہے ہیں جہاں میں چھوٹے بڑے قبائل

وسیع ہوں گے اِس اشتراکِ لطیف سے دونوں خانداں بھی
ریاضِ ہستی کی ہونگے زینت نئے مکیں بھی نئے مکاں بھی

برادرِ نسبتی کے تیور بتا رہے ہیں کہ باوفا ہے
ابھی بہت رسم و رہ بڑھے گی ابھی محبت کی ابتدا ہے

برادرِ نسبتی میں مجھ میں بڑھے نہ آئندہ کیوں صفائی
کہ ہوں گے میرے اور اِس کے بچے پھپھیرے بھائی ممیرے بھائی

سید علی منظور

بستی کی لڑکیوں میں

فریادیٔ جفائے ایّام ہو رہا ہوں
پامالِ جورِ بختِ ناکام ہو رہا ہوں — سرگشتۂ خیالِ انجام ہو رہا ہوں
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
بدنام ہو رہا ہوں
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

سلمیٰ سے دل لگا کر، سلمیٰ سے دل لگا کر
اس حور وش کے غم میں دنیا و دیں گنوا کر — ہوش و حواس کھو کر، صبر و سکوں لٹا کر
بیٹھے بٹھائے دل میں غم کی خلش بسا کر
ہر چیز کو بھلا کر
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

کہتی ہیں سب "یہ کس کی تڑپا گئی ہے صورت"
سلمیٰ کی شاید اِس کے من بھا گئی ہے صورت — اور اُس کے غم میں اِس کی مرجھا گئی ہے صورت
مرجھا گئی ہے صورت، کملا گئی ہے صورت
سنولا گئی ہے صورت
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

پنگھٹ پہ جبکہ ساری ہوتی ہیں جمع آ کر
گاگر کو اپنی رکھ کر گھونگٹ اُٹھا اُٹھا کر — یہ قصّہ چھیڑتی ہیں مجھ کو بتا بتا کر

"سلمٰی سے باتیں کرتے دیکھا ہے اس کو جا کر
ہم سے نظر بچا کر"
سلمٰی سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

کھیتوں سے لوٹتی ہیں جب دن چھُپے مکاں کو
تب راستے میں باہم وہ میری داستاں کو دُہرا کے چھیڑتی ہیں۔ سلمٰی کو، میری جاں کو
اور وہ حیا کی ماری سی لیتی ہے زباں کو
کیا چھیڑے اس بیاں کو
سلمٰی سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اِک شوخ چھیڑتی ہے اس طرح پاس آ کر
"دیکھو وہ جا رہی ہے سلمٰی نظر بچا کر شرما کے، مسکرا کر، آنچل سے مُنہ چھپا کر
جاؤ نا پیچھے پیچھے، دو باتیں کر لو جا کر
کھیتوں میں چھپ چھپا کر"
سلمٰی سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اِک شوخ تازہ وارد سسرال سے گھر آ کر
سکھیوں سے پوچھتی ہے جس دم مجھے بتا کر "یہ کون ہے" تو ظالم کہتی ہے مسکرا کر
تم اِس کا حال پوچھو سلمٰی کے دل سے جا کر
یہ گیت اُسے سُنا کر
"سلمٰی سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں!" —

اختر شیرانی

بنگال کا باغی شاعر

ایک سپاہی جاگ رہا ہے!
خندق میں سب اُس کے ساتھی خستۂ خواب،
تاریکی ہے، خاموشی ہے، سنّاٹا ہے اور میدان!
دن بھر جس کے دامن میں تھا گرم لڑائی کا گھمسان!
تیغوں تیروں کی جھنکاریں اور بوچھاڑوں کا طوفان!
اب شورش کے تھم جانے سے گورستان!
ویراں مرگھٹ یا شمشان!

چیخیں سی کچھ گونج رہی ہیں،
طیاروں سے پھینک رہے ہیں تیر شعاع!
فرشِ زمیں پر چھوڑ رہا ہے گولے کوئی بم انداز!
بندوقوں کے چل جانے کی یک لخت آتی ہے آواز!
ایک دو لمحے شور و شغب کے پھر وہی خاموشی کا گداز!
پھر ظلمت کے بادل میں روپوش جہاز!
پھر وہی افسوں خواب نواز!

دل ہے سپاہی کا بیتاب
نیند اُس مضطر سے ہے کالے کوسوں دُور،
کروٹ کروٹ پہلو بدلے چین نہ پائے وہ بیدار!
جذبات اُس کے تیز لہو کی گردش سے غلطانِ نشار!
ایلو! نادانستہ اُس کے مُنہ سے ٹپکے چند شرار!
رزم افروز و ظلمت سوز و آتش بار!
انگاروں کی سُرخ بہار!

باغی شاعر کا آغاز!
جس کی بنگلہ ادب کے حلقوں میں ہے دھُوم

جس کے ہر اک شعر میں غلطاں شعلۂ تیغ خوں آشام!
ہر بنگالی کے دل میں ہے کندہ جس کا خونیں نام!
پرچم کا دہ ہے ساونتوں کو جس کا پُرجوش پیام!
جس کے تلے ہیں دہقان و مزدور غلام!
آگے خود نذرالاسلام!

آگ، لہو، کوندے کی لپک!
گونج رہا ہے رزم گہہِ مشرق میں بگل!
بھک سے اُڑا دو، جھپٹو، کودو، گرجو، ہر چہ بادا باد!
مارو، مارو، ڈالو، ڈالو، استعمار و استبداد!
موت آئے یا اب آزادی، مر جائیں یا ہوں آزاد!
بھارت کے دقیانوسی شاعر برباد!
باغی شاعر زندہ باد!

م۔ حسن لطیفی

اندھی جوانی

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں کالی کالی
خوب برسنے والی
متوالی
پرشور
گھٹائیں
چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
گلشن کی گلپوش ادائیں آموں کی خاموش فضائیں

کوئل کی مدہوش صدائیں

بن میں بول رہے ہیں مور

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

جوانی لے آئی برسات جوانی لے آئی برسات

جوانی ہائے جوانی

سرشوری نادانی

مستانی

بدذات

جوانی

لے آئی برسات

جوانی لے آئی برسات

بیٹھا ہوں راوی کے کنارے کرتا ہوں پریوں کے نظارے

اُف یہ نگاہیں اُف یہ اشارے

چھائی نگہ پر کالی رات

جوانی لے آئی برسات جوانی لے آئی برسات

محبت آہوں کا طوفان محبت آہوں کا طوفان

محبت پیاری پیاری

میٹھی سی بیماری

بے چاری

انجان

محبت

آہوں کا طوفان

محبت آہوں کا طوفان

اک کشتی ملّاح سے خالی　　میں نے اٹھا دریا میں ڈالی
اس کشتی کا اللہ والی
پار لگائے گا رحمان

محبت آہوں کا طوفان　　محبت آہوں کا طوفان

حفیظ جالندھری

تسلّی

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز،
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم،
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رولیں
اپنے اجداد کی میراث ہے، معذور ہیں ہم۔
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں،
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں!
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے، جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں۔
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں،
اک ذرا صبر! کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں،
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام، گرانبار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے۔
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار،
چاندنی راتوں کا بیکار، دہکتا ہؤا درد،
دل کی بے سود تڑپ جسم کی مایوس پکار،
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز!

فیض احمد فیض

حسنِ عقیدت

ز نظم و نثرِ مولانا ظہوری[1] زندہ ام غالب　　رگِ جاں کردہ ام شیرازہ اجزائے کتابش را

مرزا اسد اللہ خاں غالب

کشتۂ اندازِ مُلّا جامی[2] ام　　نظم و نثرِ اُو علاجِ خامی ام

اقبال

راحل ہوشیارپوری

۱ــ مُلّا نور الدین ظہوری ترشیزی　　۲ــ مُلّا نور الدین عبد الرحمٰن جامیؒ

ابدی راحت

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے"

"تم چاہو تو اب بھی کچھ نہیں گیا کارنیلیسی! کیا واقعی تمہارے دل میں ؟ ...."

"بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو تم اب اس تکرار سے کچھ حاصل نہیں تمہیں چاہئے کہ پچھلی سب باتوں کو بھول جاؤ اور دعا کرو کہ جس شخص سے میرا آج عقد ہو رہا ہے تمام عمر"

"جس شخص سے میرا آج عقد ہو رہا ہے" تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ کارنیلیسی۔ تم ذرا پلکیں اُٹھا کر میری طرف تو دیکھو پہچانتی ہو میں کون ہوں میں"

"مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ میں نے تمہارا کافی انتظار کیا تم مجھے چھوڑ کر فوج میں چلے گئے تم نے میری پروانہ کی۔ میں تمہاری یاد کو سینے سے لگائے کئی برس رہی"

"لیکن ——"

"وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔ مجھے بھی رفتہ رفتہ قرار آگیا۔ آج پھر تم عین اس وقت جب میری شادی ہو رہی ہے اپنی گذشتہ محبت کی داستان لیکر آگئے ہو تمہیں کہو اب اس سے کیا فائدہ ؟"

"دھوکا نہ کھاؤ کارنیلیسی۔ میں اب بھی تمہیں ویسے ہی چاہتا ہوں۔ اُس سے بھی زیادہ ہم ایک دفعہ پھر اپنی محبت کے فردوس کو آباد کر سکتے ہیں۔ میں نے تمہارے ہی لئے تو ملازمت کی تھی تاکہ تمہارے لئے بہتر عیش کے سامان پیدا کر سکوں۔ میرے دل میں تمہاری محبت اب بھی ویسی ہی محبت ہے۔"

"ہو گی، لیکن میرے دل میں وہ مر چکی ہے۔ میرے دل میں اب اگر کسی کا کچھ احترام ہے۔ تو اُسی کا جس کے ساتھ آج ......"

"میرے سامنے اُس کا نام نہ لینا۔ میری غیرت اِس کو برداشت نہیں کر سکتی تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا (تم میرے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتیں")

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم نوجوان ہو خوبصورت ہو اچھے عہدے پر ہو تمہیں مجھ سے بہتر لڑکی مل جائے گی"

"مجھے تمہارے سوا اور کچھ نہیں چاہئے۔"

"یہ ناممکن ہے"

"ناممکن کیوں ہے۔ میں تمہارے دامن کو کبھی نہیں چھوڑونگا۔ دیکھتا ہوں دنیا کی کونسی طاقت مجھے تم سے الگ کر سکتی ہے"

"تم آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہو۔ مجھے مجبوراً اپنے نوکر کو آواز دینی پڑے گی۔ تم اُس کے سامنے مجھ سے ایسی باتیں نہیں

کر سکو گے،

'میں جا رہا ہوں لیکن یاد رکھو تم اُس سے آج رات شادی نہیں کر سکو گی۔ تم میری ہو تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔'

وہ باہر چوراہے پر بدحواسی کے عالم میں کھڑا ہے۔ اُسکے چاروں طرف موٹر تانگے اور بگھیاں گذر رہی ہیں لیکن اُسے اُن کا علم تک بھی نہیں۔ سڑک کا شور و غل اُسے اِس طرح محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ خواب میں کہیں دُور کی آوازیں سن رہا ہے۔ اُسکے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہے کہ کارنیلیسی کسی اور سے شادی نہ کرے لیکن آج ہی شام کو اُس کی شادی ہے۔ اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دن کے غروب ہونے میں صرف تین گھنٹے باقی ہیں۔ اُسے وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن وہ کیا کرے؟

خودکشی! نہیں یہ ایک بزدلانہ فعل ہے۔ وہ کیوں اپنے رقیب کے لئے میدان صاف کرے۔ کارنیلیسی اُس کے ساتھ ہنسی خوشی اپنی زندگی بسر کرے اور وہ سڑک پر کسی کار کے نیچے۔ نہیں یہ تخیل سخت بھیانک ہے لیکن وہ کیا کرے۔ اُس کے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ اُسکے دوست؟ اِس معاملہ میں کوئی بھی اُسکی مدد نہیں کر سکتا لیکن اگر آج کارنیلیسی کی شادی ہو گئی تو ـــــــ

اُسے ایک چکر آیا اور اُس کا دِل بیٹھنے لگا (وہ ایک وحشی شیر کی طرح غرّایا جو اچانک شکاری کے مضبوط سلاخوں والے پنجرے میں پھنس گیا ہو اور اُس کا کمزور شکاری پنجرے کے باہر کھڑا اُس کی حالت پر ہنس رہا ہو۔)

مایوسی اور بدحواسی کے عالم میں وہ ایک بجلی کے کھمبے کا سہارا لیکر آنکھیں بند کر کے تھوڑی دیر کے لئے سستایا، معاً اس کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ ایک لمحے کیلئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ (ایک ایسے خرگوش کی طرح جس کے تعاقب میں چند خونخوار شکاری کتے لگے ہوئے ہوں اور اِس بدحواسی کے عالم میں اسے یک لخت سامنے ایک ایسا غار مل جائے جس میں وہ پناہ لے سکتا ہو) اُس نے اطمینان کا ایک سانس لیا اور چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد ایک سمت کو دوڑ پڑا۔

میرا مقدس باپ' اُس نے دو دفعہ بیساختہ کہا اور راستے کی گاڑیوں کی ٹکّر سے بے نیاز ہو کر دوڑنے لگا۔ راستے کے لوگ اُسے حیرت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بعض نے سمجھا یہ پاگل ہے اور اکثر یہ خیال کرنے لگے کہ وہ کوئی مجرم ہے جس کا پولیس تعاقب کر رہی ہے۔

'وہ ضرور میری مدد کریگا۔ وہی میری مدد کر سکتا ہے۔ مقدس باپ مذہب کا رکنِ رکیں۔ اُسکو روحانی اختیارات حاصل ہیں۔ وہ چاہے تو دم بھر میں نظامِ عالم کو تہ و بالا کر دے۔ اُس کے لئے یہ کام نہایت معمولی ہے۔ میں اپنی کارنیلیسی اسی سے لوں گا۔ وہ مجھے دے سکتا ہے۔' اُسے افسوس تھا کہ وہ کارنیلیسی سے ملنے کی بجائے سیدھا اُسی کے پاس کیوں نہ گیا۔ اگر گیا ہوتا تو کارنیلیسی اسے اِس قسم کا تلخ جواب نہ دیتی۔ (ایک ایسے ملاح کی طرح جس کی کشتی طوفان میں غرق ہو گئی ہو۔ اور سارا دن ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد شام کیوقت اُسے سمندر کے ساحل کی حسین اور تسکین دہ روشنیاں نظر آنے لگیں) اُس نے اپنی تمام طاقتوں کو جمع کیا اور دوڑتا چلا گیا۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے مقدس باپ کی خوشنودی حاصل ہے۔ ورنہ اگر مجھے اس کی درگاہ میں شرف باریابی حاصل نہ ہو چکا ہوتا تو آج میں کس امید پر اس کے پاس اپنی التجا لے جاتا۔

کچھ عرصہ کے بعد اُس نے اپنے آپ کو مقدس باپ کے بنگلے کے سامنے دیکھا۔ دربانوں نے اُسے دُور سے اِس حالت میں آتے دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ وہ کسی سخت تکلیف میں ہے۔ لیکن انہیں اِس پر تعجب نہ ہُوا کیونکہ مقدس باپ کے پاس کبھی کبھی اِس سے بھی زیادہ پریشاں حال لوگ آتے تھے۔

وہ دروازے پر آکر رک گیا اور زور سے پکارا "مقدس باپ۔ مقدس باپ!"

'چلے آؤ' ، اندر سے ایک دھیمی بارعب اور پاکیزہ آواز آئی۔

ایک ایسے کسان کی طرح جو زمستاں کی کسی اولے پڑتی ہوئی رات میں کافی سفر طے کر لینے کے بعد اپنی جھونپڑی میں داخل ہو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ مقدس باپ اپنے کمرے کے وسط میں ایک پلنگ پر جلوہ افروز تھا۔ کمرے کے اندر دروازوں اور کھڑکیوں پر پردوں کی موجودگی کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا سا تھا۔ اِس ظلمت خانے میں مقدس باپ کا پُرنور چہرہ اور سفید ریش اُس کی وجاہت میں اضافہ کر رہی تھی۔

'میرے مقدس باپ! میں سخت تکلیف میں ہوں میری مدد کیجئے۔' اُسنے اپنا سر مذہبی پیشوا کے قدموں میں رکھ دیا اور رونے لگا۔

'خدا تمہیں تسکین دیگا' مقدس باپ نے اُسکے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"میری کارنیلسی مجھ سے بے وفائی کر رہی ہے۔ وہ آج ایک اور سے شادی کر رہی ہے۔ آج ہی شام کو۔ مقدس باپ! میں مر جاؤں گا۔ میری کارنیلسی مجھے دلا دیجئے۔ آپ کے لئے یہ بہت معمولی بات ہے۔"

'میری طرف دیکھو' مقدس باپ نے دوبارہ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"فرمایئے" اُس نے اپنے سر کو اُوپر اُٹھایا۔ اُسکی آنکھوں میں اُمید و بیم کی کشمکش واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔

'تمہیں وہ شخص ہو جسے خدائے عزّوجل نے اپنے خاص کرم کے لئے منتخب کیا ہے۔ تم بڑے خوش نصیب ہو'

'تو مجھے میری کارنیلسی ——— '

'نہیں۔ ابدی راحت کارنیلسی سے کہیں زیادہ بہتر ہے'

'لیکن مجھے تو میری کارنیلسی چاہیئے میں ابدی راحت کو کیا کروں گا'

'ایک معصوم بچے کیطرح تم اپنا فائدہ اور نقصان خود نہیں سمجھ سکتے تمہیں کیا معلوم کہ ابدی راحت کیا ہوتی ہے تمہیں شکر کرنا چاہیئے کہ یہ سعادت تمہارے حصّہ میں آئی ہے'

'لیکن مقدس باپ! وقت بہت تھوڑا ہے۔ شام کے وقت ——— '

'ٹھہرو! تمہارا آسمانوں پر انتظار ہو رہا ہے اور تم دنیا کے ناپاک جھگڑوں میں اپنا دماغ پریشان کر رہے ہو۔ اٹھو سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔'

'مگر ——— '

"اٹھو۔ کھڑے ہو جاؤ"، مقدس باپ نے کڑک کر کہا۔

وہ کانپ گیا اور کھڑا ہو گیا۔

"جانتے ہو یہ کیا ہے؟" مقدس باپ نے اپنے فرغل سے ایک پستول نکالتے ہوئے کہا۔

"یہ پستول ہے"، اُس نے خوف و حیرت سے جواب دیا۔

"ہاں یہ پستول ہے۔ اسے بوسہ دو اور لے لو۔ یہ تمہیں خدائے عزوجل کی طرف سے ملا ہے ملک کا وزیرِ اعظم مذہب کا دشمن ہے۔ خدا اور اُسکی بنائی ہوئی نیک روحوں کو اُسکے خون کی ضرورت ہے۔ قدرت کا منشا ہے کہ یہ کام تمہارے ہاتھوں سے سرانجام ہو۔ اُسی طاقت نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے وہ نابکار پرسوں اسی شہر میں ایک کھلے جلسے میں تقریر کریگا وہیں تم اُسے ——"

"نہیں نہیں مقدس باپ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا"،

"خاموش رہو"، مذہبی پیشوا نے درشت ہو کر کہا خدا کی مرضی کی خلاف ورزی کرنا جانتے ہو کیا ہوگا۔ زمین پھٹ جائیگی اس میں سے لاوا نکلے گا اور چاروں طرف سے تمہیں گھیرے گا۔ جہنم۔ ابدی جہنم"۔

"پناہ! مقدس باپ پناہ"، وہ لرز رہا تھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر دھر لئے۔ "لیکن اِس خدمت کے لئے میں کیوں منتخب کیا گیا"

"اس لئے کہ خدا تم پر مہربان ہے۔ وہ تمہیں ابدی راحت دینا چاہتا ہے۔ اس پستول کو لو"،

"رحم کرو مقدس باپ"،

"نہیں بیٹے"، مقدس باپ نے چلا کر کہا اور اپنی آستینوں کو چڑھا کر ہاتھ اوپر اُٹھائے، "اپنے آپ کو قہرِ الٰہی کیلئے تیار کرو۔"

"نہیں۔ نہیں مقدس باپ۔ میں احکامِ الٰہی کی تعمیل کروں گا"،

وہ مقدس باپ کے قدموں سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"یاد رکھو اگر تم نے ذرہ بھر بھی غداری کی یا اِس کا خیال بھی تمہارے دل میں آیا تو تمہیں آگ لگ جائیگی"،

"نہیں میں غداری نہیں کروں گا"، اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں ابدی راحت کی خوشخبری دیتا ہوں۔ حوریں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ تم جنّت میں حکومت کرو گے۔ اور کارنیلسی سے کہیں زیادہ ——"

"آہ کارنیلسی ——"، اُس نے آہستہ سے کہا۔

"گھبراؤ مت بیٹا۔ یہ دو دن کی بات ہے پھر تمہیں سکونِ ابدی میسر ہوگا۔ مذہبی خطبوں میں تمہارا نام دہرایا جائیگا تم پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں گی۔"

مقدس باپ نے اسکا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ "لو یہ پستول"،

اُس نے پستول کو چوم کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اب جاؤ۔ میرے بیٹے۔ اور ہاں اسکو کوٹ کے اندر اچھی طرح سے چھپا لو کیونکہ پولیس ہر شخص کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ مذہبی پیشوا نے نرم لہجے میں کہا۔ پرسوں۔ چار بجے شام" وہ باہر نکلا۔ دربانوں نے پرمعنی انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گویا وہ کہہ رہے تھے۔ دیکھا مقدس باپ نے اِس شخص کا سارا دکھ دور کر دیا ہے،

اُس کے پاؤں بوجھل ہو رہے تھے۔ اور وہ شام کے وقت نہر کی رو میں بہنے والے شیشم کے ایک سوکھے ہوئے تنہا پتے کی طرح اپنے دل ہی دل میں باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا اور اُسے معلوم نہ تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے۔

"آہ خدایا تو نے ابدی راحت کیلئے مجھے ہی کیوں پسند کیا۔ تیری دنیا کے لوگ کسقدر خوش و خرم چل پھر رہے ہیں ان سب میں مجھ سا بدنصیب اور نامراد کوئی نہیں۔ کیا تو اتنا قادرِ مطلق ہونے پر بھی اپنے دشمن وزیرِ اعظم کی جان خود نہیں لے سکتا۔ اور اس کے لئے تجھے مجھ سے ستم رسیدہ انسان کی خدمت کی ضرورت ہے یا وہ آگ جو مجھے تیرے حکم کی نافرمانی کرنے پر تا حشر جلا سکتی ہے اِس ظالم اور بدبخت وزیرِ اعظم کو بھسم نہیں کر سکتی۔ یا کیا واقعی تجھے اُن لوگوں کو اذیّت دینے میں لطف آتا ہے جو تیرے دامن کو پکڑ کر پناہ لیں۔ بارِ الہا۔ اگر میں دنیا کے مظالم سے تنگ آکر تیری امداد کا خواہاں نہ ہوتا اور اس کیلئے تیرے بنائے ہوئے مذہبی پیشوا کے پاس نہ جاتا تو تو مجھے اِس خدمت پر کسطرح معمور کر سکتا تھا۔ کیا میرا صرف یہی قصور ہے کہ میں تجھ پر ایمان رکھتا ہوں تیرے احکام کی پیروی کرتے ہوئے تیرے مقدس پیشوا کی عزت اور اطاعت کرتا ہوں۔ بجلی کی روشنیوں میں یہ مسکراتے ہوئے چہرے! خدایا ان میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں جو تیری بنائی ہوئی ہدایات کی کھلم کھلا توہین کرتے ہیں۔ تیرے مقدس پیشواؤں کو جانتے بھی نہیں پھر بھی تجھے اُن کو دکھ دینا منظور نہیں۔ اگر ہے تو مجھے جو تجھ سے ڈرتا ہوں۔ اے خدا تو منصف و عادل ہے۔ کارنیلسی آج اپنے شوہر کیسا تھ جلسۂ عقد میں مسکراتی ہوئی پھر رہی ہوگی۔ اور میں پرسوں پھانسی پر لٹکایا جاؤنگا۔ میرے مالک میں نے تیری کونسی خطا کی ہے کیا تجھے اپنی مطلب براری کے لئے بیکسوں اور ناتوانوں کے خون کی ضرورت ہے؟"

اُسے دنیا بالکل اجنبی معلوم ہو رہی تھی اور وہ (بجلی کی روشنیوں میں پر نور سڑکوں پر بھی چلتا ہوا) یہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اندھیرے میں کسی ایسے زینے سے اتر رہا ہے جس سے اُس کا گذر کبھی نہیں ہوا۔ راستے میں ایک شخص نے اُسے اُس کے نام سے پکارا۔ دوسرے کے قہقہے کی آواز آئی جانتے ہو حضرت کی محبوبہ کسی اور سے شادی کر رہی ہے۔ یہ چوٹ اُسے بہت سخت پڑی مگر اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور چلتا رہا۔

تیسرے دن جب حکومت کا وزیرِ اعظم ایک جلسے میں لوگوں کو باغیوں کی کارستانیوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ ایک شخص اُس مجمع میں اسکی جان لینے کی ناکام کوشش کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ لوگوں کے دلوں میں اُس کے خلاف سخت نفرت تھی اور وہ اُسے حقارت اور عتاب کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

وزیرِ اعظم نے پکار کر کہا۔ لوگو! یہ حکومت کا باغی ہے۔ اسے کل شہر کے صدر دروازے پر پھانسی دیجائیگی۔

ملزم چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔
"لوگو مجھے چھوڑ دو۔ مجھے ابدی راحت نہیں چاہیئے۔ مجھے اسی دنیا کی راحت لینے دو۔"

سید رضا گردیزی

تحسینِ سخن

عُرفی علیہ الرحمہ

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا دفارابی
فضائے عشق پر تحریر کی اُس نے نوا ایسی
میسر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشک عنابی

اقبال

راسخ دہلوی مرحوم

ہائے وہ مولانا راسخ کا کلام
وہ تخیل وہ مضامین کی ادا
آسمانوں پر وُہ پروازِ خیال
وہ زمینوں کو بنا لینا نیا

آغا شاعر قزلباش

راحل ہوشیارپوری

پیکِ مشتاقاں

نسیم صبح جاتی ہے سوئے مُلکِ دکن حسرت
تپشہائے جدائی کا اسی سے ماجرا کہیئے

مشامِ جاں مُعطّر ہو رہا ہے
دکن سے جھونکے آتے ہیں صبا کے

حسرت موہانی

راحل ہوشیارپوری

سمندر پار

سمندر پار کے رہنے والے! ـــــــــــــــ
سمندر! یہ سمندر کہاں تک ہے؟
اور اِس کے پار کیا ہے؟
پار کے رہنے والے!
ہم اِس پار رہنے والے تو رہتے ہیں
تم اُس پار رہنے والے بھی کیا یُوں ہی رہتے ہو؟
یہ تو دُنیا ہے
اے اِس دُنیا سے دُور!
کیا وہ بھی دُنیا ہے کوئی جہاں تُو ہے؟
سمندر پار کے رہنے والے! سُن
سات سمندر پار تُو وہاں گیا جسے ولایت کہتے ہیں،
پھر اُس سے پرے پھر اُن ساتوں کے بھی پار
تبا تُو کہاں گیا؟ اے میرے سمندر پار کے موتی! تو کہاں گیا؟
کہاں گیا اور کیوں اور کس لئے گیا؟ اور کیا تُو ہے؟
اچھا! جا، تُو اچھا گیا، تُو اُس کے لئے گیا جو اچھا ہے!
تو گیا، چلا گیا، جا، چلا جا!
لیکن ایک شام، جھٹپٹا ہوتے
اُس شام جیسی جب کہ تُو چل دیا،
اِن طوفانی ہواؤں کے اندر پکارا
"ہاں میں رہتا ہوں سمندر پار"!

کراچی ۱۱ رجون ۱۹۴۱ء

ل ب

گُریز

پھر ہُوا جاتا ہے تاراج تخیل میرا۔
اک نئے درد کا احساس ہے پہلو کے قریب
کیا فقط موت کی آغوش میں پاؤں گا نجات
کیا نہ ہو گا کبھی دُنیا میں مجھے چین نصیب؟

× × × × × × × × × ×

تیری آنکھوں میں سمائے ہوئے آنسو کی جھلک
مجھے دیوانہ بناتی ہے رُلاتی ہے مجھے
تیرے ہونٹوں کی یہ موہوم تبسم ریزی
کوئی بھولا ہوا افسانہ سناتی ہے مجھے

× × × × × × × × × ×

پیار سے یوں نہ مگر دیکھ، نہ یوں دیکھ مجھے
کہیں بھولے سے نہ کہہ جاؤں کوئی پیار کی بات
نہ کہیں لب پہ مرے حرفِ وفا آجائے
اور تو سمجھے کہ دنیا میں ہے اُلفت کو ثبات

× × × × × × × × × ×

میں نے دیکھے ہیں محبت کی تپش سے خالی
وہی سینے جو بنے شمعِ محبت کا لگن۔۔۔
میں نے دیکھے ہیں اُسی جا پہ فقط راکھ کے ڈھیر
عشق کی آگ جہاں رہتی تھی ہر دم روشن

× × × × × × × × × ×

نہ کبھی ملتی تھی فرصت جسے طوفانوں سے
حکمراں اب ہے اُسی بحر پہ خاموش فضا
آندھیاں آتی تھیں جس دشت میں بادل لیکر
اب وہاں باقی ہے سوکھے ہوئے پتوں کی صدا

× × × × × × × × × ×

نظر آتا تھا کوئی پیکرِ الفت مجھ کو
اعتبار اپنی نگاہوں پہ کیا تھا میں نے
یوں بہا جاتا تھا جذبات کی رَو میں جیسے
غایتِ عشق کو پہچان لیا تھا میں نے

× × × × × × × × × × ×

نہیں، معلوم نہیں مجھ کو محبت کیا ہے۔
حسن بہکاتا تھا کیوں مجھ کو فسوں بن بن کر
کیا خطا کی تھی نگاہوں نے کہ آخر ٹپکی
میری آنکھوں سے تمنا مری خوں بن بن کر

× × × × × × × × × × ×

مجھے دعوےٰ تھا وفا کیش ہے فطرت میری
پاس الفت کا ترے دل میں رہے یا نہ رہے
میں سمجھتا تھا محبت نہیں پابندِ زوال
گو ہوس خام ہو فانی ہو فنا ہو جائے

× × × × × × × × × × ×

وہ تمنائیں، وہ امیدیں، وہ پاکیزہ خلوص
جو پہنچتے تھے فرشتوں کی عبادت کے قریں
رفتہ رفتہ ہوئے افسانۂ ماضی — شاید
استواری کسی انسان کے مقدر میں نہیں

× × × × × × × × × × ×

ہوس و عشق میں اب فرق نہیں میرے لئے
صرف کر مجھ پہ نہ معصوم نگاہیں اپنی
ایک آوارہ و ناکارہ سے الفت کیسی؟
اپنے سینے میں دبی رہنے دے آہیں اپنی

× × × × × × × × × × ×

پھر نہ یوں دیکھ — نہیں — مجھ کو گنہگار نہ کر
منفعل رہنے دے بیتے ہوئے لمحوں پہ مجھے
بیچ کر صبر و سکوں ٹھوکریں کھانے کا خیال
گر تجھے ہو — کسی پتھر سے محبت کر لے

× × × × × × × × × × ×

مسعود پرویز

پنجابی ملازم

افرادِ تمثیل

میاں فتح خاں ۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ ایک پنجابی رئیس، محمد علی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اُن کا نجی ملازم

نواب افتخار الدولہ ۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ لکھنؤ کے ایک نواب، کلّو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نوّاب صاحب کا نوکر

وقت ۔۔۔۔۔۔۔ زمانۂ حال

پہلا منظر

مقام - لکھنؤ، نوّاب صاحب کی حویلی

میاں صاحب نوّاب صاحب کے مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں، لمبے سفر نے ان کو تھکا کر چور کر دیا ہے اور وہ ایسی لمبی تان کر سو رہے ہیں کہ اٹھنے کا نام تک نہیں لیتے، نواب صاحب دیوان خانے میں کھانے پر اُن کا انتظار فرما رہے ہیں بھوک سے تنگ آکر لکھنوی وضعداری سے چند لمحات کے لئے آخر چُھٹی لیتے ہیں، کلّو کو ہدایت ہوتی ہے کہ میاں صاحب کو باادب طریق سے بیدار کر کے کہہ دے کہ وہ ان کا انتظار کر رہے ہیں،

کلّو مہمان کمرہ میں نظر آتا ہے، گھڑی پر شام کے سات بجنے میں تین منٹ باقی ہیں۔ کلّو پورے سات پر الارم لگا کر آہستگی سے باہر آجاتا ہے، اور دروازہ کے پاس کھڑا الارم کے بجنے کا منتظر رہتا ہے، الارم بجتا ہے +

میاں صاحب (کروٹ لیتے ہوئے اور آنکھیں کھولے بغیر نیچی آواز میں) اس نالائق کو آج ہی بجنا تھا،

کلّو (میاں صاحب کو بیدار ہوتے دیکھ کر لیکن جیسے اُس نے میاں صاحب کی آواز نہیں سُنی) اف سات بج گئے، وقت بھی کتنی جلدی گزرتا ہے،

میاں صاحب سات بج گئے!

کلّو ۔ جی حضور "

میاں صاحب "اچھا! (وقفہ) میرا تولیہ صابن لاؤ"

کلّو باہر جاتا ہے، میاں صاحب گھڑی کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچتے ہیں کہ نواب صاحب بھی کیا کہیں گے کہ میاں صاحب گھوڑے بیچ کر سوئے تھے یا مُردوں سے شرط بد کر، کلّو تولیہ کنگھی پانی کا جگ، صابون وغیرہ لے کر حاضر ہوتا ہے، میاں صاحب ہاتھ منہ دھوتے ہیں۔

میاں صاحب - نوّاب صاحب کہاں ہیں؟

کلّو - حضور دیوان خانے میں آپ کا انتظار فرما رہے ہیں۔ کوئی گھنٹے بھر سے۔

میاں صاحب "اف انہیں کتنی کوفت ہوئی ہوگی"! (تولیہ واپس دیتے ہوئے) محمّد علی کہاں ہے؟

کلّو - "میرے کمرے میں سرکار"

میاں صاحب "اچھا! اسے وہاں بُلا لانا"

میاں صاحب دیوان خانے کا رخ کرتے ہیں، کلّو باتمیز نوکروں کی طرح پیچھے پیچھے ہو لیتا ہے، میاں صاحب کو آتے دیکھ کر نوّاب صاحب استقبال کے لئے اُٹھتے ہیں، کلّو محمد علی کو بلانے کے لئے چلا جاتا ہے،

نوّاب صاحب - میاں صاحب - نیند میں کوئی حارج تو نہیں ہوا؟ بچّے بار بار روکنے کے باوجود گھر میں آج کچھ زیادہ ہی شور مچاتے رہے،

میاں صاحب - جی نہیں - ایسی نیند تو کبھی غریب خانے پر بھی میسر نہیں ہوئی۔"

کلّو اور محمد علی حاضر ہوتے ہیں۔ کلّو کو نوّاب صاحب کھانا لانے کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ محمد علی تھوڑی دیر کھڑا رہنے کے بعد جوتوں کے پاس دہلیز پر بیٹھ جاتا ہے، کلّو کھانا لاتا ہے، اور مہمان اور میزبان ہاتھ دھو کر دسترخوان پر بیٹھ جاتے ہیں۔

نوّاب صاحب - واللہ آپ تو بہت تکلّف کرتے ہیں۔ کھائیے نا - شیرمال تو دیکھئے، یہ شاہی ٹکڑا تو یہاں کی خاص چیز ہے،

میاں صاحب - (لقمہ لیتے ہوئے) بڑے مزے کی چیز ہے یہ تو۔

نوّاب صاحب " یہ بریانی تو بیگم نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہے"

میاں صاحب " بریانی تو میرا من بھاتا کھاجا ہے، بے اختیار بیگم صاحبہ کی محنت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے"

نوّاب صاحب " اور یہ کوفتے دیکھئے نا - لیکن میں تو چنوں کا حلوا زیادہ رغبت سے کھاتا ہوں"

میاں صاحب (ایک چمچہ لیتے ہوئے) چنے کا حلوا میں نے تو آج ہی چکھا ہے - آپ کے دسترخوان پر ہر شے لذیذ ہے کوئی کیا کیا کھائے"

محمد علی بدستور دہلیز پر بیٹھا جماہیاں لے رہا ہے۔ پاس ہی کلّو مؤدب کھڑا ہے۔ مہمان اور میزبان کھانے سے فارغ ہو جاتے ہیں، کلّو برتن طشت میں لگا کر واپس لے جاتا ہے، اور محمد علی اُسے قریب سے جاتے ہوئے دیکھ کر گہرا سانس لیتا ہے،

نوّاب صاحب (بہ آوازِ بلند) کلّو!

کلّو۔ حاضر ہوا سرکار، (داخل ہوتے ہوئے) حکم سرکار!

نوّاب صاحب "چھیدو کی دکان سے پھل لاؤ، انگور چمن کے لینا، پشاوری نہ لینا"

"بہت خوب حضور" (کلّو جاتا ہے)

نوّاب صاحب۔ (میاں صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے) کلّو بڑا چست نوکر ہے، دیکھئے نادہ گیا، .... گلی کے نکڑ پر .... نھنے میاں کی حویلی کے سامنے .... لو وہ پھل والے کی دکان پر پہنچا .... چھیدو نے انگور تولے .... وہ کلّو چلا .... نھنے میاں کی حویلی کے سامنے .... گلی کے نکڑ پر .... وہ اللہ آیا .... (با آواز بلند) کلّو!

کلّو۔ جی حضور!

نوّاب صاحب "پھل لایا"؟

کلّو۔ "جی حضور" کلّو پلیٹ آگے بڑھاتا ہے، میاں صاحب کلّو کی مستعدی پر حیران ہیں۔

(پردہ)

دوسرا منظر

ایک سال بعد، لاہور میں بیگم روڈ، پر میاں صاحب کی کوٹھی،

میاں صاحب ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی گھنٹی کا بٹن دباتے ہیں، کچھ وقفے کے بعد محمد علی کمرے میں داخل ہوتا ہے،

میاں صاحب "محمد علی"!

محمد علی (سست آواز میں) "جی"

میاں صاحب "دیکھو۔ لکھنؤ سے نوّاب صاحب آرہے ہیں، چار پانچ دن یہاں قیام کریں گے۔ انہیں مسلم لیگ کے جلسہ میں شرکت کرنا ہے، خدمت میں کمربستہ رہنا ہوگا۔ دیکھو بھولیو مت"+

محمد علی "جی۔ بہت اچھا"

میاں صاحب "ڈرائیور سے کہو کار نکالے، ہم اسٹیشن پر جائیں گے، نوّاب صاحب کو لینے"

محمد علی "جی اچھا"

محمد علی مہمان کمرے کی صفائی میں مشغول ہے، نوّاب صاحب میاں صاحب کے ہمراہ داخل ہوتے ہیں۔ کلّو اسباب سے لدا پھندا پیچھے ہے، محمد علی نوّاب صاحب کو سلام کرکے اپنے کام کو جاری رکھتا ہے، میاں صاحب کے ماتھے پر شکن دکھائی دیتی ہے، غصّے کو دباتے ہوئے وہ محمد علی کو نواب صاحب کے لئے پانی وغیرہ لانے کو کہتے ہیں اور نوّاب صاحب سے ڈرائنگ روم میں آنے کو کہہ کر خود اسی کمرے میں جا بیٹھتے ہیں، چند منٹ بعد نوّاب صاحب بھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہیں،

میاں صاحب (اٹھتے ہوئے) آئیے یہاں تشریف رکھئے +

نواب صاحب (بیٹھتے ہوئے) آپ کی نوازش۔

میاں صاحب "سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی"

نواب صاحب "نہیں تو۔ راستہ خوب مزے سے کٹا۔ ڈبے میں کئی مندوب تھے، سیاسیات پر بحث ہوتی رہی۔ بڑا مزہ رہا بھئی بہت لطف اٹھایا"

میاں صاحب "آپ کو تو سیاسیات سے گہری دلچسپی ہے، نواب صاحب یہ مسلم لیگ چاہتی کیا ہے؟"

نواب صاحب۔ اِدھر اُدھر (جھانک کر) مسلم لیگ چاہتی تو بہت کچھ ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میاں صاحب "یعنی"

نواب صاحب "ہندوستان کے لئے آزادی، اے اے۔۔۔۔۔۔ (سر کھجلاتے ہوئے) مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ اور۔۔اور"

(محمد علی میز پر کھانا چنتا ہے)

۔۔۔۔" اور مزدور کے لئے روٹی"

میاں صاحب "مزدور کے لئے روٹی"

نواب صاحب "ہاں ہاں مزدور کے لئے روٹی"

میاں صاحب "مسلم لیگ کیا مزدوروں کی جماعت ہے؟ میں تو یہی سمجھے رہا ہوں کہ لیگ مزدور و زردوں کے جھگڑے سے پاک ہے"

نواب صاحب "آپ ٹھیک سمجھے، لیکن مزدور کو ساتھ ملائے بغیر کام نہیں چلتا، اسمبلی کے لئے ووٹ چاہئیں۔ ووٹ۔ اور ووٹ مزدور کے پاس کثرت سے ہیں، اُسے روٹی چاہئے ہمیں ووٹ"

میاں صاحب "لیکن اگر مزدور ووٹ کو خود کام میں لانا شروع کردے تو"

نواب صاحب "بات تو بری ہے۔ لیکن ہمارے پاس بھی اس کا علاج ہے"

میاں صاحب "وہ کیا"

نواب صاحب "ہم اُسے اپنی زمین سے باہر نکال پھینکیں گے (دونوں قہقہہ لگاتے ہیں) بچہ کو فاقوں سے مار کر سیدھا کردیں گے۔ ٹھیک ہے نا" (دونوں ہنستے ہیں)

میاں صاحب "مجھے ایک بات کھٹکتی ہے، کانگرس کہتی ہے کہ وہ مزدوروں کی جماعت ہے، اگر کانگرس کی حکومت قائم ہوجائے تو پھر"

نواب صاحب "گویا آپ کے نزدیک سردار پٹیل، راجندر بابو، سیٹھ جمنا لال بجاج سارے کے سارے مزدور ہیں"

میاں صاحب "کانگرس میں سوشلسٹ بھی تو شامل ہیں"

نواب صاحب "لیکن ان کا وجود آٹے میں نمک سے بھی کم ہے، آپ کو معلوم نہیں گاندھی جی نے خود حال ہی میں فرمایا

ہے کہ مزدور کا بہترین محافظ سرمایہ دار ہے"

میاں صاحب "اچھا! بات تو معقول کہی ہے (کچھ وقفہ کے بعد بلند آواز سے) محمد علی"!

محمد علی "جی"

میاں صاحب "دسترخوان بڑھا دو"

محمد علی ہاتھ دھلا کر برتن اُٹھا لے جاتا ہے

میاں صاحب "نواب صاحب محمد علی آپ کی خدمت میں حاضر رہے گا۔ کافی ہوشیار آدمی ہے"

نوّاب صاحب ہاں۔ سمجھدار معلوم ہوتا ہے

(گھنٹی بجتی ہے اور محمد علی داخل ہوتا ہے)

میاں صاحب محمد علی۔ رمضان سے پان لاؤ۔ کہنا نوّاب صاحب لکھنؤ سے آئے ہیں۔ خستہ ہوں (محمد علی کو جاتے دیکھ کر) بہت جلد آنا۔ (نوّاب صاحب سے مخاطب ہو کر) محمد علی دو سال پہلے بالکل اجڈ تھا، اب کچھ سلیقہ مند ہو گیا ہے کام میں ہوشیاری خوب دکھاتا ہے، دیکھئے نا پان لینے گیا، .... وہ تانگوں کے اڈّے کے پاس پہنچا .... لڑکوں کے سکول کے سامنے .... رمضان کی دُکان پر .... رمضان نے گلوریاں باندھیں .... محمد علی واپس دوڑا .... اڈّے پر .... کوٹھی کے احاطے میں .... وہ آیا ..... (بہ آوازِ بلند) محمد علی!

محمد علی "جی" (میاں صاحب کی باچھیں کھِل جاتی ہیں)

میاں صاحب "پان لائے ہو"

محمد علی "جی ــــ نہیں ــــ ابھی تک تو مجھے جوتی کا دوسرا پیر بھی نہیں ملا"

میاں صاحب کھسیانے ہو جاتے ہیں اور نوّاب صاحب قدرے مسکرا دیتے ہیں۔

پردہ

ایم۔ آئی ملک ایم۔ ایس سی

اِسے زندگی

برگشتہ منزل کی طرح
اندوہگیں دل کی طرح
غم کی اندھیری رات میں
تو جا رہی ہے کس طرف
اے زندگی! اے زندگی!

شیدا ہو تو انوار کی
کر جستجو انوار کی
اس عالمِ ظلمات میں
کب تک یونہی بھٹکے گی تو
اِے زندگی! اے زندگی!

پھر خرمنِ آفاق سے
تغئیر کے شعلے اُٹھے
نظمِ کہن برہم ہُوا
باغی ہیں اجزائے جہاں
اے زندگی! اے زندگی!

چل گلشنِ ہستی میں چل
اِس وادئ غم سے نکل
ہر سمت اک ہنگامہ ہے
تو بھی تو ہو آتش نوا
اِے زندگی! اے زندگی!

تاجور سامری لائلپوری

محفلِ ادب

غالبؔ کی دلّی

(از جناب پرنسپل مشتاق احمد صاحب دہلوی)

غالبؔ نے دلّی کے تین زمانے دیکھے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ دلّی کا سہاگ تھا۔ اور اس کا تاجدار خاندانِ تیموریہ کا آخری چراغ ابو ظفر [illegible] دلّی کو عطا یا گویا آغوشِ پدری میں لئے تمام آفات دہر سے بچائے تختِ خلافت پر جلوہ افروز تھا شہر مالامال اور اہلِ شہر خوشحال تھے۔ دن عید تھا اور رات شب برات تھی۔ ہر تہوار خوشی کا ایک بہانہ ہوتا تھا شب و روز میلے رہتے تھے۔ بیاہ شادی، رسم و رسوم کی دھوم دھام، دولت و حشمت کے اظہار کا اور روپیہ خرچ کرنے کا ذریعہ تھا علم و ہنر کی قدر تھی۔ شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ فن سپہ گری کا زور تھا۔ بزرگانِ دین کی دلوں میں عظمت تھی۔ خدا کا خوف تھا اور مذہب کی پابندی۔ خود حضرت ظلِّ سبحانی صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور زبدۃ الواصلین قدوۃ السالکین حضرت شاہ غلام نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب کے مرید تھے۔ اور بارہا حضور پرنور قطب الاقطاب کے مزار کی زیارت کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ غرض کہ اس زمانے کی دلّی میں امن و سکون اس درجہ میسر تھا کہ اس کا ردِ عمل اس ہنگامہ جہاں سوز میں رونما ہوا جس کو آنریبل جان کمپنی نے غدر کے نام سے مشہور کیا ہے۔ یہ وہ دوسرا زمانہ تھا جو غالبؔ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جب دلّی کا سہاگ لٹا اور بیوہ دشمن کی آتش بغض و غضب کی چتا پر بیٹھ کر ستی ہوگئی اور ایک راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ اور دلّی والے پروانہ وار اپنے تاجدار پر نثار ہوگئے اور دادِ مردانگی دے کر ہمیشہ کے لئے گنج شہیداں میں جا سوئے۔ غالبؔ نے دلّی کا تیسرا دور وہ دیکھا جب مسلمانوں کی بادشاہت کا خاتمہ ہو کر ہندوستان پر مشرقی حکومت کی جگہ مغربی حکومت کا تسلط ہوا اور مشرقی تہذیب و تمدن کی تخریب کا بیج بویا گیا۔

جب تک بہادر شاہ کی بادشاہت رہی دلّی اس تہذیب و تمدن اور علم و کمال کی حامل رہی جس کو مغلوں ترکوں ایرانیوں اور ہندیوں کے باہمی میل جول اور محبت و آشتی کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ دلّی کا شہر نہ صرف دار الحکومت ہونے کی وجہ سے اور افغانوں کی کثرت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں کیا بلکہ کسی زمانہ میں تمام دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ بہادر شاہ کے زمانہ میں بھی چاندنی چوک کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ بازار کے بیچوں بیچ ایک نہر رواں تھی اور جس جگہ اب گھنٹہ گھر ہے یہاں ایک حوض تھا۔ اس حوض کے سامنے جہاں اب کپڑے والوں کی دکانیں اور نئی سڑک ہے ایک بہت بڑی سرائے تھی۔ اسی طرح قلعہ کے سامنے جہاں اب گھاس کے میدان اور پریڈ گراؤنڈ ہیں یہاں تمام آبادی اور تمام امراء و وزراء اور قلعہ کے متوسلین کے یہاں محلات حویلیاں اور مکان تھے اور اسی جگہ خانم کا بازار۔ خاص بازار اور اردو بازار تھے۔ ان میں سے خانم کا بازار دلّی کے سب بازاروں سے زیادہ رونق کا بازار تھا۔ خاص بازار فیض بازار اور قلعہ کے درمیان تھا اور اردو بازار قلعہ اور خونی دروازے کے درمیان تھا۔ جس طرح فیض بازار

میں پہلے ایک پتلی سی نہر تھی اسی طرح چاوڑی بازار میں سے گزر کر قاضی کے حوض تک اور وہاں سے لال کنوئیں سے ہوتی ہوئی فتح پوری تک وہ نہر گشت کرتی تھی۔ مغل بادشاہوں نے ہندوستان کے گرم شہروں کی تمازت کو دور کرنے کے لئے نہ صرف اپنے محلات اور قلعے میں بلکہ شہر کے بازاروں اور باغوں میں بھی نہروں کا انتظام کیا تھا اور جابجا کثرت سے باغات لگائے تھے دلی کے تریپلئے دروازے تک اور اس کے باہر کوسوں تک باغ ہی باغ تھے جن میں سے صرف روشن آرا باغ باقی ہے اور سب دست بُرد زمانہ کے ہاتھوں غارت ہو گئے۔ محلدار خاں کا دروازہ ابھی تک باقی ہے شورے کی کوٹھی والا باغ عمارات کی نذر ہو گیا۔ شہر میں بڑے بڑے عالیشان محل اور حویلیاں تھیں جن میں اب ایک ایک محلہ آباد ہے اور اب اس محل کے نام پر محلّے کا نام ہے۔ جیسے رنگ محل۔ نواب وزیر کی حویلی۔ حویلی علی قلی خاں وغیرہ وغیرہ۔ ان حویلیوں میں دالان در دالان اور صحن چبوترہ ہوتا تھا۔ چبوترے پر شہ نشین اور بعض حویلیوں میں اندر کے دالان کے پیچھے ہی شہ نشین یا غلام گردش ہوتی تھی صحن میں چھوٹا سا چمن اور اس کے بیچ میں ایک مستطیل حوض ہوتا تھا جس میں فوارے چلتے رہتے تھے۔ اب بھی بعض ساہوکاروں کے قبضے میں ایسی حویلیاں ہیں جو انہوں نے نیلام میں لیں یا قرض کے عوض میں حاصل کیں۔

غالب کا اپنا لباس تو ان کی تصویر سے ظاہر ہوتا ہے جس کی خصوصیت اُن کی کلاہ پاپاخ ہے۔ لیکن عام طور پر مسلمانوں کے لباس میں چوگوشیہ ٹوپی تھی جسے کلاہ تتری بھی کہا جاتا تھا۔ اس کے چار پہل یا آٹھ پہل ہوتے تھے۔ اور اس کی شکل کُرک کی سی ہوتی تھی۔ اب بھی بعض خاندانوں میں اس کا رواج ہے اور بچوں کے لئے تو عام طور پر استعمال ہوتی ہے اس کے نیچے کی گوٹ میں پتلی لیس اور گوشوں کے کنارے پر فیطون لگایا جاتا تھا۔ شوقین لوگ سلمے ستارے کے کام بھی کراتے تھے اور بادشاہ سلامت کی ٹوپی میں موتی اور جواہرات بھی ٹکے ہوئے ہوتے تھے۔ دلی کی آبادی دو قسم کی تھی۔ قلعے والے اور شہر والے۔ قلعہ والے ٹوپی کے پاکھوں کو کھڑا رکھتے تھے شہر والے دبا لیتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ٹوپی پچ گوشیہ کہلاتی تھی۔ چندوے پر سے یہ ٹوپی گنبد کی شکل ہوتی تھی اور اس کے گوشے فصیل کے کناروں کی طرح کھڑے رہتے تھے ان کی ٹوپی عرق چین کہلاتی تھی جس کے چندوے میں چنٹ دے کر گول گتا لگا لیا جاتا ہے۔ یہ ٹوپی بھی بعض خاندانوں میں اب تک استعمال ہوتی رہی ہے۔ عوام میں دو پلڑی اور گول چندوے کی ٹوپی کا بہت رواج تھا اور اب تک بھی ہے دلی والے دو پلڑی کو سر پر منڈھ لیتے ہیں۔ لکھنؤ والے اوپر رکھتے ہیں۔ گول چندوے کی ٹوپی سادی یا سوزنی کے یا فیتے کے کام کی ہوتی ہے جس کا استعمال اب بھی عام ہے۔

لباس میں کرتے پاجامے کے اوپر انگرکھا استعمال ہوتا تھا۔ یہ پرانا ہندی لباس ہے۔ ہندی اونچا انگرکھا جو پیٹ سے ذرا نیچے تک آئے پہنتے تھے۔ بعد کے لوگوں نے اسے نیچا کر کے ٹخنے یا آدھی پنڈلی تک پہنچا دیا۔ قلعے والے اس پر خفتان پہنتے تھے جو جامے دار یا مخمل کی ہوتی تھی۔ زیادہ سردی میں حاشیے پر سمور۔ ویسے پتلی لیس لگا لیتے تھے۔ سینے کے قریب گھنڈی تکمے ہوتے تھے جس کو عاشق معشوق یا چشمے بھی کہتے تھے۔ عام لوگ اسے نیم آستین کہتے ہیں اور گاؤں والے کمری کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی آستینیں کہنی سے اونچی ہوتی تھیں تاکہ وضو میں سہولیت رہے اور اس کی لمبائی کمر تک ہوتی تھی۔ اس لئے اس کا نام کمری پڑ گیا

بعض لوگ سینہ کھلا رکھتے تھے اور اُسے شیروانی کہا جاتا تھا چپکن یا اچکن کا رواج بعد میں ہوا۔ عمر رسیدہ اور کمزور لوگ زیادہ سردی میں انگرکھے کے اوپر چوکور شالی رومال کو سموسہ کر کے سر پر اور پیٹھ پر ڈال لیتے تھے۔ اِس رومال کا نام بھی عرق چیں تھا اسی طرح کمر میں بتی کر کے رومال لپیٹنے کا بھی رواج تھا۔ پاجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا تھا۔ جیسے گلبدن۔ غلطہ۔ مشروع۔ موٹرا۔ اطلس یا گورنٹ پرانی وضع کے لوگ عام طور پر ایک برا یعنی ڈھیلا پاجامہ پہنتے تھے۔ شوقین لوگوں نے تنگ موری کا پاجامہ پہننا شروع کر دیا مگر ثقہ لوگ اِسے پسند نہ کرتے تھے۔ چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں جو مرہٹوں کا لباس ہے پہنتے تھے۔ نیچی نیچی بانات کی چپکن یا اچکنیں پہنتے تھے کمر میں سُرخ شالی رومال لپیٹتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل ہوتے تھے۔ پاؤں میں شرفا زیادہ گھیتلی جوتی استعمال کرتے تھے جو آج کل کے سلیپر کی طرح ہوتی تھی۔ مگر اِس کی چونچ نہیں ہوتی تھی۔ وہ ذرا اُوپر کو مُڑی ہوئی ہوتی تھی گزشتہ بیس سال تک گھیتلی جوتی دلہنوں کے لئے استعمال کی جاتی تھی سلیم شاہی جوتی یعنی پتلی چونچ والی جوتی کا فیشن شروع ہو گیا تھا۔ مگر کم استعمال ہوتی تھی۔ ہاتھ میں بانس کی لکڑی رکھنے کا بہت فیشن تھا۔ اور کندھے پر گز بھر لٹھے کا چوکور رومال پڑا ہوتا تھا۔ اِن بانس کی لکڑیوں کی خصوصیت یہ تھی کہ لمبی پور کا ٹھوس پتلا مگر بھاری بانس لیا جاتا تھا اسے تیل پلا کر مہندی لگا کر دھوئیں میں لٹکا دیتے تھے تاکہ رنگ سیاہی مائل ہو جائے ہر گانٹھ پر تار باندھتے تھے۔ اگر بانس کھوکھلا ہو تو اُسے سیسہ پلاتے تھے۔ یہ سب محنت اس لئے کی جاتی تھی کہ جس طرح آج کل لوگ ٹینس کرکٹ کھیلتے ہیں اور اُن کے بلّے احتیاط سے رکھتے ہیں اسی طرح اُس زمانے میں بانک۔ بنوٹ وغیرہ لکڑی کے کرتب کا فیشن تھا اور اسے ورزش اور اپنی حفاظت کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔

روضۃ الکبریٰ کے باشندوں کی طرح دلّی والے بھی سیر تماشے اور میلے ٹھیلے کے بہت شوقین تھے۔ زندگی کی ضروریات بہ آسانی مہیا ہو جاتی تھیں۔ ہر چیز سستی تھی حتیٰ کہ گرانی اور قحط کے زمانہ میں جو اشیاءِ خوردنی کا بھاؤ تھا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج کل سستے سمے میں نہیں ہے۔ چنانچہ گرانی کی شکایت کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں "غلہ گراں۔ موت ارزاں ہے ماش کی دال آٹھ سیر۔ باجرہ بارہ سیر۔ گیہوں تیرہ سیر۔ چنے سولہ سیر۔ گھی ڈیڑھ سیر" اس وقت ہر چیز اُس سے زیادہ گراں ہے اور ہم گرانی کو محسوس نہیں کرتے۔ کیونکہ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ اِس زمانے میں ہر چیز سستی ہونے کی وجہ سے اور دولت کی افراط کے باعث سوائے دل بہلانے کے لوگوں کو اور کوئی کام نہ تھا۔ چنانچہ مہینے میں تیس دن اور تیس میلے ہوتے تھے پھول والوں کی سیر۔ تیراکی کا میلہ۔ درگاہوں پر عرس۔ مدار کی چھڑیوں کا میلہ۔ قدم شریف کا میلہ۔ بسنت وغیرہ وغیرہ۔ ان گنت میلے تھے۔ جو موسم کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اس کے علاوہ قلعہ۔ چاندنی چوک۔ جامع مسجد اور جمنا کے پُل پر ہر روز اس قدر مجمع رہتا تھا۔ کہ میلہ ہی لگا رہتا تھا۔ غرضکہ جس خوشحالی اور فارغ البالی سے بہادر شاہ کی بادشاہت میں لوگ رہتے تھے آج کل کے لوگ اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے کیونکہ اس فارغ البالی کے نشان تک مٹ گئے۔ موجودہ نسل غلامی اور مفلسی میں پیدا ہوئی۔ اُسے کیا معلوم کہ آزادی۔ خود مختاری اور خوشحالی کسے کہتے ہیں۔

غالب بادشاہ کے مصاحب تھے۔ قلعہ میں اُن کی آمد و رفت تھی۔ قلعہ کی حالت اب ایسی تو تھی نہیں جیسی شاہجہاں

زمانہ میں تھی۔ نہ تخت طاؤس تھا نہ ہیرے جواہرات کی وہ جگمگاہٹ تخت طاؤس نادر کی نذر ہوا تو دیوانِ خاص کے جواہرات اور دیوانِ عام کی چھت کا سونا غلام قادر روہیلے اور اسی قسم کے لیٹروں نے لوٹ لیا۔ بادشاہ کمپنی بہادر کا پنشن خوار تھا۔ اخراجات شاہانہ تھے پنشن سے گزارہ نہ ہوتا تھا اس لئے قلعہ کی عمارات کی مرمت تک نہ ہوسکتی تھی سڑکوں کی درستی کا تو کیا ذکر ہے۔ اس لئے بارش میں جابجا کیچڑ ہوجاتی تھی شہر کے مقابلہ میں قلعے کی حالت اچھی نہ تھی مگر بادشاہ اور رعایا کے تعلقات بہت اچھے تھے جس کا اندازہ منشی کریم الدین صاحب کے بیان سے ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک مشاعرہ کرانا چاہا تو گو منشی جی ایک مطبع کے مالک اور متوسط الحال طبقے سے تعلق رکھتے تھے تاہم ان کی رسائی اس سلسلہ میں حکیم احسن اللہ خاں صاحب کے توسط سے قلعہ تک ہوگئی اور خلاف توقع بارگاہ جہاں پناہی میں پیشی بھی ہوگئی۔ اب اس پیشی کا حال منشی کریم الدین کی زبانی سنیئے جس سے کچھ بادشاہ کی سادہ طرز معاشرت کا حال معلوم ہوگا اور کچھ یہ معلوم ہوگا کہ بادشاہ کس بے تکلفی سے ایک معمولی درجے کے غیر معروف شخص سے بات چیت کر لیتے تھے۔ منشی کریم الدین لکھتے ہیں "چوبدار نے دیوانِ خاص کی سیڑھیوں کے پاس لیجا کر کھڑا کر دیا۔ حضرت جہاں پناہ اُس وقت حمام میں رونق افروز تھے ...... یہ حمام کیا ہے ایک عالیشان عمارت ہے۔ جمنا کے رُخ پر جو حمام کا حصّہ ہے وہ سرد ہے۔ ریتی کے رُخ خس کے پردے ڈالکر خسخانہ بنالیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی حوض ہیں۔ ان میں فوّارے چلتے ہیں۔ حمام کیا ہے ایک بہشت کا ٹکڑا ہے" چوبدار نے جب اندر داخل ہونے کے لئے کہا اس کے بعد کا حال سنیئے۔ "چوبدار نے آواز دی" ادب سے، نگاہ روبرو۔ حضرت جہاں پناہ سلامت۔ آداب بجا لاؤ" میں دُہرا ہو کر سات تسلیمات بجا لایا اور نذر گزرانی۔ نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا۔ حضرت پیر و مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے پائنتی مرزا فخرو بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے جس نے ظل اللہ کو نہیں دیکھا۔ میانہ قد، بہت نحیف جسم۔ کسی قدر لمبا چہرہ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت اُبھری ہوئی۔ لمبی گردن۔ جو کہ ذرا اونچا۔ پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ۔ گہری سانولی رنگت سر منڈا ہوا چھدری ڈاڑھی۔ ٹھوڑی کلوں پر بال۔ لبیں کتری ہوئی۔ ستر برس سے اونچی عمر تھی۔ ..... سبز کمخواب کا ایک برکا پاجامہ اور سفید ڈھاکے کی ململ کا کرتہ زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی خفتان اور کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی ...... بادشاہ سلامت نے فرمایا" میاں تمہارا ہی نام کریم الدین ہے۔ میاں ابھی تمہارا ہی ذکر مرزا فخرو کر رہے تھے ..... تم مشاعرہ کر تو رہے ہو مگر ہاتھیوں کی ٹکر کون سنبھالے گا ...... میں اور مرزا شبّو تو آ نہیں سکتے۔ ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیج دوں گا۔ اور انشاء اللہ اپنی غزل بھی بھیجوں گا ...... میں نے عرض کی " پیر و مرشد تاریخ" فرمایا " ۱۴ رجب مقرر کردو۔ دن بھی اچھا ہے۔ چاندنی رات بھی ہوگی اتنے دنوں میں بہت کچھ انتظام ہوسکتا ہے۔ نو دن باقی ہیں۔ موسم بھی ٹھنڈا ہو جائیگا۔ اچھا اب خدا حافظ" اس طرح دلّی کا آخری بادشاہ اپنی رعایا کے ساتھ گھُل مل کر رہتا ہے۔ حفظ مراتب کریم الدین کی طرف سے تھا مگر بہادر شاہ بالکل اسی طرح باتیں کر رہے تھے جس طرح کوئی اپنے برابر والے سے کرتا ہے۔ کسی ملک کے تہذیب و تمدن کا اندازہ اس ملک کے امراء کی زندگی سے کیا جاتا ہے جن میں بادشاہ سب سے بڑا ہوتا ہے اب ذرا دلّی کے آخری بادشاہ

کے کھانے کا جسے خاصہ کہتے تھے حال سُنئے۔" کہاریاں، کشمیرنیں، ہنڈکلیا۔ چھوٹے خاصے بڑے خاصے کے خوان سر پر لئے ایک قطار میں چلی آرہی ہیں۔ خاصے والیوں نے پہلے ایک سات گز لمبا۔ تین گز چکلا چمڑا بچھایا۔ اور سفید دسترخوان بچھایا۔ بیچوں بیچ میں دو گز لمبی ڈیڑھ گز چکلی چوکی لگا اس پر بھی پہلے چمڑا پھر دسترخوان بچھا خاص خوراک کے خوان مہر لگے ہوئے چوکی پر لگا خاصے کی داروغہ سامنے ہو بیٹھی۔ اس چوکی پر بادشاہ خاصہ کھائیں گے۔ باقی دسترخوان پر بیگماتیں شاہزادے شاہزادیاں کھانا کھائیں گے۔" کھانے میں فقط روٹیوں کے نام سن لیجئے "چپاتیاں۔ پھلکے۔ پراٹھے۔ روغنی روٹی۔ بری روٹی۔ بیسنی روٹی خمیری روٹی۔ نان۔ شیرمال۔ گاؤدیدہ۔ گاؤزبان۔ کلچہ۔ باقرخانی۔ غوصی روٹی۔ بادام کی اور پستے کی روٹی۔ چاول کی روٹی۔ گاجر کی روٹی۔ مصری کی روٹی۔ نان پنبہ یعنی بنولوں کی روٹی۔ نان گلزار۔ نان تماش۔ نان تنکی۔ نان خطائی بادام کی پستے اور چھوارے کی۔"

پلاؤں کے نام بھی سنئے۔ یخنی پلاؤ۔ موتی پلاؤ۔ نورمحلی پلاؤ۔ نکتی پلاؤ۔ کشمشی پلاؤ۔ فالسائی پلاؤ۔ آبی پلاؤ۔ سنہری پلاؤ۔ روپہلی پلاؤ۔ بیضہ پلاؤ۔ اناناس پلاؤ۔ کوفتہ پلاؤ۔ بریانی۔ سارے بکرے کا پلاؤ۔ بونٹ پلاؤ۔ نرگسی پلاؤ۔ زمردی پلاؤ۔ لال پلاؤ۔ مزعفر پلاؤ۔"

سب کھانے قرینے سے چنے گئے۔ بیچ میں سفلدان رکھدیئے اور نعمت خانہ کھڑا کر دیا گیا کہ مکھیاں دسترخوان پر نہ آئیں۔ مشک زعفران کیوڑے کی خوشبو کی لپٹیں آرہی ہیں۔ چاندی کے ورقوں سے دسترخوان جگمگا رہا ہے چلمچی آفتابہ بیسن دانی چنبیلی کی کھلی۔ صندل کی ٹکیوں کی ڈبیاں ایک طرف زیرانداز پر لگی۔ رومال زانوپوش۔ دست پوش۔ بینی پاک لئے رومال والیاں کھڑی ہیں۔ بادشاہ اپنی تپک پر چوکی کے سامنے آن بیٹھے۔ دائیں طرف ملکۂ دوراں اور بیگماتیں۔ بائیں طرف شہزادے شہزادیاں بیٹھیں۔ رومال خانے والیوں نے زانوپوش گھٹنوں پر ڈالے۔ دست پاک آگے رکھدیئے۔ بادشاہ نے خاصہ شروع کیا۔ جس کو بادشاہ اپنے ہاتھ سے اُلش مرحمت فرماتے ہیں وہ سرفقد کھڑے ہو کر آداب بجا لاتا ہے بیسن کھلی اور صندل کی ٹکیوں سے ہاتھ دھوئے۔ ٹھنڈا نوش کیا۔ گھنٹہ بھر بعد آب حیات مانگا۔ آبدار خانے کی داروغہ نے گنگا کا پانی جو صراحیوں میں بھرا برف میں لگا ہوا ہے جھٹ توڑ کی صراحی نکالی مہر لگی گیلی صافی لپیٹ خوجے کے حوالے کیا۔ اس نے بادشاہ کے سامنے مہر توڑ چاندی کے ظروف میں نکال بادشاہ کو پلایا۔ پیتے وقت حاضرین ادب سے کھڑے ہو گئے۔ جب پی چکے تو سب نے مزید حیات کہا۔ مجرا کیا اور رخصت ہوئے۔

مندرجہ بالا اقتباس سے بادشاہ کی خانگی زندگی کے ایک حصے کی ذرا سی جھلک نظر آتی ہے جس سے اس زمانہ کی تمدنی حالت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ کیسے کیسے انواع و اقسام کے کھانے تیار ہوتے تھے۔ دسترخوان پر کس طرح ہر قسم کی صفائی کا انتظام تھا اور کیا ادب و آداب تھے۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ بادشاہ کی نقل امیر امراء کرتے ہیں اور ان کی نقل حسب حیثیت نیچے کے طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔ چنانچہ کچھ کمی کے ساتھ مگر اسی قسم کے کھانے امراء کے دسترخوان پر بھی ہوتے ہوں گے اور غالب نے جن کا تعلق سرکار لوہارو سے تھا اور جو شاہی مصاحب بھی تھے اس تمدن و معاشرت کو اپنی آنکھ سے دیکھا۔ اور اس کے غارت ہونے پر وہ جب تک جیئے مرثیہ خوانی کرتے رہے۔

"ادیب"

مطبوعات

اُردو انسائیکلوپیڈیا۔ مرتبہ ادارہ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن۔ اس کا ایک ابتدائی نمونہ ہمارے پاس اظہارِ رائے کے لئے موصول ہوا ہے جس میں صرف الف کے چند مختلف الفاظ مثلاً آزاد، آتش فشاں، الفل مینار، ایشیا، اضافیت، امرؤالقیس، اُپنشد وغیرہ درج ہیں۔

"تعارف" میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ انسائیکلوپیڈیا پانچ پانچ سو صفحات کی بارہ جلدوں میں مکمل ہوگی اور پہلی جلد اسی سال تیار ہو جائیگی نمونے کے مضامین کی فہرست میں مضمون نگاروں کے نام بھی درج ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے پروفیسر اس کام خاص طور پر دلچسپی لے رہے ہیں اور یہ امر بہت تسلی بخش ہے

ایک عرصے سے اُردو انسائیکلوپیڈیا کے مرتب ہونے کی جابجا تجویزیں ہوتی رہی ہیں ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ہم ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی اس کوشش کو اُردو ادب کے لئے غایت درجہ مفید سمجھتے ہیں اور اُس کے کارکنوں کو اس ابتدائی نمونے پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ کام جلد سرانجام پائے گا اور اُردو ادب کی یہ کمی جلد پوری ہو جائے گی۔

یہ "باتصویر گنجینہ" علاوہ مفید ہونے کے دلچسپ اور دیدہ زیب بھی ہے۔

بعض انگریزی الفاظ کو صرف انگریزی حروف میں لکھا گیا ہے بہتر ہو کہ ان کے ساتھ ساتھ اُردو حروف میں بھی یہ الفاظ درج کر دیئے جائیں قیمت کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

ہمارے مربی۔ از پروفیسر پرتیم سنگھ صاحب ایم اے۔ حجم ۱۳۶ صفحات قیمت ۱۲ار۔ پتہ:۔ پروفیسر پریتم سنگھ ۲۹ ٹمپل روڈ لاہور۔ یہ کتاب پروفیسر صاحب کی تصنیف مذاہبِ عالم کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اِس میں مشہور پیغمبروں اور مذہبی رہنماؤں کی زندگی اور ان کی تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور وحدتِ ادیان کے اصول کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اُمید ہے کہ اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

مؤرخ کے افسانے۔ جناب سید محمود مؤرخ صاحب اُردو کے ایک مشّاق ادیب ہیں حال ہی میں انہوں نے افسانوں کی طرف توجہ کی ہے۔ اس سے قبل ایک مجموعہ شہرِ خموشاں کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے اب دوسرا مجموعہ "مؤرخ کے افسانے" شائع ہوا ہے ہمیں امید ہے کہ اس مجموعے کی کماحقہٗ قدر ہوئی۔ حجم ۱۳۰ صفحات۔ قیمت عہ۔ پتہ:۔ گلفروش پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

ہندو مسلم اتحاد۔ مصنفہ سیتہ بھگت۔ حجم ۳۲ صفحے۔ قیمت ۲ر پتہ۔ سیتہ آشرم وردھا (سی پی)

ادیب۔ یہ نیا رسالہ سید محمد ارتضیٰ صاحب واحدی اور فصیح الدین صاحب ایم اے کی ادارت میں دہلی سے جاری ہوا ہے مضامین نظم و نثر کا معیار عام رسائل سے خاصا بلند ہے ظاہری دلکشی کے اعتبار سے بھی قابل قدر ہے۔ بڑی تقطیع حجم ۶۲ صفحات تصویریں بھی دیجاتی ہیں۔ چندہ سالانہ چھ روپے۔ دفتر ادیب دہلی

"ہندوستانی ادب" یہ رسالہ غلام محمد خاں صاحب ایم اے عثمانیہ نے حیدرآباد سے جاری کیا ہے۔ افسانے نظمیں اور تنقیدی و علمی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ معیار قابل تعریف ہے حجم ۴۶ صفحات چندہ سالانہ للعہ۔ پتہ دفتر "ہندوستانی ادب" حیدرآباد۔ دکن۔

آگ سے مت کھیلو!

"امرت دھارا فارمیسی" کے ٹانک استعمال کرو!

بغیر سوچے سمجھے طاقت کی ادویات کھاتے رہنا آگ سے کھیلنا ہے مندرجہ ذیل قابل اعتبار ٹانکوں میں سے کسی ایک کا استعمال کریں تفصیل کیلئے رسالہ "امراض مخصوصہ مرداں" مفت منگوا کر پڑھیں!

کرن جوانی

سارے اعضاء کی مضبوطی۔ عورت مرد دونوں کی صحت کی ترقی جوانی کی حفاظت کرنیوالی اور ہر قسم کی کمزوری کو دور کرنیوالی ہر خاص و عام کے موافق آنیوالی عظیم دوائی ہے۔

قیمت } ۱۰۰ گولی چار روپے ۲۴ گولی ایک روپیہ
درجہ اول ۱۰۰ گولی بارہ روپے ۲۴ گولی تین

اکسیر ۱۶

پیشاب میں کسی قسم کی شکایت ہو امراض مثانہ میں نہائت مفید خفیف بخار کے لئے نہائت مفید۔ دل کے لئے ٹانک۔ سوزاک کے باقی اثر کو بھی دور کرتی ہے۔

قیمت } ۲۰۰ گولی چار روپے
۸ گولی ایک روپیہ

اکسیر ۴۷

یہ دوائی گرمی مزاج۔ سوزاک پیشاب کی جلن گرمی مثانہ۔ جریان و احتلام اور سرعت وغیرہ کے لئے مفید ہے اور دماغ کو تر و تازہ کرتی ہے۔

قیمت فی تولہ آٹھ آنے

اس موسم میں قابل استعمال ٹانک

رت مکرد هوج بی ۵

دوبارہ شباب لانے کیلئے بہترین اکسیر امیروں کیلئے ہر طرح سے ٹانک اور باقی کرتن اسکو کھانیوالے کی عمر لمبی ہو جاتی ہے

قیمت } ۳ گولی ایک روپیہ
ہیرے والی ایک گولی ایک روپیہ

دیو حلوہ

کمزور اور بیماری سے اٹھے ہوئے مرد و عورت کیلئے خوراک کے طور پر اکسیر۔ توانائی کو بحال۔ گوشت پوست دہڑی کو مضبوط کرتی ہے حاملہ استعمال کرے تو بچہ طاقتور ہوتا ہے

قیمت فی پاؤ ایک روپیہ چار آنہ

اکسیر ۳۹

جسم میں طاقت قوت پیدا کرنے کے لئے دماغی کام کرنے والوں کو محنت سے تھکاوٹ نہ ہو اس کیلئے اور جسم کی مضبوطی کے لئے حیرت انگیز خوراک ہے

قیمت } فی پاؤ دو روپے
نمونہ آٹھ آنے

امرت دھارا فارمیسی لاہور

افسانہائے عشق

مثالی محبت کے سات نہایت دلکش افسانوں کا مجموعہ

یہ دنیا کے سات بہترین مشرقی و مغربی افسانوں کے تراجم ہیں جنہیں مترجم کے سحر نگار قلم نے اُردو کے قالب میں ڈھال کر ایک نئی زندگی بخش دی ہے۔ ہندوستان بھر کے نقادوں اور صحافت و جرائد نے اس کتاب پر ہنگامہ خیز تبصرے لکھے ہیں۔ اور افسانوں اور انکے اندازِ بیان کو عدیم النظیر قرار دیا ہے۔

چند آراء ملاحظہ ہوں

الفاظ میں وہ لوچ اور ترنم ہے۔ کہ جابجا انگریزی بھی اُردو کا منہ تکتی رہ جاتی ہے۔ (ساقی دہلی)

بعض مقامات پر روح بے اختیار اہتزاز کرنے لگتی ہے۔ بیشتر افسانے دنیا کے بہترین افسانوں میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔

"زمیندار" لاہور

ترجمے میں جو کامیابی حامد علی خاں کو حاصل ہوئی ہے وہ بمشکل کسی دوسری جگہ نظر آسکتی ہے (نگار بھوپال)

نفیس مصور سرورق اعلیٰ کاغذ و طباعت حجم ۲۸۲ صفحات

قیمت رعائتی عمر مجلد ۵عہ مع محصول

ملنے کا پتہ۔ مینیجر "ہمایوں" ۳ لارنس روڈ لاہور

ہندی اسلامی سیاسیات

سے باخبر رہنے کے لئے "نوائے وقت" لاہور کا مطالعہ کیجئے۔ اپنی آزاد پالیسی اور سنجیدہ و متین تنقید کی وجہ سے اس اخبار کو شمالی ہندوستان کی اُردو صحافت میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس اخبار کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر پرچہ میں علامہ اقبالؒ کے پیغام و کلام کی تشریح پر ایک بلند پایہ مضمون ضرور شائع ہوتا ہے۔ مسٹر محمد علی جناح۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولوی عبدالحق اور سر عبدالقادر نے "نوائے وقت" کو وقت کی ایک اہم ضرورت بتلاتے ہوئے اس کی کامیابی کی دعا کی ہے۔ خواجہ غلام السیدین۔ میاں بشیر احمد۔ پروفیسر حمید احمد خاں۔ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ مسٹر ایس۔ اے۔ رحمٰن (آئی۔ سی۔ ایس) شیخ انوار الحق (آئی۔ سی۔ ایس) مسٹر ہادی حسین (آئی۔ سی۔ ایس) سابق مدیر ہزار داستان۔ پروفیسر یوسف سلیم۔ ڈاکٹر محمد باقر۔ مسٹر محمد شفیع اس اخبار کے قلمی معاونوں میں شامل ہیں۔

اخبار "نوائے وقت" محکمہ ہائے تعلیم پنجاب و سندھ کا منظور کردہ ہے۔ چندہ سالانہ دو روپے۔

نمونہ کے لئے پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں مفت نہیں بھیجا جائے گا۔

ملنے کا پتہ

مینیجر اخبار "نوائے وقت" لاہور

سائنس

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

مئی ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

جون ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

یہ رسالہ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے جس میں مختلف مضامین کے علاوہ ہر ماہ دلچسپ معلومات سائنس سے متعلق سوال و جواب سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ ترین خبریں اور نئی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ رسالہ میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ علم کے شائقین اور اُردو زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائیں گے۔

اشتہارات کے نرخ طلب کئے جاسکتے ہیں۔

چندہ سالانہ:- پانچ روپے سکۂ انگریزی ——— نمونہ کا پرچہ - آٹھ آنہ

المشتہر: **معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن**

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۔۔۔ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلت مآب جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ اگست ۱۹۴۱ء

جلد (۴۰)

نمبر (۲)

تصویر:۔ ننھا درزی

تصویر:۔ اِس مہینے کی تصویر کے لئے ہم جناب مسعود حسین خاں صاحب کے شکرگزار ہیں۔

تصحیح۔ جولائی کے "ہمایوں" میں صفحہ ۴۷۰ کے بعد صفحات کے نمبر غلط درج ہوگئے تھے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔ گزشتہ پرچے کے آخری صفحہ کا نمبر ۴۸۹ ہونا چاہئے تھا۔

جہاں نما

ایک امریکائی اخبار نویس کا جواب

امریکہ کے صحیفے "کیتھالک ورلڈ" نے ایک نامہ نگار کا خط شائع کیا ہے جس میں نامہ نگار مذکور نے موجودہ جنگِ عظیم سے پیدا ہونے والے بہت سے اہم مسائل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس سلسلے میں متعدد سوالات بھی کئے ہیں۔ ہندوستان کے متعلق وہ لکھتا ہے:-

"میں آخر میں ہندوستان اور بقول آپ کے اُس کے "اڑتیس کروڑ غلاموں" کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ نے "غلاموں" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس پر قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان میں واقعی اب تک ایسی منڈیاں موجود ہیں جیسی کبھی ہمارے ہاں چارلسٹن وغیرہ مقامات میں غلاموں کی خرید و فروخت کے لئے ہوا کرتی تھیں۔ میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ عہدِ گذشتہ میں انگلستان نے ہندوستان میں نہایت عظیم اور احمقانہ غلطیاں کی ہیں لیکن موجودہ واقعات کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے ہمیں عہدِ حاضر ہی کے ہندوستان پر نظر ڈالنی چاہئے۔ گزشتہ موسم گرما میں گاندھی کے زیرِ قیادت ہندوستانی کانگریس نے موجودہ جنگ میں حصہ لینے کے معاوضے میں مکمل آزادی یا کم از کم درجۂ مستعمرات حاصل کرنے کے لئے برطانیہ سے اتحاد کی پینگیں بڑھائیں لیکن اِن سلسلہ جنبانیوں کے دوران میں گاندھی صاحب دفعتاً امن پسند بن کر کامل عدمِ تشدد کی حکمتِ عملی کے پابند بن گئے اور گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس طرزِ عمل پر انگریز ہی نہیں خود گاندھی جی کے چیلے بھی حیران رہ گئے اور بہت سے لوگ اب تک حیران ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا نتیجۃً جو تعطّل پیدا ہو گیا ہے اس کے ذمہ دار انگریز ہیں؟"

"کیتھالک ورلڈ" کے ایڈیٹر نے اس پر جو رائے زنی کی ہے اس کے اہم حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ نامہ نگار کے فقرے واوین میں دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ایڈیٹر کا جوابی تبصرہ ہے:-

"آپ (ایڈیٹر) کا خیال ہے کہ انگلستان کا بڑا مقصد اپنی دُور دُور تک پھیلی ہوئی سلطنت کا تحفظ ہے"

ہاں بڑا مقصد لیکن تنہا مقصد نہیں۔

"تسمانیہ پر مسلسل قبضے کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک اتّفاقی ضرورت کا معاملہ ہے"

فرض کیجئے ہم تسمانیہ نہیں کہتے بلکہ ہندوستان، آسٹریلیا، کینیڈا یا سنگاپور یا یوگنڈا یا جنوبی افریقہ کہتے ہیں۔

"انگلستان کو اس تصوّر سے بھی گھن آتی ہے کہ اس کی سلطنت کے کسی حصے کا ایک انچ بھی نازیوں کے غیر ذمہ دار ہاتھوں میں چلا جائے"

ہاں بے شک لیکن ہاتھ خواہ نازیوں کے ہوں یا کسی اَور کے —— ذمہ دار ہوں یا غیر ذمہ دار، بات یکساں ہے۔

«ہندوستان کے سلطنت سے علیحدہ ہوجانے کا مسئلہ چھڑنے پر بہت کم لوگ آپے سے باہر ہوتے ہیں یا اپنی متانت کھو بیٹھتے ہیں۔"

متانت؛ نہیں صرف متانت ہی نہیں، اس پر لوگ جانیں کھوچکے ہیں اور ابھی کھوئیں گے۔

«انگلستان کا ہر مرد اور عورت صرف ایک فکر میں مبتلا ہے۔ فکر کس بات کی ہے۔ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کے امکان کی یا انگلستان پر حملے کی؟"

نہ تنہا پہلی بات کی نہ دوسری کی بلکہ دونوں کی۔ اگر انگلستان کو حملے سے محفوظ رکھنے کا معاہدہ اس شرط پر کیا جائے کہ اُس کی سلطنت تقسیم کردی جائے گی یا اس کی سلطنت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی الگ کرلیا جائے گا تو انگلستان ضرور جنگ کرے گا۔ انگریزوں کو محض انگلستان کی نہیں بلکہ اپنی سلطنت کی بقا بھی مدِّنظر ہے

«انگلستان آزادیٔ تقریر آزادیٔ تحریر اور آزادیٔ ضمیر کے لئے لڑ رہا ہے"

ہاں اور بہت سی اَور چیزوں کے لئے بھی جن میں بقول سٹریلک کے دنیا بھر پر معاشی تجارتی اور سیاسی تفوّق قائم رکھنا بھی شامل ہے۔ اگر یہ آزادیاں" اِس تفوّق کی راہ میں حائل ہوں تو انگلستان اِن آزادیوں کو دُور سے سلام کرے گا۔

«اگر ہم انگریز ناکام رہے تو یورپ سے عیسوی تہذیب کا نام و نشان مٹ جائے گا"

جب وحشی قبائل نے رومنوں کو شکست دی تھی اُس وقت بھی یہی کہا جاتا تھا مگر وُہ وحشی آخر کیتھولک ہو گئے "تم کیوں ڈرتے ہو؟ اے کمزور ایمان والو!"

«انگلستان سلطنت کے بغیر انگلستان نہیں رہے گا"

ہاں وہ انگلستان نہیں رہے گا جسے آج کل دنیا اِس نام سے موسوم کرتی ہے۔ انگلستان اور سلطنت ہم معنی الفاظ ہیں۔

«سلطنت حاصل کرنے سے پہلے انگلستان کیا تھا؟"

ایک بیچارہ چھوٹا سا جزیرہ۔ آج کل اُس کی حالت یہ نہیں۔ ونسٹن چرچل نے ہمیں یاد دلایا ہے کہ "انگلستان کے ہر پانچ آدمیوں میں سے چار کی کفیل سلطنت ہے"۔ انگلستان سلطنت کے جسم پر ایک جونک کی طرح پل رہا ہے۔

«گزشتہ موسم گرما میں ہندوستان کی کانگریس شرکتِ جنگ کے معاوضے میں کامل آزادی یا مستعمراتی درجہ حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کی طرف دستِ تعاون بڑھا رہی تھی؟"

تو مطلب یہ ہے کہ پینتیس چالیس کروڑ باشندوں کا جائز مطالبہ اگر منظور کیا جاتا تو اپنا خون بہانے کے انعام کے طور پر، نہ اس لئے کہ یہ اُن کا جائز حق تھا۔

"گاندھی نے گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کر دیا"

کیا تعجب ہے جب چرچل صاف کہہ چکا تھا کہ "ہمارا مطلق ارادہ نہیں کہ ہز میجسٹی کے تاج کا سب سے بیش قیمت ہیرا (ہندوستان) اپنے قبضہ سے نکلنے دیں" اور لارڈ برکن ہیڈ بھی کہہ چکا تھا کہ "کوئی ہوشمند آدمی اُس وقت اور تاریخ کا تخمینی تعین بھی نہیں کر سکتا جب ہندوستان کو درجۂ مستعمرات حاصل ہونے کا تصور کیا جا سکے۔

"کیا موجودہ تعطل کے ذمہ دار انگریز ہیں؟"

جی ہاں!

خوش حال ہندوستان

مسٹر ایمری اور بعض دوسرے خوش فہم انگریز ہندوستان کو بہت خوش حال سمجھتے ہیں معلوم نہیں سر ابراہیم رحمت اللہ کے سر میں کیا سمائی ہے کہ انہوں نے اس معقول خیال کی تردید شروع کر دی ہے حالانکہ اگر مفت میں خوش حالی کی سند ملتی ہو تو اُسے بہ خوشی قبول کر لینا چاہئے۔ ذیل کا بیان مسٹر ایمری سے منسوب کیا جاتا ہے:-

ہندوستان خوش حال ہے۔ مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے محاصل میں اضافہ ہو رہا ہے اس کے ساتھ ہی ہر طرف عملی طور پر مسلسل معاشرتی ترقی ہو رہی ہے۔

سر ابراہیم رحمت اللہ نے وزیر ہند کے محولہ بالا بیان کا معائنہ سنٹرل بورڈ آف ریونیو کی شائع کردہ انکم ٹیکس رپورٹ کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

اس سرکاری رپورٹ کے مطابق بھی ہمارے ملک میں ۲۰۰۰ روپے یعنی ۱۵۰ پاؤنڈ سالانہ یا اس سے زیادہ آمدنی رکھنے والوں کی "عظیم الشان" تعداد ۲۸۵۹۴۰ ہے۔ برطانی ہند کے تیس کروڑ باشندوں کے مقابلے میں یہ تعداد آبادی کے ایک فیصدی کا بھی ۱/۱۰ واں حصہ ہے

یہ تو ہے خوش حال ہندوستان، اب جس ملک کی حالت اس کے برعکس ہو وہ یقیناً بدحال ہے۔ چنانچہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں بدحال انگلستان میں جس کی آبادی ساڑھے چار کروڑ ہے، ۵۳۹ افراد ایسے تھے جن کی سالانہ آمدنی ۴۰،۰۰۰ پاؤنڈ یا اس سے زیادہ تھی۔ سر ابراہیم انگلستان کی اس بدحالی سے خوش حال ہندوستان کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

برطانوی ہند کے تیس کروڑ باشندوں میں پانچ لاکھ روپے سالانہ یا اس سے زائد آمدنی رکھنے والے افراد کی عظیم الشان تعداد ۹ ہے۔

مسٹر ایمری کے تدبر نے تو ہندوستان کی کچھ ساکھ بنا دی تھی مگر سر ابراہیم نے بے تدبیری سے خود ہی اپنے افلاس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

چو خود کردند راز خویشتن فاش　　عراقی را چرا بدنام کردند

نیند

صحت کے لئے نیند بہت ضروری ہے۔ جو لوگ بلا ضرورت زیادہ دیر تک جاگتے رہتے ہیں وہ عموماً خرابی صحت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر نیند نہ آتی ہو تو اس شکایت کو رفع کرنے کے متعدد طریقے ہیں۔ ایک طریقہ گہری دم کشی کا ہے۔ بستر پر لیٹ کر پہلے تمام اعضاء کو پھیلا دو۔ اس کے بعد تمام اعضاء اور اعصاب کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دو۔ اس عمل کو دو یا تین مرتبہ دہراؤ۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ قدرتی طریقے سے ایک درجن یا اس سے زیادہ گہری سانسیں لو۔ اگر تم کسی تکلیف یا فکر میں مبتلا نہیں تو اس کے بعد بہت جلد نیند آجائے گی۔

اس بات کا پوری طرح اطمینان کر لینا چاہئے کہ کمرے میں تازہ ہوا کی آمد و رفت کا انتظام اچھا ہے۔ اور تمہارا بستر آرام دہ ہے یعنی نہ زیادہ بھاری ہے نہ زیادہ گرم اور نہ ایسا جس میں تمہیں سردی محسوس ہو۔ اگر تمہارا جسم زیادہ گرم یا زیادہ سرد ہوگا تو بھی تمہاری نیند میں خلل واقع ہوگا۔

رات کو زیادہ وقت گزر جانے پر ثقیل غذا کھانے سے بدہضمی ہو جاتی ہے اگرچہ عصبی مزاج والوں کو شام کے وقت کوئی نہ کوئی مقوی غذا ضرور درکار ہوتی ہے۔ ضرورت سے کم کھانا بھی اتنا ہی برا ہے جتنا ضرورت سے زیادہ کھانا۔ سونے سے پہلے ہلکی سی سیر یا گرم غسل یا کوئی پینے کی گرم چیز خواب آور ہوتی ہے۔ عورتوں کے لئے رات کی نیند کے علاوہ دن کے وقت بھی تھوڑا سا آرام ضروری ہے۔ اگر ممکن ہو تو عورتوں کو دن کے وقت آدھ گھنٹے کے لئے ضرور سونا چاہئے۔

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما

مسٹر وال چند ہیرا چند جن کے زیرِ اہتمام ہندوستان میں پہلا ہوائی جہاز بنا ہے میسور میں موٹر کار بنانے کا کارخانہ بھی کھول رہے ہیں۔ سنا ہے کہ امریکا کے موٹر ساز اُن کی اس کوشش کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بمبئی میں جنرل موٹرز کے ایجنٹ مسٹر ہالسٹیڈ نے مسٹر وال چند کے منصوبے کی خبر سن کر کہا "جتنا جتھا اُتنی رونق"

ہندوستان میں موٹر کار کی تجارت پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر ہالسٹیڈ نے کہا کہ آج کل اس ملک میں سالانہ ۲۵۰۰۰ موٹروں کی کھپت ہے۔ اس فروخت میں جنرل موٹرز کا حصہ ۵۰ فی صدی سے زائد ہے۔ جنرل موٹرز والے اپنے امریکائی کارخانوں سے پرزے منگا کر اپنے بمبئی کے کارخانے میں اُن کو جوڑتے ہیں اور اس کے بعد ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اپنی موٹر کاریں بھیجتے ہیں۔ جنرل موٹرز کے بمبئی کے کارخانے میں ۷۰۰ ہندوستانی کام کرتے ہیں اور مسٹر ہالسٹیڈ نے اپنے تجربے کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ہندوستانی کارکنوں کی مناسب تربیت ہو تو وہ موٹر سازی کے فن میں بہت جلد ترقی کر سکتے ہیں۔

بڑے آدمیوں کا بچپن

"پیرپڈ" نے ایک انگریزی اخبار کے حوالے سے بعض بڑے آدمیوں کے لڑکپن کے متعلق دلچسپ معلومات درج کی ہیں۔ اُس اخبار کی رائے یہ ہے کہ کسی بڑے آدمی کے بچپن میں اُس کی آئندہ عظمت کا علم ہوجانا ضروری نہیں۔ بسا اوقات اعلیٰ درجے کی قابلیت ابتدا میں چھپی رہتی ہے، اُسی طرح جیسے کوئی نشوونما پانے والا بیج کسی پتھر کے نیچے پڑا ہو لیکن پتھر ہٹا دینے کے بعد پھوٹ کر دہ پھولنے پھلنے لگے بہت سے لوگ حوصلہ افزائی اور مناسب مواقع بہم پہنچانے سے بہت جلد ترقی کر سکتے ہیں۔

اگر کسی بچے کا ذہن جلد کام نہ کرتا ہو تو استاد کو یہ نہیں چاہئے کہ اُس بچے کو کودن قرار دے کر دوسرے بچوں کو اُس پر ہنسنے کا موقع بہم پہنچائے۔ بلکہ اُس سے بہتر سلوک کرنا چاہئے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جسے آج ہم بالکل غبی سمجھتے ہیں وہ مستقبل کا کوئی غیر معمولی قابل آدمی ہو۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جیمز واٹ (جس نے ریلوے انجن ایجاد کیا) مسٹر میک ایڈم کے مدرسے کا معمولی ترین طالب علم تھا۔ اور جی بیمانٹ جو ریڈیم کے انکشاف میں برابر کا حصہ دار تھا اتنا احمق سمجھا جاتا تھا کہ اُس کے والدین نے اُسے مدرسے سے نکال لیا۔

نپولین کی جماعت میں بیالیس لڑکے تھے جن میں نپولین کا نمبر اکتالیسواں تھا لیکن اُس نے یورپ کے نقشے کو بدل دیا اور آج وہ بے حد غیر معمولی فوجی قابلیت کا انسان سمجھا جاتا ہے۔ سر آئزک نیوٹن بھی اپنی جماعت میں صرف آخری سے پہلے نمبر پر تھا اور وہ جیومیٹری میں فیل بھی ہو گیا کیونکہ اُس نے سوالوں کو استاد کے بتائے ہوئے طریقے سے حل نہیں کیا تھا۔ لیکن ارشمیدس کے بعد اب تک نیوٹن اور گاس ہی دو سب سے بڑے ماہر ریاضیات سمجھے جاتے ہیں۔

امتحانات میں ناکام رہنا بھی کوئی خاص معنی نہیں رکھتا۔ بعض قابل طلبہ بھی امتحان میں گھبرا جاتے ہیں۔

آئین سٹائن جو اِس عہد کا سب سے بڑا ماہر ریاضیات ہے انٹرنس کے امتحان میں ریاضی میں فیل ہو گیا تھا، اور اناطول فرانس بی اے کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ ایمرسن بھی امتحان سے بہت گھبرایا کرتا تھا۔

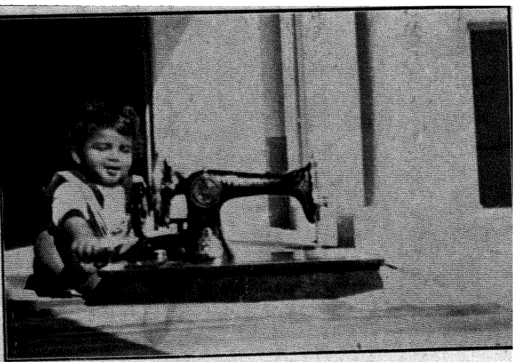
بچوں کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ "غیر معمولی بچوں" کی نوع کے دماغ بہترین نہیں قرار دیئے جا سکتے بلکہ طویل اور سخت کام کے لئے آہستہ آہستہ نشوونما پانے والے دماغ زیادہ موزوں ہیں۔

مثلاً الگزنڈر فان ہمبولٹ مدرسے میں بہت معمولی طالب علم سمجھا جاتا تھا اور جارج ایلیٹ نے تو پڑھنا بھی سخت مشکل سے سیکھا تھا۔

ایسے مشاہیر کی ہر فہرست میں جو مدرسے میں غبی سمجھے جاتے تھے ذیل کے نام ضرور شامل ہوں گے :-

ولیم شیکسپیئر، کیٹس (جو غبی ہونے کی وجہ سے سکول سے خارج کر دیا گیا) لارڈ کلائو، ٹامس کارلائل، سر لیف ہارووڈ فنانشل سکرٹری شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم (جب یہ مدرسے میں تھے تو استاد ان سے کہا کرتا تھا ہارووڈ دیکھو میں تمہیں بنجر (لارڈ) بنا رہا ہوں، اس کے بعد وہ جلی حروف میں بورڈ پر بیرن ہارووڈ (Barren Harwood) کے الفاظ لکھ دیتا اور دوسرے طلبہ Baron اور Barren کی صوتی مناسبت سے لطف اندوز ہوتے) لارڈ ریڈنگ اور مسٹر بالڈون بھی ایسے ہی غبی طلبہ تھے۔

حامد علی خاں



ننھا درزی

از: روز خیال -

بے نیاز

افراد:—

مشتاق

دوست

بُوب

دورِ حاضر

[ایک اوسط درجہ کی حیثیت کے آدمی کا کمرہ!

دائیں جانب ایک اونچا لیمپ رکھا ہے۔ اس کے نیچے گدے دار آرام کرسی اور بازو میں نئی طرز کی ایک خانہ دار میز ہے۔ میز کے اوپر بھی اور خانوں میں بھی کتابیں رکھی ہیں۔ پشت میں دیوار سے لگی ہوئی کتابوں کی نیچی سی الماری رکھی ہے۔ اس کے اوپر ایک طرف ایک خوبصورت چھوٹی ٹائم پیس اور دوسری طرف ٹانگوں پر کتاب رکھے پڑھتے ہوئے بچے کا ایک مجسمہ! دیوار پر خزاں کی ایک تصویر! بائیں جانب ایک سوفا رکھا ہے اور سامنے ایک چھوٹی گول میز۔ پشت میں بائیں جانب داخل ہونے کا دروازہ ہے۔

جس وقت پردہ اُٹھتا ہے رات کے دس بجے کا عمل ہے۔ اونچا لیمپ روشن ہے مشتاق بیٹھا کتاب کے ورق پلٹ رہا ہے۔ پڑھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بے سود۔ آخر کتاب کو میز پر ڈال دیتا ہے اور سامنے کھڑکی میں سے دور آسمان پر نکلے ہوئے تاروں کو دیکھنے لگتا ہے..... خیالات میں غرق اور ایک دنیا سے بیگانہ!]

مشتاق:۔ ستارے...... آسمان کی نیلگوں سطح پر...... جھلملاتے ہوئے سیمیں ستارے!..... (ایک ٹھنڈے سانس کے ساتھ) کیا ہر ستارہ بُوب کی سیمیں جبین نہیں ہے؟...... (سر ہلا کر "ہاں" کا اشارہ کرتا ہے اور پہلو بدل کر کرسی پر اور ذرا ڈھلک جاتا ہے)

(دوست داخل ہوتا ہے)

دوست:۔ مشتاق!

(مشتاق چونک کر گردن پھیر کے دیکھتا ہے۔ لیکن اپنے دوست کو دیکھ کر پھر اسی طرح بیٹھ جاتا ہے)

دوست:۔ میں ایک جگہ کھانے پر گیا تھا... واپس گھر جا رہا تھا۔ یہاں روشنی دیکھی تو سوچا ذرا دیر بیٹھ کر سگرٹ ہی پی لوں (سوفے پر بیٹھ جاتا ہے اور سگرٹ نکال کر سُلگاتا ہے۔ ایک کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے) کیا حال ہے؟

مشتاق:۔ حال پوچھتے ہو؟

دوست:۔ آج کیا بات ہے؟ میں نے آواز دی تو بڑی لاپروائی سے ایک نظر ڈالی... حال پوچھا تو بڑی بے نیازی سے ارشاد ہوا "حال پوچھتے ہو؟"

(تمسخر آمیز ہنسی)

مشتاق:۔ بے نیازی! تم نے لاعلمی میں کتنا موزوں لفظ استعمال کیا ہے۔۔۔۔۔۔ بے نیازی! یہی میرا حال ہے۔

دوست:۔ خیریت تو ہے؟

مشتاق:۔ تم جانتے ہو تمہارے آنے سے کیا ہو گیا؟

دوست:۔ کیا؟

مشتاق:۔ تم نے آکر مجھے میری بُوب سے جُدا کر دیا!

دوست:۔ کیوں کیا وہ یہاں آئی ہوئی تھیں؟ (گھبرا کر) نہیں بھئی میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ واللہ بھئی تم نے کہہ دیا ہوتا تو میں اندر ہی کیوں آتا۔ کیا عجیب آدمی ہو۔۔۔۔۔۔ (جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) وہ بھی مجھے کوسنے دے رہی ہوں گی کہ کہاں لوند کے مہینے کی طرح آٹپکا!

مشتاق:۔ کہاں چلے؟ بیٹھو تو!

دوست:۔ نہیں بھئی کوئی تکلف نہیں ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ لو بھئی سلام!

مشتاق:۔ (اُٹھ کر پکڑتا ہے) ارے بھئی۔ آئے ہو تو بیٹھو۔ اس طرح جانے کے کیا معنی!

دوست:۔ نہیں بھئی۔ تم بیٹھ کر اُن سے باتیں کرو۔ انہیں اکیلا بند رکھنا مناسب نہیں۔ میرا کیا ہے۔ میں صبح پھر آجاؤں گا۔ وہ تو روز روز نہیں آتیں!

مشتاق:۔ تم سمجھے ہو کہ بُوب کو میں نے اُس کمرے میں بند کر دیا ہے۔

دوست:۔ تو کیا انہیں غسل خانہ میں چھپا دیا ہے؟

مشتاق:۔ نہیں بھئی نہیں! تم بیٹھو تو۔

دوست:۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ روز تو ان کی فرقت میں تڑپتے تھے۔ اور آج جب وہ آئیں تو انہیں کہیں بند کر دیا اور وہ بھی میری خاطر۔ بھئی خاطر تو ان کی کرنی چاہئے تھی۔ میرا کیا ہے میں تو اپنا ہی آدمی ہوں۔

مشتاق:۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ تمہارے ذہن میں یہ کیسے بیٹھ گیا کہ وہ یہاں آئی ہوئی تھیں۔ اور تمہارے آنے پر میں نے انہیں کہیں بند کر دیا ہے۔

دوست:۔ ارے بھئی ابھی تمہیں نے تو کہا تھا کہ میں نے تمہیں بُوب سے جُدا کر دیا۔

مشتاق:۔ ہاں کہا تھا!

دوست:۔ تو پھر؟

مشتاق:۔ جب تم آئے تو میں اپنی بُوب کا تصور جمائے بیٹھا تھا۔ تم آئے تو سب کچھ درہم برہم ہو گیا!

دوست:۔ (قہقہہ لگا کر) لاحول ولا قوۃ! بس اتنی سی بات تھی؟

مشتاق:۔ بات اتنی سی ہی تو نہیں ہے!

دوست:۔ تو پھر کتنی ہے؟

مشتاق:۔ تم ذرا اطمینان سے بیٹھو اور ٹھیک طرح سنو تو کہوں۔

دوست:۔ تم کہو تو!

مشتاق:۔ تم جانتے ہی ہو مجھے بُوب سے کس قدر محبت ہے۔ میرا کل وجود بُوب کی محبت کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ میری رگ رگ دن رات بُوب کا نام جپا کرتی ہے میری آنکھوں میں بُوب سمائی ہوئی ہے۔ میں جدھر دیکھتا ہوں بُوب ہی بُوب نظر آتی ہے۔

دوست:۔ تو تم اس وقت بھی اسی طرح اپنا دل بہلا رہے تھے؟

مشتاق:۔ جسے تم بہلانا کہتے ہو، میرے لئے حقیقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میں بُوب سے بے نیاز ہو جاتا ہوں۔ بُوب مجھی میں ہے۔ میں اور بُوب اب الگ وجود نہیں رہے ہیں۔

دوست:۔ خوب! یہ ایک ہی رہی!

مشتاق:۔ مجھ پر محبت کی ایک لطیف رمز کا انکشاف ہوا ہے۔ ایک عجیب کیف کا ارتقا ہو رہا ہے۔

دوست:۔ اچھا؟

مشتاق:۔ بُوب سے جدائی کے باوجود میں اُس کے تصور میں ایک

سرور محسوس کرتا ہوں میرے اعصاب پر ایک مدہوشی سی طاری ہو جاتی ہے۔

دوست:۔ یہ تو ہوتا ہی ہے کوئی نیا انکشاف نہیں ہے۔

مشتاق:۔ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ وہ سرور جو مجھے تصور میں حاصل ہوتا ہے شاید یُوب سے مل کر بھی نہ محسوس ہو۔ جب میں تصور کی گہرائیوں میں ڈوب کر دور اُس نیلگوں آسمان کے جھلملاتے تاروں کو دیکھتا ہوں تو وہاں مجھے میرے جذبات کی رعنائیوں میں ملبوس میری یُوب نظر آتی ہے۔ اس کے گرد میرے شوقِ طلب کا ہالہ ہوتا ہے۔ اس کے رخسار پر میری آرزوؤں کا غازہ۔ وہاں اس کے حسن میں کچھ اَور ہی دمک ہوتی ہے۔

دوست:۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہاں کچھ نہیں ہے۔ وہاں تمہاری یُوب نہیں ہے۔ وہ تاروں میں نہیں بلکہ اپنے گھر میں رہتی ہے۔

مشتاق:۔ (بگڑ کر) ہر وہ نظر جو اس دنیا سے دُور غیر معروف چیزوں کو دیکھنے کے لئے اُٹھتی ہے دنیا پر شاق گذرتی ہے۔ دنیا محبوب کے قالب سے بلند نہیں ہو سکتی۔ قالب ہی کے جال میں پھنسی رہتی ہے۔ وہ اُس طائر کی طرح ہے جو قفس کی تیلیوں ہی میں محدود رہے۔ اُس کا حسد کسی اَور کو بھی ان تیلیوں سے دور پہنچ کر دیکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کو کسی طرح پھر اسی قفس کی فضا میں گھسیٹ لائے۔

دوست:۔ تم تو ناحق بگڑ گئے ہیں تمہیں کب مجبور کر رہا ہوں کہ تم یُوب کے قالب ہی میں محصور رہو لیکن (ستاروں کی طرف اشارہ کر کے) وہاں بھی تو کچھ نہیں رکھا۔ وہ سب تمہارے توہمات ہیں محض خیالی تصاویر!

مشتاق:۔ وہاں وہ کچھ ہے جو یہ دنیا فراہم نہیں کر سکتی۔ وہاں وہ نظر آتا ہے جو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہاں ہر چیز خوشگوار ہے مسرتیں پہلو بدل کر مصائب نہیں دکھاتیں۔ وہاں حُسن کو پائیداری ہے اَور ہر دید کے ساتھ افزائش ہوتی ہے وہاں حُسن کی نقاب میں بے وفائی نہیں ہے۔ بے رُخی نہیں ہے۔

دوست:۔ تم کیا باتیں کر رہے ہو؟ یہ تو صریحاً خود فریبی ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ حقیقت اتنی رنگین نہیں ہوتی جتنا تصور اسے بنا دیتا ہے لیکن تصور خود کوئی شکل تخلیق نہیں کر سکتا۔ وہاں کا حُسن اسی حُسن کا رہینِ منّت ہے۔ اُس کی آفرینش ہی اِس حسن کے برانگیختہ کئے ہوئے جذبات کی صناعی ہے۔ یُوب کی محبت اَور اُس کے حُسن سے تم نے یہ طلسم گھڑ لیا ہے ورنہ اِس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔

مشتاق:۔ تم کچھ ہی کہو لیکن میں ان لذائذ کو ہاتھ سے نہیں دے سکتا۔ میں ہر وقت یُوب کے ساتھ رہتا ہوں اِس کے حسن سے سرشار۔ اس تصور کی دلفریبیاں بہت لطیف ہیں۔ ان میں یہاں جیسا مدوجزر نہیں ہوتا۔ وہاں موجیں طوفان نہیں بنتیں۔ ان کی روانی میں ہلکا سا نغمہ ہوتا ہے۔

دوست:۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ باتیں تمہیں سوجھیں کیسے؟ ان میں دھرا کیا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا ان میں تمہیں لطف کیا آتا ہے؟

مشتاق:۔ ان میں سوجھ بوجھ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ تو احساس سے تعلق رکھتی ہیں ...... وہاں کا لطف مبہم ہوتا ہے یہاں ہر چیز ایک شکل رکھتی ہے، اس کے نقش نظر آتے ہیں اس لئے اِس کی جاذبیت بیان بھی کی جا سکتی ہے اَور یہی اس کی پستی کی دلیل ہے۔

دوست:۔ خبر نہیں آج تم پر یہ کیا جنون سوار ہو گیا ہے؟

مشتاق:۔ تم تو اسے جنون ہی کہو گے اس لئے نہیں کہ یہ واقعی جنون ہے بلکہ اس لئے کہ ابھی یہ تم پر سوار نہیں ہوا ہے۔

دوست:۔ خیر یہی سہی ...... عود اپنے سوز کے دھوئیں میں تخیل کا رقص بھی دیکھ سکتا ہے اَور طرح طرح کی جمالیات بھی ...... لیکن بھئی یہ حسن و رقص کے ساعت؟ اس کے درہم برہم ہونے میں دیر ہی کیا لگتی ہے؟ تم ہی بتاؤ اِس طلسم سے کیا حاصل جو ایک جستِ شوق

کی تاب نہ لاسکے۔ ایک سراب ہے جس سے پیاس نہیں بجھ سکتی ہے!

مشتاق:۔ ہر ساعت کی دریہی ہو پر ہی اصل پائیداری ہے۔ ہر آرزو کے ساتھ ایک نئی دنیا تشکیل ہوتی ہے۔ ہر طلب شوق ایک نیا مطلب پیش کرتی ہے۔ وہاں فراق کی خلش نہیں ہوتی۔ روحوں کا اتصال ہوتا ہے۔ محبت محبوب کے قالب سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔

دوست:۔ (ہنس کر) تو یہ تھی آپ کی بے نیازی! میں سیدھا سادھا آدمی ناحق بیوقوف بنا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ محبت پلٹا کھا کر بے نیازی بن گئی ہے۔

مشتاق:۔ محبت کی ابتدا کشش سے ہوتی ہے دل بے اختیار رجوع ہوتا ہے کشش کے بعد دوسری منزل طلب کی ہوتی ہے۔ مطلوب کے قرب کا شوق ہوتا ہے لیکن طلب کا ارتقا محویت بن جاتا ہے۔ طالب مطلوب میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اپنے کو بھول جاتا ہے۔ طلب کی معراج یہ ہے کہ طلب نہ رہے۔ طالب خود مطلوب بن جائے۔

دوست:۔ محبت کی انتہا بقول تمہارے یہ ہوئی کہ محبوب کی جستجو نہ رہے... بھئی ایسی محبت کو ہمارا دُور ہی سے سلام۔ (گھڑی دیکھ کر) بھئی چل کر سوئیں...... سر بھاری ہو رہا ہے ذرا زیادہ کھا لیا۔

مشتاق:۔ یہ نظام عالم ہی اسی اصول پر عمل پیرا ہے۔ ازل کی انتہا اجل ہے۔

دوست:۔ اچھا بھئی، میں تو جا رہا ہوں پھر کبھی جب تم ذرا ٹھیک ہو گے اور میرا پیٹ ذرا ہلکا تب باتیں ہوں گی..... لیکن بھئی ایک بات ہے؟

مشتاق:۔ کیا؟

دوست:۔ محبت کی آخری منزل ناکامی بھی تو فراہم کر سکتی ہے

مشتاق:۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ ناامیدی بے نیازی پر مجبور کر دیتی ہے؟

دوست:۔ جب ناامیدی کی برق گرتی ہے تو کچھ باقی نہیں رہتا۔ مطلوب کی بے رخی اور سرد مہری جب نیاز سے ناامید کر دیتی ہے۔ تو پھر بے نیازی ہی اختیار کرتے بن پڑتی ہے۔ جب سالن نہیں ہوتا تو روکھی ہی بھاتی ہے۔

مشتاق:۔ مجبوری بے نیازی کی نفی ہے۔

دوست:۔ ہو گی!..... بھئی تم جانو اور تمہارا کام۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ تم اپنے نفس کو دھوکا دے رہے ہو۔ اچھا ایک بات بتاؤ ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔

مشتاق:۔ کیا؟

دوست:۔ کیا یُوب کے پاس سے کوئی سلام پیام آیا تھا؟

مشتاق:۔ نہیں.....

دوست:۔ (قہقہہ لگا کر) بس تو عقدہ حل ہو گیا۔

مشتاق:۔ تم بڑے ظالم ہو!

دوست:۔ اور تم جو اُس غریب یُوب پر ظلم توڑ رہے ہو تو کچھ نہیں..... کم از کم اُسے تم بتا ہی دو تاکہ وہ غریب تمہارا پنڈ چھوڑے

(مشتاق خاموش ہے)

دوست:۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ اُسے کیا خبر کہ آپ بے نیاز ہو گئے۔ وہ ناحق اپنی راتیں کالی کر رہی ہو گی۔ اسے اطلاع تو کر دو۔

مشتاق:۔ تم جا سکتے ہو!

دوست:۔ بھئی تم تو ناراض ہو گئے! اچھا ایک بات تو سنو

(مشتاق خاموش ہے)

دوست:۔ ہو جاؤ تم ناراض۔ ہم کل آ کر منا لیں گے!..... اچھا بھئی ......سلام!..... بھلے آدمی سلام کا تو جواب دے!

مشتاق :- (بادلِ ناخواستہ) وعلیکم السلام۔

دوست دروازے کی طرف جاتا ہے ایک دفعہ مڑ کر دیکھتا ہے پھر چلا جاتا ہے

.... تھوڑی دیر بعد مشتاق مڑ کر دیکھتا ہے اور جا کر دروازے کا کھٹکا لگا دیتا

ہے.... آن کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے.... کچھ دیر سوچتا رہتا ہے ....)

مشتاق :- مجھے یوب کو ایک خط لکھ دینا چاہئے .... اور ساں اس کی

تصویر بھی واپس کر دوں!.....

(میز کے خانوں میں سے ایک کتاب میں سے یوب کی تصویر نکالتا ہے

اسے ایک نظر دیکھتا ہے۔ بے اختیار ہونٹ تصویر کی طرف بڑھتے ہیں لیکن

مشتاق رک جاتا ہے جلدی سے تصویر میز پر رکھ دیتا ہے اور کاغذ قلم نکال

خط لکھنے لگتا ہے........... خط لکھ کر)

مشتاق :- ہوں!..... (پڑھتا ہے)

یوب!

تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے

اور یہ محبت اب اس قدر بڑھ گئی ہے کہ تم مجھے ہر جگہ ہر وقت نظر آتی ہو۔

تم ہر دم میرے ساتھ رہتی ہو اور میں اس قرب کی ساری لطیف کیفیتوں

سے سرشار رہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ تم کہو کہ مجھے اس یوب سے کیا

واسطہ جو ہر دم تمہارے ساتھ رہتی ہے ممکن ہے کہ وہ یوب تم نہ ہو

کیونکہ اس میں تمہارا سا کھچا رہنا نہیں ہے۔ اُسے میرے جذبات

کا پاس ہے۔ اس کے حسن میں تصور کا دھندلکا تو ہے لیکن بہرحال

وہ تمہارے ہی برانگیختہ کئے ہوئے جذبات کا مجسمہ ہے اور تمہارے

ہی وجود کی ایک ارفع تشکیل!

میں تمہاری تصویر اس خط کے ساتھ واپس کر رہا ہوں۔ اس

لئے نہیں کہ مجھے اب تم سے محبت نہیں رہی ہے بلکہ اس وجہ

سے کہ یہ محبت اتنی بڑھی کہ یوب مجھ میں سما گئی۔ اب یہ تصویر

یوب کے ایک علیحدہ وجود کا احساس پیدا کر کے پھر مجھے فراق کی خلش

میں مبتلا کرنا چاہتی ہے۔

یوب! للہ تم میرے اس طلسم کو توڑنے کی کوشش نہ کرنا۔

مشتاق "

(خط پڑھ کر مشتاق چند لمحے کچھ سوچتا رہتا ہے.... پھر خط میز پر رکھ دیتا

ہے.... فوراً ہی خط اٹھا کر ایک نظر ڈالتا ہے قلم اُٹھاتا ہے لیکن پھر قلم اور

خط دونوں رکھ دیتا ہے...... کچھ سوچتا ہے...... آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھا

کر تصویر کو اُٹھاتا ہے..... آہستہ آہستہ قریب لاتا ہے... گردن جھکا

کر تصویر دیکھ رہا ہوتا ہے اور تصویر ہاتھ ہی میں ہوتی ہے کہ لیمپ کی روشنی

آہستہ آہستہ مدھم ہو کر غائب ہو جاتی ہے۔ کچھ لمحے تاریکی رہتی ہے کہ پھر

یک لخت لیمپ روشن ہو جاتا ہے.... اب تصویر میز پر رکھی ہے اور

مشتاق دریچوں آسمان پر جھلملاتے تاروں کو دیکھ رہا ہوتا ہے کہ

دروازے پر کھٹ کھٹ ہوتی ہے.... مشتاق چونکتا ہے)

مشتاق :- کون؟

(دروازہ پر پھر کھٹ کھٹ ہوتی ہے)

مشتاق :- میں پوچھتا ہوں کون ہے؟ اتنی رات گئے اب کون آگیا۔

(دروازے پر پھر کھٹ کھٹ ہوتی ہے اور

ساتھ چوڑیوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے)

مشتاق :- چوڑیوں کی آواز!.... میرا دل کہہ رہا تھا کہ یوب آئے گی!....

.... بیتاب ہو کر جلدی سے دروازہ کھولنے کو لپکتا ہے لیکن رک جاتا

ہے.... آہستہ آہستہ پھر واپس آتا ہے) کہیں یہ طلسم ٹوٹ تو نہیں جائیگا؟

(دروازے پر اس بار آہستہ سے صرف ایک

کھٹ ہوتی ہے)

مشتاق :- نہیں.... طلسم نہیں ٹوٹے گا...... میں خود یہ خط پڑھ...

کو دوں گا.... (جاکر دروازہ کھولتا ہے)... کون ہے ؟... (اِدھر اُدھر دیکھتا ہے .... مایوس ہوکر واپس آجاتا ہے) تو کیا لُوب نہیں آئی تھی...... (بہت رنجیدہ ہے لیکن رنج پر فوراً غالب آکر) چلو اچھا ہُوا !

(لُوب داخل ہوتی ہے.... چادر اُتار کر ایک کونے میں ڈال دیتی ہے ...مشتاق قدموں کی آہٹ سن کر مڑ کر دیکھتا ہے)

مشتاق:۔ (بے اختیار روح کی گہرائیوں سے مسرت بھری آواز نکلتی ہے) لُوب !

لُوب:۔ (اُسی بیتابی کے لہجے میں) ۔مشتاق !

مشتاق:۔ (فوراً بدل کر سوکھے اور کاروباری لہجے میں) تم کس لئے آئی ہو؟

لُوب:۔ (متحیر) کس لئے آئی ہوں؟...... خیر تو ہے..... آج تم کس طرح بات کر رہے ہو؟

مشتاق:۔ کوئی خاص کام ہے ؟

لُوب:۔ نہیں

مشتاق:۔ کوئی ضروری بات کہنی ہے؟

لُوب:۔ نہیں کوئی ضروری (ضروری پر زور دیتے ہوئے) بات تو نہیں کہنی۔

مشتاق:۔ تو پھر؟

لُوب:۔ پھر کیا؟

مشتاق:۔ تو پھر تم یہاں کس لئے آئی ہو؟

لُوب:۔ تم مجھ سے ناراض ہو؟

مشتاق:۔ نہیں! میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔

لُوب:۔ تم کہتے تو ہو "نہیں" لیکن تم مجھ سے ناراض ضرور ہو.... کیا اس لئے کہ میں تمہارے پاس نہ آسکی تھی؟

مشتاق:۔ نہیں !

لُوب:۔ میں مجبور تھی۔ کرتی ہی تو کیا؟ تم تو جانتے ہی ہو کہ گھر والوں کا مجھ پر کس قدر سخت پہرہ رہتا ہے۔

مشتاق:۔ تو پھر تم اس وقت کیسے آگئیں؟

لُوب:۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی سہیلی کے ہاں رات کو رہنے کی اجازت لی تھی۔ اب وہاں سے چپکے سے آئی ہوں۔

مشتاق:۔ نہ آتیں تو بہت اچھا تھا!

لُوب:۔ تم تو بہت ہی خفا ہو گئے!

مشتاق:۔ میں تم سے بالکل خفا نہیں ہوں۔ اوّل تو خفا ہونے کی وُہ بات ہی ایسی کونسی تھی اور اگر تھی بھی اب نہیں رہی۔

لُوب:۔ یا الٰہی شکر تم ناراض نہیں ہو.... (لُوب جواب تک کھڑی تھی بیٹھ جاتی ہے مشتاق کی خاموشی اور خنک جذباتی دیکھ کر) کیوں کیا آج طبیعت ناساز ہے؟

مشتاق:۔ نہیں

لُوب:۔ کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہے۔ آج تم نے مجھ سے بیٹھ جانے تک کو نہیں کہا۔ میں خود ہی بے غیرت بن کر بیٹھ گئی۔

مشتاق:۔ (پُرمعنی لہجے میں) بات؟

لُوب:۔ (مشتاق کے قریب جاکر) آج مشتاق تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کم از کم میں تمہارے اس برتاؤ کو نہیں سمجھ سکتی۔

(مشتاق خاموش ہے)

لُوب:۔ (چند لمحے خاموش رہ کر) تو کیا میں اس کے معنی یہ سمجھوں کہ اب تمہیں اپنی لُوب سے محبت نہیں رہی۔

مشتاق:۔ مجھے اپنی لُوب سے پہلے سے بھی زیادہ محبت ہے اور تمہاری محبت بھی میری لُوب کی محبت میں تبدیل ہو گئی ہے۔

یُوب :- مجھ سے جو تمہیں محبت تھی وُہ تمہاری یُوب کی محبت میں تبدیل ہو گئی ؟

مشتاق :- ہاں !

یُوب :- لیکن اس میں پھر کیا ہے۔ فرق کیا ہے میں نہیں سمجھ سکتی اگر تم کو مجھ سے محبت نہیں رہی تو صاف صاف کہو۔

مشتاق :- مجھے تم سے محبت تھی۔ لاانتہا..... لیکن تم میسر کہاں تھیں ...میرے جذبات نے میری یُوب کو میری تصور کی آنکھوں کے سامنے پیش کیا۔ اور میں نے اپنی تمام محبت اس کی طرف مبذول کر دی۔

یُوب :- لیکن وُہ بھی تو میں ہی یُوب ہوں۔

مشتاق :- نہیں یُوب ! وُہ یُوب تم سے ارفع ہے۔ وُہ اس کون و مکان کے قیوں سے آزاد ہے وُہ ہر دم میرے ساتھ رہتی ہے۔ اسے میرے جذبات کا پاس ہے اور میری محبت کا جواب محبت سے دیتی ہے۔

یُوب :- لیکن اب جب کہ میں آگئی ہوں تو اُس کی کیا حقیقت ؟

مشتاق :- میرے لئے اُس یُوب کی حقیقت تم سے زیادہ ہے۔ تم چند لمحوں کے لئے میرے پاس آتی ہو لیکن وُہ ہر دم میرے ساتھ رہتی ہے۔ اس کو میری محبت کی کل گہرائیاں معلوم ہیں۔ وُہ میرے جذبات کی پہنائیوں سے واقف ہے۔ اس کو مجھ سے پہلے میری آرزو معلوم ہو جاتی ہے۔

یُوب :- تم کیا کہہ رہے ہو..... ایک خیالی تصویر کی حقیقت مجھ سے زیادہ ہے ؟

مشتاق :- میں تم کو خیالی تصویر سمجھ سکتا ہوں کیونکہ تم ایک حسین خواب کی طرح کبھی کبھی نظر آجاتی ہو لیکن اس کی حقیقت میں میں شبہ نہیں کر سکتا

یُوب :- تم خیالی تصویروں کے عوض مجھے ٹھکرا رہے ہو ؟

مشتاق :- وُہ خیالی تصویر میرے لئے تم سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس سے مجھے سکون ملتا ہے۔

یُوب :- تم کو ("تم" پر زور دیتے ہوئے) اس سے سکون ملتا ہے نا ؟

مشتاق :- ہاں یُوب ! اور میں تمہارا بہت ممنون ہوں کہ تم نے درمیان میں واسطہ بن کر مجھے اس دائمی کیف سے دوچار کر دیا۔

یُوب :- ہوں ! تو تم میرے جذبات سے کھیلتے رہے۔ مجھے بیوقوف بنایا۔

مشتاق :- یُوب تم سمجھے.....

یُوب :- اب تم سنتے جاؤ۔ میں سمجھ گئی اور اچھی طرح سمجھ گئی...... تم خود غرض ہو تم کو صرف اپنے سکون کا خیال ہے صرف اپنے سکون کا۔ تم نے جدائی کی تلخی سے بچنے کے لئے یہ ڈھونگ بنایا ہے..... یہ بھی ایک بہانہ ہے۔

مشتاق :- تم سنو تو سہی۔

یُوب :- تم میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ صاف صاف کہہ سکو کہ میرے دل میں اب تمہاری محبت نہیں رہی اور للہ میرا پیچھا چھوڑو۔

مشتاق :- تم.......

یُوب :- کیوں یہی بات ہے نا ؟ لیکن تم سے محبت کرنے کو کس نے کہا تھا..... تمہیں مجھے اس طرح واسطہ بنانے کا حق کیا تھا ؟..... اگر محبت میں جدائی کی تلخی بھی برداشت نہ ہوتی تھی تو وُہ تمہاری محبت ہی کیا تھی..... وُہ سب جھوٹ تھا اور یہ سب ایک فریب !

(یُوب رونے لگتی ہے)

مشتاق :- (یُوب کے پاس آکر) یُوب !..... یُوب !!.....

(صوفے کے بازو پر بیٹھ کر یُوب کے شانے پکڑ کر) یُوب !!!

یُوب :- (بگڑ کر) خبردار جو تم نے مجھے ہاتھ لگایا... تمہارے چھونے سے میری روح مشتعل ہوتی ہے۔

مشتاق :- اچھا تم میری بات تو سُنو !

یُوب :- میں اب تمہاری ایک بات بھی سُننا نہیں چاہتی !

مشتاق :- بُوب! تم چپ تو ہو جاؤ۔

بُوب :- تم نہیں جانتے مجھ پر کیا گذر رہی ہے۔ میں نہیں بتا سکتی میری کیا حالت ہے۔

مشتاق :- کیا ہوا؟

بُوب :- کیا ہوا؟..... کیا ہوا..... میرے جذبات کا خون کر کے، میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پوچھتے ہو کیا ہوا..... کہتے ہو.... کہ چپ ہو جاؤں.... چار آنسو بھی نہ بہاؤں

مشتاق :- تو کیا واقعی بُوب تمہیں مجھ سے اس قدر محبت تھی؟

بُوب :- (چندے خاموشی کے بعد) تم کو یہ پوچھتے شرم نہیں آتی؟

مشتاق :- میری بُوب! میری پیاری بُوب!

بُوب :- میں تمہاری بُوب نہیں ہوں..... تمہاری بُوب تو کوئی اُور ہے..... جاؤ اس کو بُوب کہو۔

مشتاق :- میری بُوب! تم ہی میری بُوب ہو۔ وُہ تو ایک فریب تھا جس میں تمہاری سرد مہری نے مجھے مبتلا کر دیا تھا..... میری بُوب تو تم ہو..... بُوب!

بُوب :- تمہیں یقین ہے وُہ ایک فریب ہے؟

مشتاق :- ہاں میری بُوب!..... بُوب ...... اب ایسا نہیں ہوگا!

بُوب :- (آنسو پونچھ کر چپ ہوتے ہوئے) اچھا!... .... میرا دل بہت کمزور ہے! خیر!

مشتاق :- (ہنس کر) انسان بھی کیا ہے؟.... اپنے کو کس کس طرح دھوکا دیتا ہے..... یہ دیکھو (میز پر سے پرچہ اُٹھا کر) یہ وُہ خط ہے جو میں نے تمہارے آنے سے چند منٹ پہلے لکھا تھا..... اَور میں تمہاری تصویر بھی واپس کر رہا تھا۔ (ہنستا ہے)

بُوب :- دکھانا تو مجھے یہ خط! دیکھوں کیا لکھا تھا!

مشتاق :- ناحق اب تمہیں تکلیف ہوگی .... اَور اب تو اس کو پھاڑ دینا چاہئیے!

بُوب :- دو تو... (خط لے کر پڑھتی ہے.... آخری فقرہ آواز سے پڑھتی ہے.....) .... اچھا!.... "لِلّٰہ میرے اس طلسم کو توڑنے کی کوشش نہ کرنا"

مشتاق :- (شرمندہ ہو جاتا ہے اَور خط کو پھاڑتے ہوئے) وہ طلسم خود فریبی تھا بُوب اَور اب تو وُہ ٹوٹ گیا... (پھٹے ہوئے خط کی چندیاں فرش پر پھینک دیتا ہے)

(لیمپ ایک دم بجھ جاتا ہے چند لمحے تاریکی رہتی ہے..... اَور پھر آہستہ آہستہ لیمپ روشن ہوتا ہے۔ اب بُوب کمرے میں نہیں ہے۔.. مشتاق لیمپ کے نیچے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں بُوب کی تصویر ہے... پھٹے ہوئے خط کی چندیاں فرش پر نہیں ہیں۔ خط صحیح وسالم میز پر رکھا ہے.....)

مشتاق :- (چونک کر) ایں یہ کیا!... (تصویر میز پر رکھ دیتا ہے.... اضطراب کے ساتھ چاروں طرف دیکھتا ہے) بُوب؟.... (حیران ہے) اور یہ خط میز ہی پر رکھا ہے... (اُٹھاتا ہے) کیا پھٹا ہوا خط دوبارہ جڑ سکتا ہے؟... تو کیا وہ سب ایک خواب تھا؟ ہوگا... لیکن وہ طلسم تو ٹوٹ گیا.... خود فریبی....

(خط پھاڑ دیتا ہے)

پردہ

ناصر الدین شمسی

شاعری اور زندگی

سوچتا تھا کہ شاعری کیا ہے؟ — کام کی چیز۔ یا تماشا ہے؟
لوگ کرتے تو ہیں بہت توصیف — اس کی مخصوص بھی ہے کچھ تعریف؟
دیکھتا جب اساتذہ کا کلام — دل میں اُٹھتے شکوک اور اوہام
مجھ کو ملتے تھے اک جگہ باہم — خندہ و گریہ۔ شادی و ماتم
کبھی شاعر ہے ناتواں اتنا — نہ ملا موت کو نشاں اس کا
اس کی آہوں سے ہو گیا چونچال — کو نشہ اور بہار کا بھونچال
یاس و حرماں سے ارتباط رہا — بزمِ ماتم کا انضباط رہا
سر میں تھا تو قنوطیت کا جوش — ولولے دل میں تھے نہ جوش و خروش
تھے انہیں شاعروں میں ایسے بھی — نگہِ ذہن جن کی غائر تھی
ڈالتے آنکھ وہ حقیقت پر — تھی وسیع اور بالغ ان کی نظر
جن کے شعروں میں ہوتی کام کی بات — جن کا مضموں تھا رودادِ حیات
مدتوں شعر کا رہا یہ چلن — رطب و یابس رہے امینِ سخن
تھے وہ آزاد۔ حالی۔ اور اقبال — جن سے بدلی گئی وہ شعر کی چال
پھر سرور آئے اور اُٹھے چکبست — وطنیت کا کرنے بند و بست
اور ہیں مصلحوں کے زمرے میں — مصلحت ہے کہ چھوڑ جاؤں انہیں

ہے تصوف کی جو کلام میں بات — سخن آرائی کی فقط ہے گھات
فرق ہے قاتل اور بسمل میں — لب پہ کیوں آئے جو نہ ہو دل میں
غمِ دنیا ہے رات دن او فکر — پھر ہو کیا ذات او صفت کا ذکر
صوفیانہ بھی ہو چلن جس کا — یہ مسائل ہیں اس کے حق میں روا

ورنہ سب داخلہ زبانی ہے — عکس اور شخص اک کہانی ہے
جن کا ہو قول ہم ردیفِ عمل — جن کا برتاؤ ہو سخن کا بدل
اُن کو حق ہے سنائیں وہ باتیں — اور تصوّف کے مسئلے چھیڑیں
شعر کوئی غزل کا بن نہ پڑا — فلسفے کا اُٹھا دیا جھگڑا
نثر ہے وعظ، فلسفے کے لئے — شعر ہے جوش۔ ولولے کے لئے
وُہ تصوف ہو یا تفلسف ہو — شعر سے شعریت نہ جانے دو

شعر کی جو ہوئی ہیں تعریفیں — ہیں وُہ ناقص نگاہِ منطق میں
جیسا جس کا مذاق تھا لکھا — حصر اپنی پسند پر رکھا
ذہنیت کا یہی تقاضا تھا — تھا نتیجہ شعور و وجداں کا
ہوں جو جذبات دل میں جلوہ طراز — ان کو ملتی ہے شعر سے پرواز
شعر احساس کا ہے آئینہ دار — شعر جذبات کا علمبردار
شعر عکاسِ رنگِ فطرت ہے — پرتَو اندازِ حسنِ قدرت ہے
کب حقایق سے شعر ہے معصوم — شعر و فطرت ہیں لازم و ملزوم
شعر ہے نفسیات کا مظہر — وُہ نہیں ہے غلو کا دست نگر
شعر کی شان نثر سے ہے جُدا — نثر توجیہ کا ہے اک آلہ
شعر کی ہے زبان موسیقی — نثر کی ہے زبان منطق کی
ہے محاکات شعر کی زینت — نثر کی سادگی اہم ہے صفت
شعر جذبات سے ہے مالامال — نثر ہے ظرفِ پند و استدلال
شعر کے واسطے ہے رنگینی — نثر کے واسطے خوش آئینی
شعر کا نثر سے الگ اسلوب — اس کا انداز دلربا مرغوب
وزن اس کا لباس کہئے اگر — قافیہ اس کے حق میں ہے زیور
کوئی ان چیزوں کے جو دشمن ہیں — غسلِ شمسی کے سمجھو بھجن ہیں

قافیہ کا کر دنہ قافیہ تنگ — معنویت کا شعر کو دو رنگ

ہے ادب میں وہی کلام لطیف — ہوں نہ جس میں سقائمِ تالیف
اس سخن میں نہ کیوں لطافت ہو — جس کے مفہوم میں سہولت ہو
شوخی اچھی ہے۔ ہو اگر حد کی — ورنہ شامت ہے صحبتِ بد کی
ہیں ترقّی پسند جو حضرات — اُن سے کہنی ہے بس یہی اک بات
کہ کسی کو نہیں ترقی سے — سب ہیں شیدا یہاں ترقی کے
کبھی اس پر کیا ہے آپ نے غور — انقلاب اور ہے۔ ترقی اور
ہے وُہ بے روزگاری یا مزدور — شعر سے مفلسی رہی کب دور
پہلے تھا قسمتوں پہ چرخ کا راج — اب ہے معدن مصیبتوں کا سماج
شکوۂ دَورِ آسماں تھا جب — گلہ سرمایہ دار کا ہے اب
لکھے جاتے تھے پہلے شہر آشوب — اب سیاست کے سر پہ ہے زدوکوب
خلد ہی میں نہ کرتا شاعر رقص — تھا نظر میں معاشرت کا نقص
کہیں بودی جو بات پاتا تھا — منظرِ عام پر لے آتا تھا

ہو چکا ہے ادب میں استبداد — مسترد لیکن اب ہیں وُہ ارشاد
اب بھی مانا ادب میں ہیں موجود — شعر پر سخت شرطیں اور قیود
کون ہے جس کو ہو نہ یہ تسلیم — کیجئے اس کی واجبی ترمیم
لیکن اس کا رہے لحاظ ضرور — شعر کی اصل میں نہ آئے فتور
داخلیت کہ خارجیت ہو — ہے تنوّع پسند انساں کو
حُسن کی بھی تمہیں ضرورت ہے — عشق سے بھی تمہیں محبت ہے
ولولے۔ جوش۔ اور یہ جذبات — ہیں تحرک سے مل کے شرطِ حیات
دردِ دل اور ذکاوتِ احساس — اِن کو بھی سمجھو شعریت کی اساس

خوب سرمایہ کی مذمّت ہو — اور مزدور کی حمایت ہو
غم نہیں میر نظم ہو جو کسان — شاعری کا ہے اس میں کیا نقصان
بات جو ہے وہ صرف ہے اتنی — ختم اسی پر نہ ہو سخن سنجی
ان کو جتنا بھی جی میں آئے بڑھاؤ — جانشیں زلف و خال کا نہ بناؤ
شعریت کا ہی قتل نہ ہو جائے — کہیں یہ شمع گل نہ ہو جائے
ہیں جو دنیا میں واقعی شاعر — اور فن کے نکات سے ماہر
پیالہ مٹی کا ایک دیں جو انھیں — جام جمشید وہ اسے کر دیں
اُس کو بھدّے سے بھدّا دو موضوع — شاعر اس کو بنا دے بس مطبوع
نفسِ مضموں ہو مبتذل کہ دقیع — اس کو کر دیگا وہ بہت ہی رفیع
شعر کی تو بہت بلند ہے شان — شاعری کا وسیع ہے میدان
وُہ نہ ہو جائے تنگ اور محدود — ارتقا کی نہ راہیں ہوں مسدود
قید ہو شعر پر تو بس فن کی — اور پھر جس کے جو خوشی من کی

ہم کو معلوم ہے۔ عزیزو۔ خوب — اب تخیّل نیا ہے اور اسلوب
جب تخیل میں جدّت آئے گی — نئے الفاظ ساتھ لائے گی
روک ٹوک اس میں سخت ناواجب — آئیں۔ پر آئیں جب تئیں غالب
تھی محکِّ سخن پسند ثقات — تھی فصاحت بس انکے منہ کی بات
جو وُہ بولیں فقط وہی ہے فصیح — اصل میں وہ غلط ہو یا ہو صحیح
رہی حاوی دبائے خاص پسند — عام پر در رہا سخن کا بند
کوئی اُٹھا جو ضامنؔ اور نظیرؔ — تھے نگاہِ ادیب میں وہ حقیر
سُوقیت کا ملا انھیں تمغا — عامیانہ بنا کلام ان کا
غالبؔ و مومنؔ اور ناسخؔ سے — دو۔ کئی سو میں لطف اُٹھاتے تھے
اک صدی تک رہا یہ ان کا چلن — رہا خلقت پہ بند بابِ سخن

سنجوگ

پُروا کے جھونکے مل کر جب دو شاخوں کو سمجھاتے ہیں
پتے جھلمل جھلمل کر کے آپس میں مل جاتے ہیں
پنچھی، پنکھ پکھیرو، اُڑ کر گیت ملاپ کے گاتے ہیں
ــــــــــ ہاں! گاتے ہیں

پیڑوں کی فطری خاموشی
جھُوم جھُوم کر گاتی ہے
پُروا، چنچل! چپل پُروا
مڑ مڑ کر رہ جاتی ہے
شوخی سے اٹھلاتی ہے

اور کسی ڈالی پر پنچھی پریم سے پر پھیلاتے ہیں
پتے جھلمل جھلمل کر کے آپس میں مل جاتے ہیں
رات کی رادھا چاند کی گاگر لے کے جمن پر آتی ہے
بہتی دھارا سر کو جھُکا کر یادوں میں کھو جاتی ہے
چاند کی گاگر پانی میں یوں اپنے عکس کو پاتی ہے
ــــــــــ تڑپاتی ہے

جیسے اک ناری کے دل میں
یاد کسی کی آتی ہو
اور وہ جس کی یاد آتی ہے
آئے، تو پھر شرماتی ہو

سوچ ہی میں کھو جاتی ہو
میٹھا سپنا بن کر رادھا جل بھرنے جب آتی ہے
بہتی دھارا سر کو جھکا کر یادوں میں کھو جاتی ہے
گیت ہوا کی لہروں پر جب تیر کے گم ہو جاتے ہیں۔
گونج ہی باقی رہ جاتی ہے وہ خود تو کھو جاتے ہیں۔
جاتے جاتے لیکن اتنا کہتے ہیں "ہم تو جاتے ہیں"

"ہم جاتے ہیں"

یونہی ڈالی کے پنچھی بھی
گاتے ہیں اور ملتے ہیں
پتے جھلمل جھلمل کر کے
ملتے ہیں اور ہلتے ہیں۔
شاخوں کے گریباں سلتے ہیں
پریم کے ہاتھوں مل کر جب دو تن من اک ہو جاتے ہیں
گونج ہی باقی رہ جاتی ہے وہ خود تو کھو جاتے ہیں

یوسف ظفر بی۔ اے

اِکنّی

"اسے رکھ لو۔ انکار نہ کرو۔ بظاہر یہ اِکنّی ہے۔ مگر اِس کی قیمت سچ مچ اِس سے کہیں زیادہ ہے۔ بس رکھ لو اِسے میرے پاس لے دے کر صرف یہی اِکنّی ہے، گو یہ تمہاری مزدوری نہیں چکا سکتی ......"

یہ کہتے ہوئے میں نے راموموچی کی ہتھیلی پر اِکنّی رکھ دی۔ پورا آدھ گھنٹہ لگا کر اُس نے میرے بُوٹ کی مُرمّت کی تھی۔ مزدوری کی بات اُس نے میرے انصاف پر چھوڑ دی تھی۔ اِکنّی جیب میں ڈالتے ہوئے اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر شاید جیب میں اُسے مسلنے لگا،

اُسے کیا معلوم تھا کہ اِس اِکنّی سے میری ایک داستان وابستہ ہے ـــ

مجھے دہلی سے کنڈیشور جانا تھا۔ للت پور تک ریل کا سفر تھا۔ آگے لاری جاتی تھی۔ کئی روز تو اِسی شش و پنج میں گزر گئے کہ آج روپیہ ملے کل ملے۔

دہلی میں اخبار نویسوں کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ میرا ایک دوست جو کنڈیشو سے شائع ہونے والے "مدھوکر" میں کام کرتا تھا اِس سلسلہ میں دہلی آیا۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے بہت مجبور کیا۔ میں نے کام کا بہانہ کر کے بات ٹال دی۔ وُہ مان گیا۔ مگر لگے ہاتھوں مجھے بتا تا گیا کہ للت پور تک پانچ روپیہ کا ٹکٹ لگتا ہے اور آگے کل پندرہ آنے موٹر کے لئے کافی ہیں۔

ایک ہفتہ گزر گیا میں کنڈیشور کی تیاری نہ کر سکا۔ روپیہ کا انتظار تھا۔ سُسرا روپیہ بھی کبھی کبھی بہت ترساتا ہے اور گو میرے سفر کے حالات روپیہ کی تنگی سے بھرے پڑے ہیں، دہلی کی وُہ تنگی مجھے ہمیشہ یاد رہیگی۔

جس دِن میں دہلی پہنچا تھا میرے پاس کل چند آنے پیسے موجود تھے وُہ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں پر خرچ ہو گئے۔ جہاں سے روپیہ ملنا تھا نہ ملا مگر مَیں نے اپنے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نہ پیدا ہونے دئے۔

نئی دہلی سے، جہاں میں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہُوا تھا، میں اکثر پیدل ہی شہر پہنچتا اور پھر پیدل ہی اپنی اقامت گاہ کو لَوٹتا۔ ہر روز مجھے لوٹنے میں دیر ہو جاتی۔ میرا دوست ہنس کر اِس کی وجہ دریافت کرتا۔ میں ہنس کر بات آئی گئی کر دیتا۔ کیسے کہتا کہ میری جیب خالی پڑی ہے۔

خالی جیب کی مجھے کوئی خاص چِنتا کبھی کبھار ہی ہوتی ہے۔ اب یہ اِکنّی اِس موچی کو دے کر میری جیب خالی ہو گئی ہے تو کیا حرج ہے؛ میں خوش ہوں!

ایک دن دِلّی میں میری ایک دوست کے ہاں رات کو دعوت تھی۔ وہاں سے فارغ ہوتے ہوتے دس بج گئے۔ اب واپس نئی دہلی لوٹنا تھا۔ میں پیدل ہی چل پڑا۔ حوصلہ ہارنا میں نے سیکھا ہی نہیں۔

پاس سے ایک تانگہ گزرا۔ میں نے آواز دی "تانگہ"

تانگہ رُک گیا۔ ایک سواری پہلے بیٹھی تھی۔

تانگے والا بولا "کدھر جاؤ گے؟"

"جدھر بھی لے چلو"

"خوب۔ جدھر بھی لے چلُوں! ...... کدھر لے چلوں؟ ـــ

میں تو نئی دِلّی میں بارہ کھمبا جا رہا ہوں۔"

"مجھے بھی وہیں لے چلو۔"

"تین آنے پیسے ہوں گے۔ رات بہت چلی گئی ہے۔ دوسرا تانگہ نہیں ملنے کا!"

"مگر بھائی میرے پاس تو پیسے ہیں نہیں۔"

"پیسے ہیں نہیں! اجی صاحب یوں مذاق نہ کرو۔ یہ ٹھیک نہیں۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ میرے پاس سچ مچ پیسے نہیں ہیں۔"

تانگے والا کوئی بھلا آدمی تھا۔ اُسے رحم آگیا۔ بولا "اچھا تو بیٹھ جاؤ۔ تمہارے تین آنے میں خدا سے مانگ لوں گا۔"

"بہت ٹھیک۔"

تانگہ چلا جا رہا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ جب خُدا نے خود مجھے ہی تین آنے نہیں دیئے تو اِس تانگے والے کو وُہ میرے حساب میں کیسے تین آنے دے دیگا؟ میرے دِل میں کئی طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہے۔ خُدا کیا بلا ہے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خُدا کا خیال صرف ایک وہم ہے۔۔۔۔ کیا یہ سچ مچ ایک وہم ہے؟۔۔۔۔ کیا مَیں خُدا پر اتنا ہی یقین رکھتا ہوں جتنا یہ غریب تانگے والا؟ اگر نہیں تو میں نے کیسے مان لیا کہ وُہ ضرور میرے حساب میں خُدا سے تین آنے وصول کر سکے گا؟۔۔۔۔۔۔ اُس وقت مجھے وہ واقعہ بھی یاد آیا جب میں نے ایک سوال کے جواب میں اپنے ایک ادیب دوست کو بتلایا تھا کہ اگر خُدا نہ بھی ہو تو صرف اپنی پناہ کیلئے ہمیں ایک خُدا فرض ضرور کر لینا چاہیئے۔ پھر میں نے سوچا کہ اِس تانگے والے نے ضرور مجھے کوئی سادھو سمجھ لیا ہے۔ سر کے لمبے بالوں اور داڑھی کو دیکھ کر اکثر لوگوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے اور اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ سچ مچ کے خُدا پر اعتقاد رکھنے کی بجائے میں صرف ایک فرضی خُدا کو مانتا ہوں تو وُہ جھٹ مجھے اپنے تانگے سے اُتار باہر کرے۔

ساتھ والا مسافر بولا "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "دیہاتی گیت جمع کیا کرتا ہوں۔"

"کسی کمپنی کی طرف سے؟"

"نہیں صاحب! یہ میرا ذاتی شوق ہے۔"

"ذاتی شوق ہے؟۔۔۔۔۔ خوب!۔۔۔۔۔ مگر صاحب، یہ دنیا ہے۔ روپیہ کمانے کے ہی تو سب دھندے ہیں۔"

"مگر صاحب میں یہ کام صرف روپیہ کمانے ہی کے لئے نہیں کر رہا ہوں۔"

"گھر سے امیر ہو گے۔"

"گھر سے میں روپے نہیں لیتا۔"

"تو روٹی اور سفر کا خرچ کیسے چلاتے ہو؟"

"رسالوں اور اخباروں میں مضامین لکھ کر تھوڑے سے پیسے پیدا کر لیتا ہوں۔ اور میں سچ کہتا ہوں کہ اگر یہ پیسے ملنے بند بھی ہو جائیں تو بھی میں یہ کام چھوڑوں گا نہیں۔"

"آپ ضرور کوئی سادھو ہیں،"

"نہیں، صاحب، میں تو ایک گرہستی ہوں۔ میری بیوی اور بیٹی، جو اکثر سفر میں میرے ہمراہ رہتی ہیں، ان دنوں گھر پر گئی ہوئی ہیں۔"

"خوب"

خوب ہو یا نہ ہو۔ کچھ کہہ لیجئے۔ اِس وقت تو میں مُفت میں تانگے کی سواری کر رہا ہوں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں بھی اِس تانگے والے کی طرح ایک مزدور ہوں۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ وہ نقد مزدوری پاتا ہے اور اِس غریب مضمون نویس کو کبھی کبھی اخبار یا رسالے والے ٹالتے چلے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ورنہ، صاحب، آج یہ نوبت نہ آتی کہ مَیں مفت میں تانگے کی سواری مانگوں اور یہ تو اس آدمی کا خلوصِ دِلی

ہے کہ اُس نے میرے حساب کے تین آنے خدا سے لینے کی بات کہہ کر مجھے احسان کے بار سے بھی آزاد کر دیا ہے۔

سڑک پر بجلی کی روشنی تھی۔ اور اِس کے مقابلے میں غریب تانگے والے کا لیمپ بہت مدّھم معلوم ہو رہا تھا!

تانگے والا ہماری باتیں بڑے مزے سے سن رہا تھا۔ اُسے خوش کرنے کے لئے میں نے کہا "صاحب، میں تو سمجھتا ہوں تانگے والوں کی کمائی خون پسینے کی کمائی ہے۔ اگر کبھی پھر اِس دنیا میں مجھے آدمی کی جون جنم ملے تو میں تو چاہتا ہوں کہ میں کسی تانگے والے کے گھر جنم لوں۔"

تانگے والا بولا "یہ نہ کہو جی۔ ہم تو دن میں سو جھوٹ بولتے ہیں۔ اور مَیں تو چاہتا ہوں آپ کو نجات ملے۔ پیدا ہونا اور مر جانا ـــــ یہ تو بہت سخت امتحان ہے جی!"

دہلی میں وہ دو ہفتے میں نے بڑی جدوجہد کے ساتھ گزارے۔ کھانے کی کوئی تکلیف نہ تھی مگر کئی کئی میل پیدل چلنا اور وہ بھی اپنا بھاری بیگ اُٹھائے ہوئے، کچھ آسان کام نہ تھا۔ دوستوں سے ملنا اور گیتوں کی تلاش میں مناسب مقامات پر پہنچنا تو ضروری تھا۔

کنڈیشور سے خط آیا۔ لکھا تھا۔ "فوراً چلے آؤ۔" یہ چوبے جی کا خط تھا۔ اب وہاں جانا اور بھی ضروری ہو گیا۔

اپنے میزبان سے میں نے سات روپے ادھار کئے۔ پانچ روپے پندرہ آنے کرایہ کے لئے اور ایک روپیہ اور ایک اِکنّی اوپر کے خرچ کیلئے...

آٹھ آنے تو سٹیشن تک تانگے والے کو دینے پڑے۔ باقی بچے ساڑھے چھ روپے۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر پہنچا تو پتہ چلا کہ للت پور تک پانچ روپے کا نہیں بلکہ پانچ روپے گیارہ آنے کا ٹکٹ لگے گا۔ یہ بھی خوب رہی۔

تو کیا اُس کنڈیشور والے دوست نے مذاق کیا تھا؟...... اپنی کمزور یادداشت پر میں بہت جھلّایا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں نے للت پور کا ٹکٹ لیا۔ اور قلی سے اسباب اُٹھوا کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ ایک اِکنّی قلی کو دی۔

اب جو باقی بچی نقدی گنی تو کل ساڑھے دس آنے نکلے۔ اب یاد آیا کہ ڈیڑھ آنہ دن میں تانگہ پر خرچ ہو گیا تھا۔ ساڑھے دس آنے.......

کل ساڑھے دس آنے! دل میں کئی اُتار چڑھاؤ پیدا ہوئے، پھر کسی طرح غم غلط کیا۔ للت پور تو پہنچوں۔ دیکھا جائے گا۔

رات بھر ریل گاڑی کا سفر رہا۔ نیند نہ آئی۔ اگلی صبح للت پور آ گیا۔ قلی سامان باہر لے آیا۔ پتہ چلا کہ لاری کے اڈّے تک تانگے والے کو ایک دونّی دینا ہو گی۔ میری جیب میں کل ساڑھے دس آنے تھے۔ بڑی مشکل سے قلی کو دو پیسے میں بھگتایا۔ اور تانگے والا ایک اِکنّی پر مان گیا۔

تانگہ چلا جا رہا تھا۔

ساتھ کی سیٹ والے نوجوان کی طرف مخاطب ہو کر میں نے پوچھا۔ "کیوں بھائی کنڈیشور کا یہاں سے کیا لگے گا؟"

یہ سوال میں نے اِس لہجے میں کیا تھا کہ اُسے یہی محسوس ہو کہ میں اِس سلسلے میں بالکل اجنبی ہوں۔

وُہ بولا "صرف پندرہ آنے۔"

"پندرہ آنے!...... مگر بھائی میری جیب میں تو صرف دس آنے رہ گئے ہیں اور اِن میں سے ایک اِکنّی اِس تانگے والے کی ہو چکی سمجھئے۔ اور میرے پاس رہ گئے صرف نو آنے......"

"نو آنے!...... تو باقی چھ آنے کہاں سے پاؤ گے؟"

"یہی تو فکر ہے۔ کوئی سبیل ہو تو بتاؤ۔"

"اب یہ میں کیا جانوں، بھائی؟ میں تو ابھی ودیارتھی ہوں۔ سچ جانو میرے پاس ہوتے تو میں ٹکٹ لے دیتا...... اور مشکل تو یہ ہے کہ میں باہر سے پڑھنے آیا ہوں۔ کوئی مجھے اُدھار دے گا نہیں۔"

میں چُپ ہو گیا۔ اور سچ مانو، میں یہاں پہنچ کر یوں اکنّی کی چپ ہو جانے ہی کی وجہ سے اُس ودیارتھی پر اثر ڈال سکا۔

وُہ بھی چند منٹ تک خاموش بیٹھا رہا۔ تانگہ چلا جا رہا تھا۔ اور میں نے تانگے والے کو مخاطب کر کے کہا "اے بھئی اگر تم اپنی اکنّی مجھ سے نہ لو تو میری مشکل گھٹ کر چھ آنے کی بجائے پانچ ہی آنے کی رہ جاتی ہے۔"

وُہ بولا "نا صاحب میں اپنی اکنّی ضرور لوں گا۔ یوں اکنّیاں چھوڑنے لگوں تو میرا گھوڑا بھوکا مر جائے۔ اور گھر جانے پر بیوی کی گالیاں الگ کھاؤں۔"

اُسے یہ شک گزرا کہ میں اڈے پر پہنچ کر اکنّی دینے سے انکار نہ کر بیٹھوں۔ اُس نے تانگہ روک لیا۔ بولا "اڈہ اب دور نہیں۔ اکنّی نکالئے۔" میں نے اکنّی اس کی ہتھیلی پر رکھی۔ تب کہیں وُہ آگے چلا۔

وُہ ودیارتھی پوچھنے لگا "کام کیا کرتے ہو؟"

"ہر زبان کے دیہاتی گیت جمع کیا کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ٹھیک۔ 'وشوتر' میں میں نے گیتوں پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ آپ ہی کا ہوگا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کام بنتا دیکھ کر میں نے اُسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا، ورنہ کوئی اور موقع ہوتا تو میں پوچھتا کہ کس ماہ کے وشوتر کی بات ہے اور مضمون کا کیا عنوان تھا۔

وُہ بولا "آپ کا نام؟"

میں نے اپنا نام بتایا۔ اور وُہ بولا "وہ مضمون میں نے بڑے شوق سے پڑھا تھا۔ ضرور وُہ آپ ہی کا لکھا ہوا ہوگا .... یہ بہت بڑا کام ہے صاحب!"

اِس تعریف نے مجھے اور بھی شرمندہ کر دیا۔ یہ بہت بڑا کام ہے! ...... اگر یہ کام بڑا ہے تو میری مالی حالت اتنی خراب کیوں ہے؟ ..... لاری کا ٹکٹ لگے گا پندرہ آنے کا اور میرے پاس ہیں صرف نَو آنے۔

وُہ بولا "آپ اب فکر نہ کریں۔ میں آپ کا بندوبست اپنے ذمے لیتا ہوں۔ آپ کسی سے مت کہیں کہ آپ کے پاس پیسے کم ہیں۔ آپ لاری پر سوار ہو جائیے۔ ابھی لاری دو گھنٹے بعد چلے گی۔ اتنے میں میں دیکھ لوں گا۔"

اڈے پہنچ کر اُس نے مجھے آرام سے لاری میں بٹھا دیا۔ اور وہ خود ٹکٹ کنڈکٹر سے جا کر ملا۔ کون جانے اُس نے اُس سے کیا کیا سچی جھوٹی باتیں کی ہوں گی۔ میں تو اتنا ہی مانتا ہوں کہ وہ اُسے لئے ہوئے میرے پاس آیا اور بولا "وہ نَو آنے ان کو دے دیجئے۔ یہ آپ کو کنڈیشور کا ٹکٹ دے دیتے ہیں۔"

میں نے بٹوا کھولا۔ نَو کے نَو آنے میں نے بڑے غور سے دیکھے۔ گویا ہر صرف آٹھ آنے نکالے۔ انہیں اُسے دیتے ہوئے میں نے کہا "آپ اجازت دیں تو ایک اکنّی میں رکھ لیتا ہوں۔ کنڈیشور میں ضرورت پڑے گی۔ سڑک سے چوبے جی کے مکان تک اسباب لے جانے والے قلی کو دے دوں گا۔ وہاں پہنچتے ہی اُن پر یہ تو ظاہر کرنے سے رہا کہ میری جیب میں ایک اکنّی تک نہیں ہے۔"

"ہاں، ہاں اکنّی آپ شوق سے رکھئے۔"

وہاں کنڈیشور میں پہنچا تو سڑک پر چوبے جی کا ایک دوست موجود تھا۔ اُس نے میرا اسباب پہنچانے کا بندوبست کر دیا۔

وُہ اکنّی میرے پاس بچ رہی۔ اسے میں نے احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ جب کبھی چوبے جی کو گلوری کی ضرورت ہوتی میں خود جیب سے اکنّی نکال کر دکھاتا اور کہتا ۔۔ پیسے میں دوں گا۔ چوبے جی نہیں نہیں کہتے ہوئے اسے واپس کر دیتے۔

اور جب میں نے رامو سے بوٹ مرمت کرانے کے بعد اُسے یہ اکنّی دیتے ہوئے کہا۔ "اسے رکھ لو۔ انکار نہ کرو۔ بظاہر یہ اکنّی ہے۔ مگر اِس کی قیمت سچ مچ اس سے کہیں زیادہ ہے۔" میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ میں نے دیکھا کہ رامو کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئی تھیں۔ .... اُسے سارے دن میں اُس اکنّی کے سوا اور کچھ نہ ملا تھا۔ اُس نے سوچا ہو گا کہ اُس نے ایک انترجامی سادھو کا بوٹ مرمت کیا ہے ورنہ وہ کیسے جانتا کہ گھر میں اُسکی بھوکی بیوی اور بچے اِسی اکنّی کی راہ تک رہے ہیں۔

دیویندر ستیارتھی

عشقِ خود اعتماد

کوئی قدرِ مذاقِ بے وفائی کر نہیں سکتا
کوئی ناآشنا سے آشنائی کر نہیں سکتا

اگر واقع میں اب تم سوئے خبطِ جور مائل ہو
تو میں اِس خبط کی ہمّت فزائی کر نہیں سکتا
اگر واقع میں اب تم جبر کی منطق کے قائل ہو
تو میں اِس جہل کی مدحت سرائی کر نہیں سکتا

اگر یہ سچ ہے تم نازانِ کارِ بے وفائی ہو
تو یہ بالکل غلط ہیں بے وفائی کر نہیں سکتا
اگر یہ سچ ہے، تم آمادۂ بے اعتنائی ہو
تو پھر یہ جھوٹ، میں بے اعتنائی کر نہیں سکتا۔

اگر تم قصدِ کارِ کج ادائی کرنے والے ہو
تو کیا میں عزمِ کارِ کج ادائی کر نہیں سکتا
اگر تم مجھ سے جی بھر کر کھائی کرنے والے ہو
تو کیا میں تم سے کچھ بڑھ کر کھائی کر نہیں سکتا

اگر تم عازمِ ناآشنائی ہونے والے ہو
تو کیا میں تم سے ترکِ آشنائی کر نہیں سکتا
اگر تم ساعیٔ باہم جُدائی ہونے والے ہو
تو کیا میں سبقتِ باہم جدائی کر نہیں سکتا

اگر تم پیکرِ جنگ آزمائی بن کے آئے ہو
تو کیا میں ہمتِ جنگ آزمائی کر نہیں سکتا
اگر تم دشمنِ صلح وصفائی بن کے آئے ہو
تو کیا میں نفیٔ ہر صلح وصفائی کر نہیں سکتا

اگر اب تم ڈِھٹائی ہی کی مجھ سے ٹھان بیٹھے ہو   تو میں کیوں چپ رہوں کیا میں ڈِھٹائی کر نہیں سکتا
اگر اب تم لڑائی ہی کی مجھ سے ٹھان بیٹھے ہو   تو میں کیوں طرح دوں، کیا میں لڑائی کر نہیں سکتا

میں اصنامِ حسیں کے ناز اُٹھانے کو تو حاضر ہوں   پر[1] اُن کی چوکھٹوں پر جبہہ سائی کر نہیں سکتا
میں اہلِ حسن کی قیمت بڑھانے کو تو حاضر ہوں   پر[1] اُن کے وصل کی خاطر گدائی کر نہیں سکتا

اگر میں فرض کر لوں، قید و بندِ غم مقدر ہے   تو کیا میں کوئی تدبیرِ رہائی کر نہیں سکتا
اگر میں مان لوں، میرا مقدر نارسا تر ہے   تو کیا میں کچھ علاجِ نارسائی کر نہیں سکتا

اگر کوئی مرا مشکل کُشا بننے سے منکر ہے   تو کیا میں اپنی خود مشکل کشائی کر نہیں سکتا
اگر کوئی مرا حاجت روا بننے سے قاصر ہے   تو کیا میں اپنی خود حاجت روائی کر نہیں سکتا

مری ہمت مجھے خود ناخدا اپنا سکھا دے گی   بلا سے، کوئی میری ناخدائی کر نہیں سکتا
مری منزل مجھے خود ڈھونڈ کر اپنا پتا دے گی   بلا سے، کوئی میری رہ نمائی کر نہیں سکتا

جہاں آزاد! اب میرا نیازِ عشق فائز ہے
وہاں کوئی غرورِ دلربائی کر نہیں سکتا

حکیم آزاد انصاری

---

[1] میں لفظ "پر" بمعنی لیکن اور مگر وغیرہ کو قابلِ ترک نہیں سمجھتا۔ آزاد انصاری

مولوی صاحب کی چھتری

مولوی صاحب کے گھوڑے کا ذکر آپ مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کی پہلی کتاب میں پڑھ آئے ہیں۔ اب ان کی چھتری کا ذکر بھی سن لیجئے:۔

دنیا میں دو چھتریاں مشہور ہیں۔ ایک مسٹر چیمبرلین[1] کی اور دوسری ہمارے مولوی صاحب کی۔ مسٹر چیمبرلین کی چھتری کو سیاسیات سے تعلق ہے اور ہمارے مولوی صاحب کی چھتری کو مذہبیات اور معاشیات سے۔ میونک کا معاہدہ کبھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا اگر مسٹر چیمبرلین کی چھتری ان کے ہمراہ ایک طیارہ میں پرواز کر کے میونک نہ پہنچتی اور ہماری نمازِ جمعہ بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اگر کسی دن مولوی صاحب کی چھتری کو ان سے الگ ہونا پڑتا ہے۔ مسٹر چیمبرلین کی چھتری نے بڑے بڑے شاطرانِ سیاست کے چھکے چھڑا دیئے اور مولوی صاحب کی چھتری نے سکول کے تمام اساتذہ و طلبہ کو لرزہ براندام کر رکھا ہے۔ جہاں ان کی چھتری دکھائی دی، بس سمجھو مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ پھر کیا ہے۔ زید کو خبیث، بکر کو منافق اور عمرو کو فاسق و فاجر کی گردانیں سننا پڑیں۔ ہٹلر نے "پیراشوٹ" کا خیال مسٹر چیمبرلین کی چھتری ہی سے چرایا ہے اور ہمارے مولوی صاحب کی چھتری۔ سبحان اللہ! اس کی نقالی تو آسمان نے بھی کی ہے جو چھتری بن کر رہ گیا۔

چھتری تو ہر شخص کے پاس ہو سکتی ہے مگر اس کا صحیح استعمال۔ یہ صرف خداداد قابلیت پر منحصر ہے اور ظاہر ہے کہ ہمارے مولوی صاحب کو اس قابلیت سے حصۂ وافر ملا ہے جس طرح ہمارے مولوی صاحب ہر فن مولا ہیں اسی طرح ان کی چھتری سے بھی ہر ایک کام لیا جا سکتا ہے۔ ہمارے مولوی صاحب ہر چیز سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بیچاری چھتری اور ایک ہزار ایک کام۔

مولوی صاحب کی وفادار چھتری ان کو اگر موسمِ گرما میں دھوپ سے بچاتی ہے تو موسمِ سرما میں کمبل کا کام بھی چھتری ہی سے لیا جاتا ہے کیونکہ یہ صبح شام اُن کے سر پر لگی رہتی ہے۔ بارش میں چھتری کے بغیر ہر شریف آدمی کبھی کبھی شرافت سے بھیگتا ہے مگر ہمارے مولوی صاحب جو چھتری کو دم بھر کی چھٹی نہیں دیتے، مطلقاً نہیں بھیگتے۔ خشک سالی کے زمانے میں اس چھتری کے طفیل ہمارے مولوی صاحب لُو سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ یہ انہی کی حیران کن ایجاد ہے کہ جس طرف سے لُو چلتی ہو اُس طرف چھتری آڑی رکھ کر بیٹھ جاؤ۔ لُو مطلقاً نہ لگے گی۔ چنانچہ ہمارے مولوی صاحب اپنی چھتری سے سال کے ہر موسم میں مستفید ہوتے ہیں۔ موسمِ بہار میں بورڈنگ ہاؤس کے احاطے سے پھول چرا کر اس میں بھر لیتے ہیں۔ مولوی صاحب پر چوری کا مطلقاً شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ موسمِ خزاں میں دسپت جھڑ کرنے والی ہواؤں سے بچنے کے لئے بھی انہیں چھتری کا لگانا ضروری ہے۔ دن کے وقت تو حسبِ ضرورت چھتری ہر ایک شخص ہی لگاتا ہے مگر رات کے وقت چھتری لگانے کا انداز کچھ انہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

ہم نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا "قبلہ! بیدات کے وقت چھتری لگانے کا مقصد؟"

---

[1] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا اُس وقت مسٹر چیمبرلین مع چھتری کے زندہ تھے۔ "ہمایوں"

"بھئی واہ! رات کے وقت اوس پڑتی ہے۔ بغیر چھتری کے رات کو گشت کی جائے تو نزلہ ہو جاتا ہے۔ چھتری رات کے وقت اوس سے بچاتی ہے۔ یہ غلط ہے کہ نزلہ قبض سے ہوتا ہے۔ گلے میں کسی قسم کی خراش سے ہو جاتا ہے۔ سردی کے وقت گرمی۔ اور گرمی کے وقت سردی لگ جانے سے ہو جاتا ہے۔ زیادہ سرد یا زیادہ گرم چیز کھانے سے ہو جاتا ہے۔ دماغ کی کمزوری سے ہو جاتا ہے یا موسموں کے تغیر و تبدل سے ہو جاتا ہے۔ نزلہ ہونے کی وجہ ہی صرف ایک محض ایک ہے۔ وہ یہ کہ ہم لوگ رات کے وقت اوس سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں کرتے۔ سب سے اچھا انتظام یہی ہے کہ رات کو جب باہر نکلو۔ چھتری لگاکر۔ چھتری گرمیوں میں ٹھنڈک اور سردیوں میں گرمی پہنچاتی ہے۔"

ان کی اس طولانی تقریر نے ہمیں مرعوب کر دیا۔ اس لئے کہ یہ حکیم حاذق بھی ہیں۔ ہم ابھی دم بخود ہی تھے کہ پھر کہنا شروع کیا:۔

"بھئی جب چھتری خرید ہی لی۔ جب ایک مرتبہ اس پر دام خرچ ہی کر ڈالے تو صرف اسے دن کے استعمال کے لئے رکھ چھوڑنا کفران نعمت نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر یہ چھتری رات کے وقت بھی استعمال کی جا سکے تو اس میں کیوں بخل سے کام لیا جائے۔ ہندوستان اسی لئے تو آزاد نہیں ہوتا کہ یہاں کے لوگ کسی چیز کا بہترین استعمال نہیں جانتے۔ اسلام اسی وجہ سے خطرے میں ہے کہ مسلمان لوگ جو بے حد مفلس ہیں کسی چیز سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا نہیں جانتے۔ معمولی سے معمولی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے فوراً جیب ٹٹولتے ہیں۔ حالانکہ بغیر پیسہ خرچ کئے بھی یہ ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ المبذرین کانوا اخوان الشیاطین سے یہ لوگ بالکل نہیں ڈرتے۔"

لو صاحب! اس تقریر کے بعد ہماری کیا مجال تھی کہ ہم لب کشائی کرتے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ چھتری ہی ہندوستان کو آزاد کرا سکتی ہے اور چھتری ہی اسلام کو خطرے سے باہر نکال سکتی ہے۔

مولوی صاحب چھتری کو رات کے وقت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی چھتری کا غلاف سفید ہے۔ جب یہ چھتری کو بند شکل میں اپنے ہاتھ میں لئے ہوتے ہیں تو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ان کی چھتری پر "ید بیضا" کا گمان ہوتا ہے۔ ان کے تاریک کمرے کی تاریکی میں بھی چھتری کے غلاف کی سفیدی رات کے وقت ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ مولوی صاحب کے ہاں (وہ خود میرے روبرو مان چکے ہیں) مہینے بھر میں تین پیسے کا مٹی کا تیل خرچ ہوتا ہے۔ وہ دیئے کا کام چھتری ہی سے لیتے ہیں۔ جب مولوی صاحب کو رات کے وقت باہر سے آکر کپڑے اُتارنا مقصود ہوتے ہیں تو چھتری ہی سے ٹٹول ٹٹول کر کپڑے ٹانگنے کی کھونٹیوں تک پہنچتے ہیں۔

مولوی صاحب کی جائے اقامت سکول کے احاطہ ہی میں ہے۔ ان کے "عربی روم" اور قیام گاہ کے درمیان مشکل سے پچاس گز کا فاصلہ ہوگا مگر مولوی صاحب کو جب گھر سے سکول اور سکول سے گھر جانا مقصود ہو تو چھتری پہلے کھل جاتی ہے اور اس عجلت کے ساتھ کہ اس پر آٹومیٹک چھتری (خود بخود کھل جانے والی) کا گمان ہوتا ہے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جاتے وقت بھی خواہ وہ ساتھ ہی والا کمرہ کیوں نہ ہو یہ چھتری "زیبِ قامت" ہوتی ہے مولوی صاحب ماشاءاللہ سرو قد واقع ہوئے ہیں۔

مولوی صاحب کی خوش قسمتی کہئے یا ان کی چھتری کی بدقسمتی کہ مسجد بھی سکول کے احاطے ہی میں واقع ہے مولوی صاحب جمعہ کے دن دوسری اذان سے ایک دو منٹ پیشتر بدستار و جبّہ بڑی آن بان سے اپنی حرم سرا سے نکلتے ہیں بیاہے کے ساتھ ساتھ جو اس وقت کو ویش

دوو وقت ڈھل چکا ہوتا ہے تشریف لاتے ہیں۔ مگر سر پر چھتری باقاعدہ لگی ہوتی ہے۔ چونکہ مولوی صاحب دھوپ میں پگھل جانے کے ڈر سے چھتری کے باوجود دیواروں کے عین ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس لئے چھتری کی سلاخوں کی رگڑ سے دیواروں پر کچھ ایسی انمٹ سی لکیریں پڑ گئی ہیں کہ سالانہ مرمّت کے وقت سفیدی اور رنگ کے دو دو تین تین کوٹ بھی انہیں نہیں مٹا سکتے۔ بورڈنگ ہاؤس کا احاطہ ختم ہو چکنے کے بعد نیم کا سایہ مولوی صاحب کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے پھر جنرل نالج روم اور دفترِ انجمن کے برآمدے کے سائے بڑھ بڑھ کر مولوی صاحب کی قدم بوسی کرتے ہیں۔ اذان علی مسجد کی دیوار کے شمالی سایہ کو مولوی صاحب اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازتے ہیں۔ اندرونِ مسجد وضوگاہ کی چھت اور جنوبی برآمدے کے زیرِ سایہ مولوی صاحب محرابِ مسجد میں مع اپنی چھتری کے داخل ہو کر فرائضِ امامت ادا کرتے ہیں۔ یہ ہے مولوی صاحب کی گذرگاہ "از حرم تا بمسجد"

ایک دفعہ سکول میں حکم نافذ ہوا کہ جماعت میں چھڑی کا استعمال ممنوع ہے۔ اس "آرڈیننس" کے ماتحت سکول میں جس قدر چھڑیاں طلبہ کی زد و کوب کے لئے مخصوص تھیں چھنوا لی گئیں۔ مگر مولوی صاحب ماشاء اللہ نہایت جیّد الطبع واقع ہوئے ہیں۔ سوجھی اور خوب سوجھی۔ لگے چھڑی کی بجائے چھتری استعمال کرنے۔ آخر جواب طلبی ہوئی۔ لکھ بھیجا "چھڑی ممنوع ہے چھتری نہیں"

مولوی صاحب نے چھتری کے استعمال میں جو جدتیں پیدا کی ہیں اُن کی تشریح کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ یہاں چند اشارات سے شاید کچھ اندازہ ہو سکے ع

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

مولوی صاحب کو ایک دفعہ پسینہ آ رہا تھا۔ آپ نے نہایت تکلف سے چھتری اُٹھائی اور غلاف کے ساتھ منہ اور ماتھا صاف کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب رومال کبھی نہیں رکھتے۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھو چکنے پر چھتری کا غلاف تولیہ کا کام بھی دیتا ہے۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب کی پیٹھ پر کسی ایسی جگہ کھجلی ہو رہی تھی جہاں اُن کا ہاتھ نہ پہنچ سکتا تھا۔ جھٹ چھتری اُٹھائی اور اُس کے دستے کے ساتھ پیٹھ کو نہایت آسانی سے کھجا لیا۔ کسی شاگرد سے کھجلوانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

احسان ناخدا کا اُٹھائے مری بلا

ایک دفعہ مولوی صاحب بازار سے آ رہے تھے اور چھتری خلافِ معمول بند تھی۔ مگر اس طرح کہ اُس کی ساتوں سلاخیں دستے کے پاس سے ہاتھ میں دبا رکھی تھیں اور چھتری کا پیٹ ابھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اُن کی چھتری سے کچھ عقیدت سی ہو گئی ہے۔ میں نے مذاق مذاق میں اُن کے ہاتھ سے چھتری سنبھال لی۔ اُسے کھولا تو دیکھا بیچ میں بینگن بھرے ہیں۔ کھسیانے سے ہو کر فرمانے لگے "میں تو سبزی اسی میں لایا کرتا ہوں"۔

مولوی صاحب کی چھتری پردہ پوشی بھی واقع ہوئی ہے۔ ہمارے مولوی صاحب ہیں تو شادی شدہ مگر تجرد کے قائل ہیں۔ اس لئے کہ ان کا خیال ہے کہ ازدواجی زندگی ان کی ریاضت و عبادت میں مُخل ہوتی ہے چنانچہ مولوی صاحب سال بھر میں چھ ماہ تن تنہا رہنے کے عادی ہیں۔ مسجد کے عقب میں ایک تنور ہے۔ ایسی حالت میں مولوی صاحب کے خورونوش کا انتظام اسی تنور میں ہوتا ہے۔ احباب کی نگاہوں سے بچنے کے لئے کھانا کھاتے وقت مولوی صاحب اپنی چھتری میز پر تان کر آڑی رکھ دیتے ہیں اور اس کی اوٹ میں مزے سے شکم پُری کے فرائض کو ادا کرتے ہیں (ان کے عقیدہ کے مطابق کم کھانا بھی کفرانِ نعمت ہے) اس طرح مولوی صاحب بازار سے گذرنے والے احباب کی تواضع کے فرض سے بھی بچ جاتے

ہیں۔ دوسرے چونکہ بازار میں کھانا عیب ہے ان کی عیب پوشی بھی ہو جاتی ہے۔ رمضان کے مہینے میں یہ چھتری بہت کام آتی ہے بشرطیکہ مولوی صاحب کی طبیعت خدانخواستہ علیل ہو اور روزہ رکھنے کا فریضہ ان پر عائد نہ ہوتا ہو۔

مولوی صاحب کا وطن ایک ریتلے علاقہ میں واقع ہے، جہاں گرمی زیادہ ہوتی ہے اور پانی کم۔ رہگذروں پر کہیں کہیں کنوئیں ملتے ہیں مگر ان میں سے بعض پر پانی نکالنے کا اہتمام نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں مولوی صاحب پھر اپنی چھتری ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اسے کھول کر اپنی دستار سے اُلٹا باندھ لیتے ہیں اور اسے کنوئیں میں ڈال کر پانی نکال لیتے ہیں اور سیر ہو کر پی لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب نے غلاف کے لئے موٹی زین کا انتخاب کیا ہے جنگل میں جاتے وقت چھتری کی اوٹ میں آپ قضائے حاجت سے بھی عہدہ برآ ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ مولوی صاحب بیمار پڑ گئے۔ خیر سے دو تین ماہ صاحبِ فراش رہے۔ چھتری کا استعمال نہ کر سکے۔ چھتری کو بیکار پڑے دیکھ کر ہر وقت کُڑھتے رہتے تھے۔ آخر ان سے ضبط ہو ہی نہ سکا۔ ان کی ستم ظریفی دیکھئے چھتری کھلوا کر چھت کی ایک کڑی میں رسی ڈلوا اسے اُلٹا لٹکوا دیا اور اس میں کوئی من بھر پیاز خرید کر بھروا دی۔ کہنے لگے "برسات کے بعد کام آئے گی"۔

چوہوں کو مولوی صاحب سے خاصی عقیدت ہے اور انہیں اُن سے عداوت۔ اپنی چھتری سے دن بھر میں تین تین چار چار چوہے مار پھینکتے ہیں۔ گویا ان کی چھتری چوہے دان سے کم نہیں۔ لطف یہ کہ چوہوں کے بل بھی چھتری کی نوک ہی سے بند کئے جاتے ہیں۔ بیلچے اور کُدال کا کام بھی ان کی سعادت مند چھتری ہی دیتی ہے۔

اگر مولوی صاحب کو بیٹھنے کے لئے کوئی اور چیز میسر نہ آئے تو بلا توقف چھتری زمین پر ڈال اُس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کئی دفعہ دیکھا گیا کہ مولوی صاحب رات کے وقت تکیہ کا کام بھی چھتری ہی سے لیتے ہیں۔

ہمارے سکول میں جامنوں کے پیڑ بہت ہیں اور مولوی صاحب اُن کے انچارج ہیں۔ بدقسمتی سے ایک لڑکا جامنیں توڑتے پکڑا گیا۔ یہ لڑکا تھا اچھوت۔ اس کو ہاتھ لگانا گناہ مگر اسے چھوڑنا بدتر از گناہ۔ ایک دو منٹ تو یہ اسی اُلجھن میں پھنسے رہے مگر آخر چھتری ہی نے ان کی مشکل کشائی کی۔ فوراً کہا سے

چل مری چھتری بسم اللہ

چھتری کا مڑا ہوا دستہ اس اچھوت لڑکے کی گردن میں ڈالا اور اسے کشاں کشاں ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں لا موجود کیا۔ اس وقت یہ چھتری نہ ہوتی تو بس مولوی صاحب کے لئے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن، کا معاملہ ہو گیا تھا۔

کبھی کبھی مولوی صاحب چھتری کو آگے گاڑ کر نماز بھی پڑھ لیتے ہیں۔ مگر یہ کام چھتری سے اس وقت لیا جاتا ہے جب نماز بر سرِ راہ پڑھنی پڑے تاکہ آگے سے گذرنے والے نماز میں نقص پیدا نہ کر سکیں۔ جب مولوی صاحب نکاح پڑھانے جاتے ہیں تو دُلہن کا نکاح پڑھاتے وقت چھتری تان کر درمیان رکھ لی جاتی ہے تاکہ پردہ کی جائز حدود سے تجاوز نہ ہو سکے۔

ہمارے مولوی صاحب اپنی چھتری سے اپنا بستر بھی جھاڑ لیتے ہیں۔ بالخصوص لحاف۔

اگر مولوی صاحب کا کسی سے جھگڑا ہو جائے تو اپنے حریف کو طمانچے کی بجائے چھتری ہی دکھاتے ہیں۔

ایک دفعہ مولوی صاحب کو سردی لگ رہی تھی اس وقت آپ نے چھتری کو سینہ سے لگا رکھا تھا۔ مگر گرمی میں وہ چھتری سے پنکھے کا کام بھی لیتے ہیں۔ ایک دفعہ گرمی کے موسم میں ہوا بالکل بند تھی مولوی صاحب چھتری کے اُس حصے کو جہاں چھتری کی ساتوں سلاخیں آکر ملتی ہیں بعجلت تمام اوپر نیچے کرنے لگے ایک دو منٹ میں پسینہ خشک ہو گیا۔

"ایک نہ ایک وقت کھیلنا بھی ضرور چاہئے۔ اس سے بدن میں چستی پیدا ہوتی ہے"۔ کسی نے انہیں بتایا کہ باہر جنگل میں جا کر کسی درخت کی نیچی شاخ سے لٹک کر ڈنٹر پیلے جائیں۔ صبح سویرے جنگل کی طرف تو جائے ان کی بلا۔ ان کے کوارٹر کی چھت کے ایک شہتیر میں آہنی ہک لگا ہوا ہے آپ اپنی چھتری کو اُس ہک میں لٹکا لیتے ہیں اور چھتری کے ساتھ لٹک کر خوب ڈنٹر پیلتے ہیں۔ ان کی چھتری جتنی مضبوط ہے اُسی نسبت سے مولوی صاحب دُبلے پتلے ہیں۔ اپنی چھتری سے حجام، موچی، باورچی اور درزی کا کام لینے کا معاملہ ابھی تک مولوی صاحب کے زیرِ غور ہے۔ اگر ان کی جدتِ طبع شاملِ حال رہی تو یہ گتھی بھی انشاء اللہ جلد ہی سلجھ جائے گی۔

چھتری ان کی ادبیات میں بھی داخل ہو گئی ہے۔ آپ کے پاس کئی فضیلتیں ہیں۔ منشی فاضل۔ مولوی فاضل۔ ادیب فاضل۔ فاضلِ دینیات اور نہ معلوم کیا کیا۔ اس لئے جو کچھ آپ زبان سے نکالتے ہیں اُسے ادبی طور پر مستند سمجھا جاتا ہے۔ کسی سے لڑائی ہو جائے تو کہتے ہیں "ابے تجھے مار مار کر چھتری بنا دوں گا"۔ کسی شاگرد سے ناراض ہوں تو کہتے ہیں "تجھے چھتری کی طرح اُٹھا لٹکا دوں گا"۔ کسی کی تعریف کرنا مقصود ہو تو کہتے ہیں "وہ چھتری کی طرح سیدھا ہے" "وہ چھتری کی طرح وفادار ہے"۔ اُس نے اپنے عزیزوں کو چھتری کی طرح ڈھانپ رکھا ہے کبھی کہتے ہیں کہ وہ چھتری کی طرح تنا کھڑا ہے۔ ایک دفعہ اپنے کسی دوست سے کہہ رہے تھے "تمہاری زندگی تو چھتری کی طرح ہے۔ کبھی نہاں اور کبھی عیاں"۔ نہ معلوم بیچاری ایک چھتری پر کتنے روزمرے۔ کتنے محاورات اور کتنی تشبیہات تراش ڈالیں۔

مولوی صاحب کی چھتری مقیاس الاوقات کا کام بھی دیتی ہے۔ جب ان کی چھتری ان کے سر پر عموداً لگی ہوئی ہو (بشرطیکہ رات نہ ہو) تو سمجھ لو کہ سورج نصف النہار پر چمک رہا ہے یعنی دوپہر کا وقت ہے۔ اس میں یقیناً غلطی کا اندیشہ نہیں۔ اگر چھتری مشرق کی طرف آڑی ہے تو دوپہر سے پہلا وقت ہے اور اگر مغرب کی طرف جھکی ہوئی ہے تو تیسرا پہر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ان کی چھتری قطب نما سے کم نہیں اگر چھتری پیچھے کی طرف لگی ہے تو سمجھ لو سورج ان کی پشت کی طرف ہے اور اگر آگے کی طرف ہے تو سورج بھی آگے کی طرف ہی ہوگا۔ لیکن اگر آگے کی طرف سورج نہ ہو مگر چھتری آگے کی طرف لگی ہوئی ہو تو سمجھ لو کہ مولوی صاحب کا کوئی قرضخواہ سامنے آرہا ہے۔ جس سے بچنے کے لئے یہ چھتری آگے کی طرف لگی ہوئی ہے۔

ان کی چھتری مقیاس المزاج بھی واقع ہوئی ہے۔ اگر یہ چھتری ان کے دائیں یا بائیں بازو پر لٹک رہی ہو تو سمجھ لیجئے کہ مولوی صاحب آج قدرے بشاش ہیں۔ اگر بغل میں دبی ہوئی ہو تو قدرے دلگیر۔ اگر اسے اپنی گردن میں ڈال کر بار بار کھینچتے ہوں تو یہ نشانی قدرے متفکر ہونے کی ہے۔ اُس وقت مولوی صاحب کسی الجھن میں ہوتے ہیں اور اگر بند چھتری کو ہاتھ میں چھتری کی طرح لے کر چلیں تو یہ علامت

ہے اُن کے غرور کی جو کسی کسی وقت وہ اپنی ہمہ دانی پر ظاہر کیا کرتے ہیں۔

ایک دفعہ کہنے لگے "چھتری بھی عجیب ایجاد ہے۔ اس کے موجد کو نوبل پرائز مل جانا چاہیئے تھا۔ چھتری ناکارہ ہو کر بھی بیکار نہیں جاتی۔ اس کے غلاف کو دھو کر رومال بنائے جاسکتے ہیں۔ اس کی چھڑی تو بہر کیف چھڑی کا کام دے گی۔ مگر اس کی سلاخیں بھی کام آسکتی ہیں۔ ان سے حُقّہ کی نے صاف کی جاسکتی ہے"

ان کا عقیدہ ہے کہ شعراء خدا کے نزدیک اسی لئے مقہور و مطعون ہیں کہ ان میں سے کسی نے آج تک چھتری کا قصیدہ نہیں کہا۔ اگر اب بھی اُن کی قوم میں سے کوئی ایک شاعر چھتری کا قصیدہ کہہ ڈالے تو سب کا کفّارہ ادا ہو سکتا ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں "چھتریات" پر لیکچر ہونے چاہئیں۔ بلکہ یونیورسٹیوں کو اِس مضمون کو داخلِ نصاب کرکے صحیح مذاقِ تعلیم کا ثبوت دینا چاہیئے۔ چھتری کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے اگر اسے چشمِ بددُور پیرس کی ماہ جبینوں کی رفاقت کا اعزاز حاصل ہے تو کانگو و لیلی کے حبشی نژاد لوگ بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔ بچے۔ جوان۔ بوڑھے اسے یکساں طور پر چاہتے ہیں۔ ہندو مسلم سکھ اور عیسائی کی یہ محبوبہ ہے اور بہت ممکن ہے کسی روز یہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد بھی پیدا کردے۔

مولوی صاحب کی چھتری اگرچہ قاضیٔ حاجات ہونے کے علاوہ ستّارِ عیوب بھی ہے مگر ایک دفعہ اس نے اُن کا راز بُری طرح فاش کردیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے احاطے میں طلبہ کے لئے کچھ سبزی لگی ہوئی تھی۔ یہاں سے سبزی لینے پر سخت پابندیاں تھیں۔ مگر تعجب اس پر تھا کہ راتوں رات سب کیاریے خالی ہو جاتے تھے۔ ہر طرح سے سبزی کی رکھوالی کی گئی مگر بے سود۔ مالی اور سپرنٹنڈنٹ صاحب سخت تنگ آ رہے تھے مگر چور کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی حیران و پریشاں تھے۔ آخر یہ بھانڈا پھوٹ ہی گیا۔ ایک صبح مالی نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس شکایت کی کہ ٹماٹر کے تین پودے جو کل شام لدے کھڑے تھے بالکل خالی ہو چکے ہیں۔ وہ خود وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بڑے پودے کی اوٹ میں ہمارے مولوی صاحب کی چھتری پڑی تھی۔ بس معلوم ہو گیا ؎

چوں بخلوت میروند آں کارِ دیگر میکنند

ہمارے مولوی صاحب کو چھتری نے بچپن میں کھلونے کا کام دیا۔ کیونکہ اسے گھوڑا بنا کر کھیلتے تھے جوانی میں شریکِ حیات کا بلکہ "نصفِ بہتر" کا کیونکہ یہ خلوت و جلوت میں اُن کے ہمراہ رہتی ہے۔ خدا کرے بڑھاپے میں یہی چھتری عصائے پیری کا کام بھی دے ؎

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

(سید) نیاز احمد ترمذی

دعوتِ طرب

ہاں سازِ اٹھا، سازِ خوش آواز مغنّی

برسات کی بھیگی ہوئی یہ رات شبابی
ہیں رقص میں آفاق، زمانہ ہے ربابی
ہر روح کے آنچل میں دہکتے ہیں شرارے
بھیگے ہوئے جھونکے ہیں فضا بس ہیں شرابی
ہنستے ہوئے سبزے پہ مچلتی ہوئی شبنم
کلیوں کو ستاروں نے بنایا ہے شہابی
ہاں گھول دے امرت سا فضاؤں میں مغنّی
یہ موسمِ گل رنگ، یہ ماحول شبابی

ہاں سازِ اٹھا، سازِ خوش آواز مغنّی

ساحل پہ پپیہے کی صدا جھوم رہی ہے
کونین ہیں سرشار فضا جھوم رہی ہے
مخمور گلستاں میں ہوا جھوم رہی ہے
آفاق پہ رحمت کی گھٹا جھوم رہی ہے
گلزار میں پھولوں نے نیا رنگ دکھایا
گردوں پہ ستاروں کی فضا جھوم رہی ہے
سیلابِ مسرت ہے زمانہ ہے طربناک
دنیا نہیں خود بزمِ خدا جھوم رہی ہے

ہاں سازِ اٹھا، سازِ خوش آواز مغنّی

ہر گام پہ مڑتا ہوا گاتا ہوا پانی
بیتاب ہے موجوں میں ستاروں کی جوانی

گلشن پہ عجب ناز سے چھائی ہیں بہاریں
ہر پھول کے ہونٹوں پہ ہے جنت کی کہانی
بیتاب ہیں قلبِ خس و خاشاک میں ارماں
ہر برگ کے ساغر میں ہے صہبا کی جوانی
یہ محفلِ احباب یہ اوقاتِ فراغت
آئے گی نہ برسات کی یہ رات سہانی
ہاں ساز اٹھا، ساز، خوش آواز مغنّی

یوں چھیڑ ترانے کہ یہ عالم ہی بدل جائے
افسوں ترا قہارِ مشیّت پہ بھی چل جائے
پیشانیٔ حسرت پہ بشاشت و مک اُٹھے
کانٹا سا ہر اک رُوح کے پرُدے سے نکل جائے
ہر دل کی کلی کثرتِ جذبات سے ہنس دے
ہر اشک میں طوفانِ تبسم کا مچل جائے
مہتابِ مسرت ہو نمایاں شبِ غم سے
ہر ایک فغاں قالبِ نغمات میں ڈھل جائے
ہاں ساز اٹھا، ساز، خوش آواز مغنّی

اے مطربِ گل بار فضاؤں کو ہنسا دے
نغموں سے بیاباں کی خموشی کو جگا دے
مُنہ دیکھ کے رہ جائے جمالِ رُخِ ایام
اے روحِ طرب رنگِ حوادث کا اڑا دے
ہر تان سے لا راہ پہ بھٹکے ہوئے دل کو
اے خضرِ طرب فرصتِ ہستی کو بڑھا دے
کونین کی افسردہ تمنائیں تڑپ جائیں
طوفانِ ترنم میں زمانہ کو بہا دے
اں ساز اٹھا، ساز، خوش آواز مغنّی

صفیہ شمیم ملیح آبادی

اصغر کا روزنامچہ

۹ جنوری ۱۹۳۹ء

............آج مجھے منیج (منظر) کا ایک نہایت پیارا خط ملا۔ میرے تجربے میں وہ یقیناً اپنے زمانے کا سب سے ہوشیار لڑکا ہے۔ میں فخر کرتا ہوں کہ میرا ایک ایسا بھائی ہے۔

............میں سپین کی حکومت کی عظیم الشان جارحانہ کارروائی سے بہت خوش ہوا ہوں۔ اِس سے اِن ڈکٹیٹروں کو ایک سبق مل رہے گا۔ ہاں اگر مسٹر چیمبرلین پھر کہیں بھیک مانگنے چل پڑے تو اور بات ہے۔ یہ ڈکٹیٹر پہلے درجے کے لغو آدمی ہیں اور چیمبرلین سب سے عجیب وغریب مسخرا ہے اولمپیا کے برٹرم ملز سے بھی بڑھ کر۔

۱۰ جنوری ۱۹۳۹ء

میں اُس دن کو ترس رہا ہوں جب میں پھر آکسفورڈ واپس پہنچ جاؤں گا۔ آج کا دن پہلے سب دنوں سے زیادہ اُداس اور اُکتا دینے والا تھا اور اگر رف (رفعت) کا ایک لمبا اور پُرلطف خط نہ آجاتا تو میں یہی کرتا کہ دن بھر کے لئے پھر پڑ کر سو رہتا............کچھ عرصے سے اپنے ماحول سے دلچسپی قائم نہ رہنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ میں زندگی پر غور وخوض کرتا رہتا ہوں اور غمگیں خیالات میں مستغرق رہتا ہوں جس سے میری فطرت کی غم پسندی بڑھ رہی ہے۔ آج میں نے ایک خاص عزم کیا ہے اور دل سے دُعا کرتا ہوں کہ مجھے اس کے پورا کرنے کی ہمت دی جائے۔ کیا میں ایسا کر سکوں گا؟ میرے دریچے کے باہر بارش کی ٹپ ٹپ میری ہنسی اُڑاتی "نہیں" کہتی معلوم ہوتی ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ کامیاب ہوں۔ ممکن ہے اس کوشش میں ایک دن میں زندگی ہی کھو بیٹھوں اور اگر میں ناکام رہا تو گویا سبھی کچھ ہار دوں گا۔ خیر آنے والا زمانہ ہی بتائے گا کہ کیا ہوگا!

(ترجمہ از ب)

اصغر بشیر

افکارِ پریشاں ۱

کسے معلوم گم ہیں علم و عرفاں چشمِ حیراں میں
یہ تابانی نگاہوں میں ہے یا حسنِ فروزاں ہیں

حجاب اک رمزِ محبوبی ہے حسنِ جلوہ ساماں میں
جھلک کر رہ گئیں رنگینیاں گلہائے خنداں ہیں

سمایا شوق بن کر کون یہ جذباتِ پنہاں میں
عجب عالم سرور و خوشی کا ہے دل و جاں میں

تجلی بڑھ گئی زلفِ سیہ سے روئے تاباں میں
نثارِ کفر بجلی کوندتی ہے نورِ ایماں میں

نویدِ موسمِ گل یا نویدِ اضطراب آئی
نسیمِ صبح نے چنگاریاں رکھ دیں دل و جاں میں

ازل میں وہ نگاہِ ناز کی جنبش معاذ اللہ
کہ جیسے رہ گیا ہو ٹوٹ کر نشتر رگِ جاں میں

یہ دل کا اضطراب اور حسن کی یہ جلوہ سامانی
کہ جیسے جام بھر کر دے دیا ہو دستِ لرزاں میں

نفس عنبر فشاں، مسرور دل، آنکھیں منور ہیں
وہ یاد آیا کہ ہوتی ہے سحر صحنِ گلستاں میں

نہیں منت کشِ چشمِ تماشا میری رنگینی
میں وہ گل ہوں کھلایا جس کو قدرت نے بیاباں میں

انہیں ہم شعر سمجھیں یا جگر نغماتِ لاہوتی
عجب کیفیتیں ہیں تیرے افکارِ پریشاں میں

جگر بریلوی

تجلیات

بہارِ عیش سے ہے سوزشِ دروں بہتر
شرابِ ناب سے ہے اشکِ لالہ گوں بہتر

متاعِ درد پہ دونوں جہاں لٹا ڈالے
یہ ہے جنوں، تو ہے مجھ کو یہی جنوں بہتر

گرے جو ذکرِ الٰہی میں شب کے دامن پر
ہے آفتابِ سحر سے وہ اشکِ خوں بہتر

وہ آشتی سے ملے گر تو آشتی اچھی
وہ کشت و خوں سے ہو حاصل تو کشت و خوں بہتر

بہار ایک فسوں ہے خزاں بھی ایک فسوں
بہار کا ہے خزاں سے مگر فسوں بہتر

سکونِ مرگ ہے بیکارِ زندگی سے گریز
سکونِ مرگ سے ہے جانِ بے سکوں بہتر

خدا سے مانگ نہ کچھ بھی جنونِ حق کے سوا
کہ دو جہاں کی خرد سے ہے یہ جنوں بہتر

مآلِ عشق اگر خاک و خوں ہے صہبائی
تو مجھ کو بسترِ گل سے ہے خاک و خوں بہتر

"آل انڈیا ریڈیو"

اثر صہبائی

غزل

عشق کی بے تابیاں تنہائیاں
حسن کی وہ انجمن آرائیاں

چشمِ ساقی کی اثر فرمائیاں
موجِ مے لینے لگی انگڑائیاں

وہ بھی دل کے ذکر پر ہنسنے لگے
دور جا پہنچیں مری رسوائیاں

ہر تمنا خون ہو کر رہ گئی
یاد آئیں گی کرم فرمائیاں

کچھ امیدیں کچھ امیدوں کے فریب
چند جلوے اور کچھ پرچھائیاں

بھول جائیں وہ تو کوئی کیا کرے!
پھر غنیمت ہیں ستم آرائیاں

موت کی بھی اب جھجک باقی نہیں
کی گئیں وہ حوصلہ افزائیاں

آہ پر خفگی نہیں ہے بے سبب
بات کی سمجھی گئیں گہرائیاں

دل کو چسکا پڑ گیا ہے جور کا
مار ڈالیں گی یہ بے پروائیاں

تم کو رسوا کر نہ دیں ماہرؔ کہیں
چاندنی راتوں کی یہ تنہائیاں

ماہر القادری

محفلِ ادب

اُردو زبان اور صحتِ الفاظ

جب اُردو کا خاکہ تیار ہوا اور روز بروز اُس کی دلفریبیاں طبیعتوں کو اپنی طرف مائل کرنے لگیں تو اُس کی ادبی حیثیت کی بھی بنائیں قائم ہو چلیں، کئی ابتدائی دَور گذر جانے کے بعد اُردو کے ایسے ایسے شیدائی پیدا ہوئے جنہوں نے ایک طرف اس کے خدوخال کو سنوارا اور رنگ روپ کو نکھارا اور دوسری طرف اس میں وہ وہ باب کھولے جو رفتہ رفتہ وسیع میدانوں میں تبدیل ہو گئے، سوداؔ۔ میرؔ۔ آنند رام مخلصؔ، سراج دکھانہ وغیرہم وہ بزرگ تھے، جنہوں نے اُردو کی دلآویزیوں میں چار چاند لگا دیئے اور اُس کی محبت کو دُور دُور تک عام کر دیا، اِن کے بعد آنے والوں نے اِنہیں سے اپنے چراغ جلائے اور اُردو کی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اس تمام خدمت گزاری و سرگرمی کے طفیل مذاق میں صحت اور صفائی بھی پیدا ہوتی گئی جو تمام تر فارسی کا قالب بنکر اَدبی معیار کے نام سے مشہور ہو گئی، متقدّمین نے جو ذخیرۂ تصنیفات ترکہ میں چھوڑا اُس میں اُن کے جانشینوں کو ایک بڑا انبارِ سقیم و غیر معتدل نظر آیا۔ اس انبار میں کچھ قدیم الفاظ اور ترکیبیں تھیں، اور کچھ معنوی بے عنوانیاں، ان لوگوں نے اس کی اصلاح شروع کی، صدہا ہندی الفاظ کو داخلِ متروکات کیا جس پر کچھ زمانہ ہُوا اِسی رسالہ میں کچھ عرض کر چکا ہوں، یہاں صرف اِتنا عرض کر دینا مناسبِ مقام ہے، کہ بہت سے متروکات ابتک اَساتذہ استعمال کرتے چلے آتے ہیں، اس لئے کہ اوّل تو ان الفاظ نے اپنا خاص محل و مصرف پیدا کر لیا ہے، دوسرے کسی لفظ یا ترکیب کا بہت دنوں تک استعمال نہ ہونا یا کسی خاص شخص کا اُسے متروک کر دینا اُس کے ترک کی کافی وجہ نہیں، بہت سے الفاظ کو غیر معتبر اَور غلط بتایا گیا لیکن یہ سب بظاہر اُردو سے وابستگی کا نتیجہ تھا سیاسی، تمدنی یا مذہبی اغراض و مقاصد پر مبنی نہ تھا بلکہ اس زبان میں ابھی یہ صلاحیت و اہمیت ہی پیدا نہ ہوئی تھی، کہ اس کو کسی قومی یا سیاسی ادارے کی حیثیت سے دیکھا جاتا، یہ تمام تر کوشش و کاوش اس لئے تھی، کہ بھاشا اور عربی فارسی کی قیدوں سے آزاد ہو کر اُردو اپنی علیحدہ ہستی قائم کر لے، اس مقصد کے لئے اُردو جس زبان سے مراد تھی، وہ سید انشا کی ذیل کی عبارت سے کافی طور پر متحقق و متعیّن ہو جاتی ہے:۔

"مخفی نماند کہ ہر لفظے کہ در اُردو مشہور شد عربی باشد یا فارسی یا تُرکی یا سُریانی یا پنجابی یا پوربی از رُوئے اصل غلط باشد یا صحیح، آں لفظ لفظِ اُردو ست، اگر موافقِ اصل مستعمل است ہم صحیح و اگر خلافِ اصل است ہم ایہم صحیح، صحت و غلطی آں موقوف بر استعمال پذیرفتن در اردو ست زیرا کہ ہر چہ خلافِ اُردو ست غلط است گو دَر اصل صحیح باشد، و ہر چہ موافقِ اُردو ست صحیح باشد گو دراصل صحت نداشتہ باشد"[1]

[1] دریائے لطافت صفحہ ۲۶۸

اردو الفاظ کی یہی خصوصیت اس زبان کو ایک طرف عربی فارسی سے اور دوسری طرف بھاشا سے ممیز کرتی ہے اور اس کو ایک مستقل زبان کی نوعیت عطا کرتی ہے، عربی فارسی کے بے شمار الفاظ ایسے ہیں، جو اردو میں آکر اپنی ماخذ زبانوں سے بالکل مختلف مفہوم ادا کرتے ہیں، اسی طرح ان دونوں زبانوں کے باہمی امتزاج سے نیز ہندی اور عربی فارسی کے پیوند سے صدہا الفاظ ایسے وضع ہو کر رائج ہو گئے جو اپنی اصل زبانوں سے بالکل انوکھی چیز ہیں، اور اُن کے صرفی و نحوی قواعد سے آزاد، جیسے جمعدار کہ اصل میں جماعہ دار تھا یا افراتفری کہ اصل میں افراط و تفریط تھا، یا ہندی میں بیکل۔ چلتن۔ لہو وغیرہ ایسے بدلے کہ اب اُن کی اصل کا پتہ لگانا بھی دشوار ہے اس عمل کے لئے نہ کوئی خاص قاعدہ مقرر تھا نہ ہو سکتا ہے، درحقیقت زبان کے بنانے والے جمہور ہوتے ہیں، جو اپنی طبعی مناسبت اور لب و لہجہ کی سہولت کے لحاظ سے موقع و محل کے مطابق الفاظ تلاش کرتے ہیں، اگر مروجہ لفظوں نے اُن کی ضرورت پوری نہ کی تو وہ انہیں میں سے کسی کو توڑ مروڑ کر ایک نیا لفظ ڈھال لیتے ہیں یا کوئی بالکل نیا لفظ گھڑ لیتے ہیں جس کی مثال آگے آئیگی، شاعر اور ادیب اس ذخیرے کو سانچے میں ڈھلتے اور مستقل حیثیت دیتے ہیں، اس کا تجزیہ کر کے اُصول و قواعد مرتب کرتے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ پہلے قواعد و ضوابط منضبط ہو جائیں، اُس کے بعد اُن کے مطابق زبان گھڑی جائے، ابتدا میں اسی قسم کے سیکڑوں لفظوں اور ترکیبوں نے اُردو کے ذاتی وجود کی بنائیں قائم کیں۔ اور اُس کی انفرادی زندگی کے قیام و ارتقا میں امداد دی، جب زباندان ظہور میں آئے، انہوں نے اس تمام ذخیرے کو ایک خاص معیار پر جانچا اور پرکھا اور اس معیار کے اجزا کو تو ام فن یا اُصولِ فصاحت و بلاغت کا نام دیا، یہ تمام سرمایہ اس کسوٹی پر پورا نہیں اُتر سکتا تھا۔ اس لئے بہت سا حصہ متروکات کی ذیل میں آگیا اور بہت سا مستعملات میں رہا۔ آخر الذکر حصہ میں سے چند ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں، جنکی ساخت میں دو زبانیں شامل ہیں:۔

گھبرے۔ گلچلا۔ جیب کترا۔ گلے باز۔ شور بے چٹ۔ منہ زور۔ جوشیلا۔ دل لگی۔ اگن بوٹ۔ ڈھلمل یقین۔ ایماندار۔ لمبردار۔ ترشی جوان۔ ٹکڑ گدا۔ ڈنڈا کش۔ کاپی نگار۔ چھاپہ خانہ۔ ڈولی بردار۔ سمجھدار۔ چوکیدار۔ تھانہ دار۔ گاڑی بان۔ رتھ بان۔ بُوباس۔ غل غپاڑہ۔ جگت باز۔ پنشندار۔ چٹھی رساں۔ چھت گیری۔ جگت اُستاد۔ وغیرہ وغیرہ جگت اُستاد کے اُصول پر امیر مینائی نے "جگت آشنا"[1] لکھا۔

ان لفظوں نے اُردو کی مستقل ہستی ہی قائم نہیں کی، بلکہ ان میں جو اشتقاقی و اختراعی اُصول جاری و ساری ہیں۔ اُن سے اُس کی ترقی کا میدان بہت وسیع ہو گیا۔ اور یہی ان الفاظ کی سب سے بڑی خصوصیت و غایت ہے، اگر ان اصولوں کی پیروی سلیقہ اور تمیز کے ساتھ کی جائے تو اُردو اجنبی لفظوں کی چہار دیواری سے نکل کر واقعی ایک قومی زبان بنجائے۔ اور اس کی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ حایل نہ ہو۔ بعض ادیبوں کو اس کا احساس ہے، لیکن اکثریت اُن حضرات کی ہے، جنہوں نے زبان کے اشتقاقی و اختراعی راستوں کو بند کر کے اُصول و قواعد کو اس قدر تنگ و محدود کر دیا ہے، کہ زبان کے بنیادی سرمایہ میں اضافہ ہونا تو درکنار خود وہ سرمایہ ہی نابود ہوتا چلا جاتا ہے، اور اس سختی سے زبان کا جائزہ لیا جاتا ہے، کہ وہ جنس جو ایک زمانہ میں نہایت پسندیدہ اور ہر دلعزیز تھی، اب قابلِ نفرت ہو گئی۔ جب زبان سے وہ ذخیرہ نکل

[1] مرقع ادب صفحہ ۳۷

گیا جس پر اُس کی مستقل حیات وبقا کا دارومدار تھا۔ تو یہ کمی اور کمزوری پُورا کرنے کے لئے عربی فارسی کی عجیب الخلقت ترکیبیں جا وبیجا طور پر ٹھونسی جانے لگیں، لیکن زبان کے وارث یعنی جمہور کے قوائے ذہنی کب اِن شکنجوں میں جکڑے جا سکتے تھے، اور کب ان کی طبیعتیں نفسیاتی اُصول کے خلاف "مقیاس الحرارت" "قرطاس ابیض" "مقاطعۂ جوع" "طیارہ" وغیرہ کی متحمل ہو سکتی تھیں، وہ تو برابر تھرمامیٹر، وائٹ پیپر، بھوک ہڑتال اور ہوائی جہاز ہی بولتے اور لکھتے ہیں، اور بولتے اور لکھتے رہیں گے، پھر اگر اُردو لکھنؤ کے گلی کوچوں، دِلّی کی مجلسوں، یا چند علماء کی درسگاہوں یا شاعروں اور ادیبوں کے حلقۂ تلمذ یا ارباب فن کے ایوانِ ادب تک ہی محدود رہتی یا صرف پامال وہوس کارانہ حُسن وعشق کی داستان سرائی تک اس کا عمل وتصرف رہتا یا محض تفنن وتفریح ہی کا مشغلہ بنی رہتی تو ضرور یہ پابندیاں جو اُصول وفن کے نام سے عائد کی جاتی ہیں نبھ سکتی تھیں، مگر زمانہ نے کروٹ لی اور ایسی کروٹ لی کہ ساری دُنیا کی کایا پلٹ ہو گئی، ایسا انقلاب آیا کہ زمین وآسمان بدل گئے۔ معجزات سائنس نے تمام عالم کو حیرت میں ڈال دیا۔ دُنیا کے کاروبار مقاصد ومشاغل میں بھی عظیم تغیر پیدا کر دیا۔ نئی نئی ایجادات واختراعات نے انسانی بستی میں چکا چوند کر دی۔ ہر مقام کے سیاسی ومعاشرتی نصب العین میں بھی حیرت انگیز تغیرات رُونما ہُوئے۔ ضعیف اور بے بس ہندوستان اس عالمگیر اور طوفانی ہنگامہ سے کب بچ سکتا تھا اس پاک سرزمین کا وہ معصوم باشندہ بھی جو کسی زمانے میں عبادت وگوشہ نشینی کو معراج حیات ومقصود زندگی جانتا تھا۔ اپنے پُرانے معتقدات سے بغاوت کر اُٹھا، اور زمانہ کے متواتر تلخ تجربوں نے اس پر ثابت کر دیا کہ خلوت پسندی وتنہا نشینی کی میعاد ختم ہو گئی، اس کی زندگی اب تمام دنیا کی مجموعی زندگی کا مستقل جزو بنکر ہی قائم رہ سکتی ہے اور دُنیا کی مجموعی زندگی ہزاروں قسم کی سرگرمیوں پر مشتمل ہے، ان تمام سرگرمیوں میں نہ سہی چند در چند ایسی ضرور ہیں، جن میں استقلال وخلوص کے ساتھ حِصّہ لئے بغیر ہندیوں کو چارہ نہیں، ایسی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے لازم ہے کہ زبان کو بھی لامحدود وسعت دی جائے، اس لئے کہ کوئی قوم اپنی مکمل زبان کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی، یہاں کسی ایک زبان کا مقتضیات وقت کے مطابق مکمل ہونا درکنار ابھی یہی نہیں معلوم ہے کہ کونسی زبان اس سخت کشمکش اور آزمائش کے وقت ہمارا ساتھ دے سکے گی، بہرحال کوئی زبان بھی ہو۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اُسے چلنا پڑے گا اور انگریزی سے بھی اُسے مدد لینا ہو گی، جمہور اپنی روز افزوں ضرورتوں کے مطابق ہر صنعت وحرفت فن اور مشغلہ میں صدہا الفاظ مروجہ زبانوں سے گھڑتے چلے جاتے ہیں، جن کا سکہ بازاروں، کارخانوں، ملوں، کلوں، تفریح گاہوں اور اخباروں میں رواں ہے، مثال کے طور پر ایک لفظ "رتیائی" پیش کرتا ہوں، جو کانپور کے ملوں میں کام کرنے والوں نے (night Shift) کے لئے گھڑا اور خوب گھڑا ہے، اسی قبیل سے "ہوائی جہاز" بھی ہے، اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ رتیائی سے بہتر (night Shift) کے لئے کوئی دوسرا لفظ عربی فارسی کے قاعدوں سے وضع نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس میں شک ہو تو کسی عربی فارسی کے عالم کا امتحان لے لیا جائے:۔

کسی زمانے میں اساتذہ اپنے خلوت خانوں میں بیٹھے بیٹھے زبان پر احکام صادر کیا کرتے تھے، اُن کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد اِن احکام کی پابندی پر جان دیتے تھے، اُس وقت اُردو کی غرض وغایت ایک تفریحی مشغلے سے زیادہ نہ تھی، اب ملک کو ایسی

زبان کی ضرورت ہے، جو اس سرزمین کی گوناگوں خصوصیتوں کو محفوظ و قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ زمانے کے مطابق ہر قسم کی ترقی کا آسان وسیلہ بن سکے، ظاہر ہے کہ وہ قانونِ زبان جو خلوت خانوں میں بیٹھکر مرتب کیا گیا تھا اس قسم کی زبان کا ساتھ نہیں دے سکتا، اور تنگ اور سخت بندشوں میں رہ کر کوئی زبان وہ خدمت انجام نہیں دے سکتی جس کی اب ہمارے مُلک کو ضرورت ہے، ادیبوں اور شاعروں کا اب یہ فرض ہے کہ زبان کی جکڑ بندیوں کو ڈھیلا کریں، نئے الفاظ اور ترکیبوں کا جو سرمایہ داخل ہو رہا ہے، اُس کو قومی ضروریات کا مفید ثمرہ اور ارتقائے قومی کا لسانی وسیلہ سمجھیں، ادب میں اُس کی صحیح جگہ معیّن کریں، ادب و شعر کو جمہور کی عام بول چال اور گھریلو زندگیوں کے مطابق بنا کر ہر دلعزیز بنائیں، جس سے شعر و ادب عوام کی رہنے بسنے کی سب حالتوں کی اصلاح کا ذریعہ بن سکیں، اُن کی سماجی دلچسپیوں کو بہتر بنا سکیں، ان میں کشمکش حیات کے مردانہ مقابلہ کی قوت پیدا کریں، زندگی کے مقاصد سے خبردار بنائیں، مختصر یہ کہ جو تمام ملکی و قومی زندگی کو بہ حیثیت مجموعی بلند کر کے مضبوط ہموار اور پاکیزہ بنائیں، یہ تمام مقاصد آسان اور گھریلو زبان کے بغیر پُورے نہیں ہو سکتے، اور یقیناً اس زبان سے یہ مہم سر نہیں ہو سکتی جو بات بات پر زبان کاٹے اور قدم قدم پر بیڑیاں ڈالے

اِس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ اگر ہر شخص کی بولی زبان میں داخل کر لی جائے تو زبان چوں چوں کا مربہ بن کر رہ جائے، اس کا سب سے پہلا جواب یہ ہے کہ اُردو متعدد زبانوں کا مرکب ہونے کے باعث چوں چوں کا مربہ تو ہے ہی، بنکر کیا رہ جائیگی دوسرے یہ کہ ہم کو ضرورت ایسی ہی زبان کی ہے جو تمام بولیوں کی قائم مقام ہو اور جو دیہاتوں میں بسنے والے کسانوں کیلئے بہ نسبت شہریوں کے زیادہ سود مند ہو، چند شہر والے اپنے مرصّع کمروں میں آرام سے بیٹھکر غالب - آتش - داغ وغیرہم کے دیوانوں کا لطف حاصل کیا کریں لیکن عوام کو اس سے کیا فائدہ ہے :-

ان تمام باتوں کے باوصف میرا یہ بھی مطلب نہیں کہ خواہمخواہ ہر غلط سلط لفظ کو جو عوام میں رائج ہو زبان کا معتبر جزو مان لیا جائے، یا ادب کی حدود ہی مٹادی جائیں، صرف ضرورت یہ ہے، کہ ان حدود کو وسیع کر دیا جائے، جو بہت سے پُرانے قواعد توڑے بغیر ناممکن ہے، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ہمارے ارباب فن بہت سے پُرانے سکّوں کو جو صدیوں سے رائج ہیں نام نہاد قواعد و ضوابط کی گرفت میں لا کر زبان کے خزانے سے خارج کر رہے ہیں اور عجیب عجیب ہیئت کی ترکیبیں اُن کی جگہ لے رہی ہیں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا - یہ کیوں ہو رہا ہے اس پر مفصل بحث ہندی، اُردو ہندوستانی کے عنوان سے اِسی رسالہ میں اپریل ۱۹۳۶ء میں کی جا چکی ہے آگے چلکر کچھ ایسے الفاظ پیش کئے جاتے ہیں جو متقدمین کے عہد سے ابتک زبان کا ٹکسالی سکّہ بنے ہوئے ہیں، مگر عربی فارسی کے دلدادہ صرف و نحو کے قواعد یا لغت کے ماتحت ان کو اُردو سے خارج کر دینے پر مُصر ہیں - اور چاہتے ہیں - کہ یہ زبان ہماری مرضی کے مطابق رواج پائے، یہ ممکن ہے یا نہیں، ملکی ضروریات ثابت کر رہی ہیں - بہرحال یہ ظاہر ہے، کہ ان ضوابط و قواعد نے ان اساتذۂ فن کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ ضرور دیدیا ہے، جسے وہ معیار کے نام سے استعمال کر کے دُور دُور تک اپنا رُعب بٹھائے ہوئے ہیں اور جس تصنیف اور مصنف کو چاہتے ہیں مجروح و مضروب کر دیتے ہیں :-

قانونِ قدرت کی راہیں انسانی تصرفات سے باہر ہیں، اور جب کسی سرزمین میں انقلاب آتا ہے تو وہاں کی قوم نیا جنم لیتی ہے، پُرانے اداروں میں تبدیلی ہو جاتی ہے، اور زبان بھی پُرانی بندشوں سے آزاد ہو جاتی ہے، اور نئی نئی ضروریات، نئے نئے مشاغل و مقاصد کے پُورا کرنے کے لئے نیا چولا بدلنا شروع کر دیتی ہے۔ اس بارے میں اجارہ دارانِ فن کے لئے ایران کی مثال بہت سبق آموز ہے ایران میں آج کل جو زبان رائج ہے اُس کو وہاں کی پُرانی زبان سے کوئی علاقہ نہیں، اگر اب سے پچاس برس ہی پہلے کے ادبا و شعرا وہاں آج نمودار ہو جائیں تو نہ اُن کی بولی کوئی سمجھے نہ وہ کسی کی، اب جو زبان وہاں رائج ہے اُس میں ہزارہا لفظ ایسے ہیں جو اپنے پُرانے لغوی یا اصطلاحی معنی کی حدود سے آزاد ہو کر نئے نئے مطالب و مفہوم ادا کرتے ہیں اور ہزاروں لفظ نئے ایسے وضع ہو گئے ہیں، جو نہ پُرانے لغات میں ملتے ہیں نہ پُرانی صرف و نحو کے قاعدوں میں آتے ہیں، ان سب کو جدید فارسی کا نام دیا جاتا ہے خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ اب میں وہ الفاظ پیش کرتا ہوں، جو اب تک شاعروں اور انشا پردازوں کا دستور العمل بنے ہوئے ہیں، اور جن کا قلع قمع کر دینے کے لئے اہلِ فن ہر وقت شمشیر بکف بیٹھے رہتے ہیں، ان الفاظ کو دو ذیلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے

(۱) وہ الفاظ جو عربی فارسی میں کچھ معنی رکھتے ہیں اور اردو میں کچھ اور، لیکن اب ان کا استعمال عربی یا فارسی معنی کے خلاف غلط بتایا جاتا ہے

(۲) وہ الفاظ اور ترکیبیں جو اپنی ساخت میں غلط بتائی جاتی ہیں:-

۱- وہ الفاظ جو عربی فارسی میں کچھ معنی رکھتے ہیں، اور اُردو میں کچھ اور، لیکن اب ان کا استعمال عربی یا فارسی معنی کے خلاف غلط بتایا جاتا ہے

لفظ	عربی یا فارسی معنی	اردو معنی	سند
دقت	باریکی	مشکل	"یہاں سے اس نے مصر کا رُخ کیا..... جو بے دقت اُسکے قبضہ میں آ گیا" (محمد حسین آزاد۔ سکندرِ اعظم) ع "بلا دِقت میں بن جاؤں تری ساس" اکبر الٰہ آبادی "اُن میں اور شعر میں حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہے، زیادہ دقت اس لئے ہوتی ہے" (شعر العجم حصہ ۴)
اوقات	جمع وقت	حیثیت	"میں تو غریب آدمی ہوں ٹکے کی اوقات" (جامِ سرشار ۲۹۱)
عرصہ	میدان	مدت	"اور عرصۂ دراز کے بعد انکی زبان کو ادبی شان نصیب ہوئی" (تنقیدات عبد الحق ص۲) کہتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے (غالب) ع تواں بعرصۂ چِل روز یا دو ماہ رسید (نعمت خاں عالی)
سرپرست	خادم	مربّی	"یہ بھی تجویز ہے کہ اس انجمن کی سرپرستی میں ایک سلسلہ اُردو معلّٰی کے نام سے جاری کیا جائے" (تنقیدات عبد الحق)

لفظ	عربی یا فارسی معنی	اُردو معنی	سند
			"اور کتاب کو اُردو کے سب سے بڑے سرپرست اعلیٰ حضرت . . . کی طرف نسبت دیکر نظامِ اُردو کے نام سے موسوم کر دیا" نظامِ اُردو معذرت از آرزو لکھنوی
معافی	صیغہ اسم فاعل بمعنی عفو کنندہ	چھما	"طبع کے بعد معافی مانگنا یہ اور ستم ہے" نوٹ:- قابلِ معافی اور طالبِ معافی عام طور پر رائج ہیں"
فرصت	نوبت	آرام پانا	"ہر خطے میں آلام و امراضِ گوناگوں کا رونا اور قلتِ فرصت کا دونا ہے" (تنقیداتِ عبدالحق) "فرصتِ ناز بھی پہروں نہیں ملتی افسوس وہ ہے مصروف سنبھالے فراواں کوئی (داغ)
مضطر	بے اختیار و بیچارہ	بے قرار	"اُس کی چتون پھرتے ہی محفل میں ہلچل پڑ گئی مضطرب کو مضطرب مضطر کو مضطر لے چلا (داغ) ع ساتھ اپنے اُنہیں لے گئی بانوئے مضطر" (انیس) مضطر ہوں چین آنے پہ آتا نہیں مجھے رونے میں منہ نظر آتا نہیں مجھے (انیس) ع دیکھنے جاؤ ہمارے دلِ مضطر کے مزے (داغ)
فضا	فراخی زمین و کشادگی صحن	بہار، حالت	اک داغ رہ گیا ہے سو وہ بھی مٹا مٹا دل میں بہارِ عشق کی اب وہ فضا نہیں (داغ) ع سُنا جو کرتے تھے وہ باغ پُر فضا ہے یہ (چکبست) ع ازل میں تھی جو فضا اُس کا یادگار ہے یہ (چکبست) "شاید آپ کو میں نے لفظ فضا کی تحقیق لکھدی تھی، اگر اُردو کے معنی لئے جائیں تو بہار کے ہو سکتے ہیں" شوق قدوائی مرقع ادب صفحہ ۹۱
محرم	واقف کار	انگیا	کسی کی محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا
مشکور	شکر کیا گیا، ستودہ	شکر کرنیوالا	ایک نے مجمع سادات میں بڑھ کر یہ کہا گرچہ اس لطف کے مشکور ہیں ہم خاک نشیں (شبلی)

لفظ	عربی یا فارسی معنی	اردو معنی	سند
			"نہ یہ کہ سارا پنجاب خاص اردو کی واقفیت کیلئے ان کا مشکور رہو۔" (منشورات از کیفی دہلوی) ع نہ ہو مشکور کیوں پھر بندہ لطفِ کبریائی کا (ذکی تلمیذ غالب) "مدت کے بعد نامہ سعادت آیا ممنون و مشکور کیا۔" (امیر مینائی مرقعِ ادب ص۲۵)
منت	احسان کردن	خوشامد	اس نے مانی نہ کوئی میری بات منتیں کر کے بات بھی کھوئی (داغ)
تکلیف	کار فرمودن	دکھ	شبِ فراق کی تکلیف سے یقین آیا مقابل اس کے جہنم میں عیش ہوتا ہے (فارغ)
خاطر	دل	آؤ بھگت مدارات	"وہ جوہری بچہ ڈٹا ہوا ہے اور بڑی خاطریں ہو رہی ہیں۔" (جام سرشار ص۲۳) "اُن کی خاطر داری اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔" (محمد حسین آزاد - سکندر اعظم) ع "نانا کی طرح خاطرِ اُمت تھی زیادہ" (انیس)
مرتبہ	درجہ، رتبہ	بار - دفعہ	اُردو میں اس کا استعمال دفعہ کے معنی میں عام ہے اور اب فارسی میں بھی اس معنی میں عام ہو گیا ہے۔ جیسے ذیل میں "ازاں جملہ نہ سال و ہشت ماہ مرتبۂ اول حکومت نمود و بعد ازاں پانزدہ سال در کابل و قندھار مرتبۂ ثانی۔۔۔۔" (از زینت الزماں ذکر جلوس ہمایوں)
غصہ	اندوہ	غیظ، کرودھ	قلزم کے بدن میں لگ گئی آگ منہ پر غصہ سے آ گئے جھاگ (منشی جوالا پرشاد برق) غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے (آتش)
روزگار	زمانہ	روزی	"ایک لڑکی چھ مہینے کی گود میں، ابھی تک کوئی صورتِ روزگار نہیں اور نہ کہیں سے اُمید ہے۔" (شریف زادہ از مرزا رسوا لکھنوی)

میں نے صرف چند الفاظ مثال کے طور پر پیش کئے ہیں۔ اور جن مقامات پر خط کھینچ دئے ہیں۔ اُن سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہ اور اسی قبیل کے دیگر الفاظ اپنے اُردو مفہوم میں صرف مفرد استعمال نہیں ہوتے، بلکہ تراکیبِ فارسی کے ساتھ بھی ان کا استعمال جائز ہے۔

۲- وہ الفاظ اور ترکیبیں جو اپنی ساخت میں غلط بنائی جاتی ہیں:-

لفظ	کیفیت	سند
نشّی	نشہ سے بنایا گیا بمعنی نشہ کرنے والی چیز	"اس کو کسی نشّی دوا سے بیہوش کرکے بھگا لے گیا" (جام سرشار صفحہ ۲۳۹)
نشیلی	نشہ سے رسیلی کے انداز پر بنایا گیا	ع یوں نشیلی ایسی متوالی نہیں (داغ)
زہریلی	زہر سے رسیلی کے انداز پر بنایا گیا	"معشوق کی آنکھ کو زہریلی شعرائے فارس نے بھی کہا ہے" (شوق قدوائی مرقع ادب ص۵۵)
عادی	عادت سے بنایا گیا	ع ہم جو عادی ہو گئے دشنام کے (داغ) ع قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی (چکبست) تیغ ابرو کی زبان عادی ہوئی بات سیدھی بھی جو کی ٹیڑھی ہوئی (خواجہ وزیر)
سوائے	اصل لفظ سوا ہے	"سوائے وہی ڈینگ اور کوئی بات نہیں (جام سرشار ص۸۲) کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیئے (غالب) "اُن سب نسخوں میں سوائے ایک کے یہ شعر یوں لکھا ہے" (تنقیدات عبدالحق ص۲)
بہتات	عربی فارسی میں کوئی لفظ نہیں	دل ہمارا موردِ آفات ہے رنج کی بہتات ہی بہتات ہے (داغ) گوناگوں تیلیوں کی بہتات کب ہوتی ہے جب ہو خوب برسات (صفی لکھنوی)
بدحواسی	فارسی میں بے حواسی مستعمل ہے	کیا کہوں وجہ بدحواسی کی ہوش پرّاں ہیں رنگِ محفل سے (داغ) ع سمجھ لیا ہے ستمگر نے بدحواس مجھے (داغ) بجائے مے دیا پانی کا اک گلاس مجھے سمجھ لیا مرے ساقی نے بدحواس مجھے (سرور جہان آبادی) "شیریں کمان کی بدحواسی اور غم و غصّہ اور رنگِ چہرہ کے بہ انداز پر بغور نظر ڈال رہی تھی" (جام سرشار ص۱۱-۱۰)

لفظ	کیفیت	سند
تلاشی متلاشی	نثر کی لفظ تلاش سے بنے ہیں	نکلا ہے تلاشی سے فقط اک درم داغ یاروں کو مرے دل پہ ہزاروں کا بھرم تھا (داغ) ع جلوت میں یوں ہے وہ کہ تلاشی ہے چشمِ شوق (داغ) شب کو خیال رہتا ہے اک رشکِ حور کا ظلمت میں دل مرا متلاشی ہے نور کا (آتش)
بادشاہت	یہ لفظ چاہت کے طریقہ پر بنا ہے	"یہ بہار دیکھ کر اپنے رفقا سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا میں اسی عیش و عشرت کا نام بادشاہت ہے" (محمد حسین آزاد۔ سکندر اعظم)
رہائش	فارسی حاصل مصدر (ش) کے انداز پر رہنا سے بنا۔	انشا کی دریائے لطافت میں ص۱۳۱ پر اور رسالہ صبح امید میں جس کے ایڈیٹر حضرت چکبست تھے صفحہ ۳ و ۳ پر استعمال ہوا ہے
قدیمی	اصل لفظ قدیم ہے	"میں ہوں آپ کا قدیمی دعاگو" (امیر فقیر مرقعِ ادب ص۲۴)
صافی	اصل لفظ صاف ہے	آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را (غالب) آبِ صافی بنکے نکلا ابرِ تر سے ہے برستا قطرہ قطرہ خاک پر
بہبودی	اصل لفظ بہبود ہے	"لیکن زبان کی بہبودی اُن کی یا کسی کی خوشنودی پر فوقیت چاہتی ہے"۔ (منشورات از کیفی دہلوی ص۲۷)
شروعات	شروع سے بنایا گیا	"یہاں سے اُردو کی تنسیق و تنظیم شروع ہوئی جو اُنیسویں صدی عیسوی کی شروعات تک برابر جاری رہی" (منشورات از کیفی دہلوی ص۶۷)
تبادلہ	عربی فارسی میں کوئی لفظ نہیں	"تبادلۂ خیالات کے بعد اُنہوں نے مجھی کو اس کام کے لئے مجبور کیا۔ (نظام اُردو از آرزو لکھنوی ص خ) (نوٹ۔ یہاں تبادلہ ترکیب اضافی کے ساتھ ہے)
سہ کرر	مکرر کی مثال پر بنایا گیا	"نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک قافیہ کو مکرر سہ کرر باندھنا پڑتا ہے" شعر الہند ص۲۰۹ از عبد السلام ندوی)
بلا	بے اور لا دونوں ہم معنی نہیں ہیں اور دونوں دو زبانوں کے جزو ہیں اس لئے بلا غلط کہا جاتا ہے،	"اُردو کی اصل وہی زبان مانی جا سکتی ہے جس کے الفاظ سے بلا شرکت غیرے کوئی ایسا جملہ بن جائے جسے اُردو کہہ سکیں (نظامِ اُردو از آرزو لکھنوی ص۸)

لفظ	کیفیت	سند
		ع "بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس" (اکبر الہ آبادی)
لاچار	لا عربی اور چار فارسی، اسلئے غلط کہا جاتا ہے	قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا (ذوق) ع اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے (چکبست)
ازحد	بمعنی ازحد زیاد	"اس ننگ کو بیٹی کے باپ نے گوارا نہ کیا۔ قیس کو ازحد رنج ہوا" (شریف زادہ مرزا رسوا صہ ۵۹) بہت نادم خجل ازحد نہایت منفعل ہو گے اگر منھ ڈال کر دیکھو گے تم اپنے گریباں میں (حکیم محمد آور) گرچہ ازحد ہوں گنہگار مسلمان تو ہوں پیچھے پیچھے مرے دوزخ میں بھی جنت آئی (داغ)
بُوباس	ایک لفظ فارسی ایک ہندی	بوباس غیر ہے تیرے پھولوں کے ہار میں (داغ) (نوٹ۔ اضافت کے ساتھ بوباس ہے)
پھبتی نما	ایک لفظ ہندی ایک فارسی	"جدید لیکن پھبتی نما تشبیہیں بھی اس رنگ کا ایک لازمی جزو ہیں" (شعر الہند صہ ۳۰۲)
سمجھدار	" "	"سمجھدار آدمی سے زیادہ کہنا دیوانہ پن ہے" (منشورات از کیفی دہلوی صہ ۲۲۶)
تابعدار	تابع کے ساتھ دار زائد ہے	ع غمخوار باپوں کی رہیں ماؤں کی تابعدار تم (حالی)
ڈھلمل یقین	ایک لفظ ہندی ایک عربی	"بلکہ عمل سے بھی ضعیف الاعتقاد اور ڈھلمل یقین ہیں" (منشورات از کیفی دہلوی صہ ۱۶۲)
فوق البھڑک	ایضاً	وہ مس فوق البھڑک لباس زیب تن کئے اتراتی پھرتی تھی (جام سرشار صہ ۲۳۹)
لگاوٹ باز	ایضاً	"انکھڑیاں لگاوٹ باز" " "
گراں ڈیل	ایضاً	"وہ بڑے گراں ڈیل اژدہوں کی طرح منھ کھولکر (جام سرشار صہ ۲۱۶)
بے ساختہ پن	ایضاً	زیور کی نہیں حاجت ہرگز بھی حسینوں کو معشوق وہ ہے جس میں بیساختہ پن ہوگا (قانع)
گل تکیہ	گل مخفف گال ہندی اور تکیہ عربی	وہ گل تکیہ میرے مرقد میں رکھنا معطر ہو جو زلفِ مشکبو سے (داغ)

سند	کیفیت	لفظ
وہ رہگذر، وہ کوچہ وہ در مجھ سے کب چھٹا کچھ ہوش کا لگاؤ بھی دیوانہ پن میں ہے (داغ)	ایک جزو فارسی ایک ہندی	دیوانہ پن
"مگر اُن کی بے پروائی اور لااُبالی پن سے کچھ بعید نہیں" مرقعِ ادب صفحہ ۳۲	ایک جزو عربی ایک ہندی	لااُبالی پن
قفس ہی میں جائیں گے ہم گلستاں سے ہمارا یہاں دانہ پانی نہیں ہے (داغ)	ایک جزو فارسی ایک ہندی	دانہ پانی
غلطیہائے مضامین مت پوچھ لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں (غالب)	اصل لفظ غلط ہے	غلطی
دل روزِ حشر اُس کا طرفدار ہو گیا بگڑا مرا معاملہ جھوٹے گواہ سے (داغ) ع طرفداری قیامت میں کریگا پاسباں میری (داغ) ہم تو دیوانے ہیں مجنوں کی کسے جائینگے ہیں حسین آپ طرفداریٔ لیلےٰ کیجے یہاں طرفداری بہ ترکیب اضافی ہے (نجمی لکھنوی)	بمعنی جانب دار استعمال ہوتا ہے ایک لفظ عربی ایک فارسی ہے	طرفدار
اے ہمصفیر میری فغاں کا ہے رنگ اور آواز پاٹ دار کہاں عندلیب کی (داغ)	ایک جزو ہندی ایک فارسی	پاٹ دار

" قریب المرگ" کو اس لئے غلط بتایا جاتا ہے کہ قریب عربی ہے اور مرگ فارسی، اور عربی قاعدہ سے دونوں کا پیوند لگایا گیا۔ اگر اس لفظ کو زبان سے خارج کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ کسی کے اختیار کی بات نہیں تو حدِ امکان اور حور و غلمان وغیرہ کو بھی نکالا جائے۔ ان میں بھی ایسا ہی نقص ہے لفظ تو ہیں عربی اور جوڑ فارسی اضافت و عطف سے لگایا گیا ہے۔ لیکن ان کو کوئی نہیں نکال سکتا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ایسے الفاظ اور ترکیبوں کو عربی فارسی قاعدے سے جانچا ہی کیوں جائے انہیں عربی فارسی کا ایسا پیوندی جزو کہیئے، جو اُردو ہے، ورنہ اگر ایسے الفاظ کو غلط ہی کہہ دیا جائیگا۔ تو بہت سا سرمایہ ایسا خارج ہو جائیگا۔ جس کی جگہ کوئی دوسری چیز پُر نہ کر سکے گی، اور خارج کہاں سے ہو جائیگا۔ صرف علماء و بُلغا کی تحریرات سے، جمہور تو اسی لفظ سے اپنا کام نکالیں گے، جو موقع اور محل کے مطابق ہوگا، اور ان الفاظ نے اپنا خاص محل و مصرف

زبان میں پیدا کر لیا ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا، اردو تو اردو فارسی میں بھی ایسے الفاظ اور ترکیبیں ملتی ہیں جن کا ایک جزو عربی ایک فارسی ہے، مثلاً خیمہ گاہ۔ ارادت کیش۔ عقیدت مند۔ یہی نہیں بلکہ فارسی نے بہت سے ہندی الفاظ کو بھی اپنا لیا مثلاً بادلہ پوش۔ چہرہ بند، جھاڑ۔ گلاب۔ فارسی جو ایک اجنبی زبان تھی۔ اس نے ہندی کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ اور اردو کے ٹھیکہ دار اپنی ہی زبان کے الفاظ کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں، اسی سلسلہ میں اضافی و عطفی تراکیب کے متعلق بھی کچھ ضمناً عرض کرنا مقتضائے مقام ہے۔ اردو میں اضافت کے لئے 'کا' 'کے' 'کی' ہیں اور عطف کے لئے اور، اور فارسی میں یہ کام زیر زبر پیش اور واؤ سے لیا جاتا ہے، فارسی میں اضافی و عطفی تراکیب سے دو اغراض پورے ہوتے ہیں: ایک تو کلام میں کسی قدر اختصار ہو جاتا ہے اور دوسرے ترکیب میں چستی آجاتی ہے اس کے لئے اب تک یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ہندی لفظ کے ساتھ فارسی اضافت یا عطف نہ آنا چاہیئے، مثلاً موسمِ برسات' یا رنگ و روپ' کہنا صحیح نہیں، لیکن زبان کی روز افزوں ترقی واضح کر رہی ہے، کہ اُسے اس قید سے بھی آزاد کرنا ہوگا۔ اور اس کے ادب کو زندگی کی نئی روشوں کے سانچے میں ڈھلنا ہوگا اور ضروریات جو ترکیبیں اختراع کرنے پر مجبور کر رہی ہیں: ارباب فن کے غم و غصہ کے برخلاف ادبی جزو بنکر رہیں گی، کس کی مجال ہے جو ذیل کی ترکیبوں کو اور ایسی ترکیبیں صدہا ہیں، جمہور تو درکنار تعلیم یافتہ طبقہ ہی کے استعمال سے روک سکے،

ممبرانِ لیگ۔ کارکنانِ کانفرنس۔ ممبرانِ بورڈ۔ جلسۂ بورڈ۔ مالکانِ مل۔ افرادِ کمیٹی۔ طلبائے کالج۔ کاریگرانِ مل۔ افسرانِ محکمہ۔ لیڈرانِ ملک و قوم وغیرہ وغیرہ جب فارسی، عربی اور عربی عربی الفاظ فارسی کی اضافی و عطفی تراکیب کے ساتھ رواج پاکر مستند ہوگئے، جیسے حدِ امکان اور حور و غلمان اور ہندی فارسی الفاظ میں بھی افصح الفصحا داغ نے اضافت لگانے میں تعصب نہیں برتا جیسے بو باسِ غیر" تو انگریزی اور ہندی لفظوں کے ساتھ کیوں تعصب برتا جائے، دورِ حاضرہ کے وسیع النظر ادیبوں اور شاعروں نے اس کا احساس بھی کر لیا ہے اور اس کی مثالیں بھی پیش کر دی ہیں، حضرت عزیز لکھنوی مرحوم فرماتے ہیں:۔

کنارا کیجیے گا صحبتِ رندانِ کالج سے غضب ہی ڈھائیں گے اے شیخ یہ پھندے ہیں انگریزی

اکبر الہ آبادی کے یہاں اس قسم کی مثالیں متعدد ملتی ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک بات اور یاد آگئی وہ بھی عرض کردوں، اردو میں عربی فارسی کے بہت سے ایسے لفظ مستعمل ہیں جن کے اول میں حروف متحرک ہیں۔ جیسے کلمہ۔ صدقہ۔ ارنی۔ حرکت۔ برکت وغیرہ نثر میں تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ الفاظ صحت حرکت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں یا نہیں، مگر نظم میں جہاں ایسا کوئی لفظ حرفِ دوم کے سکون کے ساتھ آیا۔ کہ ارباب فن نے فوراً فتویٰ لگا دیا غلط غلط۔ اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ فارسی میں بھی یہ پابندی توڑ دی گئی ہے مثلاً

موسیٰ ازیں جام تہی دید دست | شیشہ بکہ پایۂ ارنی شکست

چناں بادشمشیر دستے فشاند | کہ در خرمن عمر برکت نماند (قدسی)

قضا با خجلتِ سائل بزمینم درکرد | بے زری کرد من انچہ بقارون زرکرد (صائب)

زبس خوش حرکت و شیریں ادا بود | کہ گر میداد تیزی خوشنما بود (ملا فوقی)

اوپر کے شعروں میں ارنی، برکت، خجلت، حرکت بہ سکون حرف دوم آئے ہیں، اُردو کے شعرا نے بھی یہ تصرف جائز رکھا ہے، میرؔ کو یہ کہے ہوئے زمانہ گزر گیا:-

"خدا کے واسطے کلمہ بتوں کا پڑھ زاہد"

لیکن ناواقفانِ اُصولِ زبان مدعیانِ فن بنگر عام رواج کے خلاف احکام صادر کرتے ہیں، اب اُن سے کیا کہا جائے، سوا اس کے کہ اُردو کے اساتذہ کے یہاں سے نظائر پیش کر کے اُن کی مزید تشفی کر دی جائے:-

اشکِ خجلت کسی میکش کے جو وہ رخ میں گریں | اوس پڑ جائے دہکتے ہوئے انگاروں پر (داغ)

تعلیم کا شور ایسا تہذیب کا غل اتنا | برکت جو نہیں ہوتی نیت کی خرابی ہے (اکبر الہ آبادی)

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت | بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت (حالی)

ع سر دینے میں سبقت کہیں کرتے ہیں وفادار (انیس)

ہاتھوں کو جوڑتی ہوں میں یا شاہ بحر و بر | شفقت کی اُس کے حال پہ ہر دم رہے نظر (انیس)

شاعری میں ان قیدوں میں اور بھی اضافہ کر دیا گیا ہے، مثلاً حروفِ علت کا دبنا۔ تعقید، ترکیبِ اضافی و عطفی میں اعلانِ نون، یائے مشدّد کا آنا، وغیرہ وغیرہ جس پر کبھی کسی دوسری فرصت میں کچھ عرض کیا جائے گا۔

"زمانہ" (شام موہن لال جگر بریلوی)

سیّد ہمایوں مرزا صاحب کے بعد

میرے شوہر سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹرایٹ لا علیہ الرحمۃ ہمیشہ مجھ سے یہ کہا کرتے تھے کہ ہماری اولاد نہیں ہے ہمارے بعد کیا ہوگا کون فاتحہ پڑھے گا حسرت و مایوسی ہمارے مزار پر برسے گی ہم گمنام ہی دنیا سے چلے، ہمارا کوئی بھی تو وارث نہیں میرے باپ دادا کا نام ختم ہو رہا ہے، یہ باتیں سُن سُن کر مجھے بھی افسوس ہوتا تھا۔ کہ ان کا کوئی بھائی بہن بھی تو نہیں، میں کہا کرتی تھی آپ دوسرا عقد کر لیں اگر کہو تو میں خود آپ کے لئے کوئی لڑکی تجویز کر دوں، مگر انہوں نے میرے اصرار پر بھی دوسرا عقد نہیں کیا اور ۷۰ سال کی عمر

میں دُنیا سے رُخصت ہوئے، اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ جو لوگ صاحب اولاد گذرے جنہوں نے دولت بھی چھوڑی اور اولاد بھی ان کا سنگِ مزار بھی نہیں۔

پچھلے سال میں لاہور گئی تھی، اور سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئی، چبوترے پر مزار ہے نہ مقبرہ بنا ہے نہ سنگِ مزار ہے۔ شادؔ مرحوم کے پوتے کا خط میرے نام آیا ہے۔ کہ جناب شادؔ کا سنگِ مزار لگوا دیجئے۔ یہ حالت اُن لوگوں کے مزار کی ہے جنکو دُنیا پُوج رہی ہے اقبال کے نام پر ہر جگہ جلسے ہوئے انجمنیں قائم ہوئیں رسالے نکلے مگر اب تک یہ مزار تیار نہیں ہوا۔ یہ لوگ صاحب اولاد بھی تھے، اور نام بھی خوب پیدا کیا۔ سید ہمایوں مرزا صاحب لاولد تھے پٹنہ عظیم آباد کے رہنے والے تھے نہ بھائی تھا نہ بہن۔ پردیس میں اپنے وطن سے دُور لاوارث دُنیا سے رُخصت ہوئے، انتقال کے بعد حضرتِ اقدس و اعلیٰ سرکار نظام شاہ دکن میر عثمان علیخاں خلد اللہ ملکہ نے تاریخِ وفات ارشاد فرمائی "در جنت ہمایوں ہم برفت" اس تاریخ پر حفیظ ہوشیار پوری نے یہ لکھا ہے۔

در ہوائے عالم نیرنگ بو	سیدِ والا ازیں عالم برفت
گفت تاریخش شہنشاہِ دکن	جانب جنت ہمایوں ہم برفت

اور بہت سے لوگوں نے تاریخیں لکھیں، تعزیت کے جلسے ہوئے، ہائیکورٹ و محکمۂ فوجداری وغیرہ کی تعطیل ہوئی ان کا مقبرہ میں نے ایسا خوبصورت بنوایا ہے، کہ اکثر بڑے بڑے بادشاہوں کا بھی ایسا مقبرہ نہیں ہے جس کے ستون ایک سو چار ہیں مرحوم کی ۵۴ صفحہ کی خود نوشت سوانحعمری "میری کہانی میری زبانی" ہے۔ یہ بھی چھپ گئی ہے، اور حج بدل بھی کروا چکی ہوں۔

مقبرہ میں قرآن خواں موجود ہے مقبرے کے قریب ہی بازو میں ایک مدرسہ بھی بچیوں کا ہے، مدرسہ صغریہ بھی ہمارا ہی ہے مرحوم نے ایک ایکڑ زمین دی تھی۔ اور سات ہزار روپے دئے تھے، اسکول کی لڑکیاں روزانہ نماز مقبرہ میں پڑھتی ہیں۔ قرآن خواں اذان دیتا ہے۔ خوبصورت بلور کی طرح مقبرہ ہے جس کے چاروں طرف کمسن لڑکیاں گھومتی ہیں۔ مرحوم کی پہلی برسی میں "میری کہانی میری زبانی" مفت تقسیم کی اور غربا کو کھانا کھلایا کپڑے تقسیم کئے، اس سن ۱۹۴۰ء میں دوسری برسی ہوئی تو مرحوم کا دیوان تقسیم کیا گیا، اور کتاب حالات بی بی فاطمہؑ جو میں نے لکھی ہے تقسیم کی گئی، غربا کو کپڑے تقسیم کئے کھانا کھلایا۔ مقبرے میں بجلی کی روشنی کی گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے اولیا اللہ کی درگاہ ہے، نہایت خوبصورت۔ میں تنہا عورت اکیلی کیا کر سکتی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس قدر ہمت رنج و غم کی حالت میں مجھ سے یہ مقبرہ بنوا دیا۔ تمام تمام دن مقبرے میں مرحوم کے مزار کے پاس بیٹھی رہتی، مقبرہ بنوانے کی نگرانی میں خود کرتی تھی۔ اور سوانح عمری کا پروف بھی وہیں دیکھتی، میں نے اپنی ڈیڑھ لاکھ کی جائداد غربا کے لئے وقف کردی ہے۔ بیرسٹر صاحب مرحوم ہمیشہ اولاد کی فکر میں رہا کرتے تھے اُن کے لئے جو کچھ ہوا۔ سب خدا کی طرف سے ہوا۔ اولاد والے دیکھیں اور نیک کام کرتے رہیں صرف اولاد کے بھروسے پر نہ رہیں۔ خدا کرے سید ہمایوں مرزا صاحب کا نام ہمیشہ زندہ رہے تاکہ دوسروں کو معلوم ہو کہ لاوارث کا وارث بھی ایک زبردست ذات ہے

صغرا ہمایوں مرزا

مطبوعات

کُلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ریڈر و پروفیسر اُردو جامعۂ عثمانیہ نے مجلسِ اشاعتِ دکنی مخطوطات کی طرف سے گول کنڈہ کے اِس مشہور تاجدار (سنہ ۹۷۳ تا سنہ ۱۰۲۰ ہجری) کے اُردو کلام کا مجموعہ اور حالات و کلام پر تبصرہ ایک ہزار ارسٹھ صفحات کی اِس ضخیم کتاب میں شائع کیا ہے۔ پیش لفظ میں مولوی سید محمد اعظم صاحب صدرِ مجلس لکھتے ہیں کہ "پیوستہ سال سٹی کالج میں دو صد سالہ جشنِ یادگارِ ولی کے موقع پر دکن کے مخطوطات" کی جو نمائش منعقد کی گئی تھی اِس سے معلوم ہوا کہ کتنے ہی انمول جواہر پارے ایسے ہیں جن کی اشاعت سے نہ صرف اُردو ادب کے ذخیرے میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوگا بلکہ اُن سے اُردو کی ابتدائی ترقیوں اِس زبان کی عہد بعہد تبدیلیوں اور عہدِ گزشتہ کی تہذیب و تمدّن کے متعلق نہایت کارآمد معلومات حاصل ہوں گی۔ نیز اس عہد کی کتابوں کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ ابتدائی اُردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ کے ساتھ ہندی کے الفاظ بھی برابر کے شریک تھے جو بعد کو رفتہ رفتہ زبان سے خارج ہو گئے۔

فاضل مرتب نے تین سال کی محنت اِس کتاب پر صرف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر بعض الفاظ اور ترکیبوں کو وہ اب تک سمجھ نہیں سکے تو تعجب نہیں کیونکہ خود محمد قلی قطب شاہ لکھ گئے ہیں:۔

ہمارا علم ہے سب عالماں پر جوں اعجاز — نہ لکھ سکے گا کئے شرح مجھ کتاباں کا

کُلیات سے پہلے تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کا ایک نہایت دلچسپ اور مفید مقدمہ لکھا گیا ہے۔ "محمد قلی قطب شاہ اکبر کا ہم عصر تھا۔ اس کا کلام کسی ملک الشعراء کے شعری کارناموں سے بھی کسی طرح کم نہیں"۔ وہ صرف اُردو کا شاعر نہ تھا فارسی اور تلنگی میں بھی اُس نے ہزاروں شعر لکھے۔ اس کے نعمت خانے میں اس کے دسترخوان پر کبھی دس ہزار آدمی سے کم نہ ہوتے۔ حیدرآباد اُسی کا بسایا ہوا ہے۔ محمد قلی کا اُردو کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں ہر صنف سخن کے وافر نمونے ہیں محلات کی رنگینیاں غریبوں کی زندگی کھیل کود تماشے نیچرل شاعری سب موجود ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ محمد قلی کی زبان میں حلاوت اور شیرینی ہے اور اس کا ناگری حروف میں منتقل ہونا بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے لیکن ہم فاضل مرتب کے اِس دعوے سے متفق نہیں ہیں کہ "اگر کوئی زبان ہندوستانی کہلائی جا سکتی ہے تو وہ اس شاعرِ اعظم کی زبان ہے"۔ مرورِ زمانہ کی وجہ سے تین چار صدیاں پہلے کی ہندوستانی آج کل کیسے ہندوستانی کا کام دے سکتی ہے؟

محمد قلی قطب شاہ کی بیسیوں معشوقائیں تھیں جن میں "بارہ پیاریاں" (ننھی سانولی کونلی پیاری گوری چھبیلی رنگیلی لالالن وغیرہ) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مقدمے کے بعد پہلے ۲۲۴ صفحات میں نظمیں ہیں پھر ۲۹۶ صفحات غزلیات اور ۴۶ صفحات دیگر اصنافِ سخن پر مشتمل ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ ہی ہیں جن کے یہ شعر خاص و عام میں مشہور ہیں :۔

پیا باج پیالہ پیا جائے نا — پیا باج یک تل جیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند — دوانے کوں کچھ پند دیا جائے نا

چند اور شعر سن لیجئے :۔

چند سُو تیرے نور تھے نس دن کو نورانی کیا — تیری صفت کن کر سکے توں آپی میرا ہے جیا
تج نام تے آرام ہے منج جیو سو تج نام ہے — سب جگ کو تجھ سوں کام ہے تج نام جپ مالا ہوا
بندہ ہوں گنہگار خدا میرا گنہ بخش — تج لطف کرا فیض خدا منج کوں سدا بخش
(میرے) (کا) (مجھ کو)
منج جیو کے پھل بن کوں کر آپ شوق ہوں تازہ — منج نین کے درپن کوں آپس مکھ تھے صفا بخش
میرے دل پھول بن کو تیرے سے — (میری آنکھ آئینہ کو اپنے چہرے سے)
منج بخت کے تارے کوں سدا رکھ توں جھلکتا — منج عیش کے سورج کوں سو دن دن نس ضیا بخش

مرتب نے اکثر اشعار میں متروک الفاظ کے ساتھ مستعمل الفاظ درج کر دیئے ہیں جس سے کلام کے سمجھنے میں خاصی آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب بلا شبہ نہایت دلچسپ اور مفید ہے اور ہم مرتب کو اس اعلیٰ درجے کی تالیف پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ کتاب باتصویر اور مجلد ہے قیمت پندرہ روپے ملنے کا پتہ :۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد (حیدر آباد دکن)

کلیاتِ سراج :۔ اس مجلس نے یہ دلکش باتصویر کتاب بھی شائع کی ہے۔ اس کے مرتب عبدالقادر سروری صاحب لکچرر اُردو جامعہ عثمانیہ ہیں۔ یہ سراج اورنگ آبادی کے کلام پر مشتمل ہے۔ شروع میں ایک دلچسپ مقدمہ ہے۔ سراج کی ولادت ۱۱۲۸ھ میں ہوئی۔ سراج آبرو اور میر کے ہمعصر تھے۔ وہ ولی سے بہت سے متاثر ہوئے۔ اُن کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ کلیات کا آغاز سراج کی مشہور مثنوی "بوستانِ خیال" سے ہوتا ہے جو ایک آپ بیتی پر مبنی ہے :۔

ارے ہم نشینو! مرا دکھ سنو — مرے دل کے گلشن کی کلیاں چنو
فلک ہو تو اس چوٹ سے جائے لوٹ — جگر کے جگر کے جگر میں ہے چوٹ
نہ کھلتا ہے دل گشتِ گلزار میں — نہ لگتا ہے جی سیرِ بازار میں
اگر سلطنت ہاتھ آوے تو کیا — وگر کیمیا گر بتا دے تو کیا
کہ جمعیتِ دل پریشان ہے — مرا فرحت آباد ویران ہے

مثنویات کے بعد غزلیات اور متفرقات اور پھر فارسی کلام درج کیا گیا ہے۔

انتخاب ملاحظہ ہو :۔

ہماری انکھوں کی پتلیوں میں ترا مبارک مقام ہوگا — پلک کے پٹ ہم نے کھول دیکھے تو عین ناقہ تمام ہوگا

اے شرابِ خرد کے کیفی نہ کر توں دعویٰ لم یختہ مغزی
مے محبت کا جام پی توں کہ اب تلک ظرفِ خام ہیگا

دو رنگی خوب نہیں یک رنگ ہو جا
سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا

کہو اُس لالۂ گلزارِ جاں کوں
کبھی تو دیکھ داغِ دل کسی کا

شربتِ دیدار کے بن زندگانی ہیچ ہے
بے رُخِ ساقی حیاتِ جاودانی ہیچ ہے

گر حقیقت کی سیر ہے خواہش
راہِ عشقِ مجاز لازم ہے

صنم ہزار ہوا تو وہی صنم کا صنم
کہ اصلِ ہستی ہے یونہ ہے عدم کا عدم

مشتاق ہوں میں تیری فصاحت کا و لیکن
"رانجھا کے نصیبوں میں کہاں ہیر کی آواز"

کتاب کی ضخامت ۴۷۶ صفحات ہے قیمت پانچ روپے ہے۔ ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد (حیدر آباد دکن)۔

سیاستِ ملیہ:- یہ دلچسپ اور مفید کتاب جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے مسلمانانِ ہند کی سیاست (۱۸۵۷ء تا آغاز ۱۹۴۱ء) کی مکمل مفصل تاریخ ہے جسے جناب محمد امین صاحب زبیری مارہروی نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب چونکہ مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اس لئے اسے مصنف نے بجا طور پر راجہ صاحب محمود آباد کے نامِ نامی سے منسوب کیا ہے۔

اس کتاب کے ۱۹ ابواب ہیں۔ افسوس ہے کہ ان میں عنوانات قائم نہیں کئے گئے لیکن نقشۂ ذیل سے ان کی جداگانہ کیفیت ظاہر ہوگی:-

بابِ اول: (تا ۱۸۸۲ء) ہندوستان میں مسلمانوں کا زوال۔ ابتدائی سیاسی میلانات۔ بابِ دوم:- (۱۸۸۵ء تا ۱۸۹۲ء) کانگریس کی تاسیس سرسید کی سیاسی پالیسی۔ بابِ سوم (۱۹۰۰ء تا ۱۹۰۹ء) سیاسی تنظیم کی کوشش۔ نفاذِ اصلاحات۔ بابِ چہارم:- (۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۴ء) انتخابِ جداگانہ سے ہندوؤں کا اشتعال۔ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش۔ بابِ پنجم (۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۹ء) مسلم لیگ اور کانگریس کا میثاق۔ آئینی اصلاحات کی رپورٹ۔ بابِ ششم (۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۳ء) ترکِ موالات۔ بابِ ہفتم (۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۶ء) شدھی اور سنگٹھن کی تحریکات۔ بابِ ہشتم (۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۰ء) نہرو رپورٹ۔ کانگریس کے اجلاسِ لاہور میں اعلانِ آزادی۔ سول نافرمانی۔ بابِ نہم:- (۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۵ء) گول میز کانفرنسیں۔ کمیونل ایوارڈ۔ آل مسلم پارٹیز کانفرنس۔ بابِ دہم: (۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء) کانگریس کی لیگ سے معاندت۔ لیگ کا اجلاس لکھنؤ۔ بابِ یازدہم:- (۱۹۳۸ء) کانگریس اور لیگ میں مذاکرات۔ بابِ دوازدہم (۱۹۳۸ء) اجلاسِ مسلم لیگ منعقدۂ پٹنہ۔ بابِ سیزدہم (۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۰ء) کانگریسی وزارتوں کے صوبوں میں مسلمانوں کے خلاف آئینی و غیر آئینی کارروائیاں۔ بابِ چہاردہم (۱۹۳۹ء) جنگ کا آغاز اور وائسرائے اور سیاسی لیڈروں کی ملاقاتیں۔ بابِ پانزدہم (۱۹۳۹ء و ۱۹۴۰ء) کانگریسی وزارتوں کے استعفے۔ یومِ رستگاری۔ بابِ شانزدہم: (۱۹۴۰ء) اجلاسِ مسلم لیگ منعقدۂ لاہور۔ بابِ ہفدہم: (۱۹۴۰ء) مذاکرات متعلقِ آئینِ جدید وائسرائے کی پیشکش۔ بابِ ہیژدہم (۱۹۴۰ء) سول نافرمانی کی مہم۔ بابِ نوزدہم: (۱۹۴۰ء و ۱۹۴۱ء) پاکستان

اخیر میں مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن اور جدید مردم شماری سے متعلق دو ضمیمے درج کئے گئے ہیں۔

کتاب چھ سو صفحات پر ختم ہوئی ہے اور مجلد ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ ملنے کا پتہ۔ عزیزی پریس آگرہ ہے۔ اس کتاب کے مفید ہونے میں ذرا بھی شک نہیں۔ سیاست کے ہر طالب علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

شمیم کے سو شعر۔ سید جمیل الدین صاحب نے جناب مظفر حسین صاحب شمیم کے سو اشعار کا یہ انتخاب شائع کیا ہے۔ شمیم صاحب ایک کامیاب ڈرامانگار اور ادیب ہیں امید ہے کہ اُن کے اشعار کا یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ قیمت ۴ر پتہ عثمانیہ بک ڈپو۔ دکان ۱۵ محمد علی بلڈنگ بمبئی ۳

انتخاب شاد۔ جناب رضی حیدر صاحب نے حضرت شاد عظیم آبادی کے سو شعروں کا یہ دلکش انتخاب شائع کیا ہے۔ قیمت صرف ۲ر پتہ نورالحسن صاحب۔ مرارپور۔ گیا۔

مکتبۂ جامعہ کا پنج سالہ پروگرام:۔ مکتبہ جامعہ دہلی نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ پانچ سال میں بعض اہم موضوعات پر مفید اور پُر از معلومات کتابیں شائع کرے۔ اس کا پروگرام ہمارے پیش نظر ہے جو ذیل کے حصوں میں منقسم ہے:۔

(الف) علمی اور ادبی کتابیں۔ اسلامیات۔ تاریخ۔ سیاسیات۔ معاشیات۔ تعلیم۔ ادب۔

(ب) بچوں کی کتابیں

(ج) عورتوں کی کتابیں

(د) تعلیم بالغاں

اس پروگرام کو پیش نظر رکھ کر حال میں چار کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

۱:۔ **بحر الکاہل کی سیاست**:۔ اس کتاب میں بحر الکاہل کی جغرافیائی حالت اور اس کے ساحلی ممالک اور جزیروں وغیرہ کے تذکرے کے بعد اس میں مختلف مشرقی، مغربی اور امریکائی ممالک کے مفاد کی وضاحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ موجودہ جنگ یہاں کیا کیا امکانات پیدا کر سکتی ہے۔ کتاب بہت پر از معلومات ہے۔ قیمت مجلد عہ

۲:۔ **قومیت اور بین الاقوامیت**:۔ یہ کتاب اوپر کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ چند باب یہ ہیں (۱) قومیت (۲) قومیت کا ارتقا (۳) مشرق میں قومیت (۴) یورپ کی جدید قومیت (۵) آفاقیت (۶) بین الاقوامیت وغیرہ۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت مجلد عہ

۳:۔ **نازیت**۔ اس سلسلے کی تیسری کتاب شاہد حسین صاحب رزاقی ایم اے نے لکھی ہے۔ اس کتاب کے چند باب یہ ہیں۔ (۱) آمریت اور عمومیت (۲) جرمن مملکت کا ارتقا (۳) فریڈرک اعظم (۴) انقلاب فرانس (۵) بسمارک اور ہٹلر (۶) اتحاد قومی کی مشکلات (۷) عہد نامۂ ورسائی (۸) قومی اشتراکیت (۹) قومیت (۱۰) نسلیت (۱۱) یہودی وغیرہ۔ اس کتاب کا مطالعہ آج کل بالخصوص بہت ضروری ہے۔ قیمت مجلد عہ

۴:۔ **ممالک اسلامیہ کی سیاست**۔ از عشرت حسین صاحب صدیقی۔ اس کتاب میں اسلامی ممالک مصر، ٹرکی، عرب

ایران، عراق، افغانستان، افریقہ کے اسلامی خطوں اور بعض اہم اسلامی شہروں کی سیاسیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسلمانوں کے لئے بالخصوص اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ حجم ڈھائی سو صفحات قیمت مجلد عمہ۔ پتہ۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔

پھریری ۔ یہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کی نئی تالیف ہے۔ اس میں مرزا صاحب کے چودہ دلچسپ افسانے شامل ہیں۔ مرزا صاحب کا لطیف مزاحیہ انداز اب تک ملک میں بہت مقبول ہو چکا ہے اور اُن کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں۔ قیمت مجلّد دو روپے۔

پتہ:۔ کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی ۳

روحِ مکاتیب :۔ حضرتِ ساغر نظامی مدیر ایشیا نے اپنے دوستوں، بزرگوں، شعراء ادباء اور مشاہیر کے وہ خطوط اس مجموعے میں جمع کر دیئے ہیں جو انہیں ۱۹۲۳ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک وصول ہوئے۔ بعض خطوط بلکہ اکثر بے تکلفانہ ہیں۔ اس مجموعے کا مطالعہ یقیناً پُر لطف اور ایک لحاظ سے مفید بھی ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحات قیمت عمہ۔ پتہ:۔ ادبی مرکز میرٹھ۔

گلِ وبلبل ۔ مجموعۂ کلامِ فارسی جناب سید علی عباس صاحب عباس بی۔اے ایل ایل بی۔ عباس صاحب کا کلام زیادہ تر غزلیہ ہے اور اُن کا اندازہ شگفتہ اور دلکش ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

میں سرخوشِ چشمِ ساقی ہوں اور دُردکشِ میخانہ بھی
مذہب ہے حکیمانہ میرا، مشرب ہے مگر رندانہ بھی

وہ میکش ہوں کہ میرا جو نفس ہے تشنۂ مے ہے
نہیں گر ساغرِ مے لب پہ ہے تقریرِ مے خانہ

فارسی

زمانہ نظمِ معیشت چناں کند تبدیل
کہ احتیاج بہ دام و درم نخواہد شد

دوش در گلشن نمودی شغلِ مے   از نشاطِ مے گلستانی ہنوز

حجم ڈھائی سو صفحات سے زائد۔ قیمت عمہ پتہ:۔ انجمن ترقی ادب دہلی۔

دوسری جنگِ عظیم :۔ از جناب محمد مرزا صاحب دہلوی۔ اس کتاب میں دولِ یورپ کی رقیبانہ سیاست کی روشنی میں موجودہ جنگِ عظیم کے اسباب و علل پر ایک سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مختلف عنوانوں پر پینتالیس دلچسپ اور پُر از معلومات باب ہیں کتاب میں ابتدائے جنگِ موجودہ سے لے کر ۱۵ مئی ۱۹۴۱ء تک کے حالاتِ جنگ بھی ہیں۔ یہ کتاب موجودہ سیاسیات کے مطالعے کے لئے بیش بہا ہے۔ حجم ۲۱۲ صفحات قیمت مجلّد عمہ۔

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ "ہمایوں" ۲۴ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(بہمیں)

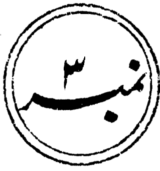
بیادگار علامۂ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے





فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۱ء

تصویر: مسٹر ستیا رتھی، مسز شانتی سُدھا ستیارتھی اور اُن کی بیٹی کوتیا

چندہ سالانہ ﷲ ششماہی سے (مع محصول) — قیمت فی پرچہ: ۸ ر

جہاں نما

ہندوستان کے شاعرِ اعظم ٹیگور کی رحلت

مجھے جن لوگوں سے واقفیت ہے، میں نے اُن میں ٹیگور کو سب سے زیادہ آفاقی، سب سے زیادہ وسیع النظر اور سب سے زیادہ کامل انسان پایا۔ کیزرلنگ

۷ اگست ۱۹۴۱ء کو موت نے ایشیا کے عظیم الشان شاعر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا نام بھی غیر فانی آدمیوں کی فہرست میں لکھ دیا۔ اِس دورِ زوال میں جن ہندوستانیوں کے وجود سے آزاد اور متمدن ممالک میں ہندوستان کی وقعت بڑھی اُن میں رابندر ناتھ ٹیگور کی شخصیت بہت ممتاز تھی۔ وِل ڈیورنٹ نے ٹیگور کو مخاطب کر کے کیا خوب کہا تھا کہ "ہندوستان میں تمہارا وجود ہی اُس کے استحقاقِ آزادی کی دلیل ہے"۔ بنگال یا ہندوستان ہی میں نہیں، دنیا کے ہر مہذب ملک میں ٹیگور کی تصانیف بے حد قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی رہی ہیں۔ خود انگریزی ادب بھی اُن کے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ کسی ادیب کا ایک محکوم ملک میں پیدا ہو کر حکمران قوم کے ادب پر اثر انداز ہو جانا بہت غیر معمولی واقعہ ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو بنگال کے ایک نہایت متمول اور روشن خیال خاندان میں پیدا ہوئے۔ چونکہ اُن کی طبیعت عام مدارس کی رسمی تعلیم سے بچپن ہی میں نفور تھی اِس لئے اُن کی تعلیم کا انتظام گھر ہی پر کیا گیا۔ ۲۴ سال کی عمر میں انہوں نے اپنی جاگیر کا انتظام اپنے ذمے لیا اور فطرۃً شاعر اور فلسفی ہونے کے باوجود اپنے اِن فرائض سے بھی بہت خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے لگے۔ اِس دوران میں اُن کی ادبی سرگرمیاں بھی برابر جاری رہیں ۱۹۱۲ء میں وہ انگلستان گئے جہاں انہوں نے اپنی بعض نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اُس وقت تک کسی ہندوستانی کو "نوبل پرائز" نہ ملا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں گیتانجلی کی تصنیف پر ٹیگور نے ہندوستان میں سب سے پہلے یہ اعزاز حاصل کیا اور حکومتِ انگریزی نے اُنہیں سر کا خطاب دیا۔

ٹیگور کی ذات میں گوناگوں قابلیتیں جمع ہو گئی تھیں۔ شاعری، ڈراما، ناول، افسانہ نگاری، سیاست اور فلسفہ اُن کی فکر کے خاص موضوعات تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ تقریباً ستر سال کی عمر میں جب انہوں نے تصویر کشی کی طرف توجہ کی تو مصوری کے فن میں بھی ایک نیا مسلک قائم کر لیا۔ چنانچہ اُن کی تصویریں ماسکو، برلن، پیرس اور نیو یارک کی نمائشوں میں دکھائی گئیں۔

ٹیگور نے تین ہزار سے زائد گیت، اڑتیس ۳۸ سیاسی کتابیں، اڑتیس ۳۸ ڈرامے اور راگ ناٹک اور اُنیس ۱۹ ناول اور افسانوں کے مجموعے لکھے۔ معلوم ہوا ہے کہ دورانِ مرض میں انہوں نے اپنی ایک سوانح عمری بھی لکھی تھی۔

عمر بھر وہ سیاسی جماعتوں کی ہنگامہ آرائیوں سے الگ تھلگ، وطن اور نسل کی قیود سے بلند رہ کر ایک عالمگیر اخوّت کے خواب دیکھتے رہے لیکن اِس کے ساتھ ہی اپنے ملک کی ذلت آمیز غلامانہ بے چارگی سے کبھی غافل نہ رہے۔ ہندوستان پر غیر ملکی قبضہ انہیں سخت شاق گزرتا تھا اور غیر ملکی حکومت کے ناروا مظالم پر اُن کا دل شاید سب سے زیادہ کُڑھتا تھا۔ اقبالؒ نے شاعر کو قوم کی آنکھ سے تشبیہ دیتے ہوئے بالکل بجا کہا ہے۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

۱۹۱۹ء میں مارشل لا کی حکومت نے جب امرتسر میں پنجابیوں کا بے دردانہ قتل عام کیا تو بنگالی شاعر کو ضبط کی تاب نہ رہی۔ ٹیگور نے اس وحشیانہ ستم آرائی پر شدید احتجاج کرتے ہوئے حکومت کی عطا کردہ سری (Knighthood) کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر واپس کر دیا حالانکہ عام ہندوستانی غلام سری کو بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں۔

آخری زمانے میں وہ ہندوستان کی انگریزی حکومت سے بہت مایوس ہو گئے تھے چنانچہ ایک موقع پر انہوں نے ذیل کا بیان شائع کیا۔

"گردشِ روزگار ایک دن انگریزوں کو ہندوستان میں اپنی سلطنت سے دست بردار ہو جانے پر مجبور کر دے گی۔ لیکن اپنے پیچھے وہ کیسا ہندوستان چھوڑ کر جائیں گے ــــــ کیسا روح فرسا دکھ درد؟ جب بالآخر ان کی صدیوں کے راج پاٹ کی ندی سوکھ جائے گی تو وہ اپنے پیچھے کیسی دلدل، کتنی گندگی چھوڑ جائیں گے۔ ایک زمانے میں یہ میرا عقیدہ تھا کہ یورپ کے قلب سے تہذیب و تمدن کے جال پرور سوتے پھوٹ بہیں گے لیکن آج جب میں عنقریب دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں میرے اس عقیدے کا دوالا پٹ چکا ہے۔"

انہیں دنوں جب ایک انگریزی مس نے ہندوستان کے بعض حریت طلبوں پر کچھ نازیبا حملے کئے تو اسی سال کے اس بزرگ نے بسترِ مرگ ہی سے اُسے سخت قاطع اور دنداں شکن جواب دیا تھا۔ افسوس ہندوستان کا ایک جلیل القدر شاعر اور ادیب ہی نہیں، آزادی کا ایک بہت بڑا علم بردار اور بلند خیال روحانی پیشوا بھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

گزشتہ چند سال سے ٹیگور کی جسمانی صحت جواب دے چکی تھی تاہم اُن کی دماغی اور ذہنی صلاحیتوں میں کوئی فرق نہ آیا تھا بلکہ اس زمانے میں وہ بہت زیادہ نظمیں لکھتے رہے اور دیگر تصانیف کا سلسلہ بھی جاری رہا مگر موت سے تین دن پہلے شاعر پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور اسی عالم میں یہ عظیم الشان ہستی ہستیٔ مطلق سے جا ملی۔

ٹیگور کا جسم خاکی کلکتہ کے نمتلہ گھاٹ پر جلایا گیا۔ اب اُن کی راکھ اُن کی قائم کردہ بین الاقوامی درس گاہ شانتی نکیتن میں پہنچ چکی ہے۔

کلکتہ سے ہمیں ٹیگور کی موت کے متعلق ایک مضمون اور لکھنؤ اور حیدر آباد سے ایک ایک نظم وصول ہوئی ہے۔ یہ سب ذیل میں درج ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور

حامد علی خاں

۷ر اگست کا دن ہندوستان اور خاص طور پر بنگال کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہے گا جس دن ملک کے بلند پایہ فلسفی عظیم الشان محبِ وطن جلیل القدر مفکر اور سب سے بڑے شاعر رابندر ناتھ ٹیگور اس دنیائے آب و گل سے اکتا کر عالم بالا کی طرف سدھارے۔ ٹیگور کی صحت کچھ عرصہ سے خراب تھی۔ ان کے گردے میں کوئی تکلیف پیدا ہو گئی تھی چنانچہ گزشتہ سال بھی اس کے آپریشن کے لئے ــــ لم پونگ سے کلکتہ لائے گئے تھے۔ مگر پھر اس وقت اس کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ درمیان میں یہ تکلیف تو دور ہو گئی تھی مگر ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ یہ آخری علالت جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے ڈیڑھ مہینہ پہلے شروع ہوئی کچھ دنوں تک آیوروید یک علاج رہا، پھر وہ ۲۵ر جولائی کو کلکتہ لائے گئے۔ آہ کس قدر یاس انگیز تھا وہ منظر جب شانتی نکیتن اپنے بانی اور محسن کو الوداع کہہ رہا تھا مگر کسے خبر تھی کہ ٹیگور کو پھر اپنی یہ محبوب سرزمین دیکھنی نصیب نہ ہو گی، اور یہ "الوداع" بول پور سے کلکتہ کے سفر کے لئے نہیں بلکہ ایک آخری سفر کے لئے ہو گی جس سے جانے والے واپس نہیں آتے۔ کلکتہ آ کر وہ اپنے موروثی مکان واقع جوراسانکھو میں مقیم ہوئے، اور سرنیل رتن سرکار، ڈاکٹر بدھن چندر رائے، اور ڈاکٹر ال۔ ام بینرجی کے زیر علاج رہے۔ کمزور وہ پہلے ہی سے تھے۔ نقاہت اور ضعف روز بروز بڑھتا گیا۔ ۳۰ر جولائی کی صبح کو ڈاکٹر ال۔ ام بینرجی نے آپریشن کیا جو کامیاب ہوا۔ اسی دن انہوں نے اپنی

آخری نظم موت۔ کئی طبّی معائنہ سے عام صحت تشفی بخش معلوم ہوئی۔ لیکن یکم اگست کی شب کو پہلی بار انہوں نے سخت بے چینی محسوس کی جو آخر وقت تک سکون کے عارضی وقفوں کے ساتھ برابر جاری رہی۔ انتقال سے پہلے آخری شب کو ۱۲ بجے سانس لینے میں کچھ دشواری محسوس ہوئی، صبح ہوتے ہوتے حالات نے نازک صورت اختیار کر لی اور اب طبیبوں اور عزیزوں کو یقین ہو گیا کہ وہ صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ ۸½ بجے ان کے کمرے میں ان کی اپنی لکھی ہوئی چند مذہبی نظمیں پڑھی گئیں، پھر اُن کے بچپن کے دوست مسٹر راماننددچیٹرجی نے ان کے لئے دعائے صحت کی مگر ٹیگور دنیا اور دنیا کی آلائشوں سے بیزار ہو چکے تھے۔ آخر بارہ بج کر دس منٹ پر سورج ڈھلنے کے ساتھ مشرق کے اس باکمال شاعر کی شمع حیات ہمیشہ کے لئے گل ہو گئی۔ بستر مرگ کے پاس ان کی بہن درنا کماری دیوی، ان کی بہو پراتما دیوی ان کی صاحبزادی میرا دیوی اور ان کے صاحبزادے مسٹر راتھندرا ناتھ ٹیگور موجود تھے۔ اس دردناک سانحہ کی خبر سارے کلکتہ میں بجلی کی طرح دوڑ گئی۔ اور آن کی آن میں سارا شہر ایک بے جان جسم کی طرح اپنے محبوب شاعر کے ماتم میں سوگوار تھا۔ شہر کی عدالتیں، کالج، اسکول، سرکاری دفاتر اور دوسرے ادارے فوراً بند ہونا شروع ہو گئے۔ پرستاروں کی بے شمار تعداد شاعر کی اقامت گاہ، یونیورسٹی، کالج اسٹریٹ اور دوسرے مقامات میں جمع ہونے لگی۔ شاعر کے جنازہ کا جلوس جو کم از کم ایک لاکھ انسانوں پر مشتمل تھا، اور جو اپنی عظمت، سادگی، شکوہ، اور یاس انگیزی کے لئے عرصۂ دراز تک ضرب المثل رہے گا جوڑا سانکھو سے ۳½ بجے روانہ ہوا۔ اسے اپر چیت پور روڈ، چترنجن ایوینیو، کولوٹولہ اسٹریٹ، کالج اسٹریٹ اور ہیریسن روڈ سے گزر کر نمتلہ گھاٹ جانا تھا۔ موسم حد درجہ تکلیف دہ تھا مگر آفتاب کی تمازت اور کلکتہ کی توے جیسی تپتی ہوئی سڑکیں ٹیگور کے عقیدت مندوں کے جوش و خروش کو کب کم کر سکتی تھیں۔ جان نثاروں کی ایک کثیر جماعت جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، بوڑھے بھی اور نوجوان بھی، بچے بھی اور لڑکیاں بھی برہنہ پا چل رہے تھے۔ آنکھیں اشکبار تھیں، دل رو رہے تھے، اور "بندے ماترم"، اور "رابندرناتھ ٹیگور کی جے" کی دردناک صدائیں دل ہلا دیتی تھیں۔ مگر آہ! ٹیگور ان ہنگاموں سے بے خبر پھولوں کے انبار میں دفن، ابدی نیند سو رہا تھا۔ کالج اسٹریٹ میں جہاں لوگ ہزاروں کی تعداد میں سڑک کے دونوں جانب جمع تھے جلوس داخل ہوا تو آدمیوں کے نہ تھمنے والے سیلاب پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ یہاں سینیٹ ہال کے سامنے یونیورسٹی کی طرف سے تعزیت کی ایک مختصر سی رسم ادا کی جانے والی تھی۔ مگر اتنے بڑے مجمع کے سکون کو برقرار رکھنا آسان نہ تھا اسلئے تابوت پر پھولوں کے مختلف ہار رکھنے کے سوا اور کچھ نہ ہو سکا۔ خلاف امید جلوس کو نمتلہ گھاٹ پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ یہاں بھی گھاٹ کے اندر اور باہر، اور ہر چہار طرف تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ مشتاقان دیدار پروانوں کی طرح شہر کے کونے کونے سے سمٹ کر چلے آ رہے تھے۔ جنازہ بدقت تمام اندر لے جایا گیا۔ کچھ عرصہ ہوا ٹیگور نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اُن کے جنازے کی رسوم شانتی نکیتن ہی میں ادا کی جائیں۔ لیکن علالت کے دوران میں انہوں نے اس پر نظر ثانی کی اور اس کا فیصلہ قوم پر چھوڑا۔ چنانچہ جنازہ کی آخری رسمیں انجام دینے کیلئے ان کے عزیزوں اور دوستوں نے نمتلہ گھاٹ کو مناسب سمجھا۔ غرض شام کے سات بجے جب تاریکی دریائے ہگلی پر اپنا تسلط جما رہی تھی رابندرناتھ ٹیگور کا جسم مبارک "بندے ماترم"، اور "ٹیگور کی جے" کے فلک شگاف نعروں کے درمیان چتا پر لٹا دیا گیا۔ اس طرح رابندرناتھ ٹیگور شاعر ہندوستان جو ہم سے پہلے ہی جدا ہو چکے تھے، اُن کا خاکی جسم بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا گیا۔

کلکتہ ۹ اگست ۱۹۴۱ء

مسعود حسن شمسی

۷ اگست ۱۹۴۱ء کی شام

چھپا آج منہ ڈھانپ کر جونہی سورج
مرے دل میں گھنٹہ سا ایک دم گیا بج

دُھندلکوں نے ڈالے فضاؤں پہ سائے
اندھیرے نے کالے پھریرے اڑائے

مری روح کو تن کی رگ رگ ہی جکڑے
کوئی جیسے جنگل میں چڑیا کو پکڑے

اندھیری فضا مرثیہ پڑھ رہی ہے
اُداسی جدھر دیکھئے بڑھ رہی ہے

سُن اے شام سُن میں بھی کچھ گا رہا ہوں
ترے گیت سے گیت اُبھار رہا ہوں

یہ تالاب نالے یہ میداں یہ ٹیلے
یہ آبادیاں آسماں نیلے نیلے

دھوئیں سے گھرے یہ ندی کے کنارے
جھلکتے ہوئے بیچ میں صاف دھارے

یہ ملاّح اور اُن کی یہ کشتیاں بھی
یہ کھیتوں سے آواز دیتے کساں بھی

چمکتے دِیئے بھی وہ آبادیوں کے
کسی گاؤں میں گیت بھی شادیوں کے

مرے غم کا یہ گیت سُن کر رہیں گے
یہ مانا سب اپنی ہی اپنی کہیں گے

سنو سننے والو سنو سننے والو
مرے گیت سے گیت اپنا ملا لو

اندھیرے کا دل آج دہلا رہا ہوں
قضا و قدر کو میں بہلا رہا ہوں

ہوا آج ٹیگور دنیا سے رخصت
نہیں بلکہ رخصت ہُوا کیفِ اُلفت

نمایاں کیا حُسنِ فطرت کو جس نے
خدا کر دکھایا محبت کو جس نے

وُہ بے لوث نقّادِ ہندوستاں کا
مغنّی و شاعر وُہ بنگلہ زباں کا

نہیں بلکہ دنیا میں وہ فردِ یکتا
ہُوا حُسن کو جس کے جادو سے سکتا

گیا گونج مغرب میں جس کا ترانہ
بھرا جس نے انگلش ادب کا خزانہ

لکھے جس نے ناول، مضامیں فسانے
ڈرامے، مُقفّیٰ عبارت ترانے

مغنّی بھی تھا اِک نئے دَور کا جو
مصوّر بھی تھا اپنے ہی طَور کا جو

جو مصلح تھا قوموں کی تنظیم کا بھی
نیا ڈول ڈالا تھا تعلیم کا بھی

بھرا فلسفے کا بھی پھولوں سے دامن
ہوئی "قومیت" نام سے جس کے روشن

دیا جس نے دنیا میں پیغام سب کو
کہ ہے بس محبت سے آرام سب کو

"یہی در حقیقت ہے رمزِ حقیقت
محبت خدا ہے خدا ہے محبت"

وہ شاعر محبّت کا ہم میں نہیں اب
نہیں دارِ فانی سے اب اس کو مطلب

سُن اے میرے شاعر سُن اے میرے شاعر
نہیں اب بھی تو رُوح سے میری باہر

کہ تو ایک سورج ہے میں اک کرن ہوں
وطن میں ہے تو میں غریب الوطن ہوں

نچھاور کروں دل تجھ پہ اشکوں کے گوہر
ترے گیت ہیں روح کا میری جوہر

ترے گیت پہ دیوتا مسکرائیں
فلک پر فرشتے ترے گیت گائیں

ترے گیت پر یہ زمیں گھوم جائے
ترے گیت پر آسماں جھوم جائے

ترا گیت میداں میں جنگل میں گونجے
سمندر میں خشکی میں جل تھل میں گونجے

فضا میں بڑی دور تک پھیل جائے — ترا گیت پربت پہ باجا بجائے
ترا گیت جھرنوں کی کَل کَل میں اُچھلے — ترا گیت ندیوں کی چھَل چھَل میں اُچھلے
نچائے ترا گیت بن میں بگولے — درختوں کی شاخوں پہ جھولا سا جھولے
ترا گیت پتّوں کے ڈنٹھل پہ ناچے — ترا گیت ٹہنی کی کونپل پہ ناچے
لچک پر ترا گیت پودوں کی جھومے — ترا گیت کلیوں کے رُخسار چُومے
ملے غازہ سا پھول کے پیرہن میں — اُڑے تتلیوں کے پَروں پر چمن میں
ترا گیت کھِلے گلوں کی ہنسی پر — ترا گیت کردے ہوا کو معطّر
دلوں میں ترا گیت دائم رہے گا — ترا گیت دنیا میں قائم رہے گا
مرے دل میں ہے گونجتا گو ابھی یہ — مری روح میں گونج اُٹھے گا کبھی یہ

مرے ساتھ جائے گا یہ اُس جہاں تک
جو لا انتہا ہے، نہ جانیں کہاں تک؟!

لکھنؤ ۹ راگست ۱۹۴۱ء — سید مقبول حسین احمد پوری

معرفتہ الکمال

ڈاکٹر ٹیگور کی رسمی نمود — ہوگئی نذرِ فروغِ نار و دُود
جلنے والی چیز جل کر بہ گئی — لیکن عظمت اُن کی تاباں رہ گئی
ڈاکٹر ٹیگور کا ملی وقار — بے نیازِ دولتِ ناپائدار
ایسے ہر اعزاز کو ٹھکرا دیا — مُنفعل تھا جس سے قومی ولولہ
ڈاکٹر ٹیگور جیسے باکمال — آئے پہلے بھی نظر یاں خال خال
عہدِ استقبال میں بھی ہوں گے کم — کیوں نہ ہو ہندوستاں گیر اُن کا غم
بلکہ یہ غم عام ہونا چاہیئے — اُن پہ دنیا بھر کو رونا چاہیئے
بزم آرائے مشاہیرِ جہاں — کیا نہ تھا یہ شاعرِ ہندوستاں؟
اوّلاً نوبل پرائز ان کو ملا — ہند کی حد تک یہ ہیں سرِ سلسلہ
ترجمے کی لے کے عینک مُستعار — میں نے دیکھا ہے جو ان کا شاہکار
آہ! اس کو بھی بھُلا سکتا نہیں — ہے اثر کی یہ تو حدِ آخریں!
اس کی اصلی روح سے واقف جو ہیں — سُن چکا ہوں اُن کے بھی اقوال ہیں
کتنی ہے مسحور کُن یہ شاعری — شاعری کہیئے اسے یا ساحری؟

اِن پہ نازاں اجتہادی مکرمت
معرفہ بن کر رہی "ٹیگوریت"

حیدرآباد دکن ۱۰ راگست ۱۹۴۱ء — سید علی منظور حیدرآبادی

"میں ہوں خانہ بدوش"

"میں ہوں خانہ بدوش"[1] کے نام سے پروفیسر دیوندر ستیارتھی صاحب اپنے بعض مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ شائع کر رہے ہیں۔ ستیارتھی صاحب کو تقاضا تھا کہ اس مجموعے کا دیباچہ جناب میاں بشیر احمد صاحب مدیر "ہمایوں" لکھیں۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ اُن کا تقاضا کامیاب رہا۔ اس دیباچے کو قارئینِ "ہمایوں" کی دلچسپی کے لئے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

جائنٹ ایڈیٹر

تقریباً پانچ چھ سال ہوئے، شاید سردیوں کا زمانہ تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں "المنظر" میں اوپر اپنے کمرے میں میز پر کچھ لکھ پڑھ رہا تھا کہ ایک نوکر نے ایک چھوٹا سا پُرزہ میرے ہاتھ میں لا کر دیا۔ اُس پر لکھا تھا "دیوندر ستیارتھی"۔ میں نے سوالی نظر سے نوکر کی طرف دیکھا۔ وہ بولا "جناب ایک لمبی داڑھی اور کھلے بالوں والا فقیر صورت آدمی ہے"۔ فقیروں سے میری ملاقات ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن پڑھے لکھے فقیروں سے کبھی کبھی مل لیتا ہوں۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ مجھے اس "فقیر" کی صورت پسند آئی۔ اُوپر بلا لیا۔

وہی لمبی داڑھی، بڑی بڑی مونچھیں، لمبے لمبے کھلے بال، روشن آنکھیں، بغل میں ایک بستہ دبائے۔ لمبا قد اور اُس پر ایک لمبا سا کوٹ پہنے یوں ستیارتھی صاحب اندر داخل ہوئے۔ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک ٹیگور نما آدمی میرے سامنے تھا۔ مجھے شانتی نکیتن یاد آ گیا۔

ستیارتھی صاحب نے نرم نرم باتیں کرنی شروع کیں اور اپنے تھیلے میں سے جب "ماڈرن ریویو" اور "ایشیا" کے انگریزی پرچے نکالے اور اُن میں اپنے باتصویر گیتوں والے مضمون مجھے دکھائے اور سنائے تو میں نے بالکل ہتھیار ڈال دیئے۔ مجھ پر ان کا بہت رعب پڑ گیا۔ میں انہیں اُس سے بھی اُوپر کی منزل میں اپنی برساتی میں لے گیا۔ میں نے نوکر کو آواز دی، چائے منگوائی اور جی میں سوچا کہ آج کی شام ادبی عیش و عشرت میں گزارنی چاہیئے۔ ایک حقیقت نگار ادیب سے ملاقات ہو گئی اور وہ بھی بایں شکل و صورت! اُس روز سے لے کر آج تک میں نے بہت کوشش کی ہے کہ ستیارتھی صاحب کے مضامین کو تنقیدی نظر سے دیکھوں مگر سچ یہ ہے کہ کامیاب نہیں ہوا۔ نقص دیکھنے کی ابتداء ہوتی ہے کہ اُن کی وہ ہلکی پتلی سی آواز، ان کی وہ گھنی لمبی داڑھی، اُن کی وہ ساری ہیئت کذائی یاد آ جاتی ہے اور میں پھر اُن کی تحریر سے محض لُطف اُٹھانے لگتا ہوں۔

لیکن انصاف کی نظر سے دیکھئے تو اُن کی تحریر ہے بھی پُر لطف۔ سیدھی سادھی طرز، سیدھے سادھے خیالات، پھر کس طرح جو کہا ہے وہ دل میں جگہ نہ پا لے؟

ستیارتھی صاحب کی عمر اس وقت ۳۲ سال کی ہے۔ جا بجا بالوں کی کثرت نے خواہ مخواہ بزرگانہ شان پیدا کر دی ہے۔ یہ اٹھارہ سال کے تھے کہ نہ معلوم کیوں انہوں نے خودکشی کرنے کی ٹھان لی۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم انہیں سمجھا بجھا کر اگلی دنیا کے مضافات سے واپس یہاں لائے۔ بس واپس آنا تھا کہ بمصداق "ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں" آپ نے ہندوستان بھر میں گھومنا شروع کر دیا اور کہاں تو یہ کہ ساری دنیا سے بیزار تھے اور اب یہ حالت ہو گئی کہ اِسی دُنیا کے درختوں اور پرندوں اور بیلوں اور سبزیوں اور عورتوں اور کسانوں اور ان سب کے اُلٹے سیدھے گیتوں کے عاشقِ زار ہو گئے۔ گھر میں چین نصیب نہیں۔ بلکہ اوّل اوّل تو یوں تھا کہ جیب میں پیسہ نہیں تو بے ٹکٹ ہی ریل کا سفر ہو رہا ہے۔ پھر گھر والوں

---

[1] ناشر "نیرنگ دنیا" نسبت روڈ لاہور

نے بیوی کی زنجیر پاؤں میں ڈالی کہ شاید اسی طرح یہ "سندی" قابو میں رہے۔ لیکن یہ حضرت زنجیر تڑا کر زنجیر ہمراہ لئے پھر اُسی طرح ہر طرف لگے قلانچیں بھرنے اور اس سے وہ جھنکار پیدا ہوئی جس نے "کویتا" نام پایا۔

مجھے اس "غریب ادیب" کی تحریر اس لئے بھی پسند ہے کہ یہ حال کی شہری تہذیب سے بھاگ کر دیہات کی سادہ فضا میں زندگی کا بھید ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ اور میں بھی باوجود اپنی "امیرانہ ادبیت" کے کم از کم نظری طور پر موجودہ تمدن سے بیزار اور عزلت کا دلدادہ ہوں۔

سنئے لکھتے ہیں:۔

"میں گیت جمع کرتا ہوں، عوام کے گیت .... کھلے شگفتہ سکھی جوبن کے گیت، حُسن کے خواب، پریم کے ترانے، پنگھٹ کے گیت، کھیتوں کے گیت، زندگی کی ہر لہر کے گیت، دُکھ اور غریبی کے گیت"

ان کے لئے "گاؤں گاؤں جانا، ہر صوبہ میں لوگوں کے دلوں کا مطالعہ کرنا" یہ ہے اس خانہ بدوش مُصنّف کا کام۔ لیکن اسی پر بس نہیں،

"میں ستاروں کی طرف دیکھتا ہوں جھلملاتے ستارے مستی میں ناچتے بہشت کے چراغ ہی تو ہیں۔ چمکو، چمکنا ہی زندگی ہے .....

صدیوں سے ہم آدمی سے چمکنے کے لئے کہتے آ رہے ہیں"

کبھی وہ برما میں ایراوتی کے کنارے جا لیٹتا ہے:۔

"شام کی سُرخی آسمان پر اور دھرتی پر خاموش ایراوتی۔ یہ نظارہ مجھے مگن رکھتا ہے۔ چت لیٹی ہوئی ریت پر میں بھی لیٹ جاتا ہوں سو نظاروں کا ہے ایک نظارہ ایراوتی کا کنارہ۔ صدیوں سے وہ یوں ہی بہہ رہی ہے۔ وہ اس دیس کی ماں ہے۔ لوگوں کے قہقہوں کی امانت دار ..... جیسے کہہ رہی ہو میں نے ہی انہیں ہنسنا سکھایا ہے ...... یہ فضا مجھے پسند ہے۔ زندگی ہونی چاہیئے ندی کی طرح، کھلی اور آزاد ایراوتی کی طرح .... یہ تیرہ سو میل لمبی ندی ہے ..... شروع میں کوئی بھی دریا یہ جاننے کی پروا نہیں کرتا کہ اُسے کتنی دور جانا ہے۔ وہ بہنے لگتا ہے، یہی زندگی ہے"

"خانہ بدوش ادیب" جو رسالوں میں مضامین بیچ کر اپنے سیر و سفر میں اُن کی "مزدوری" کا انتظار کرتا ہے۔ برما کے اس دریا کے کنارے "امیر اور غریب کے درمیان" حائل ہونے والی "خلیج" کا نظارہ دیکھ لیتا ہے اور کہہ اُٹھتا ہے "کب بدلے گی سماج کی حالت؟" پھر لکھتا ہے:۔

"ایراوتی ہر نئے زمانے کا استقبال کرتی آئی ہے وہ بہتی رہی ہے۔ بہنا ہی زندگی ہے۔ اس میں طوفان بھی آئے ہیں۔ اور اب کے سماج میں بھی ایک بڑا طوفان آ کے رہے گا۔ گھناؤنی رجعت پسندی کی جڑیں اُکھڑ جائیں گی۔ کوڑا کرکٹ بہہ جائے گا۔ اور پھر شاید ایراوتی کے پانیوں پر لوگوں کے آنسو کبھی نہ گریں گے"

دیکھا آپ نے اُدھر ایراوتی مُصنّف کو "شانتی دیتی ہے" لیکن اِدھر مُصنّف کو ایک طوفان اُٹھتا دکھائی دیتا ہے۔ برما کے لوگ ہندوستانیوں کی طرح مُردہ دل نہیں،

"جدھر نگاہ اُٹھاؤ ہنستے ہوئے چہرے۔ لوگ تو میں نے بہت دیکھے بھالے ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اتنے خوش لوگ پہلے

دیکھے بھی ہوں تو یاد نہیں آ رہے۔ اتنی بھی کیا خوشی ہے؟"

گویا ہندوستانی مصنّف کے لیے اِتنی خوشی ناقابلِ برداشت ہوگئی۔

"صدیوں سے اِس دیس کی عورت آزاد ہے۔ مرد نے اس کی آزادی اور خوشی پر چھاپا نہیں مارا۔ اگر وہ اپنے خاوند کی وفادار رہتی ہے..."

"لنکا دیس" بھی ہندوستان سے مختلف ہے:

"اِدھر زندگی کا معیار ہندوستان کی اوسط درجے کی زندگی سے اونچا ہے۔"

"اِدھر سہاگن اور بیوہ کی بھی کوئی پہچان نہیں۔"

اور اِس فقرے نے مجھے بڑا مزا دیا:۔

"شنٹ کرتے ہوئے انجنوں کی طرح خوش پوش جنٹلمین ہر چیز کو گھورتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔"

شاید اِس "سادھو مصنّف" کو بھی انہوں نے گھور کر دیکھا... لیکن اب مئی ۱۹۴۰ء میں یہ کچھ ایسے سادھو نہ رہے تھے چنانچہ انہوں نے لنکا والوں سے بھی خراج وصول کر لیا۔

"اب میں کچھ اتنا غریب نہیں۔ کولمبو کے اخبارات سے مجھے اپنے مضامین کا معاوضہ ملنے لگا ہے۔"

سچ پوچھیے تو یہ سادگی پسند خانہ بدوش سادھو کبھی تھا ہی نہیں۔ "برہمچاری" والے قصّے میں "پنج ترنی" کی کہانی سُن لو۔ "لج پُھلے اندو نن اور[1] "پیار بھی کسی وِدّیا سے سستا نہیں۔" آپ بیتی لکھتے ہیں۔

"میں سنبھل نہ سکا۔ جسم ہارتا جاتا تھا...... اُس کی لمبی لمبی پلکیں اور اُس کے اُبھرے ہوئے گال، کیا یہ سب مایا ہے؟"

اور بے دھڑک کہتے ہیں،

"اِس پیار سے خُدا ناراض ہوتا ہے تو ہو جائے۔ یہ بات تھی تو یہ صورتیں نہ بنائی ہوتیں، یہ جذبات نہ دیئے ہوتے...... کیا برہمچریہ ہی سب سے اونچی چیز ہے؟ کیا اس کے لئے سب لطف چھوڑ دینا چاہیئے؟ یہ سب لطف جو خوبصورتی، گرمجوشی اور خود رفتگی سے مل رہا ہے؟"

واہ "برہمچاری جی!" سچ ہے "آدمی کتنا چھپا رہتا ہے!" "چھلّو" والی داستان میں بھی اِس رنگ کی جھلک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا "جوگی اُتر پہاڑوں آیا[2]"۔ مصنّف دیکھنے کو بھولا بھالا ہے لیکن اُس کی نظر ہر طرف لگی رہتی ہے۔ شُبہ ہونے لگتا ہے کہ چرخہ کاتنے والی دوشیزہ کے جنگلی کبوتر میں بھی آپ ہی کا جلوہ ہے۔ "جنگلی کبوتر نے مینوں تنجن وِچ اکھ ماری[3]!" کتاب کے خاتمے پر "اج دے شقین منڈے، اکھنڈ جھٹک کے باگیاں لیندے[4]" والے

---

[1] حد جنگلوں میں پھول کھل گئے

[2] جوگی پہاڑ سے اُتر آیا

[3] چرخہ کاتنے والی لڑکیوں کی محفل میں جنگلی کبوتر نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا!

[4] آج کل کے شوقین نوجوان (محبوبہ کے گالوں پر) کھانڈ لگا کر بوسے لیا کرتے ہیں!

نوجوانوں میں شاید بیچاری جی جی بھی شامل ہوں! یعنی یہ "بودی والا تارا[1]" ایک عام چلتا پھرتا انسان ہے!

ہر شخص سے، ہر جانور سے، ہر چیز سے مصنف کو جو محبت ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ تہذیب سے گریز ہے، عوام سے لگاؤ ہے۔ اسی لئے اس مجموعے میں متمدن نظمیں نہ ملیں گی بلکہ عوام کے گیت اور وہ بھی دیہاتی گیت۔

"دھرتی کے بیٹے" کون ہیں؟ درخت

"ہمیشہ سے آدمی اور درخت کے درمیان پیار کا ایک لطیف جذبہ قائم ہے اور یہ رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا...... بوڑھے بڑ کی نگاہوں میں ایک ٹھوس سچائی بھری ہے وہی سچائی محنت مشقت کے بعد چھاؤں میں بیٹھے ہوئے کسان اور مزدور کو صدیوں سے محسوس ہوتی رہی ہے........ نہ تنہا آدمی بھلا نہ تنہا درخت۔

"کلّی ہووے نہ بناں وچ ٹاہلی، کلّا نہ ہووے پُت جٹ دا[2]!"

یہ مصنف نرا شانتی پسند نہیں،

زمین میں جکڑے ہوئے درختوں کی رگوں میں بھی لہو دوڑ رہا ہے......"

ہرنی کی درد انگیز پکار سے مصنف کی عمل پسندی جوش میں آ گئی ہے۔

"ہمارے دیہاتی گیتوں میں ہرنی کی پکار نہ جانے کتنی صدیوں سے گونج رہی ہے۔ گاؤں کو ایسی بستی مت سمجھئے جہاں ایک سی عورتیں اور ایک سے مرد کسی نہ کسی طرح ملتی جلتی زندگی کے دن کاٹ کر چلتے بنتے ہیں۔ مصیبت میں سارا گاؤں مل کر دنیا سہے، مل کر کروٹ بدلتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بھوک اور غریبی مٹ جائیں اور گم ہوئی آزادی پھر نصیب ہو جائے۔ ان پُرتحریک لمحوں میں ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے جس کے مطابق صرف قسمت پر شاکر رہنے کا مسئلہ پھیکا پڑنے لگتا ہے۔ اور یہ خیال بھی کہ امیری اور غریبی کی حدیں سدا یوں ہی بنی رہیں گی، مٹنا شروع ہو جاتا ہے۔"

وطن کی محبت ستیارتھی کے رگ و پے میں موجزن ہے:-

"ہندوستان کے طول و عرض میں ہرنی کی پکار گونج رہی ہے مگر سوال تو یہ ہے کیا ہمارا وطن یوں ہی بے کس رہے گا؟ کیا ہماری قوم یوں ہی منہ بسورتی رہے گی؟ شکاری بھائی کب تک اُس کا پیچھا کرتا رہے گا؟ کب ناچے گی ہرنی خوشی میں آ کر؟"

"خانہ بدوش مصنف" کو عوام سے گہرا عشق ہے اور ہونا ہی تھا۔ ہمارے کسانوں کی زندگی جیسا کہ میکسم گورکی نے پُرانے روس کے متعلق لکھا ہے "ایسی غریبی اور جہالت میں گزرتی ہے کہ غم اُن کی تفریح کا ایک بہانہ بن جاتا ہے دکھ اور بپتا سے وہ بچوں کی طرح

---

[1] شہاب یا دُم دار تارا

[2] نہ شیشم کا درخت جنگل میں اکیلا ہو اور نہ کسی کسان کا بیٹا اکلوتا ہو۔

کھیلتے ہیں اور اپنی تکلیف پر شرمندہ نہیں ہوتے۔" لیکن اِس دُکھ درد کا دوسرا پہلو بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ یو۔پی کے دیہات میں چماروں کی محفلوں میں رات کو

"جب ڈھولک بجنے لگتی ہے ساری فضا اُس کی تفرکن پر ناچ اُٹھتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہاں کوئی غربت باقی رہی ہے نہ کوئی غلاظت .... الاؤ کی سنہری روشنی میں کالے کلوٹے آدمی بھی کتنے بھلے دکھائی دیتے ہیں...... کتنے خوش ہیں یہ لوگ جیسے ماضی، حال اور مستقبل کے سامنے پُسنے سچے ہو گئے ہوں۔ کتنا مذاق، کتنی چٹکیاں، کتنے قہقہے، کتنے لطیفے، یہ سب اِس الاؤ کے شعلے ہیں جو اُن کی دلی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔"

"خانہ بدوش مصنف" کہاں کہاں جاتا ہے۔ اُس کے کان میں کیا کیا آوازیں پڑتی ہیں۔

"کھُلی آزاد ہواؤں کے لئے میرا دل ہمیشہ بے چین رہا ہے۔ ہوائیں مجھے اُڑائے لئے پھرتی ہیں......... اور مسافر تو چل پڑے، تو بھی چل۔ رات گئی دن آیا، دیکھ کہیں نہ پڑ جائے مایا کا سایہ۔ ہواؤں کا یہ پیغام میں روز سنتا ہوں۔ میں ہوں خانہ بدوش .... ہمیشہ سڑک مجھ سے کہتی ہے۔ چلو ابھی اور آگے چلو...... کبھی کسی دوست کا خط آجاتا ہے تو زندگی اور بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مَیں نے صرف دوست ہی کمائے ہیں.......

'پتاجی! ہم لنکا کب جائیں گے؟'

'چپ بیٹی ابھی پیسے تو آنے دو کہیں سے۔'

'کہاں سے پیسے آئیں گے؟'

'نیا بھیجے گا۔'

'ضرور؟'

'ہاں ضرور!'

کویتا ہنس رہی ہے، اس کی ماں بھی اور میں بھی۔"

آخری مضمون "جنگلی کبوتر" میں خانہ بدوش مُصنف اپنے گاؤں کا کیسی سادہ اور لطیف زبان میں ذکر چھیڑتا ہے۔

"ماں کی گود کی طرح یہ گاؤں بار بار مجھے بلاتا ہے...... چاروں طرف کتنے ہی چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ راس کماری تک چکر لگا آیا، اِس سے بھی پرے لنکا میں بھی گھوم پھر آیا۔ مگر پاس کے یہ گاؤں میری نظر سے پرے رہے۔"

کتاب اِن لفظوں کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔

"جنگلی کبوتر کی طرح جو آسمان کی وسعتوں کا دورہ کرنے کے بعد پھر دھرتی پر اُترتا ہے، مَیں بار بار یہاں چلا آتا ہوں۔ یہ ساری دھرتی مجھے بلاتی ہے۔ یہاں میں نے جنم لیا۔ میرے سپنوں میں جو درجہ اِسے حاصل ہے وہ کسی دوسرے کا حق نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات

ہے کہ یہ گاؤں ہمیشہ کے لئے مجھے جکڑ نہیں سکتا۔ غربت بھی ہے اور افسردگی بھی مگر دل کو خوش کرنے والے گیت بھی تو ہیں، تھکن اُتار دینے والے، ڈانواں ڈول روحوں کو خود فراموشی کے عالم میں لے جانے والے۔ یہ گیت دھرتی کے بیٹے ہیں اور مستقبل کے امانت دار۔ سنے جاؤ اور گائے جاؤ اپنے گیت پرانے اور نئے دھرتی کے بیٹو!"

مصنف کے گاؤں کا نام نفرت پسند کانوں کے لئے ذرا نامانوس ضرور ہے مگر حب الوطنی کو منطق کی پروا نہیں۔ وہ اپنی سادگی و پرکاری سے سخت کو نرم اور کرخت کو شیریں بنا دیتی ہے۔ یہی کام ستیارتھی صاحب نے کیا ہے۔

کتاب کی تمہید یوں ہے۔

"گھوم گھام کر میں ادبی دنیا کے کوچے میں ایک فقیر کی طرح اپنا کچکول لئے آنکلا ہوں"

ستیارتھی صاحب اگر فقیر ہیں اور پہلے پہلے نظر تو کچھ ایسے ہی آتے ہیں تو وہ بڑے مزے کے فقیر ہیں۔ بعض مجھ سے مصنف ہیں کہ اپنے کمرے کی میز ہی پر بیٹھ کر لکھنا چاہتے ہیں اور بعض "خانہ بدوش مصنف" ہے ہیں کہ جب تک رام چندر جی کی طرح لنکا کا سفر نہ کریں ایک مختصر سا مضمون لکھنے کو بھی ہاتھ میں قلم نہیں اٹھاتے۔ مزاج ہو تو ایسا!

میں اُوپر لکھ چکا ہوں کہ میں اس کتاب کو نقاد کی حیثیت سے دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں تو اس سے لطف اُٹھانا چاہتا ہوں۔ ستیارتھی صاحب اپنے خط میں مجھے لکھتے ہیں "میں صرف تعریف نہیں چاہتا۔ آشیرواد اور مشورہ کے بنا مقدمہ کا رنگ پھیکا ہی رہتا ہے" مقدمہ پھیکا رہا ہو یا شوخ، میں نے کتاب پڑھ کر لطف اُٹھا لیا اور جو لکھنا تھا لکھ دیا۔ ہاں مصنف کی تسلی کے لئے اتنا اور لکھ دیتا ہوں کہ بعض ہندی لفظوں نے بڑا مزا دیا۔ لیکن اگر "لاگو" اور "اپسرا" کے سے شبدوں کا دخل نہ ہوتا تو بہتر ہوتا۔ البتہ حق یہ ہے کہ یہ دخل درمعقولات ہے بہت کم۔ ایک اور بات کی بھی مجھے ذرا سی شکایت ہے۔ دیہاتی گیتوں میں ایسے گیتوں کو جگہ نہیں دی گئی جو عام فہم اُردو سے تعلق رکھتے ہوں۔ میرے ایک یو۔ پی کے دوست نے بھی، جنہیں میں نے راجپوتانہ اور یو۔ پی کے گیتوں کے مشمولہ نمونے سنائے یہی شکایت ظاہر کی۔ اُمید ہے کہ اپنی کسی آئندہ تصنیف میں مصنف اس کمی کو پورا کر دے گا۔

اس سلسلے میں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ستیارتھی صاحب فرقہ وارانہ تعصب سے پاک ہیں۔ چنانچہ اپنے مضمون ہرنی کے اخیر میں لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کے مختلف صوبوں کی دیہاتی زبانوں کا تقابلی مطالعہ بہت اہم ہے۔ اُن صوبوں میں بھی جہاں ہندو آبادی زیادہ ہے یا جہاں کی زبان میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں کتنے ہی فارسی اور عربی الفاظ بھی موجود ہیں۔ بار بار مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ زبان کے متعلق ہمارا تعصب سرے سے سطحی اور بناوٹی ہے۔ لوگ یہ دیکھ کر کسی لفظ کا استعمال نہیں کرتے کہ اُس کا حسب نسب، جنم استھان یا مذہب کیا ہے بلکہ ہر لفظ اُن کی زبان پہ اُسی طرح آتا ہے جیسے دھرتی پر کوئی پودا اُگتا ہے"

اِس سلسلے میں بعض اُن شیریں جملوں کا اعادہ کر دینا چاہتا ہوں جن سے میں نے خاص طور پر لطف اُٹھایا۔

"شاعری کی زبان جذباتی فضا میں جنم لیتی ہے۔ لفظوں میں ایک قسم کا ناچ سا پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے۔" (مجھے گلہ کرنا چاہئے کہ ستیارتھی صاحب نے کبھی نہ مجھے گا کے سنایا نہ ناچ کر دکھایا۔ "خانہ بدوش مُصنّف" ضرور اِن فنوں سے واقف ہوگا)

"سیپی کے سینے میں جیسے موتی پروان چڑھتا ہے گاؤں کے سینے میں گیت پلتے ہیں۔"

"عورت کو سطحی انداز سے دیکھنا کتنا آسان ہے، بہت کم ہیں جو اس کا چہرہ نہیں دیکھتے دل دیکھتے ہیں۔"

"پہلے پہل پرندوں کے میٹھے بول سن کر آدمی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ہوگی۔" (اِس سے مجھے ایمرسن کا وہ فقرہ یاد آ گیا کہ اگر ستارے دس ہزار برس میں صرف ایک رات نظر آتے تو اِنسان صدیوں اُس منظر کو نہ بھولتا)۔

مُصنّف نے گیتوں پر یوں تبصرہ کیا ہے۔

"گیتوں کے جذبات اُن کی زبان سے کہیں زیادہ پُرانے ہوتے ہیں۔"

"گیت کیا ترجمہ کی چیز ہو سکتی ہے؟....... ترجمے میں وہ خوبی نہیں پیدا کی جا سکتی جس سے دیہاتی موسیقی کا جادو ایک ایک لفظ میں جذبات کی تصویر کو زندہ کر دیتا ہے۔"

"یوں گیت تو سبھی اپنی اپنی جگہ دل کی سمٹی ہوئی دنیا میں جذبات کی لہریں پیدا کر دیتے ہیں مگر غمناک گیتوں کی بات ہی کچھ اور ہے....... زندگی میں غم ہے بھی زیادہ۔ تو غم کے گیت ہمیں کیوں نہ پسند آئیں؟"

"دیہاتی گیت بالکل سادہ ہوتے ہیں۔ اِس لئے وہ تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں اور یہی عمدہ گیتوں کی شناخت ہے۔"

"پنجابی شعر و نغمہ کی زبان ہے۔ صدیوں سے پنجابی گیت زندہ ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ جب تک پنجاب کے میدانوں میں دریا بہتے ہیں، اُس کے کھیتوں میں گیہوں اور باقی اناج پیدا ہوتے ہیں اور جب تک 'تِرنجن' میں عورتیں باہم مل کر چرخہ کاتتی ہیں، یہ گیت مر نہیں سکتے۔"

"خدا کی عالم خلقت کے بنیادی ترنم اپنی آپ بیتی سنا کر ہمیں زندگی اور موت کے دوراہے پر لا پہنچاتے ہیں۔"

پنجابی گیتوں پر مُصنّف مست ہے اور سچ یہ ہے کہ مجھے بھی انہیں نے مزا دیا۔

"چرخے دی گوکج سُن کے، جوگی اتر پہاڑوں آیا"[1]

"میرا اے چل چرخہ اوتھے وے جتھے تیرے ہل وگدے"[2]

مجھے شُبہ نہیں کہ "چرخہ اور ہل دیہاتی زندگی کے دو زبردست پہیئے ہیں" لیکن اصل یہ ہے کہ اپنی مادری بولی کے گیتوں ہی میں موسیقی سنائی دے سکتی ہے۔

---

[1] چرخہ کی گونج سُن کر جوگی پہاڑ سے نیچے اُتر آیا۔

[2] میرا چرخہ وہاں لے چل جہاں تیرے ہل چل رہے ہیں۔

اُڈّنی چڑیے اُڈّ وے کانواں
کوتیا کھیڈ دے نال بھراواں[1]"

"کوتیا بی بی رانی
سوہریاں دے گھر جانی[2]"

"منڈے آپنے تھائیں رہندے
نی دھیاں کیوں بنائیاں ربّ نے[3]"

"خانہ بدوش مصنف" کے گیتوں کی دور دور نشرواشاعت ہوچکی ہے۔ ہندی، اُردو، پنجابی، انگریزی رسالوں میں اُن کے مضامین معاوضے پر چھپتے ہیں۔ امریکہ کے رسالے "ایشیا" سے بھی انہیں خراجِ تحسین مل چکا ہے۔ وہ ہندوستان کی تیس زبانوں سے گیت جمع کر چکے ہیں اور اِن گیتوں کو کئی بڑے بڑے آدمی سن چکے ہیں۔ ستیارتھی صاحب گھر بیٹھ کر دیہاتی گیت گانے کے قائل نہیں۔ وہ ایسے خانہ بدوش ہیں کہ غریب کی کوٹھڑی سامنے آجائے یا امیر کا محل، معمولی انسان راہ میں مل جائے یا کسی لیڈر کا پتہ چلے وہ ہر کہیں جا گھستے ہیں اور ہر کسی سے جا ملتے ہیں۔ معلوم نہیں انہوں نے کبھی اپنی نسبت یہ سوچا ہے کہ وہ بڑے" پرچارک" آدمی ہیں، وہ گویا ہر جگہ یہ صدا بلند کرتے سنے گئے ہیں ؎

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے!

اور آج کل کے درویش کو ہونا بھی ایسا ہی آدمی چاہئے جیسے کہ وہ ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں ایک بقچہ ہوتا ہے اُن کا کچکول۔ اس میں "ایشیا"، "ماڈرن ریویو"، "ہمایوں"، "وشال بھارت"، "پھلواڑی" وغیرہ رسالوں کی فائیلیں ہوتی ہیں جن میں اُن کے مضامین چھپ چکے ہیں۔ ساتھ ہی وُہ اپنے متعلق آٹھ صفحات کا ایک اعلیٰ درجے کا پمفلٹ نکال دکھاتے ہیں جس کے سرورق پر اُن کی پُر رعب شبیہ ہے۔ ایک صفحہ اُن کی خود نوشت سوانح عمری کے لئے وقف ہے۔ پھر ٹیگور، گاندھی، سروجنی نائیڈو، ایڈیٹر ماڈرن ریویو، سی۔ ایف اینڈریوز وغیرہ سے ملاقات کا ذکر ہے اور اُن کے متعلق اِن بڑے آدمیوں کی رائیں۔

مجھے یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ مجھ سے "امیر ادیب" کی طرح ستیارتھی صاحب سے "فقیر ادیب" بھی اپنا کیمرہ رکھتے ہیں جس سے وہ مقامات اور اشخاص کو اپنے ساتھ شامل کر کے اُن کی تصویر اُتارتے اور پھر شائع کر دیتے ہیں۔ اِسے کہتے ہیں مشتہر یا مشتہر ادیب۔ چُھپنے چھپانے کی کیا بات ہے۔ تصویر منہ سے بولتی ہے! یہ ہے مستور رہتے ہوئے بھی منظورِ نظر بننے کا ڈھنگ اور کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مصنفین کے لئے اتنی خود پسندی بھی جائز نہ سمجھی جائے تو بیچارے کیا کریں؟

---

[1] اُڑ جا ری چڑیا، اُڑ جا رے کوّے! کوتیا اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیل رہی ہے۔

[2] کوتیا بی بی رانی ہے۔ وہ سسرال میں جانے والی ہے۔

[3] لڑکے اپنے گھروں میں رہ سکتے ہیں۔ ہائے! خدا نے بیٹیوں کو کیوں جنم دیا؟

اِس پمفلٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ ستیارتھی صاحب شروع شروع میں خدا کے فضل سے بلا ٹکٹ ریل کا سفر کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی فاقہ مستی تک بھی نوبت پہنچ جاتی تھی۔ کیا کرتے؟ بنگال سے بمبئی اور کشمیر سے کولمبو تک کے متعدد سفر اور پھر گاؤں گاؤں گھومنا یا کوئی للّو پنجو کرسکتا ہے یا پھر حضرت ستیارتھی۔ جہاں انہیں بہت سی دقتوں کا سامنا ہوا ہے وہاں بلاشبہ انہوں نے زندگی سے خاصا لطف بھی اُٹھایا ہے اور مفید کام کر دکھایا ہے۔

ٹیگور لکھتے ہیں۔

"ہم پروفیسر ستیارتھی کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمیں عوام کے نفس کے تخلیقی پہلو سے دو چار کرایا ہے...."

گاندھی جی کہتے ہیں۔

"ہم شری ستیارتھی کے موقر استقلال کے مداح ہیں جس کی بدولت ہم عوام کے ادب سے روشناس ہوئے...."

سروجنی نائیڈو کہتی ہیں۔

"میں ستیارتھی کے کام کی دلدادہ ہوں۔ وہ ایک سادھو کی طرح گاؤں گاؤں جاتے ہیں اور ہندوستان کے وہ گیت جمع کرتے ہیں جن سے ہمیں صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ساری نوعِ انسان درحقیقت ایک ہی گھرانا ہے! بچوں کی لوریاں اور چرخے کے گیت ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ملکوں میں بھی ایک دوسرے سے کس قدر ملتے جلتے ہیں...."

مئی ۱۹۴۰ء میں جب ہمارا مُصنّف مدراس پہنچا تو مسٹر راج گوپال آچاریہ نے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"پروفیسر ستیارتھی ہمارے عوام کی ذکاوت کے علم بردار ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان بھر میں اُن کے ساتھ کا دوسرا آدمی موجود نہیں۔ اُن کا مشن حب الوطنی سے بھی بلند تر ہے۔ عوام لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن گیت گانا خوب جانتے ہیں۔ خیال سے راگ تک صرف ایک چھلانگ درکار ہے۔ یہ ہے دیہاتی گیتوں کا حُسن، ہماری یونیورسٹیوں کو ستیارتھی صاحب کی مدد کرنی چاہئیے"

غرض ہمارے "خانہ بدوش مصنف" نے صرف دیہاتوں میں آوارہ گردی نہیں کی بلکہ شہروں میں بھی اپنا جال پھیلایا ہے۔ پچھلے دنوں میں یہ مقدمہ لکھنے کو تھا کہ میرے بیٹے منظور بشیر نے ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کے ٹائمز آف انڈیا کے ہفتہ وار باتصویر ایڈیشن میں مجھے انعامی تصویروں میں ایک تصویر دکھائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ستیارتھی صاحب جلوہ گر ہیں۔ کسی مدراسی نے "پری کو شیشے میں اتار کر" جو تصویر اخبار میں بھیجی تو فوراً "نائدِ انعام" پا لیا۔ تصویر کے نیچے لکھا ہے "ستیارتھی" یہ ہے بھدوڑ کا "گیت منگا" "خانہ بدوش مُصنّف"! میں اُنہیں ایک دوست کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

کراچی ۲۰ جون ۱۹۴۱ء

بشیر احمد

اے محبوب

عالمِ شوق کی کوئی نہیں حد اے محبوب ۔۔۔ لمحہ لمحہ ہے ازل اور ابد، اے محبوب

رنگِ تغئیر سے آزاد ہے کیفیّتِ عشق ۔۔۔ اِس میں شامل نہ جنوں ہی نہ خرد اے محبوب

ہے یہ اعجازِ محبّت، کہ محبّت کے خلاف ۔۔۔ خود ہر اک بات ہوئی جاتی ہی رد اے محبوب

پردۂ چاکِ گریباں ہیں ترے دیوانے ۔۔۔ چاک کرتے ہیں حجاباتِ خرد، اے محبوب

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ غمِ دوراں کو، ۔۔۔ کیوں غمِ دل سے ہوئی جاتی ہی کد، اے محبوب

عشق تنہا سہی، بیکس سہی، بے زور سہی ۔۔۔ بس ترے نام کی کافی ہی مدد، اے محبوب

کیا کہوں کس کو، وہاں محوِ فغاں دیکھا ہے ۔۔۔ ختم ہوتی ہے جہاں ضبط کی حد، اے محبوب

عشق نے شرک کی پستی سے بچایا مجھ کو ۔۔۔ عشق ہے شرحِ "ہو اللہ احد" اے محبوب

تو نے مجھ کو غمِ الفت کی امانت بخشی ۔۔۔ کیوں نہ ہو مجھ سے دو عالم کو حسد اے محبوب

سرنگوں، عالمِ برہان و مظاہر ہے یہاں ۔۔۔ خود محبت ہے محبت کی سند اے محبوب

نذر کرتا ہوں ترا وعدۂ فردا تجھ کو
کہیں یہ نذر بھی ہو جائے نہ رد اے محبوب

روشؔن صدیقی

بھوک

(لندنی دوست کے نام خط)

ہم یاس پسند ہیں! یہ بھی خوب کہا۔ لیکن کبھی یہ بھی سوچا ہم امید کہاں سے لائیں؟ یہاں کی دنیا کی فضا میں یا ابتھر ہے یا یاس۔ یہاں نظامِ زندگی کی بنیادیں یاس پر رکھی جاتی ہیں اور پھر ان بنیادوں پر زندگی کی جو عمارت تعمیر کی جاتی ہے اُس کا در و دیوار یاس سے بنایا جاتا ہے۔ یاس آشنا ہندوستانی والدین کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو آنکھیں کھولتے ہی اُسے ہر طرف محرومی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فاقہ زدہ ماں اور غربت کا شکار باپ اُس کی ابتدائی اور اشد ضروریات پوری کرنے سے بھی قاصر ہوتے ہیں۔ ماں اُسے کافی دودھ نہیں پلا سکتی۔ باپ اُس کے تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا مہیا نہیں کر سکتا۔ یہاں ایسا کوئی ادارہ نہیں جو ایسے بچوں کی نگہداشت کر سکے جن سے فطرت نے فیاضانہ سلوک نہیں کیا۔ ایسے بچے جب بھوک اور گرمی سردی سے اپنا پیٹ اور جسم بچاتے ہوئے بڑے ہوتے ہیں تو قدم قدم پر انہیں محسوس کرایا جاتا ہے کہ انہیں دنیا میں "پھینکتے" وقت فطرت کے پیشِ نظر کوئی مقصد نہیں تھا۔ یہ "پھینکنے" کا لفظ میں نے عمداً استعمال کیا ہے تاکہ تم یہاں کے بچوں کی زندگی کی کیفیت کا صحیح اندازہ کر سکو۔ جہاں تم رہتے ہو وہاں ہر ایک بچے کا کوئی وارث و نگہبان ہوتا ہے۔ خواہ اُس کے ماں باپ اُس کے وارث اور نگہبان ہوں یا نہ ہوں۔ ہر ایک مُلک کی حکومت افزائشِ نسل کو قوم و ملت کے لئے مفید خیال کرتی ہے۔ اِسی لئے جب Maternity Homes (سرکاری زچہ خانے) میں بچہ پیدا ہوتا ہے تو اِس دنیائے مصائب میں اُس کے ورود سے قبل اُس کی تمام آسائشوں کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ اوّل تو اس کے ماں باپ اُس کی پرورش کا بار اُٹھانے کے قابل ہوتے ہیں اور یہ نہ ہو تو کوئی امیر کبیر اُسے متبنیٰ بنانے کے لئے پہلے ہی وعدہ کر لیتا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو حکومت اُس کی پرورش کا ذمہ لے لیتی ہے۔ یہ ہے اصل میں پیدائش۔ یہاں جس بے سر و سامانی میں بیشتر بچے وارد ہوتے ہیں اُسے پھینکا جانا نہیں کہو گے تو اور کس نام سے یاد کرو گے۔ بہر صورت اس غلام آباد میں پھینکے ہوئے بچے جب ذرا بڑے ہوتے ہیں تو یا وہ سکول کا رخ کرتے ہیں اور یا محنت مزدوری کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اِس کے سوا یہاں کی غیر دلچسپ دنیا میں بچوں کے بچپن کے ایام کو تباہ کرنے کا اور کوئی طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔ تم پھر کہو گے کہ بچوں کے جو مشاغل میں نے بیان کئے ہیں اِن سے اُن کا بچپن تباہ کیسے ہوتا ہے۔ ہندوستان کی بات سمجھنے کے لئے ہندوستانی دل و دماغ سے کام لینا چاہئے۔ ولایتی تصور سے کام نہیں چلے گا۔ سُنو یہاں کے بچے سکول کیسے جاتے ہیں۔ میں صرف انہی بچوں کا ذکر کر رہا ہوں جو پھینکے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں بیشتر بچے پھینکے ہی جاتے ہیں۔ پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد بہت کم ہے۔ لہٰذا تمہیں اُن کا خیال نہیں کرنا چاہئے۔ حکومتِ پنجاب نے پرائمری تک تعلیم لازمی کر دی ہے لہٰذا قید و جرمانہ کی سزا سے ڈر کر تمام والدین کو بچے سکول بھیجنا پڑتے

ہیں - ورنہ تعلیم کی "لایعنیّت" (خدا نے یہ لفظ درست ہے یا نہیں - بہرحال موزوں ہے) تمام والدین پر روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے - دیہاتی بچے کو شہری بچے سے سویرے جاگ اُٹھنا پڑتا ہے کیونکہ اُس کا سکول گھر سے کم ازکم ایک میل اور بعض دفعہ چار میل کے فاصلے پر ہوتا ہے - یہ بچہ چھاچھ کے ساتھ باسی روٹی کھا کر سر پر بستہ اُٹھا کر سکول کھلنے سے ایک گھنٹہ پیشتر گھر سے چل دیتا ہے - اور اپنے دیگر ہمجولیوں کے ساتھ رینگتا ہوا اور راستے میں پکی ہوئی فصلوں میں سے گنّے، چنے، مکّی، باجرہ اور گندم کے خوشے توڑتا ہوا سکول پہنچتا ہے - بچوں کے سکول میں جمع ہونے تک سکول کے منشی صاحب ابھی اپنے بستر ہی پر بیٹھے ہوتے ہیں - سب سے پہلے آنے والے طالب علموں کو ان کا بستر گول کر کے ان کی چارپائی سکول کے صحن سے اُٹھانا ہوتی ہے - ایک طالب علم کیکر کی مسواک منشی جی کے لئے بنا کر لاتا ہے - دوسرا اُن کا سر دھونے کے لئے دہی یا چھاچھ گاؤں سے مانگنے جاتا ہے - تیسرا اُن کے لئے کنوئیں سے پانی نکالتا ہے - ٹائلیٹ کا یہ ساز و سامان جمع ہونے پر منشی جی کا اشنان شروع ہوتا ہے - سردیوں میں تھوڑے سے پانی سے کام چل جاتا ہے لیکن گرمیوں میں منشی جی چوکی پر لنگوٹا باندھے ہوئے بیٹھتے ہیں تو اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے - بچے کنوئیں سے پانی نکال نکال کر ہلکان ہو جاتے ہیں لیکن منشی جی کی سیری نہیں ہوتی اور سوئے اتفاق سے اگر منشی جی سکھ ہیں اور ان کے "کیسی اشنان" کا دن ہے تو پھر بچوں کے بازوؤں کی خیر نہیں ہوتی - الغرض دن چڑھے تک یہ دھندا جاری رہتا ہے - منشی جی کے محبوب طلبہ اُن کی دیکھ بھال میں لگے رہتے ہیں اور باقی صحن میں یا گلی ڈنڈا کھیلتے رہتے ہیں یا ایک دوسرے سے گالی گلوچ میں مشغول رہتے ہیں غسل یا اشنان کے بعد منشی ناشتہ کرنے بیٹھتے ہیں - اس وقت تمام مقامی نعایم منشی جی کے دسترخوان پر جمع ہوتے ہیں - دہی، چھاچھ، مکھن اور پراٹھے جمع کرنا تو ایک شاگرد ہی کے ذمے ہوتا ہے لیکن ہنگامی تحائف کی بھی کمی نہیں ہوتی - کہیں سے نئی سبزی کا سالن آرہا ہوتا ہے - کہیں سے کھیس کا پیالہ بھیجا جاتا ہے اور کوئی خربوزے اور ککڑیاں اپنے کھیت سے لا کر پیش کرتا ہے - منشی جی نہایت خندہ پیشانی سے ناشتہ کرنے کے بعد جب توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُٹھتے ہیں تو اُس وقت سکول کو دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے - تمام بچے یہ منظر دیکھ کر سہمے ہوئے اپنی اپنی جگہ سمٹ کر بیٹھ جاتے ہیں - اِس وقت منشی جی کی پیشانی پر وہ تیوریاں پڑتی ہیں جو سارا دن نہیں اُترتیں - اور منشی جی کی کامیابی کا سارا انحصار انہی تیوریوں پر ہوتا ہے - اگر کہیں کوئی سخت جان لڑکا اِن تیوریوں سے خائف نہ ہو تو اُس کی مرمت اُس پوائنٹر (pointer) سے کی جاتی ہے جو محکمے نے نقشے پر مختلف مقامات دکھلانے کے لئے منشی جی کو دے رکھا ہوتا ہے - لیکن منشی جی جغرافیہ کا سبق پڑھانے کی بجائے اِس پوائنٹر سے اخلاقی سبق دیتے ہیں - آخر وہ بھی مجبور ہیں - جب سکول کا افتتاح ہوا تھا تو اُس وقت محکمے نے نقشے سکول میں بھجوائے تھے - یہ نقشے رفتہ رفتہ پرانے ہو کر پھٹ گئے - اب ان کی یادگار صرف پوائنٹر ہی رہ گیا ہے تو یہ کیوں نہ کسی کام میں لایا جائے - الغرض منشی جی اپنے خیال میں نہایت کامیابی سے پوائنٹر اور تیوریوں کی مدد سے بچوں کو سبق

ئے یہاں مدرسین کے تین طبقے ہیں - ایک پرائمری سکول کے منشی ہیں جن کی تنخواہ پولیس کے سپاہیوں کے برابر ہوتی ہے - اِسی لئے وہ بیشتر بالائی آمدنی کے سہارے زندہ رہتے ہیں - دوسرا طبقہ ثانوی سکول کے ماسٹروں کا ہے - جن کی تنخواہ کے بیشتر گریڈ حالداروں کے ہیں - لیکن بالائی آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے اکثر فاقہ مستی میں گذرتی ہے - تیسرا طبقہ کالج کے پروفیسروں کا ہے جن کی معقول تنخواہیں ہیں اور کام نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ تنخواہ کے اضافے کے ساتھ ساتھ عقل میں کم ہوتے رہتے ہیں - البتہ نئی طرز کے پروفیسر جاپانی تنخواہوں پر ملازم رکھے جاتے ہیں اور اِن سے کام بھی زیادہ لیا جا رہا ہے -

دینے کے بعد انہیں پھر مفید کاموں میں لگا دیتے ہیں۔ اب کے مرغوب طلبہ کے دوسرے گروہ کی باری آتی ہے۔ اِن کے ذمے منشی جی کے کپڑے دھونا، منشی جی کی بیوی کے کام کرنا، اُن کے بچوں کو کھلانا، اُن کی بھینس کو نہلانا اور چارہ ڈالنا، اور اُن کے گھر کی صفائی کرنے کے علاوہ بیسیوں کام ایسے ہوتے ہیں جن سے پھرتیلے لڑکے بمشکل ہی سارے دن میں عہدہ برا ہوتے ہیں۔ جب منشی جی کے تمام کام بخوبی سرانجام پا جائیں تو سکول میں چھٹی ہو جاتی ہے۔ مقامی طلبا اپنے گھر جا کر ماں باپ کے کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور دُور سے آنے والے طلبہ گنے کھاتے ہوئے اور راستے میں چنوں کے ہولے بھونتے ہوئے شام کو گھر جا پہنچتے ہیں۔ شہری طالب علم کی زندگی مختلف ہے۔ وہ چھاچھ اور باسی روٹی کی بجائے دہی اور کلچے یا پوری سے ناشتہ کرتا ہے اور بستہ سر پر اُٹھانے کی بجائے ایک بیگ ہاتھ میں لے کر نکلتا ہے۔ گھر سے سکول تک اُس کی گذرگاہ اُن غلیظ گلیوں پر مشتمل ہے جن کو اُس کے سکول جانے کے وقت بھنگی اور سقے صاف کر رہے ہوتے ہیں۔ چونکہ سکول میں اُس کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں اس لئے وُہ بیگ کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے یا زمین پر رکھ کر اُس سقّے کو دیکھنا شروع کر دیتا ہے جو نہ صاف ہونے والی بدرو کو اپنی مشک سے پانی کی ایک باریک دھار ڈال کر اِس لئے گیلا کر رہا ہوتا ہے کہ بھنگی اُس کے کناروں پر جمی ہوئی غلاظت کی تہوں کو اُلٹ پلٹ کر تعفن سے ساری گلی کو بُودار کر دے۔ اور صفائی کے داروغے پر ثابت کر سکے کہ اُس دن کا نیکی کا وہ کام جو اُن کے سپرد ہے انہوں نے بحسن و خوبی سرانجام دے دیا ہے۔ اِن بدرروؤں میں اگر کہیں گندہ پانی رُک گیا ہو تو سکول جانے والا بچہ وہاں "نہر نہر" کھیلنا شروع کر دیتا ہے یعنی اِس پانی کے اوپر غلیظ مٹی کا ایک پل ہاتھوں سے بنا کر اُس میں ایک سوراخ نکال کر پانی کے لئے راستہ بناتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اُس نے انجینئرنگ کا کوئی معجزہ کر دکھایا ہے۔ مختلف گلیوں کی مختلف جراثیم سے لدی ہوئی گرد اور بُو سونگھتا ہوا یہ بچہ سکول پہنچتا ہے تو یہاں اپنے لئے اُس کمرے میں جگہ پاتا ہے جس میں تعمیر کے وقت سے لے کر اب تک سورج نے کبھی نہیں جھانکا اور جس میں زلفِ محبوب کی طرح پیچدار گلیوں میں سے ہوا ایک دفعہ آنے کے بعد برسوں سے باہر جانے کا راستہ ہی نہیں پا سکی۔ یعنی یہ اُس کا سکول ہوتا ہے جو ہوا اور روشنی دونوں سے محروم ہوتا ہے۔ درس و تدریس ختم ہونے کے بعد بچہ بھوک سے نڈھال ہو کر سکول کی چاردیواری سے باہر نکلتا ہے۔ یہاں خوانچے والوں کا ایک مجمع اُس کا استقبال کرتا ہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق وہ صبح گھر سے دھیلا، پیسہ یا آنہ لے کر نکلتا ہے اور یہ سرمایہ وہ اُن خوانچے والوں کی نذر کر دیتا ہے جو یہاں باسی پکے ہوئے چنے، سڑے ہوئے پھل، غلیظ چٹنیاں، بھنبھناتی ہوئی مکھیوں والی مٹھائی، ادھ بھنے کباب، ناپاک شربت، اور سوکھے ہوئے لیکن گیلے کپڑے سے تر کئے ہوئے نان بیچ رہے ہوتے ہیں۔ بچہ حریص نگاہوں اور مشتاق ہاتھوں سے اِن غلاظتوں پر لپکتا ہے اور پیٹ کے تنور کو اِن سے بھرتا ہوا گھر چلا جاتا ہے۔

مزدور بچے کی حالت اِس سے بھی بُری ہے۔ روکھی سوکھی روٹی سے ناشتہ کرنے کے بعد وُہ دُکان یا کارخانے کی طرف چل دیتا ہے۔ سارا دن بوجھ اُٹھاتا ہے، دھونکنی چلاتا ہے، لوہا کوٹتا ہے، دھوئیں اور غلاظت سے ہاتھ منہ کالے کر کے ٹوٹتے ہوئے جسم اور ہڈیوں اور تھکے ہوئے پاؤں سے رینگتا ہوا شام کو گھر پہنچتا ہے اور جو مل جائے اُس کو کھا کر سو رہتا ہے اُس کے لئے بچوں کے کھیل بے معنی ہیں۔ اُس کی نازک اور لچکدار ہڈیاں ہتھوڑے کے بوجھ اور آگ کی تپش کو برداشت کرتے کرتے جوان ہونے سے پہلے ہی اُس کے کام کرنے

کے اوزاروں کی طرح سخت ہوجاتی ہیں۔

کھاتے پیتے گھرانوں کے بچوں کے لئے زندگی میں مشقت اور محرومی کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ وہاں کا بچہ نازونعمت کے گہوارے میں ملتا ہے۔ سکول کی آسودگی میں بڑا ہوتا ہے۔ اور طاقت بخش غذا کھا کر جوان ہوتا ہے تو ملک اور قوم اُس کو سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ وہاں قوم کا ہر نوجوان قوم کو عزیز ہے اور قوم ہر نوجوان کا یہ پیدائشی حق سمجھتی ہے کہ اُس کے لوازم حیات پورا کرنے کے لئے اُسے باکار رکھا جائے۔ یہاں نوجوان کی بیکاری کا مسئلہ اِس قدر خطرناک سمجھا جاتا ہے کہ کوئی ادارہ اِس کی طرف توجہ کرنے کی جرأت ہی اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ عین جوانی کے عالم میں یہاں کا نوجوان اپنی اُمنگوں، آرزوؤں اور اُمیدوں کی شکست کے بعد اکثر یہ شعر گنگناتا ہوا دیکھا جاتا ہے:۔ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اِس شعر کی گنگناہٹ کے ساتھ ہی اُس کی یاس پسند زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اضطراب سرد ہونے کے بعد پہلی منزل پر نوجوان کہ رہا ہوتا ہے:۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اب اُس کی زندگی کے کسی شعبے کو دیکھو تو اُس کی یاس تمہیں قومی عذاب بن کر ساری قوم پر چھائی ہوئی نظر آئے گی۔ اُس کے مشاغل حیات، اُس کا کاروبار، اُس کی ذاتی بہتری کی مساعی یہاں تک کہ اُس کے سامانِ تفریح سب یاس کے رنگ میں ڈوبے ہوں گے۔ غلام آباد میں بسنے والے نوجوان کی روح دو تین نسلوں کی مسلسل غلامی کے صدمے سے اِس قدر مضمحل ہو چکی ہے کہ اب اُس میں یہ طاقت ہی نہیں رہی کہ وہ اُمید افزا جذبات سے کوئی کام بھی کر سکے۔ بے بسی، بیچارگی اور بے سروسامانی کی آغوش میں پل کر جب نوجوان عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو یہاں اُس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی جوانی، اپنی کوششیں یہاں تک کہ اپنا لہو مٹی کے بھاؤ بیچنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن اِس فاقوں کی ماری سرزمین میں اُسے کوئی خریدار نہیں ملتا۔ چند سرمایہ داروں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ اُسی کی طرح بھوکے ننگے ہوتے ہیں اور کسی کو یہ استطاعت نہیں ہوتی کہ ملک و قوم کی اِس ارزاں فروخت ہونے والی دولت کو خرید سکے۔ سرمایہ دار اس دولت کو خریدنے کی اہلیت رکھتے ہوئے بھی اِس کام پر آمادہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اُس کا مذہب صرف روپیہ ہے۔ ملک، ملت، قوم اور ملک کی آزادی سے اُسے کوئی تعلق نہیں۔ اُس کی بلا سے ملک میں آگ برسے یا گدھے کو ملک کا بادشاہ بنا دیا جائے جب تک اُس کا روپیہ محفوظ ہے وہ ملک و قوم کی طرف توجہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں سرمائے کے اجارہ داروں کی نہایت قلیل اور محدود تعداد کے سوا باقی سب ہندوستانی مفلس ہیں۔ افلاس کا لازمی نتیجہ بھوک ہے۔ بھوکے رہ کر روح کی بالیدگی کا سامان مہیا کرنے کا خیال ہم فرنگی آقا کی تہذیب سے آشنا ہونے کے بعد ترک کر چکے ہیں۔ اب ہمارے لئے اِس فلسفہ میں کوئی تسکین نہیں۔

مردِ حُر چوں اُشتراں خارے خورد
مردِ حُر خارے خورد بارے بُرد

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے جسم کی تحلیل کے ساتھ ہماری روح اور ہمارا ضمیر بھی مضمحل ہو جاتا ہے۔ اور یاس پسندی کی طرف یہ پہلا قدم ہوتا ہے جو ہمارا نوجوان گرد و پیش کے مایوس کُن حالات سے متاثر ہونے کے بعد اُٹھاتا ہے۔ ایک عرصے تک اور بعض دفعہ بہت قلیل عرصے تک اُس کی جوانی بھوک سے نبرد آزمائی کرتی ہے۔ وُہ اپنی آسائشوں اپنی تفریحوں، اپنی عیاشیوں یہاں تک کہ اپنی ضروریات کو بھی خیر باد کہ دیتا ہے۔ وُہ اپنی سربلندی، خود داری یہاں تک کہ صداقت پرستی اور حق پرستی کو بھی ترک کر دیتا ہے۔ لیکن غلام آباد کی پیچھا نہ چھوڑنے والی بھوک گرسنہ درندے کی طرح جوانی کی صبر آزما گھڑیوں میں اُس کا تعاقب کرتی ہے۔ وُہ اپنی جوانی کو بھوک کے ہاتھوں پامال ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو اُس کا خون کھول کھول پڑتا ہے۔ لیکن اپنی بیچارگی کا کوئی درماں اُس کے پاس نہیں۔ پھر اُس کی یہی بیچارگی بغاوت کی وُہ راہیں اُسے سجھاتی ہے جن راہوں پر چل کر دُنیا کے بڑے بڑے نبی بھی دنیا کے نظام کو بدلنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ وہ اہنسا، برت، عدمِ تعاون، ہنگامی تقریروں، اور بلند نعروں میں اپنے کھلے ہوئے ضمیر کے لئے پناہ ڈھونڈتا پھرتا ہے یا میری طرح تمہیں خط لکھ کر اپنے مضمحل ضمیر کی کمزور آواز کو دنیا تک پہنچانا چاہتا ہے۔ لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔

عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا   ؎
دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا

'مردمی' بہت بڑی چیز ہے۔ یہاں عشق کا جذبہ تک مفقود ہے۔ سینما کے پردے پر رونے والے عاشق اور اُن عاشقوں کو دیکھ کر رونے والے عاشق تو بہت مل جائیں گے۔ لیکن اِن سب کو رونے والا ہی پاؤ گے۔ مردمی یا عشق سے اِن کو دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ جرأت آموز، گستاخ اور بیباک عشق غلام آباد میں اِسی طرح معدوم ہے جیسے وہاں کی دنیا سے رونے والے عاشق معدوم ہیں۔ وُہ اقبال بیچارا یونہی تو نہیں کہا کرتا تھا:۔ ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

تم ہی کہو نومیدی کی راکھ کے ڈھیر میں اُمید کی چنگاری کہاں سے آئے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے جب لندن میں ہم دونوں سیر کو جایا کرتے تھے اُس وقت A. R. P Shelters (ہوائی حملوں سے بچنے کی پناہ گاہیں) نئی نئی کھد رہی تھیں۔ اپنے شوقِ تجسس کی تسکین کے لئے ہم اِن پناہ گاہوں کو کھودنے والوں کے پاس جا کر کھڑے ہو جایا کرتے تھے اور ایک دن تم نے ایک جفاکش فرنگی مزدور سے پوچھ ہی لیا:

'آخر تم اتنی مصیبت میں کیوں گرفتار ہو؟ پتھریلی زمین پر تم پھاؤڑا مارتے ہو تو وہ پتھر سے ٹکرا کر واپس آ جاتا ہے۔ ہوائی حملوں سے تمہیں کیا بچانا ہے جو تم اپنا خون پسینہ ایک کر رہے ہو؟'

مزدور پھاوڑا مارتے مارتے ایک لمحہ کے لئے رُک گیا۔ وہ تمہاری اشتراکی تبلیغ پر غور کر رہا تھا۔ اُسے اپنے افلاس اور بے سروسامانی کا پورا احساس تھا۔ لیکن وہ تمہاری اشتراکی تعلیم کا اثر قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ تمہیں یاد ہے اُس نے تمہیں کیا جواب دیا تھا۔

'مسٹر تمہارا یہ خیال درست ہے کہ میرے پاس اپنی جان کے سوا ہوائی حملوں سے بچانے کے لئے اور کوئی چیز نہیں۔ لیکن یہ اونچے اونچے محلات جو تُم دیکھ رہے ہو ان میں رہنے والے ہمیشہ وہاں نہیں رہتے۔ اور نہ مجھے ہی بیگانہ سمجھتے ہیں۔ میں اپنی قوم کو اُسی طرح عزیز ہوں جس طرح یہ اونچے محلات اور موٹروں والے۔ میرے دست و بازو کی محنت کا صلہ مجھے معقول دیا جاتا ہے اور قسمت کا چکر آزاد ملک میں چلتا ہی رہتا ہے۔ آج ان محلات میں اگر کوئی اور ہے تو کل مجھے بھی ان میں رہنے کا موقع ملے گا۔ زندگی اُمید سے قائم ہے اور میں پناہ گاہ کو اِس لئے کھود رہا ہوں کہ اُس قوم کو بچا سکوں جو مجھے عزیز رکھتی ہے۔ کیونکہ نازیوں کے حملے سے اگر قوم نہ بچ سکی تو مجھے بچانے والا بھی کوئی باقی نہ رہے گا'

ہم کچھ سمجھے اور کچھ نہ سمجھے اور آگے چل دیئے۔ مَیں کل لاہور کی ایک سڑک پر سے گذر رہا تھا اور مزدوروں کو کمیٹی کی sewage کی نالیاں کھودتے دیکھ کر رُک گیا۔ sewage کی گہرائی دیکھ کر لندن کی پناہ گاہ کا گڑھا یاد آگیا۔ یہاں امن کے زمانے میں اِن نالیوں نے شہر کو اِس طرح کھوکھلا کر دیا ہے جس طرح جنگ کی تیاری کے زمانے میں لندن کی سیرگاہوں کو پناہ گاہوں کے گڑھوں نے کھوکھلا کر دیا تھا۔ یہاں بھی ہندوستانی مزدور اپنی عورتوں اور بچوں سمیت مٹی اکھاڑ رہے تھے۔ جون کی اِس دوپہر کو آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ مَیں اور ایک بابو (غالباً ڈگری یافتہ بیکار نوجوان تھا) تماشا دیکھنے لگے۔ مزدور کی چوٹی سے پسینہ بہتا ہوا اُس کے ٹخنوں تک پہنچ رہا تھا لیکن وُہ برابر کدال چلا رہا تھا۔ سامنے ایک "شہنشاہی ملازم" (I.C.S) کی کوٹھی تھی جس کے تمام دروازوں اور کھڑکیوں پر خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی تھیں اور ایک ملازم پمپ سے باری باری اِن ٹٹیوں پر پانی چھڑک رہا تھا۔ بابو کی نگاہیں مزدور کو دیکھتے دیکھتے کبھی کبھی کوٹھی کی طرف اُٹھ جاتیں۔ اور انسانی زندگی کے تفاوت کو دیکھ دیکھ کر وُہ گہرے سوچ میں پڑ جاتا۔ یکایک اُس نے مزدور سے پوچھا۔

'بھیّا یہ کتنی دیر میں ختم ہوگا؟'

'بابو جی ہمیں کیا معلوم۔ ہمیں تو کھودنے سے غرض ہے' مزدور نے کدال روکنے کے بغیر جواب دیا۔

بابو نے پھر پوچھا' تو تم اِس دھوپ میں اِس قدر شدت سے کیوں کام کر رہے ہو؟'

'کام نہ کریں تو کھائیں کہاں سے۔ بابو جی آپ جائیے۔ ابھی ٹھیکیدار آگیا تو آپ کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر خفا ہوگا!'

بابو مایوس ہو کر آگے بڑھ گیا۔ مَیں سوچ رہا تھا ہندوستانی اور فرنگی مزدور میں کتنا فرق ہے۔ کدال دونوں چلاتے ہیں لیکن کام کرنے کا جذبہ اور صلہ مختلف ہے۔ وہاں کے مزدور کا کدال بھی حبِ وطن کے جذبے سے سرشار تھا اور اُس کا صلہ بھی یہاں کے بیشتر بابوؤں کی تنخواہ سے زیادہ تھا۔ نتیجہ ایک اُمید افزا زندگی تھی۔ یہاں کے مزدور کا کدال بھوک کے پہاڑ کو کھود رہا تھا اور اُس کی محنت محض پیٹ کے تنور کا ایندھن تھی۔ نتیجہ ایک بے معنی اور مایوس کن زندگی تھی۔ مَیں بابو کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

غالباً وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ مزدور اُس سے اِس لحاظ سے تو بہتر ہے کہ اُسے پیٹ بھرنے کے لئے کام کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ لیکن تعلیم پانے کے بعد اور اپنی بیشتر جسمانی قوتوں کو تباہ کرنے کے بعد وُہ ذہنی اور جسمانی طور پر یہ کام کرنے کے بھی قابل نہ رہا تھا۔ چلتے چلتے اُس کی یاس انگیز نگاہیں ایک دفعہ پھر اُس کوٹھی کی طرف اُٹھیں جہاں وردی پوش ملازم ٹَٹیوں پر پانی ڈال رہا تھا۔ مزدور کے جہنم اور شہنشاہی ملازم کی جنت کے درمیان وُہ اپنے آپ کو بے بسی اور خافوں کے اعراف میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی بھُوکی نگاہیں جب کوٹھی کی طرف دیکھتیں تو عظیم الشان اور خنک کوٹھی کے در و دیوار پر 'بھوک' کا لفظ جلی حروف میں لکھا ہوا مجھے ایسا نظر آتا جیسے لندن میں سلیفرج کی دُکان سے نظر نہ آنے والی بجلی کی شعاعوں سے شام کو سامنے کے مکان پر اُس دن کی اہم خبریں لکھی جایا کرتی تھیں۔ جانتے ہو اِس ملک میں ایسے بیشمار نوجوان ہیں جن کی آنکھوں سے ہر وقت بھوک کا اعلان ہوتا رہتا ہے اور یہ ایسی بھوک ہوتی ہے جس کا درمان اِن غلام زادوں کے بس کی بات نہیں۔ اِن لوگوں کی یاس پسندی کی تمہیں شکایت ہو تو اِس شکایت کو کیسے رفع کیا جا سکتا ہے۔

یہ اُن عوام کی بھوک کی تصویر ہے جن کی یاس پسندی کی تمہیں شکایت ہے۔ یعنی یہ وُہ عوام ہیں جو تمہارے قول کے مطابق تعلیمیافتہ ہیں اور دل و دماغ رکھتے ہیں۔ لیکن اگر اُن عوام کو دیکھو جو تعلیمیافتہ بھی نہیں تو پھر تم ہندوستان کی یاس پسندی دیکھ دیکھ کر خود بھی مایوس ہو جاؤ۔ مَیں مسوری جا رہا تھا۔ لاہور سے تیسرے درجے کے ایک اُس ڈبے میں گھسنے لگا جس کے دروازے کو چار پانچ اکھڑ سے نوجوان روکے کھڑے تھے۔ میں آگے بڑھا تو ایک نے کہا۔

'یہ ڈبہ فوجیوں کے لئے ہے'

مَیں نے دروازے کی طرف دیکھا وہاں کوئی لیبل وغیرہ نہیں تھا۔ مَیں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

'آپ فوجی ہوں گے۔ لیکن یہ ڈبہ تو فوجیوں کے لئے محفوظ نہیں کیا گیا'

'جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے۔ ہم آج ہی بھرتی ہو کر متھرا جا رہے ہیں۔ ویسے آپ بڑے شوق سے بیٹھئے لیکن چونکہ ہم رات کو شور مچائیں گے اس لئے آپ آرام نہیں کر سکیں گے'

میں نے ہنستے ہوئے اُن کی دعوت قبول کر لی۔ اور ساری رات جاگنے کے لئے تیار ہو کر نشست پر بیٹھ گیا۔ گاڑی چلی۔ رنگروٹوں نے پہلے تو 'اللہ اکبر' اور 'یا علی' کے نعرے لگائے۔ پھر 'ڈھولا' اور 'ماہیا' گانے لگے۔ اس کے بعد حقے کا دور چلا۔ اور گپ شپ ہونے لگی۔ یورپ کی جنگ کی خبروں سے ہندوستان میں جنگی اذکار اِس قدر کثرت سے مقبول ہیں کہ بیشتر شہروں میں فوجی افسروں نے جنگ کے متعلق باتیں کرنے کی ممانعت کر دی ہے۔ فوجیوں نے جنگ کے متعلق ایک دو استفسار کئے اور مَیں مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو گیا۔ رنگروٹوں نے مجھے بیکار سا ہم سفر جان کر اپنی سیاسیات پر بحث شروع کر دی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

'دوست تمہارا تو اُون کا اچھا بھلا کاروبار تھا تم کاروبار چھوڑ کر بھرتی کیوں ہو گئے؟'

دوسرے نے جواب دیا 'بھائی اگر اُون بک سکتی تو ہم اپنی جان کیوں بیچتے۔ ولایتی کارخانے بند ہونے سے ہمارا مال جانا بھی بند

ہو گیا ہے ۔ اور بھوکوں مرتے ہم نے اٹھارہ روپے کے عوض سرفروخت کر دیا ہے ۔ تم نے دیکھا تو تھا ہی کہ رخصت ہوتے وقت میری ماں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی'

اب سب گفتگو میں شامل ہو گئے ۔ اور باری باری کہنے لگے ۔

'دوست ہماری ماں تو تھی نہیں جو رخصت کرتے وقت روتی ۔ البتہ بیوی بچوں سمیت دامن سے لپٹ رہی تھی ۔ لیکن ہم نے سمجھا کہ اِن کے پاس رہے تو بیوی بچوں سمیت بھوک کا شکار ہو جائیں گے ۔ اِس لئے یہی بہتر سمجھا کہ توپ کے منہ سے بھی روٹی نکال کر لانی پڑے تو لانی چاہئے'

'روٹی کا تو کوئی غم نہیں تھا ۔ اچھی بُری مل جاتی تھی لیکن ہمارے گاؤں کے جمعدار صاحب نے کہا کہ فوج میں سرکاری راشن بہت عمدہ ملتا ہے ہفتے میں دو دفعہ گوشت ملتا ہے ۔ ایک دفعہ کھیر بھی ملتی ہے اور سارا ہفتہ بغیر کسی فکر کے ہر روز کھانا مل جاتا ہے'

'بھئی یہ تو درست ہے کہ ہفتہ بھر کھانا مل جایا کرے گا لیکن یہ کہو کہ کھاؤ گے کتنے ہفتے ؟'

'ارے تم تو ایسے ہی مرے جا رہے ہو ۔ یہ کہو کہ بھوک سے مرنا بہتر ہے یا بم سے ۔ یہاں بھوک سے بلک بلک کر مرتے ۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ بم سے یک لخت موت ہو جائے اور پھر ہفتے میں دو دفعہ گوشت کھاتے ہوئے مرنا کتنا خوشگوار ہے ۔ ہم نے تو پچھلے سال عید پر گوشت کھایا تھا ۔ پھر نصیب نہیں ہوا ....'

ساری رات بیشتر اِسی بھوک کی باتیں ہوتی رہیں جو اِن جوانوں کو موت کے منہ میں لئے جا رہی تھی ۔ دن میں دو مرتبہ اور ہفتے میں چودہ مرتبہ گوشت کھانے والے اِس امر کا کیسے اندازہ کر سکتے ہیں کہ گوشت نہ ملنے سے یہ جوان ذہنی انحطاط کے کس گڑھے میں گرے ہوئے تھے اور اُسی جسم کو کس سستے بھاؤ پر بیچنے کے لئے تیار ہو گئے تھے جس کو فربہ کرنے کے لئے انہیں گوشت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی ۔ ایک عرصے تک لندن میں رہنے کے بعد بھوک کے یہ مناظر ذہن سے گم اور نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں ۔ شاید تم ہماری مایوسی کی شکایت کرنے میں حق بجانب ہو لیکن ہماری غلامی کی تصویر کے اُس رُخ کو بھولنا نہیں چاہئے جس میں انسان سے مویشیوں کا سا سلوک کیا جا رہا ہے ۔ پنجابی جوانوں کی ارزاں فروشی کا ذکر سنتے سنتے مسوری پہنچا تو کئی سَو آدمی سنگلاخ راستوں پر اُن گاڑیوں کو کھینچتے ہوئے دیکھے جن کو یہاں کی زبان میں رکشا کہتے ہیں ۔ غلاموں کے اِن غلاموں کو یعنی رکشا والوں کو کام کرتے دیکھو تو مسوری آنے کا مزا کرکرا ہو جاتا ہے ۔ مسوری کی مختلف چوٹیوں سے بادل دست و گریبان ہو رہے تھے ۔ لاہور کی گرمی سے جھلسے ہوئے جسم کو بھی یہاں آکر سردی محسوس ہونے لگی ۔ ہم نے بس سے اُترتے ہی گرم کپڑے نکال کر پہن لئے ۔ اور شہر کی طرف بڑھنا شروع کیا ۔ پاس سے ایک رکشا گذری ۔ رکشا قلی ننگے پاؤں اور ننگی پنڈلیوں سے پتھریلی گذرگاہ پر رکشا کو کھینچتے اور دھکیلتے ہوئے جا رہے تھے ۔ رکشا میں کسی مہاراجہ کی ایک گُچھ گڑیا کی طرح سجی ہوئی بیٹھی تھیں ۔ بیگم نے کہا

'خیر اِن کے لئے رکشا کی سواری میں مضایقہ نہیں ۔ آخر صنفِ نازک ہیں'

اتنے میں ایک اور رکشا گذری ۔ ایک نوجوان لڑکا اور ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر کا آدمی رکشا میں سوار تھے ۔ ایک چڑھائی پر قلیوں

نے بہت زور مارا لیکن رکشا اپنے بھدے بوجھ سمیت ایک انچ اوپر نہ چڑھی۔ مجبوراً انہوں نے سواریوں سے درخواست کی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے رکشا سے اُتر جائیں لیکن سواریاں اِس پر بضد تھیں کہ انہوں نے دام دیئے ہیں اور وہ اُن کو قلیوں کا خون پسینہ ایک کر کے وصول کریں گے۔ قلیوں نے پھر زور مارا۔ ایک سوار کا گھوڑا پسینے سے تربتر پاس آکر رک گیا۔ منہ میں جھاگ تھا اور نتھنوں میں دم نہیں سماتا تھا۔ رکشا پتھر کی ڈھلان سے اوپر نہیں چڑھتی تھی۔ قلیوں نے گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

'حضور آپ ایک منٹ کے لئے اُتر جایئے۔ دیکھئے یہ تو ایسی دشوار ڈھلان ہے کہ جانور بھی یہاں آکر رک گیا ہے ہمیں رکشا ذرا اوپر چڑھا لینے دیجئے۔ پھر آپ بیٹھ جایئے'

• سواریوں نے سُنا اَن سُنا کر دیا پینسٹھ درجے کی سردی میں قلیوں کے کپڑے پسینے سے شرابور ہو رہے تھے لیکن سواریاں پاؤں پر دوشالہ ڈالے ہوئے ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ قلیوں نے دم لے کر ایک دفعہ پھر زور لگایا۔ رکشا گھسٹتی ہوئی پتھر سے ورے چلی گئی۔ اور قلیوں نے اطمینان کی سانس لی اور پھر حیوانوں کی طرح رکشا کو کھینچنا شروع کر دیا۔ کہو اِن انسان نما بار برداری کے جانوروں کے دل کے کس کونے میں اُمید بسیرا کر سکتی ہے۔ اِن کو آزاد ہندوستان میں بھی رکشا کھینچنی ہے اور جانوروں کی طرح کام کرنا ہے۔ یہ کس مستقبل کے لئے اپنے حال سے جنگ کریں اور تمہاری شکایت رفع کریں۔ جانوروں اور بھوکوں کے لئے مادرِ وطن ایک بے معنی چیز ہے۔ سرمایہ داروں کے لئے بنک کے سوا اور کوئی چیز دلچسپ نہیں۔ جاگیرداروں کے لئے اپنی جاگیر کے سوا باقی ہندوستان کوڑی کے مول کا نہیں۔ پھر مادرِ وطن کے لئے کون دردِ سر مول لے۔ تم تو بھرے پیٹ والوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے لندن میں راشن کی زندگی بھی بہت آرام دہ ہے۔ اِس لئے تم بیکار باتوں کو سوچنے میں بہت وقت صرف کرتے ہو۔ ورنہ ہماری یاس پسندی کا گلہ نہ کرتے۔ یہاں تو سب سے کڑا مسئلہ پیٹ کا ہے۔ اِس کو بھر دو تو ہم ابھی سے تمہاری طرح حوصلہ مند ہو جائیں گے۔

محمد باقر

آبادی کا پروانہ

جب میرا دل آباد تھا

میں تنہائی کا پجاری تھا

لیکن جب میرے دل کی دنیا ویران ہو گئی

میں آبادی کا پروانہ بن گیا۔

سنسار ندی

کنارے کنارے چلا جا مُسافر
خُدا کے سہارے چلا جا مُسافر

خطرناک ہیں وادیاں اِس ندی کی — ہُوا نذرِ ہر ناتواں اِس ندی کی
کبھی اِس کی گہرائیوں میں نہ جانا — بلی نہنگ کب مہرباں اِس ندی کی

کنارے کنارے چلا جا مسافر
خدا کے سہارے چلا جا مسافر

اگر زندگی مُعتبر چاہتا ہے — مبارک جو اپنا سفر چاہتا ہے
اماں کی جلو میں سلامت روی سے — پہنچنا اگر اپنے گھر چاہتا ہے

کنارے کنارے چلا جا مُسافر
خدا کے سہارے چلا جا مُسافر

کہیں دل نہ دے بیٹھنا دل لگی میں — یہاں زہر گھولا گیا ہے ہنسی میں
یہاں دوستی وجہِ راحت نہیں ہے — ڈبو دیتے ہیں۔ پردۂ دوستی میں

کنارے کنارے چلا جا مُسافر
خدا کے سہارے چلا جا مُسافر

یہاں نامِ انصاف لینا خطا ہے — خدائی سے چال اِس ندی کی جُدا ہے
یہاں نامِ انسانیت ہے تشدد — یہاں ہر زبردست بندہ خُدا ہے

کنارے کنارے چلا جا مُسافر
خُدا کے سہارے چلا جا مُسافر

سُنائے گا پھر کس کو جا کر فسانا — مخالف زمیں جابروں کا زمانا
قدم پڑتے ہیں ڈگمگائے ہوئے سے — اے جانے والے کہیں لُٹ نہ جانا

کنارے کنارے چلا جا مُسافر
خدا کے سہارے چلا جا مُسافر

یہاں راز دل کا بتانا غضب ہے
زبانوں پہ حق بات لانا غضب ہے
بنا دی ہے مرحُل کے جوڑا کوؤں نے
قدم اُس ڈگر سے ہٹانا غضب ہے

کنارے کنارے چلا جا مُسافر
خُدا کے سہارے چلا جا مُسافر

یہاں سُن کے ہوتے ہیں خوش مال والے
غریبوں کی آہیں یتیموں کے نالے
یہاں آدمیت کہاں ڈھونڈتا ہے
یہاں لیتی ہے آدمیت سنبھالے

کنارے کنارے چلا جا مُسافر
خُدا کے سہارے چلا جا مُسافر

ترے راستے ہیں جو آکر اڑے ہیں
تقدّس مآبی کے جو آئینے ہیں
تجھے اِن سے امید ہے رہبری کی
ارے یہ تو اِنساں نما بھیڑیے ہیں

کنارے کنارے چلا جا مُسافر
خدا کے سہارے چلا جا مُسافر

یہاں ساز بجتا نہیں کوئی گت کا
یہاں نام طاقت ہے حیوانیت کا
بڑھا چل بڑھا چل کہ انسان ہے تو
گلا گھونٹتے ہیں یہ انسانیت کا

کنارے کنارے چلا جا مُسافر
خدا کے سہارے چلا جا مُسافر

یہاں سُکھ کہاں ہے یہاں دُکھ گھنیرے[1]
غلامی ہے ڈالے ہوئے اپنے ڈیرے
یہاں کی تباہی کا کیا پوچھنا ہے
اِدھر بھی لٹیرے اُدھر بھی لٹیرے

کنارے کنارے چلا جا مُسافر
خدا کے سہارے چلا جا مُسافر

یہی راستا، تو جدھر جا رہا ہے
یہی منزلِ قرب سے جا ملا ہے
چلا جا چلا جا بڑھا چل بڑھا چل
یہی راستا ہے یہی راستا ہے

کنارے کنارے چلا جا مُسافر
خدا کے سہارے چلا جا مُسافر

ابرا حسنی گنوری

[1] ہندی۔ بہت

فقیر سائیں کی کرامات

احمد ندیم صاحب قاسمی نے اپنے اشعار میں دہاتی ماحول کی دلکش تصویریں پیش کر کے ہماری شاعری کے لئے ایک نئی شاہراہ کھول دی ہے۔ آج کل جب ملی شہری زندگی میں حقیقی ہندوستانی معاشرت کا کوئی تصور باقی نہیں رہا، دہات کی سادہ زندگی کم از کم ہندوستان کی اصلی روح کی کچھ جھلکیاں ضرور دکھاتی ہے۔ ذیل کا افسانہ قاسمی صاحب کی دہاتی شاعری کا ایک منثور مگر نہایت دلآویز اور کامیاب مرقع ہے۔ "ہمایوں"

[افسانہ گو:۔ کل کی بات ہے کہ تارہ گاؤں کی جنوبی چراگاہوں کے ایک اندھیرے کنج میں ایک نوجوان چرواہا نیم کے چھتنار درخت کے سلئے میں سو رہا تھا، کہ اچانک......]

دُور ایک لڑکی زور زور سے چیختی اور بھاگتی ہوئی آتی ہے اور نوجوان چرواہے کے قریب آ گرتی ہے۔ اِدھر اُدھر بیٹھی ہوئی بھیڑیں بکریاں تتر بتر ہو جاتی ہیں اور چرواہا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور خواب آلود آواز میں کہتا ہے۔

نوجوان:۔ کیا ہے؟ کون ہے تو؟ اتنا چیخ کیوں رہی ہے؟

چرواہی:۔ (خوفزدہ آواز میں):۔ سانپ۔ سانپ!

نوجوان:۔ (گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے) کہاں ہے سانپ؟ کدھر ہے؟

چرواہی:۔ (انگلی اُٹھا کر):۔ اُدھر۔ وہاں۔ وُہ جوہڑ کے کنارے بوڑھے شیشم کی جڑ میں۔ اِتنا بڑا۔ میرے بازو جِتنا موٹا!

نوجوان:۔ شیشم کی جڑ میں؟ (ہنستا ہے) اری بھولی تم شاید اِدھر پہلی بار آئی ہے۔ شیشم کی جڑ والے سانپ نے آج تک کسی کو نہیں ڈسا۔ اُس کا رنگ کالا ہے نا ——— اور کالے سانپ ڈسا نہیں کرتے ——— کالے سانپ فقیر ہوتے ہیں ——— اللہ والے!

چرواہی:۔ لیکن اُس کی آنکھیں چنگاریوں کی طرح چمک رہی تھیں ——— اُس نے اپنی زبان ہلائی تھی مجھے دیکھ کر!

نوجوان:۔ تو اس میں خوف کی کونسی بات ہے ——— کیا تم ہر روز سینکڑوں جانداروں کی آنکھیں کو چمکتے اور زبانوں کو ہلتے نہیں دیکھتیں؟ ——— لیکن تم ہو کون؟

چرواہی:۔ میں اِدھر ایک گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ ابا نے جنگل کے داروغہ سے اس چراگاہ میں بھیڑیں بکریاں اور گائے بیل چرانے کی اجازت لے لی ہے۔ آج میں پہلی بار یہاں آئی ہوں لیکن یہ چراگاہ تو بہت سُونی ہے!

نوجوان:۔ واہ! یہ نرم نرم سبزہ۔ یہ ہرے ہرے گنجان نیم۔ وُہ اودے پربت۔ وُہ پربت کے قدموں میں نیلی جھیل۔ یہ جوہڑ۔ یہ جوہڑ کے کنارے

پر بوڑھا شیشم اور پھر یہ نیم کے چھتناروں کے سائے ——— ساری یہ جگہ سُونی ہے! (ہنستا ہے)

چرواہی:- لیکن ہمارے گاؤں کی چراگاہیں تو اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں - وہاں ننھے ننھے جھرنے ہیں - آئینہ نہ ملے تو اُن میں چہرہ دیکھ لو اور پھر ان جھرنوں کے کنارے رنگ رنگ کے پھولوں کی قطاریں ——— وہاں سب چرواہوں اور چرواہیوں کے پاس بنسریاں ہوتی ہیں اور وہ سب اتنا اچھا گاتی ہیں جیسے بہت سی شہنائیاں اکٹھی بج رہی ہوں۔

نوجوان:- اور یہاں!

چرواہی:- یہاں تو میں جدھر جاتی ہوں چرواہے پڑے سو رہے ہیں اور چرواہیاں بیریوں پر پتھر برسا رہی ہیں - اُدھر ایک بیر زمین پر گرا اُدھر سب کی سب گتھم گتھا - کسی کی اوڑھنی پھٹ گئی تو کسی کی بالی گر گئی - اُس کے بُندے چھک گئے تو اُس کی ننھی ناک کو چیرتی دور جا گری ——— اور پھر بوڑھے شیشموں کے نیچے کالے کالے اتنے اتنے سانپ ——— !

نوجوان:- تمہاری باہنوں جتنے موٹے! (زیر لب مسکراتا ہے)

چرواہی:- تم مذاق کرتے ہو ——— اللہ قسم میں نے اتنا بڑا سانپ دیکھا ہے۔

نوجوان:- اور میں کب کہتا ہوں کہ نہیں دیکھا - دیکھا ہوگا - اتنا ہی موٹا ہوگا - اتنا ہی بھرا بھرا ——— اور ملائم ——— اور ——— اور زہری!

چرواہی:- (کڑک کر) بدمعاش، لپاڑا اُٹھ کر جانے لگتی ہے)

نوجوان:- جاتی ہو؟ ——— لیکن وہ دیکھو ابھی تک شیشم کے نیچے کوئی چیز رینگ رہی ہے - کچھ نہیں نظر آرہا تمہیں؟ کیا تم خشک پتوں کو چٹختے نہیں سن سکتیں؟ فقیر سائیں شاید ادھر ہی کا رُخ کر رہے ہیں!

چرواہی:- (پھر وہیں بیٹھ جاتی ہے) اب ——— اب میں واپس کیسے جاؤں گی!

نوجوان:- ٹھہرو - میں بنسری بجاتا ہوں، فقیر سائیں وہیں مست ہو کر جھومنے لگیں گے،

چرواہی:- تمہارے پاس بنسری ہے؟

نوجوان:- ہاں - (بنسری نکالتا ہے) - اور میں گاتا بھی ہوں

چرواہی:- (مسرت آمیز تعجب سے) تم گاتے بھی ہو؟

نوجوان:- ہاں - ایسا اچھا گاتا ہوں کہ تم سُن لو تو اپنے گاؤں واپس جانے کا نام نہ لو،

چرواہی:- تو بڑا مُنہ پھٹ ہے رے!

نوجوان:- لیکن یہ تو تمہارے ہی سوال کا جواب تھا۔

چرواہی:- میں جاتی ہوں ——— اُس موٹے سانپ کی طرح تیری آنکھیں بھی چمکنے لگی ہیں - (اُٹھ کر) اب کدھر گیا سانپ!

نوجوان:- وہ کالی کالی لہراتی ہوئی لکیر نظر نہیں آرہی تمہیں ——— وہ شیشم کے تنے سے پکھ ادھر ہٹ کر - وہ جھاڑی کے پاس!

چرواہی:- مجھے تو کچھ نہیں دِکھتا۔

نوجوان:- خوف نے تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ (بنسری سے ایک سُریلی اور تیز آواز نکال کر رُک جاتا ہے)

چرواہی:- (شوق بھری آواز سے) بجاؤ۔

نوجوان:- لیکن تم بیٹھتیں کیوں نہیں! —— ایں —— اُدھر نہیں۔ اِدھر۔ یہاں میری چادر پر —— بچ بچ بچ جوتے اتارنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ اطلس و کمخاب کا فرش تو نہیں۔ یہ تو ایک غریب چرواہے کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

چرواہی:- بجاؤ۔

نوجوان بنسری بجاتا ہے۔ اور اُس میں سے ایسے رسیلے اور سہاؤنے سُر نکالتا ہے کہ چرواہی جھومنے لگتی ہے اور جب وہ بنسری سینے پر دھر دیتا ہے۔ تو چرواہی نیم وا آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتی ہے اور کہتی ہے

چرواہی:- بہت اچھی بجاتے ہو۔ بنسری کے سارے رنگ تمہاری اُنگلیوں کی پوروں کے بس میں ہیں!

نوجوان:- اور میری اُنگلیاں خدا جانے کس تال کی دُھن پر ناچتی رہیں —— میں اپنی بنسری سے ایسے دلآویز سُر پہلے کبھی نہیں نکال سکا۔ آج تو مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ حدِ نظر تک پھیلی ہوئی چراگاہیں بنسری کی الاپوں میں لپٹی ہوئی میرے اِرد گرد چکر لگا رہی ہیں اور میں

چرواہی:- (دبی دبی ہنسی کے ساتھ) ہے ہے۔ میں تو بھونچال سے بہت ڈرتی ہوں اور تو نے تو ساری چراگاہوں کو گھما دیا!

نوجوان:- بات کاٹنے میں تجھے خاص دسترس حاصل ہے۔ ذرا آگے بھی تو سُن لیا ہوتا۔

چرواہی:- کیا۔ آگے کیا؟

نوجوان:- اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے ——

چرواہی:- جیسے؟

نوجوان:- جیسے —— جیسے —— (اور پھر کہیں دور دیکھتے ہوئے نہایت تیزی سے بولنے لگتا ہے) جیسے تم اِن الاپوں کے سحر سے اُٹھ کھڑی ہوئی ہو۔ تمہاری زلفیں ہوا میں اُڑ رہی ہیں۔ تمہاری اوڑھنی پھڑپھڑا رہی ہے۔ تمہاری کالی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔ تمہارے نارنجی ہونٹ کپکپا رہے ہیں اور گھومتی ہوئی چراگاہوں کے پس منظر میں تم آسمانوں پر رہنے والی ایک حور معلوم ہوتی ہو —— اور اب کہ بنسری کا سحر ختم ہو چکا ہے، تم اپنے پر پھڑپھڑاؤ گی اور آنکھ کی جھپکی میں آسمان کی نیلاہٹوں میں گھُل جاؤ گی۔ تم ——

چرواہی:- بس —— دیکھ رے چھوکرے —— میں سانپ سے ڈر کر ادھر آئی تھی اور تیرا فرض تھا کہ تو مجھے میرے مویشیوں تک پہنچا آتا اور پھر یہاں آ کر اُسی طرح مزے سے سو جاتا۔ یہ جو تو ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کے قصوں والی باتیں لے بیٹھا ہے یہ مجھے بہت بُری لگ رہی ہیں۔ اور کان کھول کر سُن لے کہ میں ایسے دراز زبانوں کی گردنیں ناپنے میں بھی تاک ہوں جو مجھے گویا سمجھ کر مجھ سے

کھیلنا چاہیں۔ سُن رہا ہے تو؟ ارے تو نے مجھے بنسری کے دو چار میٹھے سُر سنا دیئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو نے مجھے خرید لیا اور اب وارث شاہ کی لکھی ہوئی باتیں دہرانے کا تجھے پورا حق حاصل ہے! بھولے! اس راہ پر سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیئے ورنہ کوئی ہیر یا سوہنی کبھی تیرے تالو پر جوتے چٹخا کر چلتی بنے گی۔

نوجوان:۔ قیامت تک یہ نوبت نہیں آسکتی۔ کیونکہ تم پہلی اور آخری لڑکی ہو جس کے قدموں پر ہم نے اپنے نغمے نچھاور کئے ہیں۔

چرواہی:۔ اور شاید میں ہی پہلی لڑکی ہوں جو اپنی جان کے خوف سے تمہارے اس قدر قریب آگئی اور تمہاری پُتلیوں میں چنگاریاں چمکنے لگیں۔

نوجوان:۔ اوہ ـــــ یہاں روزانہ سینکڑوں لڑکیاں لنڈوری چڑیوں کی طرح اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہیں۔ سب میری بنسری کی تانوں کو سراہتی ہیں ـــــ سب میرے اس قدر قریب آجاتی ہیں کہ اُن کے بال میری باہوں کو اور اُن کی سانسیں میری کنپٹیوں کو چھونے لگتی ہیں ـــــ لیکن پگلی ـــــ نغمے پیدا کرنے والے کاغذ کی ناؤ نہیں ہوتے کہ جدھر سے کوئی لہر اٹھے اُدھر ہی بہ نکلیں، یہ تو فولادی چٹانیں ہوتی ہیں!

چرواہی:۔ لیکن یہ فولادی چٹان اپنی جگہ سے اُکھڑ کیوں رہی ہے؟

نوجوان:۔ یہی تو بات ہے! ـــــ اور تمہارے سوال کا جواب خود تمہارے پاس ہے۔

چرواہی:۔ لیکن اگر مجھے اپنے سوال کا جواب معلوم ہوتا تو میں سوال کرتی ہی کیوں؟

نوجوان:۔ (مسکرا کر) کیونکہ یہ بھی تم خوبصورت آنکھوں والیوں کی ایک مقناطیسی ادا ہے!

چرواہی:۔ دیکھ رے۔ اتنا کھل کر باتیں نہ کر۔ لگام دے اپنی کترنی کو۔ میں کوئی آوارہ لڑکی تھوڑی ہوں کہ تیری ان چکنی چپڑی باتوں سے پھسل پڑوں ـــــ میری منگنی ہو چکی ہے!

نوجوان:۔ اور یہی حال میرا ہے۔ میں بھی تو کسی اجنبی لڑکی کا منگیتر ہوں۔ ابا کہتے ہیں وُہ خوبصورت ہے اور دودھ بلوتے ہوئے ایسے ایسے اچھے گیت گاتی ہے کہ گاؤں کی لڑکیاں اُس کے گانے سُننے کے لئے چھپ چھپ کر چھتوں پر چڑھ آتی ہیں اور دیر تک سمٹی پڑی رہتی ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ کسی لڑکی کو دیکھے بغیر بیاہ کر لینا پرلے درجے کی نادانی ہے، ہو سکتا ہے وہ کوئی چڑیل ہو ـــــ اکھڑ اور پھوہڑ ـــــ ہو سکتا ہے اُس کی آنکھیں صرف سُرمے کی دھار سے خوبصورت لگتی ہوں اور اُس کے ہونٹ صرف مِسّی سے گلابی بنائے گئے ہوں اور وُہ صبح کو اُٹھے تو میرے سارے خوابوں پر بُھتنے سے ناچنے لگیں۔ تمہارا کیا خیال ہے ایسی منگنی کے متعلق؟

چرواہی:۔ ایسی باتیں لڑکیوں سے پوچھی جاتی ہیں؟ ـــــ گیت بنانے والے پاگل ہوتے ہیں۔

نوجوان:۔ لیکن تم نے اپنے منگیتر کو کبھی دیکھا ہے؟

چرواہی:۔ اللہ کرے مجھے اُس کی صورت کبھی دکھائی نہ دے۔ میں تو راتوں کو بستر پہ پڑی روتی رہتی ہوں کہ ابا نے مجھے چھوڑی ہوئی ہڈی کی طرح اُٹھا کر پرے کیوں پھینک ڈالا۔ جانے وُہ کون ہے۔ کیسا ہے ـــــ اگر وُہ کوئی بڑی بڑی مونچھوں والا آبنوسی رنگ کا ہٹا کٹا بھینسا نکل آیا تو اللہ قسم میں تو بس کہیں کسی چٹان پہ سے کود پڑوں گی، اُس موٹے بھوت کے جنگل میں عمر بھر پھنسے رہنے سے تو یہی بہتر ہے

کہ میری نعش نیچے درختوں میں اٹک جائے اور چیلیں اور گدھ میری بوٹیاں نوچ نوچ کر ــــ (اس کی آواز بھرا جاتی ہے۔ نوجوان اس کے ہاتھ کو ہولے ہولے تھپکاتا ہے)

نوجوان:۔ لے تو تو رو دی۔ تم لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہو، من کو ذرا سی ٹھیس لگی اور نین چھلک پڑے۔ قسمت پر بھروسا رکھو ــــ اور دیکھو تم اب اِس طرف پھر بھی کبھی آؤ گی؟

چرواہی:۔ (اچانک ہاتھ کھینچ لیتی ہے اور آنسو پونچھتی ہے) دو مہینے تک مویشی اِدھر ہی لانے پڑیں گے۔

نوجوان:۔ اور کبھی نیموں کے اِس چھتنارے کا بھی رُخ کرو گی؟

چرواہی:۔ اگر سانپوں نے راستہ نہ روکا۔

نوجوان:۔ کالے سانپوں کے سوا مجھے کوئی اور سانپ نظر آجائے تو اللہ قسم اُس کے سر پر ایڑی رکھ کر ایک بار گھوما ہوں اور سب کچھ چرٹرٹر کر کے دھر دیتا ہوں۔ لیکن کالے سانپوں سے خوف کیسا۔ یہ تو فقیر ہوتے ہیں۔ کسی نے چھیڑا تو پل پڑے۔ ورنہ کہیں دبکے بیٹھے رہے۔ نہ کسی سے دشمنی نہ دوستی۔ بس اللہ سے لَو لگائے کنڈل مارے پھنکارتے رہتے ہیں۔ ایک دن مجھ سے ابا نے کہا تھا کہ نورے ــــ اگر کہیں کالا سانپ ــــ۔

چرواہی:۔ کیا نام ہے تمہارا؟

نوجوان:۔ نورا ــــ نور محمد۔

چرواہی:۔ (گھٹنوں کے بل بیٹھ کر) اور تمہارے ابا کا نام؟

نوجوان:۔ (حیران آواز میں) بہادر ــــ بہادر خاں۔

چرواہی:۔ اوہ!

چرواہی گھبرا کر اُٹھتی ہے اور جوتے گھسیٹتی بڈھے شیشم کی طرف بھاگنے لگتی ہے۔

نوجوان ایک دو لمحے حیرت زدہ کھڑا رہتا ہے اور پھر پکارتا ہے

نوجوان:۔ لیکن دیکھنا شیشم کی چھاؤں تلے فقیر سائیں بیٹھے پھنکار تو نہیں رہے؟

(چرواہی رُک جاتی ہے اور سر جھکا لیتی ہے)

نوجوان:۔ اری تو اتنی گھبرا کیوں گئی ہے۔ لے یہ بدمعاش بچا تجھے تیرے مویشیوں تک پہنچا آئے، (دو قدم اُٹھا کر رُک جاتا ہے اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھتا ہے) لیکن تیرا کیا نام ہے آخر؟

چرواہی:۔ میرا ــــ میرا ــــ میرے ابا کا نام اللہ دین ہے!

(چرواہا ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر قہقہے لگاتا ہوا سر پر لوٹ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ کہتا ہے)

نوجوان:۔ تو کہتے ہیں ہونے والی بیویوں کو بیاہ سے پہلے دیکھنے والے نوجوان دوزخ میں جھونکے جاتے ہیں! ہاہاہا ــــ کیسی اُلٹی بات! ــــ ہاہاہا!

احمد ندیم قاسمی

بات پائی۔ میں نے اسے انتہائی رنج والم کی حالت میں دیکھا لیکن یہ غم واندوہ کسی کی جدائی میں نہ تھا۔ میں نے اسے ایک عزمِ آہنیں کے ساتھ اپنے کام میں مصروف پایا مگر یہ جدوجہد کسی کی محبت حاصل کرنے کے لئے نہ تھی۔ اس کے سامنے کچھ اور ہی مقاصد تھے۔ میں پورے انہماک کے ساتھ اس کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا کہ جمیل آگئے اور فوراً تیار ہونے کے لئے کہا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے سینما جاتا کسی قدر بار گذرا۔

میں اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم ہم لوگ کب ٹرام میں سوار ہوئے اور کتنا راستہ طے ہوگیا۔ میں اس وقت چونکا جب جمیل نے کہا سنتے ہو! میں کہتا ہوں کہ یہ فلم بہت اچھی ہوگی۔

میں نے کہا تمہیں یہ الہام کیسے ہوگیا؟

جمیل نے جواب دیا۔ میں کسی کی یاد میں کھویا ہوا نہیں ہوں۔ میں اپنی آنکھوں سے کام لے رہا ہوں۔ وہ دیکھو!

وُہ ٹرام میں لگی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ یہ منظر اسی فلم میں سے لیا گیا تھا جسے دیکھنے ہم لوگ جارہے تھے۔ اس منظر میں ایک لڑکی نہایت حسرت ویاس سے کسی کو رخصت کرتے ہوئے دکھائی گئی تھی۔ میں نے جمیل کو سنانے کے لئے کہا "صرف اس تصویر کو دیکھ کر تو نہیں کہا جاسکتا کہ فلم اچھی ہوگی۔ مجھے تو اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ ہر عورت ایسی رونی صورت بنا سکتی ہے۔

جمیل نے طنزاً کہا" اور غالباً ہر مرد بھی"۔

میں نے کہا ان قیاس آرائیوں کی ضرورت نہیں۔ ہماری منزلِ مقصود آپہنچی ہے ابھی پتہ چل جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں میرا خیال صحیح تھا۔ فلم میں کوئی جدت نہ تھی۔ وہی آغازِ الفت کی مسرتیں، جدائی کے صدمے اور پھر ملنے کی خوشی۔ میں ایسی بیسیوں فلمیں دیکھ چکا تھا۔ بعض اوقات ایسی ہی فلمیں میں نے بڑے شوق سے دیکھی تھیں لیکن آج میں نے اس فلم میں کوئی دلچسپی نہیں لی معلوم ہوتا تھا جمیل اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے ہیں ممکن ہے وہ صرف یہ دکھانا چاہتے ہوں کہ ان کا قیاس بالکل صحیح تھا۔ تماشے کے دوران میں جمیل نے کبھی کبھی فلم کی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا کبھی انہوں نے کہا دیکھو اس موقع پر اس کی سنجیدگی کس قدر مناسب ہے۔ کبھی بولے اوہو! اس کا تبسم کتنا دلکش ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا آنسوؤں سے اس کا چہرہ کتنا دلفریب نظر آرہا ہے۔ میں نے کہا جمیل! معلوم نہیں تم اس کے آنسوؤں سے متاثر ہو رہے ہو یا خط و خال کی جاذبیت سے۔ مگر مجھ پر ان دونوں میں سے کسی کا اثر نہیں ہو رہا ہے۔ تمہاری جادو بیانی بھی بے اثر ثابت ہو رہی ہے۔ ہم لوگ جب تماشا گاہ سے باہر نکلے تو میں محسوس کر رہا تھا کہ آج بُری طرح وقت ضائع ہوا۔

مکان واپس جانے سے پہلے مجھے کچھ عید کارڈ اور خط لکھنے کے لئے کاغذ خریدنے تھے مگر دماغی تکان کو دُور کرنے کے لئے سب سے پہلے چائے پینا ضروری تھا۔ ہم تماشا گاہ سے نکلنے بھی نہ پائے تھے اور ابھی میں اس فلم سے بیزاری کا اظہار بھی نہ کرسکا تھا کہ ایک لڑکا مجھے ایک تصویر دے گیا۔ یہ آئندہ آنے والی فلم کا اشتہار تھا۔ میں نے اسے وہیں پھینک دیا۔ جمیل دیکھتے ہی رہ گئے۔

چائے خانے کی دیواریں تصویروں سے آراستہ تھیں۔ ان میں اکثر و بیشتر عورتوں کی تصویریں تھیں۔ کسی میں بالوں کی درازی کو نمایاں کیا گیا تھا کسی میں چہرے کی سُرخی کو۔ میں نے اس دیوار کی طرف رُخ کرلیا جدھر تصویریں نہ تھیں لیکن اس دیوار میں آئینے لگے ہوئے تھے اور

تصویروں کا عکس اِن میں نظر آرہا تھا۔ خلافِ معمول میں نے بہت جلد چائے ختم کر دی۔

ہم لوگ اس دکان میں پہنچے جہاں عید کارڈ فروخت ہوتے تھے۔ دیواروں پر نظر کئے بغیر میں نے دکاندار سے کہا کہ مجھے چند عید کارڈ دکھائیے۔ اِس نے کئی کارڈ میرے سامنے رکھ دیئے۔ سب پر عورتوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے اُس سے بہترین کارڈ دکھانے کے لئے کہا۔ وہ چند اور کارڈ نکال لایا۔ شاید ان کا کاغذ زیادہ نفیس تھا۔ تصویریں اِن پر بھی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان تصویروں میں عریانی زیادہ تھی میں نے اب بھی ناپسندیدگی کا اظہار نہ کیا۔ اِس نے کہا یہ بہت قیمتی ہیں۔ ہزاروں بک چکے ہیں۔ میں نے کہا یہی آپ کے بہترین کارڈ ہیں؟ وہ بولا اِس سے بہتر ہمارے پاس موجود نہیں۔ میں نے کہا تو ذرا اپنے بدترین کارڈ مجھے دکھا دیجئے۔ اپنی خفگی کو چھپاتے ہوئے اِس نے چند کارڈ مجھے دکھائے۔ ان میں سے چند پر مناظرِ قدرت بنے ہوئے تھے اور بعض پر صرف بیل بوٹے۔ انہیں میں سے چند میں نے انتخاب کر لئے۔

کاغذ خریدتے وقت بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ کسی دستہ پر کوئی عورت خط لکھتی ہوئی دکھائی گئی تھی۔ کسی پر صرف اس کا چہرہ بنا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان پر تصویریں کیوں بنی ہوئی ہیں۔ بمشکل سے ایک دستہ ایسا ملا جس پر کوئی تصویر نہ تھی۔ جمیل میرے ساتھ تھے اور بڑی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ جب ہم دکان سے نکلے تو انھوں نے بھی اطمینان کی ایک سانس لی اور میں نے بھی۔ وہ شاید اس لئے خوش تھے۔ کہ ایک مرحلہ طے ہوا اور میں اِس خیال سے مطمئن تھا کہ اب تصویروں سے سابقہ نہیں پڑے گا۔

ہم لوگ ٹرام اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے راستے میں ایک اشتہار ہمیں دیا گیا۔ یہ کوٹ پتلون کے کپڑوں کا اشتہار تھا۔ اس پر کوئی تصویر نظر نہ آئی ورنہ ڈر تھا کہ کوئی عورت کوٹ پتلون پہنے ہوئے نہ دکھائی دے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ جمیل کی نگاہیں بھی اسی اشتہار کی طرف ہیں۔ میں نے اشتہار کو الٹ کر جو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ تصویر میں ایک عورت اپنے شوہر کو کوٹ پہنا رہی ہے۔ اس کے بعد میں نے کسی اشتہار کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سڑک کے نکڑ پر ہم لوگ ٹرام کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ راستہ کے دوسری طرف جو نظر گئی تو دیکھا کہ ایک وسیع چوک میں بڑے بڑے اشتہارات آویزاں ہیں۔ اِن میں حروف تو کم تھے مگر نقوش زیادہ۔

میں حیران تھا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ کہیں اِن تصویروں سے پناہ بھی ملے گی یا نہیں۔ میں نے سوچا کہ بہتر ہے میں کسی طرف نگاہ ہی نہ اُٹھاؤں۔ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے میں نے ایک اخبار خرید لیا۔ مگر ورق اُلٹتے ہی پھر تصویروں پر نظر پڑی۔ میں نے اخبار جمیل کو دے دیا اور خود ایک گہرے سوچ میں پڑ گیا۔

میں نے کہا جمیل آج عجیب و غریب خیالات میرے دماغ میں پیدا ہو رہے ہیں۔

جمیل نے کہا یہ تو کوئی نئی بات نہیں

میں نے کہا میرے لئے یہ خیالات بالکل نئے ہیں۔ مجھے تعجب ہے اِس سے پہلے مجھے ان باتوں کا احساس کیوں نہیں ہوا۔

جمیل بولے آج کوئی نیا سودا سر میں سمایا ہے۔

میں نے کہا جمیل یہ کوئی دل لگی نہیں میں واقعی بڑی سنجیدگی سے یہ سوچ رہا ہوں کہ آخر دنیا کو یہ کیا ہو گیا ہے؟ کیوں تصویر

کی اس قدر بھوکی ہورہی ہے اور پھر غریب عورت ہی کے کیوں پیچھے پڑ گئی ہے۔ کیا عورت اس بات کو برداشت کر سکتی ہے کہ اس کے پیکرِ جمیل کی ہر گلی کوچے میں اس بے حیائی کے ساتھ نمائش کی جائے۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ شرم و حیا کی دیوی کبھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی ——— ولیکن قلم در کفِ دشمن است۔

معلوم ہوتا ہے جمیل کو میرے ذوق کی پستی پر بڑی دیر سے غصہ آرہا تھا انہوں نے تصویروں کی موافقت میں ایک طویل تقریر کی۔ مجھے نہیں معلوم انہوں نے کیا کیا کہا مگر چند الفاظ مثلاً عورت ——— قدرت کا حسین ترین نقش ——— تخلیق کا مقصد ——— محبت ——— جمالیاتی ذوق ——— اور اسی قسم کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ میں نے اس ناگوار بحث کو ختم کرنے کے لئے کہا میں محبت جیسے پاک جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ جمالیاتی ذوق کی بھی داد دیتا ہوں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

جمیل نے بحث کو کچھ اور طول دینا چاہا۔ وہ محبت کے متعلق کچھ کہنے لگے میں نے جھلا کر کہا کیا مرد کی زندگی کا یہی ایک مقصد ہے اور کوئی نہیں مردوں کو دنیا میں اور کوئی کام نہیں ———

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر میں نے کہا جمیل آج میں نے ایک عورت کو دیکھا ———

جمیل نے پوچھا بہت حسین تھی؟

میں نے کہا۔ معلوم نہیں۔

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ صبح سے لے کر شام تک جو بے شمار تصویریں ہمیں نظر آتی ہیں ان میں عورت کو ایک محبوبہ ہی کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی اور حیثیتوں کی طرف ہماری نگاہ جاتی ہی نہیں۔ میں جمیل کی دماغی الجھن کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ میں نے کہا میں نے اس عورت کو ایک ٹوٹے ہوئے جھونپڑے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر مطالعے میں مصروف دیکھا۔ پھر اس کو کتب خانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ناتوانی سے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے مگر چہرہ سے عزم و استقلال نمایاں تھا۔ اس کے جوش اور انہماک سے پتا چلتا تھا۔ کہ کوئی بہت بلند مقصد اس کے پیشِ نظر ہے۔ ہاں میں تم سے یہ کہنا بھول گیا کہ جس وقت میں اسے دیکھ رہا تھا مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا کہ وہ خوبصورت ہے یا بدصورت۔

جمیل نے پوچھا یہ تم کس عورت کا تذکرہ کر رہے ہو؟

میں نے کہا۔ مادام کیوری کا۔ آج جب تم آئے میں اسی کی سوانح عمری پڑھ رہا تھا مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں اسے چلتے پھرتے پڑھتے لکھتے دیکھ رہا ہوں۔ اس کی عزت میری نگاہوں میں بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے ایسی تصویریں کم دیکھی ہیں جنہیں دیکھ کر ہمارے دل میں ادب و احترام کے جذبات پیدا ہوں۔

جمیل بولے - مگر میں نے دیکھی ہیں -

میں نے تعجب سے پوچھا - کہاں؟

انہوں نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تمہارے کمرے میں -

مکان پہنچنے کے بعد میں نے دیوار پر سے ایک تصویر اتاری اور اس کے پرزے پرزے کردیئے اور تصویروں کا بھی یہی حشر ہونے والا تھا لیکن جمیل نے مجھے روک دیا - انہوں نے کہا - آج تمہیں یہ کیا ہوگیا ہے - یکایک تمہیں عورت سے نفرت کیوں ہوگئی - اگر قدرت کے حسین ترین نقش کی قدر تمہارے دل میں باقی نہیں رہی تو لاؤ یہ تصویریں مجھے دے دو - تم نے اتنی اچھی تصویر چاک کردی یہ کیا بدمذاقی ہے -

میں نے کہا - میں صنفِ نازک کی تذلیل گوارا نہیں کرسکتا -

جمیل تصویریں لے کر چلے گئے اور میں نے مادام کیوری کی سوانح عمری اُٹھالی -

تصدق حسین بی۔اے

سوزِ فراق

کہاں ہم اے امیر اور اب کہاں داغ
وہ جلسے ہو چکے خُلد آشیاں کے![1]

امیر مینائی

اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ
ملتے امیر احمد و سید جلال سے!!

داغ

یادِ رفتگاں

الہ آباد ہم بھی عنقریب اے جوش جائیں گے
پیٹ کر رو دیں گے جی کھول کر اکبر کے مدفن سے

جوش ملیح آبادی

بدن سے جان بھی ہو جائے گی رخصت جگر لیکن
نہ جائے گا خیالِ حضرتِ اصغر[2] مرے دل سے

جگر مرادآبادی

راحل

---

[1] نواب کلب علی خاں مرحوم والیٔ رام پور۔ [2] اصغر گونڈوی مرحوم۔ جگر نے یہ شعر اصغر مرحوم کی زندگی میں کہا تھا۔

ریڈیو

(شیخ ناسخ سے معذرت کے ساتھ)

ہے ریڈیو حضورِ معلٰی کے سامنے
یا زہرہ نغمہ زن ہے ثریا کے سامنے

بالکل بجا ہے ساتھ اگر یہ بھی ہم کہیں
بے جان بولتا ہے مسیحا کے سامنے

(حکیم مومن سے معذرت کے ساتھ)

ریڈیو ہو تو گوشۂ خلوت
خامشی آشنا نہیں ہوتا

یہ مرے پاس ہوتا ہے گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مولانا روم سے معذرت کے ساتھ)

پیش من سازے کہ نامش ریڈیو ست
ہر زماں در نغمہ و در گفتگو ست

خشک چوب و خشک تار و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست

(پطرس سے معذرت کے ساتھ)

بہ محفلہا کجا یابیم آں آتش نوائے را
کہ از خود ہائے و ہوئے آفرید و اندراں گم شد

مپرس از جستجو و نارسائی ہائے آں مجنوں
چو صوتِ ریڈیو ہر سو دوید و ہر زماں گم شد

اسد ملتانی

جواہرات

یم لینٹن نے ایک نوجوان لڑکی کو اپنے دفتر کے اسسٹنٹ کے گھر دعوت میں دیکھا، نہ جانے اُس کی آنکھوں میں کیا کشش تھی کہ وہ دیکھتے ہی اُس کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ وہ ایک ٹیکس کلکٹر کی بیٹی تھی جو کچھ عرصہ پیشتر مر چکا تھا اور اب وہ اپنی ماں کے ساتھ پیرس میں رہتی تھی۔ اُس کی ماں چاہتی تھی کہ کسی معقول آمدنی والے شخص کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کردے۔

نوجوان لڑکی نسوانی حسن کا بہترین نمونہ تھی ——— خوبصورت، خوب سیرت، سادہ اور سمجھ دار ——— غرضکہ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جیسی لڑکی سے شادی کرنے کے خواب ہر نوجوان دیکھتا ہے۔ اُس کا سادہ حُسن، اس کی طبیعت کی سادگی اور ایک ہلکا سا تبسم جو ہر وقت اُس کے گلاب کی پنکھڑیوں ایسے ہونٹوں پر کھیلتا رہتا تھا۔ اُس کی روح کا عکس تھا۔ ہر شخص اُس کی تعریف میں رطب اللسان تھا ——— "خوش قسمت ہے وہ شخص جو اس سے شادی کرے گا"

ایم لینٹن اُس وقت وزارتِ امورِ داخلہ کے دفتر میں کلرک تھا اور تقریباً تین ہزار پانسو فرینک سالانہ کماتا تھا۔ اُس نے نوجوان لڑکی سے شادی کی درخواست کی اور درخواست قبول کرلی گئی ——— لینٹن اپنی بیوی کے ساتھ نہایت خوش وخرم رہتا اور وہ گھر کو ایسے سلیقے سے چلاتی کہ اُن کی زندگی چین سے کٹتی۔ وہ اپنے خاوند سے نہایت محبت کے ساتھ پیش آتی۔ اُس کے حُسنِ صورت اور حسنِ سیرت کا یا عالم تھا کہ شادی کے چھ سال بعد بھی لینٹن نے یہ محسوس کیا کہ اُسے اپنی بیوی سے پہلے سے کہیں زیادہ محبت ہے وہ اپنے دل میں اکثر سوچا کرتا کہ کتنے بیوقوف ہیں وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ بیوی سے محبت نہیں کی جاسکتی۔

وہ اپنی بیوی کی دو باتوں پر اکثر ہنسا کرتا تھا ——— اُس کی تھیٹر جانے کی عادت اور جھوٹے جواہرات کی چاہت۔ اُس کی سہلیاں (چند افسروں کی بیویاں) اکثر اُس کے لئے ٹکٹ خرید لیتی تھیں اور وہ اپنے ساتھ اپنے خاوند کو بھی گھسیٹنے کی کوشش کرتی لیکن اُسے تھیٹر سے کوئی رغبت نہ تھی۔ اس لئے اکثر وہ اُسے اکیلا ہی بھیج دیتا۔

تھیٹر جانے کی وجہ سے اُس میں بھی اپنے حُسن کو چمکانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لیکن اُس کا لباس سادہ ہی رہا ——— اور یہ اُس کی اور اُس کے لباس کی سادگی ہی تھی جو کشش کا باعث تھی۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو زیور اور جھوٹے جواہرات سے مزین کرنا شروع کردیا جو بالکل سچے موتیوں کی طرح چمکتے ———

اُس کا خاوند جو اُس کی اِس دکھاوے کی عادت سے کچھ ناراض سا تھا، اُس سے اکثر کہتا ——— "پیاری! اگر تمہیں سچے موتی اور جواہرات خریدنے کی توفیق نہیں تو تمہارا سادہ حسن ہی تمہارا بہترین زیور ہونا چاہئے۔ لیکن وہ مسکرا کر کہتی ——— "میں مجبور ہوں، مجھے

ان جھوٹے جواہرات سے پیار ہے، میں مانتی ہوں کہ یہ میری کمزوری ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ انسان اپنی فطرت کو نہیں بدل سکتا، پھر وہ اپنے جھوٹے زیوروں سے کھیلنا شروع کر دیتی اور لینٹن سے کہتی :۔ "سچ بتلائیے! کیا یہ خوبصورت نہیں!"

وہ ہنس کر کہتا "تمہارا شوق بالکل خانہ بدوشوں کا سا ہے"

جب وہ رات کے وقت آگ کے پاس بیٹھتے تو وہ اکثر اپنے زیور کی صندوقچی نکال لیتی جسے لینٹن طنزاً "کوڑا کرکٹ" کہا کرتا تھا۔

وہ جھوٹے جواہرات کو بڑے شوق سے دیکھتی اور اکثر ضد کرکے اپنے خاوند کے گلے میں نیکلس ڈال دیتی اور پھر خوب ہنس کر کہتی "پیارے تم کتنے بھلے معلوم ہوتے ہو!"

یہ کہتی ہوئی وہ اپنا سُندر مکھڑا لینٹن کے آغوشِ محبت میں چھپا دیتی اور اپنی لچکیلی باہیں اُس کے گلے میں ڈال دیتی۔

ایک رات جب وہ تھیئیٹر سے واپس آئی تو اُسے سردی لگ چکی تھی۔ صبح اُسے نمونیا ہوگیا اور آٹھ دن بعد وہ لینٹن کو ہمیشہ کے لئے داغ فراق دے گئی۔

لینٹن کی رنگت، بات چیت، غم واندوہ اور گریہ وزاری سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وُہ بھی اب چند دنوں کا مہمان ہے۔ وہ صبح سے شام تک روتا ـــــ اُس کا دل ناقابلِ برداشت غم کے تیروں سے چھلنی ہو چکا تھا، کہتے ہیں وقت ہر قسم کے غم کا علاج ہے لیکن لینٹن پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا، ـــــ وہ اکثر دفتر میں بیٹھا بیٹھا رو پڑتا۔

زندگی ایک بارِ گراں ہو چکی تھی، اُس کی آمدنی جو اُس کی بیوی کے ہاتھوں میں تمام سامانِ زیست مہیا کر دیتی تھی، اب اُس کے گزارے کے لئے بہت قلیل تھی۔

ایک صبح جب اُس کی جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی اُس نے ارادہ کیا کہ کچھ فروخت کرے۔ اچانک اُسے جھوٹے جواہرات کا خیال آیا جو پہلے بھی اُس کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے تھے، سب سے پہلے اُسے وہ نیکلس بیچنے کا خیال آیا جو کبھی کبھی وُہ اُسے پہنا دیتی تھی۔ اُس نے خیال کیا زیادہ نہیں تو چھ سات فرینک تو مل ہی جائیں گے۔

دفتر جاتے ہوئے وہ راستے میں ایک جوہری کی دکان میں داخل ہوا، اُس نے سوداگر سے کہا ـــــ "جناب میں یہ نیکلس فروخت کرنا چاہتا ہوں" سوداگر نے نیکلس اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا، کبھی وہ اسے ادھر سے دیکھتا کبھی اُدھر سے، کبھی دور رکھ کر دیکھتا اور کبھی تولتا۔ لینٹن یہ سمجھا کہ سوداگر شاید اُسے بنا رہا ہے اور وہ کہنے ہی والا تھا "میں جانتا ہوں اس کی قیمت دو چار فرینک سے زیادہ نہیں ہو سکتی" کہ سوداگر نے کہا "جناب! اس نیکلس کی قیمت بارہ اور پندرہ ہزار فرینک کے درمیان ہے لیکن جب تک آپ یہ نہ بتائیں کہ آپ نے یہ کہاں سے لیا ہے میں اسے خریدنے کے لئے تیار نہیں"

لینٹن حیرانی کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکا لیکن تھوڑی دیر کے بعد کہا "کیا آپ صحیح کہہ رہے ہیں؟" جوہری نے سمجھا شاید یہ اس قیمت پر رضامند نہیں اس لئے کہا "آپ کو اگر اطمینان نہ ہو تو کہیں اور جا سکتے ہیں میں زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار فرینک دے سکتا ہوں"

لینٹن نے حیرانی سے کانپتے ہوئے نیکلس اُٹھا لیا اور کچھ سوچنے کے لئے باہر چلا آیا، تھوڑی دیر بعد وہ ایک اور دُکان میں داخل ہوا جوہری نے نیکلس دیکھتے ہی کہا" اوہ! میں جانتا ہوں! یہ نیکلس اِسی دکان سے خرید ا گیا تھا۔

لینٹن نے پوچھا" اِس کی قیمت کیا ہوگی؟"

جوہری نے کہا" میں نے یہ نیکلس پچیس ہزار فرینک کو بیچا تھا، اب ہم اِس کے لئے اٹھارہ ہزار فرینک دینے کو تیار ہیں اگر آپ ہمارے قاعدے کے مطابق ہمیں یہ بتا دیں کہ آپ کے قبضے میں یہ کس طرح آیا"

اِس دفعہ لینٹن جو حیرانی کے عالم میں کھویا ہوا تھا، بیٹھ گیا اور بولا" لیکن ذرا غور سے دیکھئے۔ اِس وقت تک میرا خیال تھا کہ یہ چھ سات فرینک سے زیادہ قیمت کا نہ ہوگا۔

جوہری نے پوچھا ——— "جناب آپ کا نام؟"

لینٹن نے کہا میں وزارتِ امورِ داخلہ کے دفتر میں ایک کلرک ہوں اور میرا ایڈریس ہے ——— "نمبر۱۶ ریوڈی مارٹر" سوداگر نے اپنی کتابیں کھولیں اور کچھ دیر کے بعد کہا" یہ نیکلس مسز لینٹن کو ۲۰ رجولائی ۱۸۶۶ء کو نمبر۱۶ ریوڈی مارٹر کے پتہ پر بھیجا گیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، سوداگر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کہیں یہ کوئی چور تو نہیں ——— اور لینٹن حیرانی کی وجہ سے خاموشی کے عالم میں کھویا ہوا تھا۔

آخر جوہری نے کہا" آپ چوبیس گھنٹے کے لئے نیکلس ہمارے پاس چھوڑ جائیے، ہم اپنی تسلی کرلیں گے اور آپ رسید لیتے جائیے۔

لینٹن نے جواب دیا" بہتر!"

پھر رسید جیب میں ڈال کر باہر چلا گیا، وہ خیالات کی رو میں بہا جا رہا تھا۔ دو تین دفعہ راستہ بھول گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کی بیوی اپنی جیب سے تو اتنے قیمتی جواہرات خرید نہیں سکتی تھی آخر اُس نے یہ کیسے حاصل کئے؟

ضروری ہے کہ یہ تحفے ہیں ——— تحفے! ——— تحفے!

لیکن اُسے یہ تحفے کس نے دیئے؟ اور کیوں؟

چلتے چلتے وہ چوک میں ایک طرف کھڑا ہو گیا، اُس کے دل میں شکوک پیدا ہو رہے تھے۔

میری بیوی ——— اُف ——— میری بیوی!

دنیا اُسے گھومتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، اور زمین اُس کے پاؤں تلے کانپ رہی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اِردگرد کی تمام عمارتیں گر رہی ہیں۔ وہ وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑا اور جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو ایک ہسپتال میں پایا۔

گھر واپس آکر اُس نے تمام دروازے بند کر لئے، اور دیر تک روتا رہا، بار بار اپنے رومال کو کاٹتا تھا، وہ غم سے نڈھال اور تھکان سے چور گہری نیند سو گیا۔ صبح وہ کافی دیر سے جاگا۔

حسن فروش اور قوم فروش

وہ ایک گناہ گار عورت تھی سماج کی ٹھکرائی ہوئی حسن کے بازار میں بیٹھنے والی۔ جسم فروش ــــ قابلِ نفرت مخلوق! اور مولانا ایک بہت بڑے رہنما تھے۔ ایک مقتدر روزنامے کی ملکیت وادارت میں شریک۔ راج دربار میں عزت کے مالک ــــ امیر و وزیر کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ! بات بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ دونوں عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ صورت آشنائی سے شناسائی ہوئی اور شناسائی سے وہ ہنگامی اور جذباتی تعلق جسے اُس وقت مولانا محبت کہتے تھے اور اب حماقت سمجھتے ہیں۔

دونوں ایک ہی قصبہ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک شریف خاندان کی چشم وچراغ تھی۔ اُس قصبہ میں آج بھی اُس کے بزرگوں کا نام ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔ مولانا کے باپ چنگی میں ایک معمولی محرر تھے۔ اگر تنخواہ ہی پر انحصار ہوتا تو مولانا اور اُن کے چار پانچ چھوٹے بھائی اور پانچ چھ بہنیں سب کبھی بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے شباب میں داخل نہ ہو سکتے بلکہ اوائل عمری میں فاقہ کشی کے باعث اللہ میاں کے پاس پہنچ جاتے لیکن خدا جسے پیدا کرتا ہے اس کی روزی کا سامان بھی ساتھ ہی مہیا کر دیتا ہے۔ منشی جی کی اولاد بھی دستِ غیب کے بل بوتے پر بڑھتی اور پھلتی پھولتی رہی بیٹوں۔ بیٹیوں۔ بہوؤں۔ پوتیوں اور نواسوں نواسیوں کا ایک اچھا خاصا لشکر تھا مگر اللہ نے سترہ روپے ماہوار میں ایسی برکت ڈال دی تھی کہ بری بھلی گزران ہو ہی جاتی تھی۔

وہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی۔ دولت میں کھیلنے والی! اور اس کی شادی بھی ایک امیر زادے ہی سے ہوئی۔ مگر دولت کی فراوانی کے باوجود سسرال آکر وہ مسرت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو کر رہ گئی۔ اِس کا شوہر ایک امیر زادہ تھا۔ نوجوان۔ اور مسلمان۔ ایک بے ملک نواب کا اکلوتا بیٹا اور اِس پر مستزاد یہ کہ باپ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا! دو سال جوں توں کر کے گزر گئے۔ اِس نے جھڑکیاں کھا کھا کر دن اور رو رو کر راتیں گزاریں۔ گھر میں سب کچھ ہونے پر بھی اِس نے تین تین وقت فاقہ کیا۔ نوکروں اور ماماؤں کی موجودگی میں بھی اس نے برتن مانجھے اور کپڑے دھوئے۔ لیکن وہ شوہر کو اپنا نہ بنا سکی۔ اِس میں اِس کا کوئی قصور نہ تھا۔ اور اس کا شوہر کہتا تھا کہ میرا بھی کوئی قصور نہیں! غلطی تمہارے والدین اور میرے والدین کی ہے۔ میری شادی اُس سے ہونی چاہیئے تھی جسے میں چاہتا ہوں اور تمہاری شادی ــــ لیکن وہ تو شادی سے پہلے کسی کو چاہتی ہی نہ تھی۔ غلطی خواہ کسی کی ہو۔ سزا بہر حال اُسے مل رہی تھی۔

آخر بڈھا اور بیمار خسر چل بسا۔ اُدھر اس کا جنازہ گھر سے نکلا اِدھر شوہر نے بیوی کو باہر نکال دیا کہ اب تمہارے لئے اِس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔ اب یہاں میرے دل کی رانی رہے گی۔ اس نے لاکھ کہا کہ مجھے لونڈی کی حیثیت ہی سے یہاں رہنے دو۔ میں تمہاری رانی کی باندی بن کر رہوں گی مگر امیر شوہر نے ــــ جو ایک دن پہلے محض امیر زادہ تھا ــــ ایک نہ مانی۔

وُہ اپنے باپ کے گھر آئی۔ دُلھن بن کر گئی تھی۔ طلاقن ہو کر لوٹی۔ باپ زندہ ہوتا تو یقیناً کلیجے سے لگا لیتا۔ مگر بیٹی کا صدمہ بہت پہلے اس کی جان لے چکا تھا۔ بوڑھی ماں دل پہ پتھر رکھ کر اب تک سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ نوجوان بیٹی اس طرح لُٹ کر گھر آبیٹھی تو غم ضبط کی حد سے باہر ہونے لگا۔ مگر اُس نے اِسے سینہ میں دبائے رکھا۔ لیکن دل کو کب تک دھوکا دیا جاسکتا ہے؟ اور پھر اپنے دل کو؟ کچھ عرصہ اندر ہی اندر گھلتی رہی اور آخر ایک دن اپنے رفیقِ حیات سے جا ملی!

اب وُہ بھائیوں کے رحم و کرم پر تھی۔ دو وقت روٹی ملتی تھی لیکن بھاوجوں کے طعنے چٹنی اور پیاز کی طرح ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے ــــــ طعنے۔ بدگمانیاں، تہمتیں اور بہتان ــــــ اور آخر ایک دن ایک شریف گھر کی بیٹی کو گناہ کے بازار میں بیٹھنا پڑا۔ بھاوجوں نے کہا "ہم نہ کہتے تھے؟" بھائی بولے" پتہ ہوتا تو جب پیدا ہوئی تھی اسی وقت گلا گھونٹ دیتے۔ سماج نے فتویٰ دیا" شیطان نے اسے بہکایا ہے۔ اب اس کے سائے سے بھی بچنا چاہئے"۔ــــ شیطان نے یہ سنا تو ہکا بکا رہ گیا۔

مولانا نے گرتے پڑتے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ بہت جوتیاں چٹخائیں۔ مگر کہیں نوکری نہ ملی۔ کچھ عرصہ ادھر اُدھر دھکے کھاتے رہے آخر ایک اخبار میں ملازمت کر لی۔ بیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی تھی۔ دس مل جاتے اور دس مالک اُن کے حساب میں جمع کرتا جاتا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کی زندگی میں وہ ان کا یہ حساب بے باق نہیں کرے گا۔ مولانا کے تقاضوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دفتر سے نکالے گئے۔ یہاں سے نکلے تو ایک اور اخبار کے عملے میں جا شامل ہوئے۔ دوسرا اخبار ــــــ تیسرا اخبار ــــــ چوتھا اخبار ــــــ معلوم نہیں مولانا نے کتنے اخباروں میں کام کیا لیکن پندرہ سولہ سال کی یہ جدوجہد کام آئی اور ایک دن خود انہوں نے اپنی ہی طرح کے ایک دوست کے ساتھ مل کر اپنا اخبار نکال لیا۔

خوشامد اور چاپلوسی کا فن وہ سیکھ ہی چکے تھے۔ چڑھتے سورج کی پرستش کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر میں دھن برسنے لگا۔ جو کاروباری اصول اُن کے آقا اُن سے برتا کرتے تھے وہی مولانا نے اپنے ملازموں پر آزمائے۔ اخبار نویسی سے لیڈری ملی اور لیڈری سے راج دربار میں کرسی!

وہ بازار میں بیٹھتی تھی اور مولانا دفتر میں۔ مگر رات کو دونوں ملتے تھے۔ اُس کے بازار میں بیٹھنے کا سبب بھی مولانا کے کئی داؤ پیچ اور اُس کی صرف ایک لغزش تھی! لیکن اب وہ مولانا کو خوب سمجھتی تھی۔ کوئی وقت تھا جب مولانا اسے اپنی تسکینِ ہوس کا سامان جانتے تھے۔ اب وہ انہیں دفع الوقتی کا ذریعہ سمجھتی تھی۔ ایک دن مولانا نے اس سے کہا:-

"آخر تم مجھ سے باقاعدہ نکاح کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"ایک بار باقاعدہ نکاح کر کے کیا حاصل کیا تھا جو اب دوبارہ اس غلطی کا ارتکاب کروں؟"

"لیکن اُسے تو تم سے محبت ہی نہ تھی"

"اور تمہیں ہے!"

"اور میں ہر روز تمہارے پاس آتا کس لئے ہوں؟"

"تفریح کا کھلونا سمجھ کر۔ اپنے نفس کی آگ بجھانے!"

"نفس کی آگ میں کہیں اور بھی بجھا سکتا ہوں"

"اب بھی بجھاتے ہوگے"

"غلط کہتی ہو۔ میں اپنی عزت کو خطرے میں ڈال کر تمہارے پاس آتا ہوں۔ اگر کوئی مجھے یہاں دیکھ پائے تو کیا کہے؟" اُس کی آنکھوں میں حقارت کی آگ چمکنے لگی۔ دانت پیس کر بولی

"چنگی کے محرر کے بیٹے۔ تیرا دادا ہمارے قصبے میں لکڑیاں بیچا کرتا تھا"

مولانا کھسیانی ہنسی ہنس کر بولے

"میں نسب پر فخر نہیں کرتا۔ اسلام میں حسب و نسب پر تفاخر حرام ہے۔ میں اپنی ذات پر فخر کرتا ہوں" مولانا ابھی کچھ اور کہنا چاہتے تھے مگر اس نے ان کی بات کاٹ لی اور زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ ایک قہقہہ جس کی گونج اُس کی زہریلی اور عمیق نفرت کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ بولی

"تو نسب پر فخر کو حرام سمجھتا ہے۔ تیرے حلال و حرام کا معیار کیا ہے؟ اور تیری ذات! تجھ میں اور مجھ میں فرق کیا ہے؟ میں اپنا جسم بیچتی ہوں تو اپنی قوم بیچتا ہے۔ میں نے اپنی روح بھی بیچی ہوگی۔ میں روح اور جسم کے جھگڑوں میں نہیں پڑتی۔ لیکن تو نے تو دوسروں کی روحیں بھی بیچ ڈالیں۔ مجھے بتا تجھ میں اور مجھ میں فرق کیا ہے؟ یہاں آنے سے تیری عزت خطرے میں پڑتی ہے۔ وہ عزت جو تو نے جھوٹ بول بول کر، دوسروں کو دھوکا دے دے کر، زیردستوں کا گلا گھونٹ گھونٹ کر اور زبردستوں کے جوتے چاٹ چاٹ کر بنائی یہاں آنے سے خطرے میں پڑتی ہے۔ اب تو میرے حرام اور حلال پر تقریر کرنا چاہتا ہے۔ میرا جسم کا سودا کرنا حرام اور تیرا قوم کا سودا کرنا حلال۔ میں سماج کی گناہ گار ہوں؟ آخر کیوں؟ سماج کو مجھ سے کیا نقصان پہنچا؟ میں کسی کو گناہ کا بلاوا دینے نہیں جاتی۔ تم خود یہاں چل کر آتے ہو۔ حالانکہ اس سے تمہاری عزت خطرے میں پڑتی ہے! اور تم سماج کے گناہ گار نہیں ہو جو بچوں، بوڑھوں، مردوں، عورتوں سب کو بیچتے ہو، اپنی عزت بنانے کی خاطر! اور پھر اسے خطرے میں ڈال کر ہر روز یہاں آتے ہو!! اس لکڑی فروش کے پوتے سن! ہم دونوں دکاندار ہیں۔ میں اپنی چیز بیچتی ہوں تو پرائی چیز۔ میری دکانداری میرے اور میرے گاہکوں کے سوا کسی اور کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ تیری دکانداری تیرے اور تیرے گاہکوں کے سوا کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ میں صرف اپنا جسم بیچتی ہوں تو پوری قوم بیچتا ہے۔ مذہب بیچتا ہے۔ ملک بیچتا ہے اور اگر تیرا بس چلے تو تُو خدا کو بھی بیچ ڈالے۔ اس پر بھی تو اپنے آپ کو معزز اور محترم سمجھتا ہے اور یہاں آنے سے تیری عزت خطرے میں پڑتی ہے ـــــ"

اس رات اُس کی خودداری کو چوٹ لگی اور اس کا سویا ہوا نسوانی غرور جاگ اُٹھا۔ صبح ہوئی تو وہ ایک بدلی ہوئی عورت تھی۔ وہ ایک

ہی جھٹکے میں گناہ کی دلدل سے نکل آنے میں کامیاب ہوگئی۔ مگر اب وہ کسی مرد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی تعلیم معقول تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی باقی زندگی یتیموں کے کسی مدرسہ میں معلمہ کی حیثیت سے گزار دے اور روکھی سوکھی روٹی اور موٹے کپڑے کے سوا اس کا کچھ معاوضہ نہ لے۔ اُس نے مولانا ہی سے نواب صاحب کا نام سن رکھا تھا۔ نواب صاحب قوم کے بہت بڑے رہنما، ایک مشہور سوشل ریفارمر اور بڑے دردمند بزرگ تھے ان کی نگرانی میں لڑکے لڑکیوں کے کئی کالج اور سکول چل رہے تھے۔ اس نے برقع اُٹھایا اور دوپہر سے پہلے پہلے اِن کی خدمت میں جا حاضر ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ نواب صاحب اِس فیصلے پر شاباش کہیں گے اور اُسے اپنے پچھلے گناہوں کو کفارہ ادا کرنے کا موقع بخشیں گے۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ تو بازار میں بیٹھنے والی عورت ہے تو انتہائی غضبناک لہجے میں کڑک کر بولے "نکل جا۔ ناپاک مخلوق۔ بدکار، فاحشہ عورت نکل جا یہاں سے۔ تجھے میری کوٹھی میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی ——"

ابھی ڈانٹ جاری تھی کہ نوکر آیا اور اُس نے نواب صاحب سے عرض کی کہ اخبار —— والے مولانا —— تشریف لائے ہیں۔ نواب صاحب نے نوکر سے کہا کہ اس فاحشہ عورت کو دھکے دے کر کوٹھی سے باہر نکال دو اور خود مولانا کے استقبال کے لئے دروازے کی طرف بڑھے۔ مولانا کو دیکھتے ہی انہوں نے بڑے زور سے اسلام علیکم کہا اور انتہائی تپاک سے ہاتھ ملا کر بولے "مولانا آپ تو عید کا چاند ہوگئے ہیں۔ دس بارہ نوکر دوڑائیں تب جاکر کہیں آپ کی زیارت ہوتی ہے" مولانا مسکرا کر بولے "ابھی کیا کہوں۔ یہ قومی کام ہی اتنے ہیں کہ اِن سے فرصت نہیں ملتی ......"

وہ باہر نکلتے نکلتے صرف اتنا ہی سن سکی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اُس نے دل میں کہا مجھ میں اور اس میں یہی فرق ہے کہ میں اپنا جسم بیچتی ہوں اور یہ اپنی قوم —— اس کی دکان بڑی ہے!

حمید نظامی

یادِ احباب

ایک ہمدردی رُسوا[1] تھی انیس حسرت

سو وہ رسوا بھی اُسے جاکے دکن بھول گئے!

برقؔ[2] کا اکثر یہ کہنا یاد آتا ہے مجھے!

تنکے چنوانے لگی ہم سے جُدائی آپ کی!

حسرت موہانی

راحل

1. ڈاکٹر مرزا محمد ہادی صاحب رُسوا بی اے، بی ایچ ڈی مرحوم مصنف "امراؤ جان ادا" و مثنوی "امید و بیم"
2. جواں مرگ محمد عظمت اللہ برق فرزند منشی محمد رحمت اللہ صاحب رعد مرحوم مالک نامی پریس، کانپور

رباعیات

ہے نفس سے فصل تا دیدِ ایک نفس
ہے کرشک سے تا القیں ایک نفس
جب طرح کر ثبات سے گزار
اِس ایک ہی سانس کو ثبات
ہے حاصلِ عمر ہم نشیں ایک نفس

ہم مرد نہیں ابرو پہ نہ بل ڈالیں گے
اس نفس پہ علائق کو سمجھ ڈالیں گے
کیا موت کا ڈر موت کی سختی کیسی
ہنسی سے یہ پیوشیاں کو بدل ڈالیں گے

غزل

شرابِ عشرت سے مست ہیں ہم کرم سے ساقی کے پَل رہے ہیں
سُلگنے والے سُلگ رہے ہیں جو جلنے والے ہیں جل رہے ہیں

بُری ہوا روزگار کی ہے جہاں کا ایسا ہے نیل بگڑا
زبان جن کی تھی صدقِ کامل وُہ اپنا وعدہ بدل رہے ہیں

نشے میں سرشارِ چشمِ مے گوں غضب کا بے چین تُرکِ مژگاں
اُبی ہوئی تیغ پٹ پڑی ہے سہام رہ رہ کے چل رہے ہیں

دورنگی ایسی ہے اس جہاں میں کہ دو بھی دل ایک سے نہیں ہیں
کسی کی حسرت نکل رہی ہے، کسی سے شعلے نکل رہے ہیں

کوئی یہ کہہ دیتا اُن سے جا کر انہیں کو کہتے تھے تم وفاگر
تمہاری صورت پہ مرنے والے فنا سے ہستی بدل رہے ہیں

کسی کی یکساں نہیں رہی ہے، نہ دل لگاتے نہ داغ کھاتے
جو عطر ملتے تھے گُل رخوں کے وہ آج ہاتھ اپنے مل رہے ہیں

علاج کیا ان ضدوں کا شاعر کہ میری آغوشِ شوق میں وُہ
بگڑ رہے ہیں سنور رہے ہیں تڑپ رہے ہیں مچل رہے ہیں

غیر مطبوعہ

حضرت آغا شاعر قزلباش مرحوم

غزلیات

۱

کشتۂ تقدیر ہوں یا غافلِ تدبیر ہوں
رنج و غم کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہوں

تو سزا دے یا جزا دے مالک و مختار ہے
کیا کہوں تجھ سے کہ میں شرمندۂ تقصیر ہوں

کج اگر پڑتا ہے تیرا تیر پڑنے دے کہ میں
خود بخود زد پر جو آجاتا ہے وہ نخچیر ہوں

مٹ چکا ہوں پھر بھی میرا مرتبہ دیکھے کوئی
میں حجازی قافلے کی خاک دامن گیر ہوں

کل نویس تقدیر گر تھا اے کے شمشیر و کتاب
آج کیوں مجبور ہوں زندانیٔ تقدیر ہوں

ابوظفر اعظمی

۲

عمرِ عزیز شوقِ تماشا میں کٹ گئی
یعنی تصورِ رخِ زیبا میں کٹ گئی

رنگیں تصورات کے فردوس میں رہے
اپنی تو ایک اور ہی دنیا میں کٹ گئی

امیدِ وصل نے مجھے کیا کیا دیے فریب
افلاک پر تعاقبِ عنقا میں کٹ گئی

دیتے رہے ثبوتِ وفا اور چپ رہے
امیدِ لطف و خدمتِ اعدا میں کٹ گئی

اس زندگی میں واسطی کچھ تلخیاں بھی تھیں
پر یوں کٹی کہ نشۂ صہبا میں کٹ گئی

سید جمیل واسطی

۳

تڑپ محبت کی برقِ مضطر تڑپ بپا انقلاب کر دے
مجاز کو وہ ترقیاں دے حقیقتیں بے نقاب کر دے

نہیں ضروری کہ جام بھی ہو سبو بھی ہو اور میکدہ بھی
نظر تو جس کی طرف اٹھا دے اسی کو مستِ شراب کر دے

یہ سب بجا ہے کہ فطرتِ حسن میں ہے شوخی بھی برہمی بھی
ترے کرم سے بعید کیا ہے جو عشق کو کامیاب کر دے

یہ تیرا غمزہ یہ تیری شوخی، یہ تیرا شیوہ یہ تیرا عشوہ
خوشی کو اندوہ کر دکھائے سکون کو اضطراب کر دے

تری نگاہوں میں اس قدر ہے تجلیاں بخشنے کی طاقت
بڑھائے ذرہ کی شان اتنی کہ غیرتِ آفتاب کر دے

مری نگاہوں سے دور رہ کر مری امیدوں پہ ہنسنے والے!
یہ بزم بھی تیری منتظر ہے یہاں بھی آ انقلاب کر دے

نزاِ مکاں لامکاں ہے مانا مگر ذرا سی یہ التجا ہے
جہاں سمائی نہیں نظر کی وہاں مجھے باریاب کر دے

کہاں کا اختر کہاں کا گوہر کہاں کا خورشید، ماہ کیسا
یقیں کا آئینہ چور کر کے جہاں کو موجِ سراب کر دے

اختر ہوشیارپوری

اشعار

(۱) نفس میں وہ رنگیں نوائی کہاں
چمن کی اما[illegible] میں رہی

(۲) جو بھی ملی بری بھلی ہم تو خوشی سے پی گئے
قدرِ حیات کیا کریں مر نہ سکے تو جی گئے

وجد

قانون

یہ ایک سخت سردرات تھی۔ اور مشرقی ہوائیں جسم میں سوئیاں سی چبھوتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔ گلی کے آخری سرے پر بس آکر رکی۔ دو عورتیں اور ایک مرد سردی میں ٹھٹھرتے، کانپتے بس میں داخل ہو گئے۔ اور بس کی تین خالی سیٹیں اور پُر ہو گئیں۔ نوخیز لڑکی ایک قیمتی گرم فراک پہنے ہوئے تھی۔ اس کی بغل میں ایک چھوٹا سا حیا پانی کتا اپنی ننھی سی ناک بار بار پنجے سے کھجار ہا تھا اور سردی سے سکڑا لڑکی کی بغل میں دبکا ہوا تھا۔ کنڈکٹر نے گھنٹی بجائی اور بس روانہ ہو گئی۔ کنڈکٹر دروازے سے سرک کر اندر آگیا اور ٹکٹ دینے لگا تھوڑی دیر بعد اس کی نگاہیں اس ننھے سے کتے پر جم کر رہ گئیں جو لڑکی کی بغل میں سمٹا ہوا بیٹھا خر خر کر رہا تھا اور اُس کی سفید سفید تسبیح کے دانوں سی آنکھیں لڑکی کی بغل میں سے باہر سڑک پر اندھیرے میں جھانک رہی تھیں۔ سڑک کی بتیاں بس کے قریب آتیں۔ ان کی روشنی بس پر پڑتی اور تھوڑی دیر میں بس بتیوں کی روشنیوں کو سرد سڑک پر کانپتے ہوئے چھوڑ آگے بڑھ جاتی بس ایک قوی ہیکل دیو کی طرح گھر گھر کرتی تاریکی کے پردوں کو جن پر روشنی کے دھبے پڑے ہوئے تھے چیرتی چلی جارہی تھی۔

میں نے کنڈکٹر کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی کے بَل آئندہ پیش آنے والے واقعے کی ترجمانی کر رہے تھے۔ وہ کتے کی طرف گھور رہا تھا۔ یہ اُس کے لئے ایسا موقع تھا جس کا وہ ہمیشہ بس کے دروازے میں نیم آدیزاں حالت میں انتظار کیا کرتا تھا۔ یہ اُن لوگوں میں سے تھا جو اپنی قسمت پر کبھی شاکر نہیں ہوتے۔ جو اپنے کاموں سے، اپنے فرائض سے ہمیشہ نالاں رہتے ہیں۔ جن کو دنیا کا ذرہ ذرہ اپنا دشمن نظر آتا ہے۔ جو ہمیشہ اپنی قسمت کو کوسا کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ نیم غصے کی حالت میں رہنے کی وجہ سے ایسے موقعوں کا انتظار کیا کرتے ہیں کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال سکیں۔ یہ ظاہر کر سکیں کہ وہ بھی اس دنیا میں کچھ قوت رکھتے ہیں۔ کچھ طاقت کے مالک ہیں۔ اور ان کا لفظ بھی قانون ہو سکتا ہے۔

آخر وہ کرخت آواز سے بولا! "تم اس کتے کو بس سے باہر لے جاؤ"

لڑکی نے جو پہلے ہی سے کنڈکٹر کے تیور دیکھ کر ان الفاظ کی متوقع تھی اور جس نے اپنا جواب بھی پہلے ہی سوچ رکھا تھا جواب دیا "لیکن یہ تو میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں"

کنڈکٹر نے بس کی چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اوپر سے بالکل کھلی تھی "تمہیں اسے باہر لے جانا ہی پڑے گا۔ یہ میرا حکم ہے"

لڑکی نے جواب دیا "میں تو ایسے موسم میں اوپر نہیں جاؤں گی۔ سردی تو میری جان ہی لے لے گی"

لڑکی کی ہمراہی عورت نے جو اس وقت تک اس منظر کو بڑی تشویشناک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہا یقیناً۔ یقیناً۔ تمہیں ہرگز اوپر نہیں جانا چاہئے۔ اور پھر اس صورت میں جبکہ تم کھانسی اور زکام میں مبتلا ہو"

لڑکی کے ساتھی مرد نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "اوپر جانا تو حماقت ہے!"

کنڈکٹر نے رسی کھینچی۔ بس کی چھوٹی سی متحرک دنیا میں گھنٹی نے ٹن کی آواز پیدا کی اور بس رک گئی۔

کنڈکٹر نے کہا "یہ بس اس سے آگے ہرگز بڑھنے نہیں پائے گی۔ جب تک اس کتے کو باہر نہ لایا جائے" اور وہ اُتر کر فٹ پاتھ پر کھڑا ہوگیا۔ قانون اُس کی حمایت پر تھا۔ اور مسافروں سے لدی ہوئی بس اُس کی مخالف! لیکن بس کا قانون تو یہی تھا۔ پھر وہ لوگوں کی مخالفت سے کیوں ڈرتا۔ وہ قانون کی آڑ میں اپنے بے چین دل کو تسکین کیوں نہ دیتا جبکہ اسے موقع مل رہا تھا۔ اس کی بے قرار روح اس وقت حقیقی مسرت حاصل کر رہی تھی۔

بس میں غم و غصہ کا طوفان بڑھ رہا تھا۔

"بے حیا!"

"بے شرم!!"

"لعنت ہے اس کی ذہنیت پر"

"یہ فوج میں کیوں نہ ہوا"

"بلاؤ پولیس کو!"

"چلو ہم سب اس کے خلاف کمپنی میں رپٹ کریں"

"ہم اس سے اپنا کرایہ واپس لیں گے"

"ضرور! ضرور!! ہم اسے کرایہ واپس کرنے پر مجبور کر دیں گے!"

سب مسافر لڑکی کی حمایت پر آمادہ تھے۔

وہ ننھا سا جانور خاموش بیٹھا ہوا سڑک پر مدہم روشنی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس جھگڑے، فساد اور بگڑے ہوئے حالات سے جو محض اُس کے وجود سے پیدا ہوئے بالکل ناواقف تھا۔ کنڈکٹر ٹہلتا ہوا بس کے دروازے کے پاس آیا۔

"تمہارا نمبر کیا ہے!" بس میں سے ایک آواز آئی۔ اور ایک نوجوان نے بڑی پھرتی سے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی کاپی نکالی اور پنسل جیب میں ٹٹولتے ہوئے کنڈکٹر کی طرف دیکھا۔

"یہ رہا میرا نمبر!" کنڈکٹر نے پروائی سے اپنے نمبر کی طرف اشارہ کر دیا۔

"تم ہمارے کرائے واپس دے دو!"

"تم صرف اس لئے ملازم رکھے گئے ہو کہ مسافروں کو ان کی منزلِ مقصود تک پہنچاؤ!!"

"تم ہمیں ساری رات سردی میں ٹھٹھرتا ہوا نہیں چھوڑ سکتے!!!"

"کرائے واپس نہیں کئے جا سکتے!" واحد جواب تھا۔

دو تین جسم اپنی جگہوں سے اُبھرتے ہوئے نظر آئے ..... ایک ..... دو ..... تین اور تین سائے رات کی تاریکی میں گم ہو گئے۔ کنڈکٹر نے جلدی جلدی فٹ پاتھ پر ٹہلنا شروع کر دیا اور پھر کھڑا ہو کر ڈرائیور سے باتیں کرنے لگا۔ ایک دوسری بس جو اس سڑک پر آخری تھی قریب سے گھر گھراتی ہوئی گزر گئی۔ مسافروں نے اُسے کھڑا کرنے کے لئے اپنے ہاتھ کھڑے کئے، رومال ہلائے۔ آوازیں دیں۔ چلائے۔ لیکن بس گزرتی چلی گئی۔

ایک بڈھے نے اپنی جگہ پر کسمساتے ہوئے کہا "یہ شیطان کنڈکٹر ہم خیال ہیں" اور اپنی نیلی سی سردی سے ٹھٹھری ناک مسلنے لگا۔

"ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں" ایک نوجوان نے ٹائی درست کی اور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سکڑ کر بیٹھ گیا۔

کسی نے بڑے زور سے گھنٹی بجائی۔ ڈرائیور کی جگہ کا دروازہ کھلا۔ ایک سر باہر نکلا۔ ڈرائیور نے طنزاً کہا "یہ نئے کنڈکٹر صاحب کون پیدا ہو گئے ہیں" تھوڑی دیر جواب کا انتظار کیا۔ مگر اس سوال کا وہاں کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے اپنا سر پھر کھڑکی کے اندر کر لیا۔ اور اپنے بازوؤں کو دونوں ہاتھوں سے تھپتھپاتے ہوئے گنگنانے لگا۔ بس کی روانگی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ایک سپاہی بس کے قریب آیا جس نے اندر کی طرف جھانکا۔ سوالات کی بوچھاڑ اور شکایات کے ہجوم نے سپاہی کو تھوڑی دیر کے لئے بوکھلا دیا۔

سپاہی نے نرمی سے کہا "لیکن تم جانتے ہو وہ بھی تو اپنے قوانین پر عمل کرتا ہے" "تم اپنے نام اور پتے اسے کیوں نہیں دے دیتے!"

"لیکن یہ تو وہ لیتا ہی نہیں!"

سپاہی نے مسکراتے ہوئے کہا "خوب!" اور وہاں سے کھسک کر دور گلی میں جا کھڑا ہوا۔ جہاں اسے دو ساتھی اور مل گئے۔

بس وہیں کھڑی ہوئی تھی۔ ننھا کتا ابھی تک سڑک کی روشنیوں میں سے تاریکی کی طرف جھانک رہا تھا۔ کنڈکٹر ایک کپتان کی طرح جو اپنے جہاز کے عرشے پر فتح کے وقت ٹہل رہا ہو فٹ پاتھ پر ادھر اُدھر چہل قدمی کر رہا تھا۔ ایک نوخیز لڑکی جس کے چیخ چیخ کر باتیں کرنے سے بس میں گونج پیدا ہو رہی تھی بڑبڑاتی ہوئی بس سے اتری اور سیدھی کنڈکٹر کی طرف اس طرح گئی جیسے دیکھنے والی نگاہیں ابھی کنڈکٹر کو زمین پر خون میں لوٹتا ہوا ہی تو دیکھیں گی۔ لیکن وہ اپنی جگہ پر قائم تھا۔ غیر متحرک، اُس کا دل اس طرح سرد تھا جس طرح وہ تاریک رات اور ایسا سخت جیسا وہ فٹ پاتھ۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اس کے قریب سے سپاہیوں کی طرف چلی گئی جو دور کھڑے ہوئے بے جان غیر متحرک بتوں کی طرح اس ڈرامے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ پھر واپس پلٹی۔ اپنے نوجوان ساتھی کو بلایا اور دونوں تاریکی میں غائب ہو گئے۔ باقی ماندہ مسافروں نے بھی ان کی پیروی کی اور اکا دکا اپنی جگہوں سے اُٹھ اٹھ کر تاریکی میں گم ہونے لگے۔ بس خالی ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس جوشیلے نوجوان نے بھی جس نے نمبر طلب کیا تھا اور جس نے کہا تھا کہ وہ کنڈکٹر کی اس حرکتِ نازیبا کا انجام بھی دیکھے گا چاہے اسے بس میں صبح تک ٹھٹھرنا ہی کیوں نہ پڑے اس موقع کو کھسک جانے کے لئے غنیمت سمجھا۔

اور پھر تو کتے کی حمایتی پارٹی نے کنڈکٹر کے مطالبہ کو مان لینا ہی مناسب سمجھا۔

آخر تنگ آ کر کتے والی لڑکی نے کہا "بہت اچھا ہم اوپر چلی جاتی ہیں"

اس کی ساتھی عورت چلائی "ہرگز نہیں!"

"میں ضرور جاؤں گی!"

"تو پھر تمہیں نمونیا ہو جائے گا۔"

لڑکی نے فیصلہ کن بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ہونے دو!"

اس کے نوجوان ساتھی نے کہا "ہرگز نہیں۔ کیا تم کتے کے لئے جان دے دوگی؟" مگر اس اثنا میں وہ بس کی چھت والے زینے پر غائب ہو چکی تھی۔ کنڈکٹر اندر آیا۔ گھنٹی چیخی اور اس کی سردی سے کانپتی ہوئی آواز ڈرائیور کو چلنے کی اطلاع دیتے ہوئے ٹھٹھر کر رہ گئی۔ بس روانہ ہو گئی۔ وہ ایک فاتح کی طرح مسافروں کی نکتہ چینیوں سے بے نیاز دروازے میں کھڑا تھا۔ باقی ماندہ مسافر اس کی بدمزاجی کے متعلق سرگوشیاں کر رہے تھے۔

تھوڑی دور جا کر انجن خراب ہو گیا۔ اور کنڈکٹر ڈرائیور کی مدد کے لئے بس سے نیچے اتر کر اس کی طرف چلا گیا۔ اس کام کے لئے بھی کافی وقت درکار تھا۔ اور اسی دوران میں کتے والی لڑکی چھت پر سے آہستہ آہستہ نیچے اتر آئی۔ اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ انجن درست کر لیا گیا۔ کنڈکٹر واپس بس میں آیا۔ گھنٹی بجائی اور بس چلدی۔ پھر اس کی نگاہیں کتے پر پڑیں اور اس کا ہاتھ پھر رسی کی طرف اٹھ گیا۔ گھنٹی کی تیز آواز تاریکی کا جمود توڑتی ہوئی گونج گئی اور دور سڑک کے کنارے درختوں کے سرسراتے ہوئے پتوں میں ڈوب گئی۔ ڈرائیور نے پیچھے کی طرف جھانکا۔ کنڈکٹر نے کتے کی طرف اشارہ کیا۔ بس رک گئی وہی ڈراما پھر انہیں کرداروں اور مناظر کے ساتھ دہرایا گیا مفت پاتھ پر ادھر ادھر ٹہلتا ہوا کنڈکٹر غصے سے پرہٹ کا پکا! اپنے بازوؤں کو تھپتھپا کر گنگناتا ہوا ڈرائیور! سڑک کی مدھم روشنیوں کی طرف جھانکتا ہوا کتا! اور کتے والی لڑکی کا دعویٰ کہ وہ چھت پر ہرگز نہیں جائے گی اور آخر اس کا بسورتے ہوئے چلا جانا!!

جب میں بس کا تنہا مسافر رہ گیا تو کنڈکٹر نے مجھ سے کہا "آخر میں بھی تو اپنے قوانین پر عمل کرتا ہوں" اگرچہ وہ فاتح تھا۔ اس نے بازی جیت لی تھی لیکن وہ اپنی صحیح حالت اور مجبوری واضح کر کے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتا تھا۔

میں نے کہا "قوانین!" ویسے تو قوانین ایک بہت ضروری چیز ہیں لیکن آخر مختلف قوانین میں بھی تو فرق ہوتا ہے۔ ان میں بعض ایسے ہیں جن پر بہت تشدد سے عمل کیا جاتا ہے۔ جیسے سڑک کے قوانین۔ جنہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان میں نوجوان کا خطرہ ہوتا ہے یا حادثہ ہو جانے پر کم از کم ہاتھ پاؤں کا ضائع ہو جانا ضروری ٹھہرا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے قوانین کو توڑا نہیں جا سکتا۔ ان پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض قوانین تو صرف ہماری راہنمائی کے لئے بنائے گئے ہیں۔ تاکہ ہم وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر ضروری سمجھیں تو ان پر عمل کر لیا جائے ورنہ نظر انداز کر دینے میں بھی کچھ ہرج نہیں کتوں کے متعلق قانون ہے۔ اب کتا بس میں لانے کی صرف اس لئے اجازت نہیں کہ دوسرے مسافروں کو تکلیف نہ ہو۔ لیکن اگر اس سے نقصان یا تکلیف کا اندیشہ نہ ہو تو یہی کتا بس میں لانے میں ہرج ہی کیا ہے یہ تو عقلی بات ہے جس طرح عقل نے اجازت دی کر لیا۔ قانون تمہارے ہاتھ میں کوڑے کی طرح نہیں ہونا چاہئے کہ تم اس سے مسافروں کو اندھا دھند زدوکوب کرو۔ بلکہ یہ تو تمہیں اختیار دیا گیا ہے تاکہ بوقت ضرورت تم اس سے فائدہ اٹھا سکو۔ یہ ایسے قوانین ہیں کہ جن کے مقصد پر نظر رکھنی چاہئے نہ کہ الفاظ پر۔ کیونکہ یہ قوانین مسافروں کی تکالیف کے تدارک کے لئے ہوتے ہیں ان کی مصیبتوں میں اضافہ کرنے کے لئے نہیں ہوتے۔ ان قوانین سے مسافروں کی راحت مدنظر ہوتی ہے نہ کہ قانون کے الفاظ تم نے قانون کے الفاظ پر عمل کیا لیکن اس کا حقیقی مقصد فوت ہو گیا۔ اور یہی قانون جو مسافروں کی آسائش کے لئے بنایا گیا ہے اس کے برعکس ثابت ہوا۔ کیونکہ قانون پر عمل کرنے اور اس پر زور دینے کا یہ موقع نہیں تھا۔ تم قوانین کو اپنی جذباتی حالت پر موقوف کر دینا چاہتے ہو!"

اس نے میری باتوں سے بہت اچھا اثر لیا اور انہیں تسلیم کیا اور جب میں بس سے اترنے لگا تو بڑی نرمی سے کہا "شب بخیر!"

ترجمہ۔ اسعد گیلانی

اصغر کی یادیں

بیگم بشیر احمد کے نام ایک نوعمر لڑکی کا خط

کرڑپہ۔ مورخہ ۳۰ رجولائی ۱۹۴۱ء

محترمہ آپا جان

تسلیم بہزار تکریم۔ مزاج شریف؟ آپ کا دردناک مضمون "یہ دنیا" کی سرخی سے گزشتہ ہفتے کے "تہذیب" میں نظر سے گزرا۔ اور بے حد قلق ہوا۔ واقعی ماں کی ممتا اور اپنی جان سے زیادہ عزیز اولاد کا غم بہت بڑا ہوتا ہے۔ ع یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو۔ آمین! مگر دنیا میں رنج وغم کے نہیں ہوتا دامانِ صبر وشکیب کو ہاتھ سے نہ دینا اور ہمت نہ ہارنا چاہئے ؎

زمانہ چھان مارا ہے "یہ دنیا" دیکھی بھالی ہے ۔۔۔ نہ ہے کوئی خوش وخرم نہ کوئی غم سے خالی ہے

اور کسی شاعر کا شعر ہے ؎

مقامِ شکر ہے غافل مصیبت دنیا ۔۔۔ اسی بلانے سے اللہ یاد آتا ہے۔

غرض آپ دانا بینا ہیں۔ میں کیا عرض کروں اور کیا تسکین دوں؟ خدائے پاک آپ کو صبرِ جمیل و دولتِ ایمان سکونِ قلبی عطا کرے آمین۔

ہمارے والد ماجد کی بیاضِ خاص میں ایک دلسوز وغم بیز نظم تھی جسے نقل کرکے بیرسٹر صاحب اور آپ کی تسکینِ قلب کے لئے ارسال کرتی ہوں۔ خدا کرے اس نظم سے آپ کے بیقرار دلوں کو قرار آئے۔ آمین۔ ثم آمین۔ (بیرسٹر صاحب قبلہ کو یہ نظم ضرور دکھایئے)

قبل ازیں بھی ہمارے والدِ ماجد نے خاص آپ کے نام ایک غم بیز نظم حضرت قلندر کرڑپوی کی روانہ کی تھی جس کی رسید بھی آگئی ہے۔

والدِ ماجد آپ دونوں کی خدمات میں تسلیمات عرض کرتے ہیں اور دعائے خیر۔ ع

گر قبول افتد زہے عزوشرف

فقط والتسلیم۔ ناچیز مریم خاتون۔

دخترِ محمد لال خاں ادیب ہیڈ کانسٹیبل پولیس پنشنر، کرڑپہ (صوبہ سرحد)

جنت سے ایک خط

بیٹے کی طرف سے اپنے باپ کے نام (از شاعرِ انقلاب سیماب اکبر آبادی)

روتے ہو بابا۔ رات دن، ناحق۔ مرے مرنے سے تم
واپس میں آسکتا نہیں۔ آہ و فغاں کرنے سے تم[1]
بھائی جُدا اندوہگیں، اماں جُدا بے آس ہیں
آخر یہ مایوسی ہے کیوں؟ ہم تو خُدا کے پاس ہیں
اپنی امانت تھا تمہیں اللہ نے مجھکو دیا
میں تو اُسی کا مال تھا جب چاہا اُس نے لے لیا
اللہ کی مرضی سے ہی میں نذرِ دریا ہوگیا
بے سود رٹنا آپ کا "کیا عزم تھا؟ کیا ہوگیا؟" (ادبِ کلاچی)
رونے سے کیا ہے فائدہ؟ رونے سے کیا مل جائیگا؟
دنیا سے جو جاتا رہا واپس نہ پھر وُہ آئے گا!
بے سود آہ وزاریاں بے فائدہ یہ شور ہے
قسمت پہ کس کا جبر ہے۔ قدرت پہ کس کا زور ہے؟
اماں سے کہہ کر بندگی۔ کہہ دو نہ وُہ روئیں مجھے
جاگیں تو دیں دل سے بھلا۔ اور بھول کر سوئیں مجھے
میں گلشنِ فردوس میں ہوں چین اور آرام سے
دکھ درد سے نا آشنا واقف نہیں آلام سے
حوریں بٹھا کر گود میں دن بھر کھلاتی ہیں مجھے
دے دے کے میٹھی لوریاں شب کو سلاتی ہیں مجھے
تم سے بھی ستّر درجہ مجھ پر مہربان اللہ ہے
غلمان میرے دوست ہیں حوروں کو میری چاہ ہے

---

[1] یہ مصرع اسی طرح وصول ہوا "ہمایوں"

تکلیف میری روح کو دیتے ہو جب روتے ہو تم
میرے لئے تکلیف کا گویا سبب ہوتے ہو تم
تم فاتحہ مجھ پر پڑھو تو روح میری شاد ہو
دنیا میں تھا میں نے پڑھا۔ شاید تمہیں بھی یاد ہو
خیرات کرتا ہے کوئی گر مرنے والے کے لئے
ملتی ہیں دس دس نیکیاں ایک ایک کے بدلے اسے
کھانا کھلاؤ تم وہاں۔ مجھ کو یہاں کھانا ملے
اِک قطرہ تم خیرات دو اور مجھ کو پیمانہ ملے
یہ تھی بڑی خوش قسمتی ہم آپ سے پہلے مرے
زندہ ہے وُہ بیٹا جو اپنے باپ سے پہلے مرے
بابا۔ خُدا کے واسطے۔ رونا نہ اب ہرگز ہمیں
امّاں کو بھی تسکین دو۔ بے فکر وہ ہم سے رہیں
جنت میں جب آؤ گے تم، پھر تم سے مل جائیں گے ہم
دنیا میں تو ہرگز نہ اب بھولے سے بھی آئیں گے ہم
وُہ رات دن کے مخمصے رونا مچلنا چیخنا
سو مشکلیں سو آفتیں۔ قصہ چکا جھگڑا مِٹا
مرتے ہی گویا چھُوٹ گئے ہم سینکڑوں آفات سے
آگاہ پہلے تو نہ تھے فردوس کے حالات سے
ہر وقت اِک تازہ خوشی ہر شادمانی ہے نئی
ہم مر کے زندہ ہو گئے، یہ زندگانی ہے نئی،
آگاہ ہو جائے اگر ہر آدمی انجام سے
بیزار ہو توبہ کرے اس زندگی کے نام سے

(گزرانیدہ مریم خاتون دختر حضرتِ ادیبؔ کٹپوی
تھانہ وڈاکخانہ کٹوپہ ضلع خاص صوبہ مدراس)

محفلِ ادب

میاں کے دوست

(از بیگم حجاب امتیاز علی)

دنیا میں دوست کس کے نہیں ہوتے۔ آپ کے میرے۔ ہر ایک کے دوست ہیں۔ بعض دوست مخلص اور وفادار بعض محض خوشگوار۔ بعض سے تکلف کے تعلقات بعض سے یگانگت کے مراسم۔ لیکن ہر صورت میں معقول اور رکھ رکھاؤ کے لوگ۔ ادب آداب سے واقف۔ میل ملاپ کے طور طریقوں کی سمجھ رکھنے والے۔ آٹھویں دسویں وہ آپ کے ہاں آتی ہیں۔ دسویں بارھویں آپ اُن کے ہاں چلی جاتی ہیں۔ معمولی راہ و رسم ہے تو ملاقات پندرہ بیس منٹ میں ختم ہوگئی۔ پُرانے اور گہرے تعلقات ہیں۔ تو زیادہ وقت صرف ہوگیا اس میں بات چیت گپ شپ۔ شکوہ شکایت۔ ہنسی مذاق سب کچھ ہو جاتا ہے۔

چائے کا وقت ہو۔ تو اکٹھے چائے بھی پی لی جاتی ہے۔ کھانے کا وقت ہو۔ تو کھانا بھی کھا لیا جاتا ہے۔ مہینے میں دو ایک دفعہ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے یوں گزار لئے جائیں۔ تو اپنا جی بھی خوش ہوتا ہے۔ اور دوست کے دل میں بھی کسی طرح کا میل نہیں آنے پاتا۔ دوست کے ساتھ اس کے رشتہ دار اور عزیز بھی آپ کے اخلاق اور احتیاط کے قائل ہوتے ہیں۔ اُلفت و محبت کی فضا میں خوشگوار طور پر بسر ہوتی چلی جاتی ہے۔

لیکن ـــــ شوہر کے دوست ـــــ! خدا کی پناہ! ـــــ تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ تو ایک مستقل بیماری ہیں۔ ملیریا کا حملہ بھی ایک دن ناغہ کرکے ہوتا ہے۔ لیکن کیا مجال جو یہ بیماری ایک دن بھی ناغہ کر جائے۔

سرِ شام سے جو دورہ شروع ہوتا ہے تو ممکن ہے جو نصف شب سے پہلے پیچھا چھوڑ دے؟ آپ ہر ممکن کوشش کر دیکھئے۔ جو تدبیر بھی انسانی ذہن تصور میں لا سکتا ہے عمل میں لے آیئے۔ ناممکن ہے۔ کہ آپ کو کامیابی ہو۔ اس دورے کے دوران میں زبان تالو سے لگنے کا نام نہیں لیتی۔ قہقہوں کی آوازیں فلک شگاف ہوتی ہیں۔ پیاس بڑھ جاتی ہے۔ بھوک بھی عموماً کھل جاتی ہے۔ گرمی کا موسم ہو۔ تو کافی۔ خشک میوہ یا تلی ہوئی چیزیں اور سگرٹ پان کا تو جیسے ہوکا ہو جاتا ہے۔

موت کے بعد کی زندگی کی طرح سسرال کی بھی کوئی بات یقینی نہیں۔ ممکن ہے آپ کا شوہر بھلا مانس نکلے یا چڑچڑا مرد۔ آپ کی ساس مہربان اور شفیق ہو۔ یا لڑاکا اور جھگڑالو۔ آپ کی نند محبت شعار ہو۔ یا تلی کی خصلت کی اور چغلخور۔ سوائے ایک بات کے ہر بات غیر یقینی ہے۔ اور یقینی بات یہ ہے کہ سسرال میں آپ کو اور کچھ نصیب ہو یا نہ ہو۔ شوہر کے دوستوں سے ضرور بالضرور سابقہ پڑے گا۔ یہ

بالکل ممکن ہے۔ کہ آپ کے شوہر بہ خود غلط بھی نہ ہوں۔ لیکن یہ قطعی ناممکن ـــــ کہ وہ دوست نہ رکھتے ہوں۔ اور دوست بھی اسی غیر معمولی قسم کے جسے "شوہر برانڈ" کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

ان حضرات کی پہلی نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ عموماً آتے عین اس وقت ہیں جب آپ شوہر کے ساتھ کہیں باہر جا رہی ہوں۔ ادھر آپ تبدیلِ لباس کے بعد اپنا ننھا سا بیگ ہاتھ میں سنبھال کر پورٹیکو کا رُخ کرتی ہیں۔ اُدھر یکایک باہر سے "ہلو اور مزاج شریف"۔ اور کہاں کے ارادے ہیں؟ اور ٹھہروں گا بالکل نہیں۔ اور کوئی خاص کام نہ تھا۔ بس اتفاق ہی سے آ گیا۔ اور لیجئے میں چلا" کی آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں ......

اگر آپ تجربہ کار واقع ہوئی ہیں۔ تو "لیجئے میں چلا" سن کر آپ خود فی الفور اپنے لباس خانے میں واپس چلی جاتی۔ اور لباس پھر تبدیل کر لیتی ہیں کیونکہ آپ بخوبی جانتی ہیں۔ کہ ان حضرات کی "لیجئے بس چلا" کے معنی ہیں۔ چلتے چلتے درجن بھر سوال کر ڈالنا۔ کہ کہاں جا رہے ہو؟ کس کے پارٹی ہے؟ بڑا کج اخلاق شخص ہے۔ کہ ہمیں پارٹی کی اطلاع تک نہیں دی۔ ان کے بھائی کو تم جانتے ہو گے۔ ارے وہی پچھلے مہینے جن کا مضمون چھپا تھا۔ وقت نہیں۔ ورنہ ان کے اپنے مراسم کی پوری تفصیل تمہیں سناتا۔ لیکن اتنا کہے بغیر تو اس وقت بھی نہیں رہ سکتا۔ کہ بے حد خلیق اور وضع دار شخص ہے۔ دونوں بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے"۔ اس ساری تفصیل کے بعد ان حضرات کا آداب عرض کر کے رخصت ہو جانا بھی اطمینان بخش نہیں ہوتا۔ دروازے تک پہنچتے پہنچتے انہیں کئی ضروری باتیں واپس کھینچ لاتی ہیں۔

اگر آپ کو پارٹی یا سینما کے کسی شو میں ضروری پہنچنا ہو۔ تو میں ہر شادی شدہ عورت کو مشورہ دوں گی۔ کہ وہ اپنے شوہر کو وقت سے کم از کم دو گھنٹے پہلے مُنہ ہاتھ دُھلا کر اور تبدیل لباس کرا کے کار میں بٹھا دے۔ اور کار کے دروازے اور شیشے بند کر کے ان پر پردے کھنچوا دے۔ تاکہ کسی دوست کو شوہر کا سایہ تک نظر آنے کا امکان نہ رہے۔ صرف اسی طرح آپ کہیں وقت پر پہنچنے کی اُمید کر سکتی ہیں۔

ان حضرات کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے۔ کہ ان کی زندگی کا گھڑی سے مطلق کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر آپ شوہر کے کسی دوست کی کلائی یا جیب میں گھڑی دیکھیں۔ تو بلا تکلف اور بلا تامل یقین کر لیجئے۔ کہ یہ شے کھلونے کی قسم سے ہے۔ وقت بتانے کی غرض سے نہیں لگائی گئی۔ اس کو صرف آرائش و زیبائش کے خیال سے لگا لیا گیا ہے۔ اور یہ لوگ دو دو تین تین گھنٹے کے بعد کبھی اس پر نظر ڈال دیتے ہیں۔ تو وقت دیکھنے کے لئے نہیں۔ بلکہ محض یہ اطمینان کرنے کو کہ کسی لطیفۂ غیبی سے یہ کھلونا گھڑی چلنی تو نہیں شروع ہو گئی؛

ان حضرات کی آنکھوں کی بناوٹ میں اللہ تعالیٰ نے وہی خوبی رکھی ہے جو بلّی کی آنکھوں کو بخشی ہے۔ دن چھپ جائے۔ شام پڑ جائے۔ آدھی رات گزر جائے۔ ان کی آنکھوں کو مطلق کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ان کے بیٹھنے کا بے تکلف انداز۔ ان کی بات چیت کا کھلا لہجہ اسی انداز سے جاری رہتا ہے جیسا تیسرے پہر کے وقت تھا۔

ان حضرات کی تیسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کھانے پینے کے متعلق ان کا نقطۂ نظر درویشوں کا سا ہوتا ہے۔ لہٰذا نہ انہیں مطلق دلچسپی نہیں ہوتی۔ کھانے پینے کو پیٹ بھرنے اور جینے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ نہ کبھی ان کے گھر کوئی ایسی چیز پکتی ہے جس کو کھانے کا شوق انہیں کھانے کے وقت اُٹھ کھڑے ہونے پر مجبور کر دے۔ نہ کبھی ان کے ضمیر کو یہ خیال بے چین کرتا ہے

کہ گھریلو زندگی کے لُطف اور حُسن کے لئے بیوی بچے کا کبھی میاں کے ساتھ کھانا کھا لینا بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے۔

جب کبھی اطلاع باہر بھیجی جائے۔ کہ کھانا تیار ہے۔ تو ان کا طرزِ عمل مثنوی میر حسن کی بیروُن کی طرح خود فراموشی اور سرد مہری کا سا ہوتا ہے ؎

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے — تو بولے "بہت خوب لے آیئے"۔

ان حضرات کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ آتے ہی عموماً بیوی کی مزاج پرسی ضرور کرتے ہیں۔ ان کی آمد پر اگر سکنجبین یا مینگو فل کے گلاس باہر بھیج دیئے جائیں۔ تو تاکید سے بہرے کی معرفت اندر یہ سوال پہنچایا جاتا ہے کہ "آپ خیریت سے تو ہیں نا؟"

ابتدا میں میں دل میں کہا کرتی تھی کہ الٰہی دنیا میں کیسے کیسے ہمدرد اور نیک نفس اور دردمند لوگ موجود ہیں۔ جن کے دل سے دوست کی بیوی کی صحت کا خیال کبھی نہیں اُترتا۔ لیکن جب ہر روز اور ہر دوست سے یہی پیغام مجھے مسلسل پہنچتا رہا۔ اور اپنی صحت میں نے ہر لحاظ سے ایسی پائی۔ کہ اس کے متعلق کسی قسم کا کوئی اندیشہ افواہ کی صورت بھی اختیار نہ کرسکتا تھا۔ تو سمجھ گئی کہ یہ جملہ اسی صورت سے استعمال ہوتا ہے جیسے زبان میں محاورے اور ضرب الامثال استعمال کی جاتی ہیں۔

رشتہ کے وقت لوگ بَر کے متعلق طرح طرح کی چھان بین کرتے ہیں۔ لڑکے کی ذات کیا ہے؟ خاندان کیسا ہے؟ عمر کتنی ہے؟ لڑکا شکل و صورت اور صحت کا کیسا ہے؟ اخلاقی اور مالی حالت اچھی ہے یا بُری؟ نباہ کرنا جانتا ہے یا نہیں۔ غرض طرح طرح کی باتیں کرید کرید کر نکالی جاتی ہیں۔ لیکن سراغ رسانی کے اس عمل میں کبھی کوئی یہ نہایت اہم بات معلوم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کہ ان حضرات کے دوستوں کا حلقہ کس حد تک وسیع ہے۔ یہ میں اس خیال سے نہیں کہہ رہی کہ فارسی زبان میں "کند ہم جنس با ہم جنس پرواز" یا انگریزی زبان میں A man is known by the company he keeps کی مثل موجود ہے۔ یہ تو میں جب کہتی اگر میں اچھی صحبت رکھنے والے لڑکے کو رشتہ کے لئے زیادہ موزوں سمجھتی۔ اچھے بُرے کا سوال ہی نہیں۔ اچھے ہوں جب بُرے ہوں جب۔ شوہر کے دوست ہر حال میں بڑی خطرناک چیز ہیں۔

میری رائے میں اگر اور ہر طرح اطمینان کر کے بَر کو سو میں سے سو نمبر دیئے گئے ہیں تو اس کے دوستوں کی تعداد معلوم کر کے فی دوست کم سے کم بیس نمبر بلا تکلف کاٹ لینے چاہئیں۔

بلا مبالغہ یقین فرمائیے، ایک شوہر کے رسولی ہونا اتنی اندیشہ ناک بات نہیں۔ جتنا اس کا ایک دوست رکھنا۔

(نشر شدہ) "تہذیب نسواں"

مطبوعات

مطبوعاتِ انجمنِ اسلامی تاریخ و تمدن (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

یہ انجمن پانچ سال ہوئے مسلم یونیورسٹی میں اِس غرض سے قائم کی گئی کہ نوجوان مسلمانوں میں قومی اور اسلامی زندگی کی ایک رَو دوڑا دے۔ یہ انجمن سالانہ جلسے کرتی ہے یوم النبی مناتی ہے جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ ذوق و شوق سے شریک ہوتے ہیں اور اسلامی ہفتہ مناتی ہے۔ گاہے گاہے اس انجمن کی دعوت پر صاحبانِ فضل و کمال علی گڑھ آتے ہیں اور اپنے بلند پایہ مقالے پڑھتے ہیں یا تقریریں کرتے ہیں۔

انجمنِ مذکور نے ہمیں پانچ ایسے دلچسپ و مفید مقالات بھیجے ہیں جو خاص جلسوں میں پڑھے گئے۔

سائنس اور اسلام:۔ یہ مولانا حافظ محمد طیب صاحب (دیوبند) کی ایک تقریر ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان سب عناصر سے زیادہ اشد اور اُن پر غالب و متصرف ہے۔ ایک مشتِ استخواں سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ عاجز ہے۔ لیکن یہ طاقت اور لطافت انسان کے بدن سے پیدا نہیں ہوسکتی بلکہ وہ اُس کی روح ہے جو تمام مادّی عالموں سے بھی زیادہ لطیف چیز ہے۔ ؎

بے حجابی یہ کہ ہر ذرّہ سے جلوہ آشکار اُس پہ گھونگٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

رُوح جب بھی اپنی اصلی فطرت پر چلی ہے اُس سے عجائبات کا ظہور ہوا ہے اور یہ تعلق مع اللہ کی قوت ہی سے ممکن ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ اُس منبعِ جود و کمال کی طرف رجوع کرے۔ خلاصۂ بحث یہ ہے کہ دائمی رفعت و عزت رُوحانیت ہی میں ہے اور یہ کہ جب تک سائنس کے کارنامے مذہب کے لئے خادم اور ذریعۂ تحصیل نہ بنیں گے اُن کا انجام خوش کُن نہ ہوگا۔

تمدنِ اسلام:۔ یہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا ایک مقالہ ہے۔ یہ ہے تمدنِ اسلام کا پیام بیسویں صدی کی دُنیا کے نام۔ ایک مسلمان بچے کی بنیادی تعلیم ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اِسی طرح زندگی کے ایک ایک مرحلے میں اسلام کے طرزِ عمل کی مجسم مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ "قدم قدم پر پہرا بیٹھا ہوا ہے"۔ مقصدِ حکومت کی گمراہی کی جڑ یہی ہے کہ انسان نے حاکم اپنے کو سمجھ لیا حالانکہ حکومت صرف اللہ کی ہے۔ آج کل کے کمیونزم کے مقابل میں پیغمبرِ اسلام اور بعض دوسرے اکابرِ اسلام کی زندگی کے واقعات پیش کرکے بتایا گیا ہے کہ کس طرح وہ زندگی جس میں قوانینِ الٰہی کا نفاذ ہوتا ہے اپنا اور دوسروں کیلئے باعثِ رحمت ثابت ہوتی ہے۔

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے:۔ از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ اس مقالے میں بتایا گیا ہے کہ اسلام میں قومیت کا عنصر قطعی ناپید ہے اور وہ مجرّد ایک اصولی حکومت ہے۔ آج کل یہ دُھن اکثر لوگوں کے سر پر سوار ہے کہ مسلمان کے نام سے جو ایک قوم بن گئی ہے اُس کے ہاتھ میں حکومت آجائے، حقوق کا تحفظ ہوجائے، ملازمتوں اور تعلیمی اور انتخابی ادارات میں اُن کا حصہ مقرر ہو۔ حالانکہ اسلام کے سامنے قومیں اور ملتیں نہیں صرف انسان ہیں۔ اسلامی حکومت کی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے کیونکہ ملک خدا کا ہے اور انسان صرف اُس

کے خلیفہ کی حیثیت سے یہاں کام کرتا ہے۔ اسلامی انقلاب کی واحد سبیل یہ ہے کہ "ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اُٹھے۔" اس کے مقابل میں آج کل یہ حالت ہے کہ "جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اُتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ ایک اسلامی سٹیٹ کے لئے صرف وہی شخص کارآمد ہو سکتا ہے جس میں یہ صلاحیت ہو کہ جس حیثیت میں بھی اُس کو کام کرنے کا موقع ملے وُہ اس کام کو مسلمان کی حیثیت سے انجام دے سکے۔ اس کے لئے ایمان، شعورِ اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوتِ فیصلہ اور شخصی جذبات اور ذاتی اُمنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اور ایسے جواں ہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان رکھتے ہوں یہاں تک کہ سوسائٹی حکومت قانون قوم وطن جو چیز بھی اُن کے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اُس سے لڑ جائیں۔"

ایمان:۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی تقریر ہے۔ فرماتے ہیں کہ "قوموں کی موت و حیات ایک متخیلہ کی موت و حیات پر موقوف ہے۔ جب کبھی دو قوموں کا مقابلہ ہوگا تو ہمیشہ اُس کی فتح ہوگی جس کا نقطۂ تخیل زبردست ہوگا اور جس کے افراد اس رشتۂ حیات میں سب سے زیادہ مستحکم بندھے ہوئے ہوں گے۔" "دنیا میں جو کمزور قومیں فنا ہوئی ہیں اُن کی صورت یہی ہوئی ہے کہ اُنہوں نے اپنا متخیلۂ ایمانی چھوڑ کر کسی دوسری طاقت ور قوم کے متخیلۂ ایمانی کو قبول کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وُہ قوم مٹ گئی۔" اس کے بعد نسل و وطن کے سیاسی اور سوشلزم کے اقتصادی عقیدوں کی ناکامی و فریب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے مقابل میں صحیح ایمان کے ضروری خصوصیات یہ ہیں کہ وہ عالمگیر اتحاد و اُخوت کی بنیاد ڈال سکے اور انسانوں کو نیکی کے لئے اُبھار سکے اور بُرائی سے روک سکے۔ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے۔ اور یہ محض ایمان ہی سے ممکن ہے ایسا ایمان جس کا نتیجہ نیک عمل بھی ہو۔ تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ "دل کا چین اخلاق کی طاقت اور عالمگیر انسانی برادری کی دولت اگر ممکن ہے تو وہ صرف اُس توحید کے ذریعہ جس کی دعوت اسلام دیتا ہے۔"

فردوسِ گم گشتہ:۔ چوہدری غلام احمد صاحب پرویز مدیرِ طلوعِ اسلام کا مقالہ ہے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی جن صحیح آئین و ضوابط کے ماتحت رہ کر اپنے منتہائے کمال پر پہنچتی ہے وہ وحیِ خداوندی کے باہر کہیں نہیں مل سکتے۔ اسلام کے تین عناصرِ ترکیبی ہیں اوّل ضابطۂ قوانین الٰہیہ۔ دوم قوتِ نافذہ۔ اِن دونوں کی حامل جماعتِ مومنین یا حزب اللہ۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت ناگفتہ بہ ہے لیکن ضابطۂ خداوندی یعنی قرآن کریم کی موجودگی میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ "یہ ہدایت آج ہمارے پاس موجود ہے اِس لئے ہم جہنم کی پستی سے اُبھر کر پھر اُسی جنت کی بلندی پر پہنچ سکتے ہیں۔" "فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کی سبیل ہے قرآن کریم سے تمسک اور جماعتی زندگی کے تخیل کا احیاء۔" لہٰذا آج جو قدم مسلمانوں میں انفرادی زندگی کی بجائے اجتماعی زندگی پیدا کرنے کے لئے اُٹھے ہیں مبارک ہیں۔" "اگر مسلمانوں نے آج اِس نکتے کو سمجھ لیا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے تو رفتہ رفتہ اُن کی لٹی ہوئی ثروتیں چھنی ہوئی دولتیں اور مٹی ہوئی عظمتیں ایک ایک کر کے ان سے ہم کنار ہو جائیں گی اور دُنیا اس پیشگوئی کی صداقت کی گواہی دے گی کہ

خروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے ۔۔۔ زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے"

یہ تمام مقالے اس قابل ہیں کہ مسلمان نوجوان بغور اِن کا مطالعہ کریں۔ اِن کے لکھنے والے ایسے اصحاب ہیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کی نشاۃ الثانیہ میں خاص طور پر حصہ لے رہے ہیں۔

ب۔ ا

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگارِ علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

جلد ۴۰ — **"ہمایوں" بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۴۱ء** — **نمبر ۴**

تصحیح :- گزشتہ مہینے "فردوسِ گم گشتہ" کے ریویو میں چودھری غلام احمد صاحب پرویز کے نام کے ساتھ "مدیر طلوعِ اسلام" کے الفاظ سہواً مدرج ہو گئے۔ اس کے ایڈیٹر اخوند زادہ حسین امام صاحب ہیں۔

چندہ سالانہ صہ **ششماہی** سے **مع محصول ڈاک!** **قیمت فی پرچہ**:- ۸/

جہاں نما

آزادی کے گداگر اور صداقت شعار چرچل

موجودہ مہذب حکومتوں کا یہ فیشن ہے کہ اگر وہ کسی غیر ملک پر قبضہ کرتی ہیں تو اُس کو اور باقی دنیا کو یقین دلا دیتی ہیں کہ یہ قبضہ محض مقبوضہ ملک کے فائدے کے لئے کیا گیا ہے۔ اگر اُس ملک کے باشندوں کا رنگ گورا ہو تو قبضہ اُن کی آزادی کے تحفظ کے لئے ہوتا ہے اور اگر وہ کالے ہوں تو پھر یہ قبضہ اُنہیں مہذب بنانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ رسم کے مطابق آخرالذکر قسم کے مقبوضہ ملک سے یہ وعدہ بھی ہوتا ہے کہ وُہ مہذب بنتے ہی آزاد کر دیا جائے گا۔ دراصل یہ موجودہ فاتحین کی شائستگی اور حُسنِ خلق ہے ورنہ انہیں یہ وعدہ کرنے پر بھی کون مجبور کر سکتا ہے۔

ہندوستانیوں کا ایک پست خیال اور بے ہمت طبقہ اس رسم کو جاننے کے باوجود انجان بنتا ہے اور ایک بہادر اور فاتح قوم کو محض اُس کے رسمی اور شائستہ اعلانوں پر لفظی بحث کی مشکلات میں گھسیٹتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ کسی طرح فاتح قوم سے اُس کی خون پسینے کی کمائی ہوئی سلطنت بھیک میں مانگ کر ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر مالکِ ملک بن جائے۔ یہ لوگ حکومت کے دروازوں پر آئے دن ع

کچھ راہِ خدا دے دے

کی صدائیں لگاتے پھرتے ہیں اور اُس کو ناحق دق کرتے رہتے ہیں۔

رسم ورواج کی پابندیوں کا بُرا ہو کہ اربابِ حکومت میں سے کسی اللہ کے بندے کو اب تک سچّی بات کہنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ ایک وعدے کے بعد دوسرا وعدہ اور پھر اُس وعدے پر گداگرانہ ذہنیت کے ہندوستانیوں کی لفظی بحث حکومت کے لئے ہمیشہ ایک نئی پریشانی پیدا کر دیا کرتی تھی۔

ہمارے موجودہ مالک اور انگلستان کے برگزیدہ وزیرِ اعظم مسٹر چرچل کی اخلاقی جرأت قابلِ تعریف ہے کہ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر یہ معاملہ ہمیشہ کے لئے خوب صاف کر دیا ہے۔

صدرِ جمہوریۂ امریکہ کے اشتراک سے مسٹر چرچل کہیں یہ اعلان کر بیٹھے تھے کہ موجودہ جنگ آزادیٔ اقوام کے لئے لڑی جا رہی ہے مطلب تو صاف تھا کہ حال ہی جو قومیں جرمنی کے زیرِ نگیں ہو گئی ہیں وہ جرمنوں کے اثر واقتدار سے آزاد کرا لی جائیں گی، لیکن بوجھ بجھکڑ ہندوستانیوں نے مسٹر چرچل کو اِس لفظی بحث میں پھانسنا چاہا کہ "اقوام" میں تو ہم بھی شریک ہیں۔ پھر کیا یہ جنگ ہمیں بھی آزادی دلا دے گی؟

ان عقل کے مالکوں نے یہ نہ سمجھا کہ انگلستان جرمنی کے خلاف لڑ رہا ہے، اپنے خلاف جنگ آزما نہیں۔ جنگ کا یہ انوکھا

مقصد کبھی نہیں سنا گیا کہ کوئی قوم اپنا خون بہا کر فتح حاصل کرنے کے بعد خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارے اور اپنی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اُسے ہوسِ سلطنت رکھنے والے نامرد بھک منگوں کے حوالے کردے۔ آفرین ہے اُن عقلمند ہندوستانیوں کو جو انگریزوں کو ایسی اُلٹی کھوپری کا مالک سمجھتے ہیں

اگر بہادر چرچل کے علاوہ کوئی اور انگریز اِس بحث میں پھنسایا جاتا تو غالباً وہ چکرا جاتا یا اِن گدایانِ بہرم کو کسی جھوٹے وعدے سے ٹالنے کی کوشش کرتا مگر صداقت شعار چرچل نے یہ دوٹوک جواب دے دیا کہ ہمارے اِس مشترکہ اعلان سے تمہارا یا سلطنتِ برطانیہ کے کسی اور علاقے کا قطعاً کوئی تعلق نہیں، نہ تمہارے متعلق حکومت کی اُس حکمتِ عملی میں کوئی فرق آئے گا جس پر وُہ کاربند ہے۔

بات بھی درست ہے۔ سلطنت کی بھیک نہ آج تک کسی نے مانگی ہے نہ کسی نے دی ہے۔ اگر ہماری بے غیرتی اِس حد کو پہنچ چکی ہے۔ کہ ہم بھیک میں مانگی ہوئی سلطنت سے مطمئن ہو سکتے ہیں تو انگریزوں پر کیا بھوت سوار ہُوا ہے کہ ہم اُن سے بھی ایک خلافِ فطرت "بخشش" کرنے کی توقع رکھیں حالانکہ اُن بیچاروں کے آباؤ اجداد نے اُن کے لئے قوتِ بازو اور عقل و دانش سے چھ ہزار میل دُور یہ سلطنت حاصل کی تھی اور وُہ اس پر اب تک اپنی قابلیت اور حکمت سے قابض ہیں۔

اس نمک خوار کی رائے تو یہ ہے کہ آئندہ تمام انگریز مدبر صاف گوئی میں صداقت شعار چرچل کی پیروی کیا کریں تاکہ کسی کو ناجائز موقع ہی نہ ملے کہ سرکار کا وقت بیکار لفظی بحث میں ضائع کرنے پائے۔ خدا کرے آئندہ جو ہندوستانی گداگر انگریز سرکار کے دروازے پر

کچھ راہِ خدا دے جا

جا تیرا بھلا ہوگا

کا نعرہ بلند کرے، اُسے ایسا ہی ٹکا سا جواب ملے۔ آمین!

ہندوستان کی مرکزی حکومت کی آمد اور خرچ

سنہ	آمد	خرچ
۱۹۲۶-۲۷ء	۱۳۱۶۵۴۶۹۰۳	۱۳۱۶۵۴۶۹۰۳
۱۹۲۷-۲۸ء	۱۲۷۲۲۷۷۹۲۰	۱۲۷۲۲۷۷۹۲۰
۱۹۲۸-۲۹ء	۱۲۸۹۷۰۲۴۱۶	۱۲۹۲۸۵۶۴۱۸
۱۹۲۹-۳۰ء	۱۳۲۶۴۵۵۱۰۲	۱۳۱۴۱۷۱۵۰۴
۱۹۳۰-۳۱ء	۱۲۴۵۹۵۵۷۲۱	۱۳۶۱۸۰۰۶۹۵
۱۹۳۱-۳۲ء	۱۲۱۶۴۹۵۷۱۴	۱۳۳۳۹۳۸۹۹۱

	آمد	خرچ
۱۹۳۲-۳۳ء	۱۲۵۴۳۶۹۷۹۵	۱۲۳۸۸۵۰۶۰۳
۱۹۳۴-۳۵ء	۱۲۲۱۲۴۰۴۷۲	۱۲۱۷۶۴۰۴۷۲
۱۹۳۵-۳۶ء	۱۲۱۰۷۲۶۵۲۷	۱۲۱۰۷۲۶۵۲۷
۱۹۳۶-۳۷ء	۱۱۷۸۳۸۹۱۹۲	۱۱۹۶۲۶۰۷۹۶
۱۹۳۷-۳۸ء	۱۲۲۴۸۰۰۰۰۰	۱۲۲۴۸۰۰۰۰۰
۱۹۳۸-۳۹ء	۱۱۹۵۶۷۶۰۰۰	۱۲۲۲۱۵۱۰۰۰
۱۹۳۹-۴۰ء	۱۲۱۷۹۹۵۰۰۰	۱۲۱۷۶۷۹۰۰۰

تیز رفتاری کی یادگاریں

دُخانی کشتی

۱۹ اگست ۱۹۳۹ء کو سر میلکم کیمبل نے "بلو برڈ ۲" کو ۱۴۰ میل فی گھنٹہ چلا کر پانی پر رفتار کی سابقہ کل عالم یادگار کو مات دی۔

ریل گاڑی

۳ جولائی ۱۹۳۸ء کو لندن اینڈ نارتھ ویسٹرن ریلوے "کی کارونیشن ایکسپریس" ۱۲۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار تک پہنچی۔ یہ دنیا میں ریل گاڑی کی یادگار تیز ترین رفتار کہی جاتی ہے۔

موٹر سائیکل

دنیا میں موٹر سائیکل کی تیز رفتاری کی یادگار ارنسٹ ہین نے ۱۷۶٫۶۴ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا کر قائم کی۔

برف پر پھسلنے کی رفتار

۱۶ فروری ۱۹۳۳ء کو ناروے کے مشہور مشّاق جیلینڈ نے برفانی جوتوں کی مدد سے برف پر ۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پھسل کر دنیا بھر میں انسانی ٹانگوں کی تیز رفتاری کی یادگار قائم کی۔

موٹر کار

جان کوب نے موٹر کار کو ۳۶۸٫۸۵ میل کی رفتار سے چلا کر کیپٹن آئسٹن کی قائم کردہ ۳۵۷٫۵۰ میل فی گھنٹہ کی یادگار کو مات دی۔

دیہات کی سادہ تہذیب

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے پچھلے دنوں اپنے ایک مضمون میں ہندوستانی دیہات کے باشندوں کی فطری سیرچشمی اور مہمان نوازی کا ذکر کرتے ہوئے ذیل کا واقعہ بیان کیا تھا۔

"ایک دفعہ مجھے ایک مقام سے جو کلکتے سے سو میل کے فاصلے پر واقع تھا کلکتہ تک موٹر میں آنے کا موقع پیش آیا۔ موٹر کار کی مشین میں کوئی نقص واقع ہو جانے کی وجہ سے ہمیں تقریباً ہر آدھ گھنٹے کے بعد پانی بدلنے کی ضرورت درپیش ہوتی تھی۔ جس گاؤں کے قریب ہم پہلے پہل ٹھہرنے پر مجبور ہوئے وہاں کے ایک باشندے سے ہم نے پانی مانگا۔ اس نے کافی دقّت اُٹھاتے کے بعد ہمیں پانی بہم پہنچایا لیکن جب ہم نے اس کے بدلے میں بہ طور انعام اُسے کچھ دینا چاہا تو اُس نے غریبی کے باوجود اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پندرہ گاؤں اور ایسے آئے جہاں یہی واقعہ پیش آیا لیکن کسی شخص نے انعام قبول نہ کیا۔ اس گرم ملک میں جہاں مسافروں کو پانی کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے اور جہاں گرمیوں میں پانی کم ملتا ہے وہاں لوگ ضرورت مندوں کو پانی مہیا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ طلب و رسد کے قانون کے مطابق وہ چاہیں تو اسے اپنا کاروبار بنا سکتے ہیں لیکن ان کے لئے یہ خدمت ایک مذہبی فریضے کی حیثیت رکھتی ہے انہیں پانی بیچنے کیلئے کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی انہیں اپنی زندگی فروخت کرنے کا مشورہ دے۔ پانی کی ملکیت کو وہ اپنے کسی شخصی گُن سے منسوب نہیں کرتے"

شہری زندگی میں کاروباری ذہنیت زیادہ نمایاں ہے۔ آہستہ آہستہ دیہات پر بھی اسی ذہنیت کا غلبہ ہو رہا ہے اور فطری سادگی اور سخاوت کی جگہ سوداگرانہ ذہنیت لے رہی ہے۔ ڈاکٹر ٹیگور لکھتے ہیں:۔

"ایک کروڑ پتی سیاح جو اپنے روپے کی مدد سے منڈی کی تمام اشیائے خوردنی کو قبضے میں کر لینے اور دنیا کو فاقہ کشی کے لئے مجبور کر کے خود دولت مند بننے پر ہر وقت تیار رہتا ہے جب ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ان دیہات میں سے گزرتا ہے تو وہ ان لوگوں کے اخلاق کو خاطر میں لانے کے قابل بھی نہیں سمجھتا۔

. . . .

ان لوگوں کی تہذیب بلا شبہ بہت سادہ ہے لیکن اس کا ارتقاء صدیوں میں ہوا ہے۔ اس سادگی کی نقالی آسان کام نہیں۔ انسان چند سال میں اس قابل تو ہو سکتا ہے کہ ایک مشین کا چکر گھما کر ہزاروں سوئیوں میں بیک وقت سوراخ کرنا سیکھ لے لیکن دشمن یا اجنبی سے یہ سادہ دلانہ مروت کا سلوک سیکھنے کے لئے پشت ہا پشت کی مشق درکار ہے۔ سادگی اپنی قدر و قیمت کا شمار نہیں کرتی اور اُسے کسی مزدوری کی توقع بھی نہیں ہوتی۔ اسی لئے وہ لوگ جو طاقت کے نشے میں سرشار ہیں اس بات کا احساس نہیں کرتے کہ روحانیت کا یہ سادہ اظہار تہذیب کا سب سے بہتر ثمر ہے"

مرزا عظیم بیگ چغتائی اور حضرتِ فانی بدایونی کی رحلت

اگست ۱۹۴۱ء ہندوستان کی ادبی زندگی کے لئے بہت منحوس ثابت ہوا۔ ٹیگور کے بعد اردو زبان کے دو مشہور ادیب یعنی مرزا عظیم بیگ چغتائی اور حضرتِ فانی بھی اسی مہینے میں ہم سے جُدا ہو گئے۔

مرزا عظیم بیگ نے عالمِ جوانی میں ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء کو رحلت فرمائی۔ وُہ بے حد زود نویس نثار اور مزاحیہ رنگ میں ہندوستان کی خانگی زندگی کی دلچسپیوں کے بہت چابک دست عکاس تھے۔ انہوں نے اپنی مختصر ادبی زندگی میں اردو افسانہ نگاری کی بہت خدمت کی۔ اُن کی بیسیوں کتابیں مدت تک اُن کا نام زندہ رکھیں گی۔

"ہمایوں" سے مرزا صاحب مرحوم کے بہت دیرینہ تعلقات تھے اور غالباً اُن کی ادبی زندگی کا آغاز "ہمایوں" ہی کے صفحات سے ہوا تھا۔ اس لئے ہمارے لئے اُن کا انتقال دُہرے رنج کا باعث ہے اور ہم اس صدمے میں اُن کے اعزّہ واقربا کے ساتھ دل سے شریک ہیں۔

۱ مرزا صاحب کی رحلت کی خبر سے متاثر ہو کر جنابِ جگر قریشی لدھیانوی نے ایک قطعہ لکھ کر ہمایوں کے لئے بھیجا ہے جو درجِ ذیل ہے ؎

طریقِ مزاح کا خوش ذوق بانی تھی مشہور جس کے قلم کی روانی
وہ چغتائی زندہ دل اب کہاں ہے کدھر چھپ گیا ہے وہ ماہِ معانی

جناب شوکت علی خاں صاحب فانی بدایونی اپنی حُزنیہ غزل گوئی کے لئے مشہور تھے۔ جن دنوں اُن کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوا اُردو غزل کی مخالفت شروع ہو چکی تھی لیکن فانی اُس عہد کے بعض اور شعراء کی طرح غزل گوئی پر اصرار سے جمے رہے اور آخر ایک پختہ اور مقبول رنگ پیدا کر لینے میں کامیاب ہوئے۔

فانی ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں گھر پر عربی اور فارسی کی تعلیم ہوئی۔ اس کے بعد اُنہوں نے ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ سے بی۔اے اور ۱۹۰۸ء میں ایل ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی۔ گیارہ سال کی عمر میں فانی نے غزل گوئی شروع کی اور پہلا دیوان ۳۰ سال کی عمر میں مرتب کیا مگر افسوس کہ مسودہ ضائع ہو گیا۔ اس کے بعد جو غزلیں مل سکیں "باقیاتِ فانی" کے نام سے شائع کی گئیں۔ سُنا گیا ہے کہ اب "انجمنِ ترقیٔ اُردو" کی طرف سے "کلیاتِ فانی" کے نام سے اُن کا مجموعۂ کلام شائع ہوا ہے۔

افسوس کہ صاحبِ کمال فانی کی زندگی کے آخری ایام حیدرآباد دکن میں بہت تنگدستی کی حالت میں گزرے اور طویل علالت کے بعد ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کو وہیں اُن کا انتقال ہو گیا۔

زندگی آخر تک اُن کے لئے ایک دردانگیز الجھن بنی رہی۔ خود کہتے ہیں ؎

اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

خُدا اُن کی روح کو آسودہ کرے۔

حامد علی خاں

مرزا عظیم بیگ چغتائی

مجھے مرزا فہیم بیگ صاحب چغتائی کے ایک خط سے جب مرزا عظیم بیگ مرحوم کے انتقال کی اطلاع ملی تو میں نے اُن سے مرحوم کے مختصر حالاتِ زندگی لکھنے کی درخواست کی تھی۔ میرے خط کے جواب میں اُنہوں نے ذیل کا خط اور حالات لکھے ہیں جنہیں انہیں کے قلم سے درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ح

برادرم حامد علی خاں

کیا لکھوں ایک تو کوتہ قلم واقع ہوا ہوں، دوسرے طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، اس کے علاوہ میرزا عظیم بیگ مرحوم کے بہت سے حالات ابھی تک معلوم نہ ہو سکے، کچھ یوں ہی بے ترتیب سی چند باتیں لکھ سکا، یہ دیکھ کر آپ اپنے طور پر کوئی مضمون نکال دیجئے، دوسرے صاحبان کو اتنی بھی معلومات نہیں، میں چاہتا ہوں سب سے پہلے مرحوم کے متعلق ہمایوں میں کچھ شائع ہو۔

بہت ممکن ہے کہ اپنے اپنے تعلقات اور جذبات و معلومات کے مطابق دوسرے اخبارات اور رسالے مرحوم کے متعلق لکھیں، یا نہ لکھیں اس سے کیا غرض میرا بھائی تھا میں چاہتا ہوں، کہ ایک مضمون اُس کی یادگار کے طور پر ہمایوں میں نکل جائے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۴۱ء ـــــ دعاگو۔ میرزا فہیم چغتائی

والد کا نام۔ میرزا قسیم بیگ چغتائی بی۔اے علیگ

صاحب موصوف میرے منجھلے چچا میاں تھے، آپ نے سرسیّد احمد خاں صاحب کی زندگی ہی میں علی گڑھ سے بی۔اے کیا، اور ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔

میرزا عظیم بیگ بتاریخ ۱۲ اگست ۱۸۹۵ء مطابق ۲۳ ربیع الاوّل ۱۳۱۶ھ بروز جمعہ بوقت چار بجے صبح بمقام غازی پور پیدا ہوئے یوں تو کئی دن سے جھڑی لگی ہوئی تھی لیکن اُس وقت کچھ اس زور سے بارش ہوئی، کہ پردے کی دیوارِ خام ڈھے پڑی اور بنگلے کے احاطے میں پانی ہی پانی ہو گیا۔

سید زین العابدین صاحب نے جو ہمسایہ تھے عظیم بیگ نام رکھا، ان دنوں عظیم بیگ کے نانا شیخ امداد علی صاحب مصنف ناول رزم و بزم آگرہ میں سخت علیل تھے، جس وقت اُنہیں نواسے کی نوید پہنچی تو اُن پر نزع طاری تھی، "مبارک ہو،" کہا اور خاموش ہو گئے۔

میرے والد مرحوم میرزا ابراہیم بیگ چغتائی المتخلص بہ میرزا کو اس مولود کی خبر ضلع بھنڈار یاست گوالیار میں ہوئی، اُنہیں بھی یہ نام پسند آیا، اور انہوں نے "پُورِ نو عظیم بیگ" میں ۱۳۱۶ء نکالا تھا۔

۱۹۰۱ء میں میرزا قسیم بیگ صاحب کا غازی پور سے رائے بریلی کو تبادلہ ہو گیا تھا، وہاں انہوں نے عظیم بیگ کے بڑے بھائی میرزا نسیم بیگ کی سواری کے لئے ایک ٹٹو لیا، اُسے آتے جاتے دیکھ کر عظیم بیگ کچھ ایسے سہمے کہ حضرت کو بخار آنے لگا، رفتہ رفتہ چند

روز میں یہ حالت ہوئی کہ اکثر غشی طاری ہوجاتی تھی، اور اس درجہ کمزوری بڑھی کہ کروٹ لینا مشکل ہوگیا۔

رائے بریلی سے تبادلہ ہونے پر ان کے والد میرزا قسیم بیگ صاحب ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ گئے اور کوٹھی امین الدولہ بہادر میں مقیم ہوئے، وہیں عظیم بیگ کے ختنے کئے گئے۔

۱۹۰۳ء میں اُناؤ کو تبادلہ ہوا، وہاں عظیم بیگ کی بسم اللہ (مکتب) کرائی گئی۔

چند مہینے بعد اُناؤ سے مین پوری تبدیل ہوئے، مین پوری میں عظیم بیگ کو مولوی میاں جان صاحب اُردو کا قاعدہ پڑھانے اور تختی لکھوانے لگے۔

شروع اکتوبر ۱۹۰۳ء سے مین پوری میں ایسی سخت بارش شروع ہوئی، اور ندی میں ۵ طغیانی آئی، کہ بازاروں کے راستے بند ہوگئے، اُن دنوں ہاتھی کی سواری پر بھی کچہری جانا دشوار تھا، عظیم بیگ کو کچھ موسم کی خرابی اور کچھ دانت نکلنے کی وجہ سے تیز بخار آیا، اُس شدت میں ایک دورہ ایسا پڑا کہ دانتی بھنچ کر بے ہوش ہوگئے۔ میرزا نعیم بیگ[1] صاحب باوجود پیرانہ سالی کے عظیم بیگ کی دوا دوش کے سلسلہ میں بار بار ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیگتے گئے اور بھیگتے آئے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو بھی بخار آنے لگا جلد جلد حالت گرتی گئی حتیٰ کہ یکم نومبر ۱۹۰۳ء کو انتقال کر گئے۔

میرزا نعیم بیگ صاحب چغتائی کی قبر مولوی محسن صاحب کاکوروی صاحب ہفت بند کاشی کی ٹہر واڑ میں درختوں کے سلسلے میں نہایت مناسب مقام پر بنائی گئی۔

۱۹۰۴ء میں میرزا قسیم بیگ صاحب کا تبادلہ مین پوری سے بدایوں کو ہوگیا، ۳۱ر جولائی ۱۹۰۸ء کو مولوی احمد حسین صاحب نے عظیم بیگ کا قرآن شریف ختم کرایا، اور وہ بدایوں کے تحصیلی اسکول کی دوسری جماعت میں داخل کر لئے گئے۔

یکم اپریل ۱۹۰۹ء کو ضعیف القویٰ اور دائم المرض ہونے کی وجہ سے ان کا نام اسکول سے خارج کرادیا گیا، اپنے گھر ہی مولوی احمد حسین صاحب سے اُردو پڑھتے تھے۔

۱۵ر مئی ۱۹۱۱ء درجہ ششم پاس کر کے ساتویں درجے میں آئے، پھر ۱۶ر جولائی کو اپنے بڑے بھائی میرزا نسیم بیگ کے ساتھ ولی محمد خاں ملازم کی نگرانی میں رام پور پڑھنے کو گئے، لیکن وہاں کا انتظام خاطر خواہ نہ ہونے کی وجہ سے دو مہینے بعد بدایوں واپس آئے۔"

یہ چچا میاں کے لکھے ہوئے روزنامچے کا اختصار ہے، اسی کاپی میں کچھ صفحے سادہ چھوڑ کر خود عظیم بیگ نے اپنے تھوڑے سے حالات لکھے ہیں، جن کا اقتباس حسب ذیل ہے:-

یکم نومبر ۱۹۱۹ء کو کوآپریٹو ٹریننگ کلاس میں داخل ہوا - ۱۴ر اپریل ۱۹۲۰ء کو اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہوں، سیکنڈ ڈویژن میں سب سے اوّل رہا، کل لڑکوں میں میرا ساتواں نمبر رہا، یعنی فرسٹ ڈویژن والوں میں ملا کر۔

یکم مئی ۱۹۲۰ء اسسٹنٹ منیجر ڈسٹرکٹ بنک ضلع ایٹہ مقرر ہو کر ۲ر کو ایٹہ پہنچا۔ رمضان شریف کا مہینہ نہایت سخت گذرا، چودھویں روز بیمار ہوا، تو عید تک صحت نہ ہوئی، طبیعت مضمحل رہتی ہے، بہت کمزور ہوگیا ہوں۔

۲۵ر اگست ڈسٹرکٹ کوآپریٹو بنک ایٹہ کو تقریباً ایک ہزار روپیہ خسارہ ہوا اس واسطے اسسٹنٹ رجسٹرار صاحب بابو رام سرن داس نے

---

[1] ہم لوگوں کے بڑے ابا (تایا)

مشورہ دیا کہ میں چھٹی لے کر گھر جاؤں چنانچہ میں نے عمل کیا چھٹی لے کر آگرہ گیا، وہاں سے ایٹہ واپس آیا، چار روز تنخواہ کا انتظار کیا، لیکن نصف ماہ بعد ملی، تنخواہ ملی اور بیکار ہو کر برانچ پہنچ گیا۔

بقر عید ۱۹۲۰ء سندیلہ میں پچاس روپیہ تنخواہ اور دس آنہ یومیہ بھتہ پر سپر وائزری پر تقرر کی اطلاع ملی، لیکن جب برانچ سے وہاں گیا تو قبول احمد صاحب مینجر سندیلہ سے معلوم ہوا کہ جن کی جگہ یہ تقرر ہوا ہے، ابھی تک خبر نہیں ان کا تبادلہ کہاں کیا گیا، لہٰذا واپس جاؤ۔ اطلاع ثانی پر آنا۔

یکم نومبر کو میں نے سندیلہ جا کر سنٹرل کوآپریٹو بنک میں سپر وائزری کا چارج لیا۔

چند مہینے سے نائب تحصیلداری کی نامزدگی کے لئے کوشش جاری تھی، ۲۲ دسمبر ۱۹۲۰ء کو دو روز کی چھٹی لے کر آگرہ گیا، کمشنر صاحب کے یہاں حاضری دی، تو انہوں نے فرمایا، کہ امسال کچھ نہیں ہو سکتا۔

۷ اکتوبر داڑھی رکھائے سوا مہینہ ہو گیا، دیکھئے کب تک رہے۔

یکم اپریل ۱۹۲۱ء آج تین مہینے بعد میں نے داڑھی مونڈ ڈالی۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء ہفتہ بھر سے پہلی مرتبہ پیچش میں مبتلا ہوں، اس سے قبل یہ بیماری کبھی نہیں ہوئی تھی۔

۱۳ نومبر ۱۹۲۱ء دس یوم کی چھٹی لے کر اس امید پر آگرہ گیا، کہ تحصیلداری کی نامزدگی ہو جائے لیکن نہ ہوئی، میں نے پانچ روز کی رخصت اور بڑھوائی، کیونکہ میری شادی کا مسئلہ درپیش تھا، خوب سوچ بچار کے بعد میں نے قطعی فیصلہ کر لیا، کہ شادی ضرور کرنا چاہئے، اور سب بھی بسیار قیل و قال کے بعد رضامند ہو گئے، اور صفدر خاں صاحب کے ذریعہ سے ان کے بھائی سردار خاں صاحب کو رقعہ روانہ کر دیا گیا، رامپور سے میری منجھلی بہن کا خط آیا، کہ سردار خاں صاحب نے یہ رشتہ منظور کر لیا، آئندہ موسم سرما میں شادی ہو جائے گی۔

۳ دسمبر ۱۹۲۱ء کو والد ماجد کا تار آیا کہ صاحب کمشنر نے مجھ کو آبکاری میں نامزد کر دیا ہے، ڈاکٹری سارٹیفکیٹ چاہئے، میں نے بیس روپے کے خرچ سے ڈاکٹری سارٹیفکیٹ حاصل کیا اور بھیج دیا۔

دوسری فروری ۱۹۲۲ء آبکاری کے واسطے معائنہ ہوا، طبیعت بہت مکدر ہوئی، خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں نہیں لیا گیا، ۲۵ فروری برائے انتخاب سب رجسٹراری مقرر ہوئی، مگر انتخاب ملتوی کر دیا گیا، نہ جانے آئندہ انتخاب کب ہوگا۔

آئندہ ماہ یعنی اپریل ۱۹۲۲ء میں میری شادی کی تاریخ مقرر ہونے والی ہے۔

عظیم بیگ مرحوم نے اس کاپی میں اتنے ہی حالات لکھے اور رہ گئے، اب جو کچھ بے ترتیب سا مجھے معلوم ہے لکھتا ہوں۔

مرزا عظیم بیگ نے اسکول کے دنوں میں رابنسن کروسو کے سفرنامے کی طرح ایک ترکی خاندان کا فرضی سفرنامہ "قصر صحرا" تصنیف کیا تھا، جو غالباً ۱۹۱۶ء میں دارالاشاعت لاہور سے شائع ہوا، اس کے پہلے ایڈیشن میں سرورق پر بجائے عظیم بیگ کے میرا نام فہیم بیگ چھپ گیا تھا۔

۱۹۲۳ء میں مرزا عظیم بیگ آگرہ کوآپریٹو بنک میں تھے، پنشن ہو جانے کے سبب سے چچا میاں بھی آگرہ ہی آ گئے تھے، میں نے فخرہ والی کوٹھی میں یہی

---

[1] ان دنوں بہرائچ میں چچا میاں تھے۔

سے واپس آکر رہنے سہنے پایا، اس وقت تک عظیم بیگ کی شادی ہو چکی تھی، اس واسطے ان کی دلہن بھی وہاں تھیں۔

جیسا وہ خود اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں، اُن کے قلم سے ایک انگریزی ناول Mrs Frank Penny کا اُردو ترجمہ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۰ء کو ہو گیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں کسی دوست کی صلاح سے آگرہ کو اپریٹو بنک کی ملازمت ترک کر کے بمبئی گئے وہاں ایک ہوٹل میں نوکری کر لی، چند مہینے ہوٹل کی ملازمت کر کے علی گڑھ چلے گئے، یونیورسٹی کی پچاس سالہ جوبلی میں اُن سے ملاقات ہوئی، چچا میاں بھی وہیں ڈگی والی کوٹھی میں جس میں محمد علی مرحوم نے جامعہ ملیہ قائم کی تھی، رہتے تھے، اور جامعہ ملیہ دہلی کو منتقل ہو چکی تھی، اس وقت مجھے اور میاں حفظ الرحمٰن صاحب جامع حفظ العلوم کو عظیم بیگ نے ایک طبعزاد ناول سنایا تھا، اور ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو ان کے مصنفہ ایک ترک خاندان کے سفرنامہ "قصرِ صحرا" کا دوسرا حصہ دار الاشاعت لاہور سے چھپ کر عظیم بیگ کے پاس پہنچ چکا تھا۔

عظیم بیگ نے علی گڑھ جا کر نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب مرحوم کے کارخانہ میں نوکری کر لی تھی، اور فاضل وقت مطالعہ میں گذارتے تھے، اس طرح انہوں نے ۱۹۲۷ء میں بی۔ اے کیا، اور ۱۹۳۰ء میں ایل۔ ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔

کچھ عزیز و اقارب کیونکہ وہاں موجود ہیں لہٰذا عظیم بیگ کو یہی سوجھی کہ جودھپور میں وکالت کرنی چاہیئے، وہاں جا کر مارواڑی غیر مارواڑی کا تصفیہ تھا، مارواڑی ثابت کرنے کے لئے لکھا پڑھی کی، جب فیصلہ میں دیر معلوم ہوئی، تو اپنی خسرال رام پور چلے گئے، رامپور میں تقریباً چھ مہینے وکالت کی تھی، کہ انہیں مارواڑی تسلیم کر لئے جانے کی اطلاع ہوئی، اس واسطے جودھپور چلے گئے۔

اپریل ۱۹۳۶ء میں ریاست جاورہ کی چیف ججی پر مامور ہوئے، لیکن افسوس جاورہ راس نہ آیا، پیدائشی دائم المرض چلے آئے تھے، میرے خیال میں شاید وہ بالکل تندرست تو زندگی بھر لگاتار ایک سال کیا چھ مہینے بھی نہ رہے ہوں گے، قیام علی گڑھ سے اکثر حرارت میں مبتلا ہو جایا کرتے تھے، جاورہ جا کر دیرینہ کمزوریوں نے ٹی بی کی صورت اختیار کر لی، مجبوراً صرف چودہ مہینے وہاں کی چیف ججی پر رہ کر جودھپور چلے آئے۔

انہوں نے ۱۹۳۰ء سے باقاعدہ رسائل و اخبارات میں مضامین بھیجنے شروع کئے تھے، اور یہ سلسلہ صاحبِ فراش ہو جانے کے باوجود جودھپور میں بھی جاری رکھا، البتہ اب کوئی ایک سال سے لکھنے کی طاقت نہ رہی تھی۔

جنوری میں مجھے جودھپور بلایا، اور بڑی بڑی منتوں کے علاوہ تار دیا کہ جلد آیئے، لیکن فروری میں نشرگاہِ لکھنؤ پر دو پروگرام مقرر ہو چکے تھے، جاتے جاتے بہت دن لگ گئے، دوسری مارچ کو جودھپور پہنچا، تو میاں عظیم بیگ مشتِ استخواں نظر آئے، اِدھر میں خود بلڈ پریشر کی وجہ سے سخت تکلیف میں مبتلا تھا، خیر میرا بھگتوان تو نہ جانے کب ختم ہو گا۔ موت زندگی کی الجھن میں دن کاٹتا رہا، مگر میاں عظیم بیگ روز بروز ضعیف ہوتے گئے، کچھ دن تو چوبیس گھنٹے میں ایک آدھ ٹوسٹ کھا کر چند تولہ چائے پی لیتے تھے، پھر اس میں بھی کمی ہو گئی، اور مختصر یہ کہ جون میں پیروں کا ورم شروع ہو گیا۔

اب زندگی کی کیا اُمید ہو سکتی تھی، لیکن واقعہ ہے کہ موت کا یقین ہونے کے باوجود وہ نہایت مستقل مزاج رہے، اور ایسا بھی ہوا کہ کبھی ورم میں قدرے کمی آ گئی، کبھی کچھ زیادہ ہو گیا، پھر کچھ ایسے ناگفتہ بہ وجوہ حائل ہوئے، کہ انہیں اسی حال میں چھوڑ کر مجھکو ۱۳ جولائی کی صبح شیخوپور آنا پڑا۔ ۲۴ اگست ۱۹۴۱ء کو عظیم بیگ کے بڑے فرزند رحیم بیگ سلمہٗ کے خط سے معلوم ہوا کہ عظیم بیگ ۲۰ اگست کو ایک بجے دن کے قیدِ حیات سے آزاد ہو گئے۔

اُس روز حسبِ معمول صبح پانچ بجے بیدار ہو کر انہوں نے اچھی طرح باتیں کیں، تھوڑی دیر میں کہنے لگے، مجھے نیند آ رہی ہے، سب لوگ ہٹ گئے کہ ذرا آرام کر لیں، لیکن بار بار دیکھ جاتے تھے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی، ایک بار اُن کی حالت کچھ عجیب سی نظر آئی، تو اُن کی والدہ سمیت عزیز و اقارب اس کمرے میں آکر بیٹھ گئے، میاں عظیم بیگ آہستہ آہستہ غرغر کر رہے تھے، ان کا ہاتھ ٹیڑھا رکھا تھا، وہ جو سیدھا کیا، تو روح منتقل ہو چکی تھی۔

ساڑھے پانچ بجے شام کو جنازہ اُٹھا، اس وقت ایسی بارش ہو رہی تھی کہ سڑکوں کی نالیاں ڈھائی ڈھائی فٹ چل رہی تھیں، مگر جنازہ نہ بھیگا سا تھا خیر کے قبرستان تک پہنچ گیا۔ گھوڑا پیر کی درگاہ کے احاطے باہر نہر کے درمیان ایک چھوٹا سا قطعہ ہے وہاں میرے خاندان کے افراد کی چار قبریں پہلے موجود تھیں، چچا میاں (مرزا قسیم بیگ) اور میرے والد ماجد بھی وہیں آسودہ ہیں، اس ہڑواڑے میں عظیم بیگ کی پانچویں قبر ہے۔

۱۲ اگست ۱۸۹۵ء مطابق ۲۳ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ بمقام غازی پور بروز جمعہ پیدا ہونے والے ہندوستان کے ایک خاص ادیب مرزا عظیم بیگ چغتائی ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء مطابق ۲۵ رجب ۱۳۶۰ھ بروز چہارشنبہ جودھپور میں ناپید ہو گئے۔

مرزا فہیم چغتائی

گوئٹے پر حافظ کی شاعری کا اثر

پینسٹھ برس کی عمر میں گوئٹے کی زندگی کا ایک دلچسپ دور شروع ہوتا ہے۔

اِس سے پہلے وہ مدتوں طبیعیات اور حیاتیات کی دشوار گزار گھاٹیوں میں بھٹکتا پھرا۔ خوش قسمتی سے اِس علمی تگ و دو میں گوئٹے کے فطری ذوقِ ادبیات نے اس کا دامن تھامے رکھا ورنہ ممکن تھا کہ اُس کے فلک پیما تخیلات جو جرمن زبان کی شاعری کا بہترین سرمایہ ہیں سائنس کے کسی ادق مسئلہ میں اُلجھ کر رہ جاتے۔ جس طرح ٹالسٹائے آخری عمر میں جمالی اور اخلاقی رجحانات کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا اِسی طرح گوئٹے کی طبیعت بھی سائنس اور ادب کی آویزش سے محفوظ نہ رہ سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں اُس کی شاعری میں سائنس کا دخل ہو گیا وہاں اُس کے علمی نظریات میں شاعری کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ آپ فاؤسٹ ہی کو لیجئے۔ اس میں علمِ کیمیا، مابعد الطبیعیات اور نظریۂ ارتقا کے مسائل کا بیان شاعرانہ تخیل کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اِسی طرح سائنس کے میدان میں جب اُس نے نیوٹن کے سات رنگوں والے نظریہ کی تردید کی تو تمام یورپ کے حکماء نے اس کی مخالفت میں لمبے چوڑے مضامین لکھے مگر وہ برابر کہتا گیا کہ میں یہ کیسے مان لوں کہ سفید روشنی جو ایک سماوی مظہرِ قدرت ہے سات حصّوں میں منقسم ہو سکتی ہے ؎

بُت پرستی میں بھی رکھ حُسن کے پہلو پہ نظر
ہار بن، دَیر سے رشتہ ہو تو زنّار نہ بن

عمر کے اس دَور میں جب عوام کے روحانی اور جسمانی قوٰے پر یخ بستہ افسردگی چھا جاتی ہے اور ہمارے شاعر "شیب" کا ماتم شروع کر دیتے ہیں گوئٹے کی رگوں میں خون کے بجائے شراب اور آگ گردش کرنے لگتی ہے اور وُہ ایک نوعمر عاشق کی عقیدت مندی کے ساتھ "محبوبِ چہاردہ سالہ" کے سامنے دوزانو ہو جاتا ہے۔

اِس حیرت انگیز تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ اتنا عرصہ خشک علمی مباحث میں مصروف رہنے سے اُس کی طبیعت افسردہ ہو گئی تھی۔ اب آہستہ آہستہ ردِّعمل شروع ہو رہا تھا۔ عین اِسی وقت وہ حافظ شیرازی کی شاعری سے روشناس ہوا۔ فارسی شاعری اور تغزل کی دو نمایاں خصوصیات ہیں حکمت اور عشق چونکہ گوئٹے کی [illegible] کا خمیر انہی دو عناصر سے اُٹھایا گیا تھا اِس لئے وُہ حافظ کے حکیمانہ تغزل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ حافظ نے بندگی اور الوہیت، حقیقت و معرفت، مذہب و اخلاق اور فنا و بقا کے مسائل کو ساقی کے گوشۂ چشم اور چینِ ابرو سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری ذہنی اُلجھنوں میں مذہب اور تصوّف کا اثر غالب ہے، اِس لئے ہم حافظ کی شراب کو شرابِ معرفت سے تعبیر کرتے ہیں، مگر گوئٹے جو لامذہب کیا مذہب کا دشمن تھا اُس کو معرفت اور حقانیت کا واعظ نہیں بلکہ جوانی اور محبت کا پیامبر سمجھتا تھا۔ اس کو حافظ کی شراب میں تلخی اور بدمستی کا احساس ہوتا تھا۔ اُس کے لئے حافظ کی قنوطیت بھی اُمید افزا ثابت ہوئی۔ حافظ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے بقول خود اس کو از سرِ نو شباب حاصل ہو گیا۔ نقدِ نگاہ کا انتخاب

کہنے یا ذہنیت کا فرق کیسی ستم ظریفی ہے کہ جو کلام ہمیں یاس و قنوط کا درس دیتا ہے۔ جسے پڑھ کر ہمارے نوجوانوں کے عملی قوےٰ مفلوج ہو جاتے ہیں وہی کلام ایک آزاد قوم کے پیر زال کے لئے آبِ حیات کا کام کرتا ہے۔

گوئٹے پر حافظ کے کلام کا یہ اثر ہوا کہ دن رات اس پر عجیب مسرت بخش وجدانی کیفیت طاری رہنے لگی۔ وہ بسا اوقات گوشۂ تنہائی میں چلا جاتا یا باہر ویرانہ میں نکل جاتا اور پہروں ایک ایک شعر پر غور و خوض کرتا رہتا۔ معنوی محاسن سے قطعِ نظر اس کو غزل کے قافیئے اور ردیف سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی مگر سب سے زیادہ وہ فارسی شاعری کی اچھوتی تشبیہوں سے متاثر ہوا۔ مثلاً سیمیں ذقن، گلبدن، آہو چشم، نرگسِ جماش، بوسۂ شکریں، سرو رواں، لعلِ نوش لب، ساقِ شمشاد قد۔ ساعدِ سیم اندام، وغیرہ۔ مغربی شاعری میں لطیف تشبیہوں کی کمی نہیں مگر فارسی کے مقابلے میں گوئٹے انہیں ہیچ سمجھتا تھا۔ حافظ کی نادر تراکیب اور سبک بندشیں اس کی جمالیاتی حس کو تسکین کا ساماں بہم پہنچاتی تھیں۔ اس کے تتبع میں گوئٹے نے بعض بہت نازک تراکیب اپنی زبان میں داخل کیں۔ گوئٹے کے اس رنگ میں کہے ہوئے قطعات حافظ کے شعروں کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

گوئٹے ایک آزاد مشرب حکیم تھا۔ اس کا تخیّل وطنیت اور ملّت کی بندشوں سے آزاد تھا۔ بنی نوعِ انسان کے لئے اُس کی ہمدردی اور دلسوزی ہمگیر تھی۔ وہ رنگ و قوم کی قیود کو انسانیتِ عالیہ کے لئے لعنت سمجھتا تھا۔ اس نے بارہا اپنی قوم کے قومی جنون، خود پرستی، استبداد، عسکری تادیب اور فنونِ لطیفہ سے بیگانگی کا رونا رویا ہے۔ اُس کا قول ہے کہ اگر جرمنوں کو یہودیوں کی طرح ساری دنیا میں بکھیر دیا جائے تو وہ یقیناً انسانیتِ عالیہ کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ بحیثیتِ قوم اُن کا وجود صد درجہ خطرناک ہے۔ چونکہ وہ خود ایک عالمِ بے بدل تھا، اس لئے کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ عمر بھر میں اس نے صرف دو شاعروں کو اپنا ہم مرتبہ تسلیم کیا۔ حافظ اور بائرن۔ حافظ کے مشرب کی عالمگیر وسعت نے اُس پر جادو کا اثر کیا۔ اِس شعر کو اُس نے یقیناً بہت سراہا ہو گا ؎

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

والٹیر کی طرح وہ بھی اپنے ہم عصر رہنمایانِ دین کی ریاکاری اور ابلہ فریبی سے سخت نالاں تھا۔ حافظ نے مکّار صوفیوں کا خوب خاکا اُڑایا ہے۔ یہاں بھی دونوں میں نسبتِ روحانی پیدا ہو گئی۔ حافظ کے مندرجۂ ذیل اشعار میں اُسے ویمر یا برلن کے کسی گندم نما جَو فروش بشپ کی زندہ تصویر حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہو گی ؎

نقدِ صوفی نہ ہمہ صافی و بے غش باشد
اے بسا خرقہ کہ مستوجبِ آتش باشد

صوفیٔ ما کہ ز وِردِ سحری مست شدے
شامگاہش نگراں باش کہ سرخوش باشد

صوفیاں جملہ حریفند و نظر باز ولے
زیں میاں حافظِ دل سوختہ بدنام افتاد

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند

چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

فقیہِ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد

کہ مے حرام ولے بہ ز مالِ اوقاف است

اِس جگہ بے اختیار مجھے پنجاب کے "طوّ باز" پیرزادوں کا خیال آگیا جن کے مجاہداتِ نفس کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ، وسعتِ خرگوش کے شکار اور کشمیر کی سیر تک محدود ہو کے رہ گئے ہیں۔ مریدوں کی جو حالت ہوگی وہ ظاہر ہے۔ طالب آملی نے سچ کہا ہے ؎

خانۂ شرع خراب است کہ اربابِ صلاح

در عمارت گریٔ گنبدِ دستارِ خود اند

حافظ کے کلام نے گوئٹے کو صحیح معنوں میں جوان کر دیا تھا۔ اس کا جنسی جذبہ از سرِ نو بھڑک اُٹھا۔ انہی ایام میں جب وہ حافظ کے ہاتھ سے بادۂ شیراز کے جام نوش کر رہا تھا ایک مدت کی جدائی کے بعد اُسے اپنا ایک رنگیں مزاج دوست فان ولمر ملا۔ فان ولمر کے ساتھ اس کی نوعمر محبوبہ میرین بھی تھی میرین جیسی خانہ بدوشوں کی لڑکی تھی جسے چودہ برس کی عمر میں فان ولمر نے اس کے والدین سے خرید لیا تھا۔ آمدِ شباب کے ساتھ اس بدیسی حسینہ کا جوبن پہاڑی چشمے کی طرح پھوٹ پڑا۔ متناسب اعضاء، گدرایا ہوا جسم، سیاہ رسیلی آنکھیں، کلی کی طرح نازک دہن، آواز میں طوطیٔ شکرداں کی چہک، گوئٹے نے محسوس کیا جیسے حافظ کی خیالی محبوبہ اس کی نگاہوں کے سامنے زندہ ہو کر آگئی ہے۔ ہزار جان سے اُس پر عاشق ہو گیا۔ وہ اُسے مشرقی حسن کا بہترین نمونہ سمجھنے لگا۔ عربی اور فارسی ادبیات کے مطالعہ کے بعد لفظ "مشرق" کے ساتھ جو رنگیں تاثرات اس کے ذہن پر مرتسم ہو گئے تھے میرین کو دیکھ کر تازہ ہو گئے۔ اس کے رگ و پے میں عنفوانِ شباب کی گرمی دوڑ گئی اور اس کے جمالی احساسات تھرتھرا اُٹھے ؎

گفتم ز لعلِ نوشِ لباں پیر را چہ سود

گفتا بہ بوسۂ شکرینش جواں کنند

انہیں ایام میں فان ولمر نے گوئٹے کو اپنے دیہاتی مسکن پر آنے کی دعوت دی۔ جسے اُس نے دلی شوق کے ساتھ قبول کر لیا۔ اب اُس کی زندگی شراب و شعر کی فضا میں گھِرنے لگی۔ وہ بہت کم باہر نکلتا۔ اپنے کمرے میں ایک طرف بیٹھا تصورات کی دنیا میں کھویا رہتا۔ سامنے میز پر ایک نقرئی ساغر شراب سے لبالب بھرا پڑا رہتا اور وہ اس پر نظریں گاڑے بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا رہتا ؎

ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم

اے بے خبر ز لذتِ شُربِ مدامِ ما

دن کا کچھ حصہ وہ پائیں باغ کے پھولوں کے مطالعہ میں گزارتا اور شام کو میرین سے پیانو پر اپنے لکھے ہوئے گیت سنتا اور سر دُھنتا بسا اوقات جذبات کی فراوانی سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ میرین اپنے دستِ نازک سے اُسے مئے گلرنگ اُنڈیل کر دیتی جب گوئٹے آتشبار نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تو میرین کے رخسار اُن کی تپش سے تمتما اُٹھتے ؎

یاد باد آنکہ چو یاقوتِ قدح خندہ زدے

درمیانِ من و لعلِ تو حکایت ہا بُود

کبھی کبھی وُہ اس کے قریب آ بیٹھتی تو گوئٹے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں اُسے اپنی شراب و عشق کی تعریف میں لکھی ہوئی غزلیات سُنایا کرتا۔ میرین جس کی رگوں میں صحرا کا جنوں پرور خون گردش کر رہا تھا اپنے بوڑھے عاشق کی والہانہ محبّت کی تاب نہ لا سکی۔ اس مُعمّر شاعر کے گیتوں نے جن میں بادۂ شیراز کی آگ دہک رہی تھی اس پر [illegible] کر دیا۔ اور وُہ بھی اُس سے محبّت کرنے لگی۔ گوئٹے کا یہ قطعہ اُسی زمانے کا ہے۔

اُس نے مجمع پر ایک نگاہِ دزدیدہ ڈالی

سب حیران ہیں کہ اِس نگاہ کا مطلوب کون ہو سکتا ہے

مگر میں خوب جانتا ہوں کہ یہ خاموش پیار

میری ہی خوش نصیبی میں اضافہ کرے گا

مگر یہ معاملاتِ ناز و نیاز زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکے۔ فان ولمر گوئٹے کی سرمستی اور میرین کی محبت بھری محبوب نگاہوں سے خائف ہو گیا۔

ترا حیا و مرا آبِ دیدہ شد غمّاز

وگرنہ عاشق و معشوق راز دارانند

اس کے بعد جلد ہی ولمر نے میرین سے نکاح کر لیا۔ اب گوئٹے کو بھی اخلاقی فرض کے پیشِ نظر اپنی محبوبہ سے جُدا ہونا پڑا اور وُہ دل پر پتھر رکھ کر ویمر چلا گیا۔ اس کے بعد تادمِ مرگ اُن کی ملاقات نہ ہو سکی، مگر میرین کی محبّت اُس کے دِل میں باقی رہی۔ اب اس نے اپنی نظموں میں اپنے آپ کو حافظ اور میرین کو زلیخا کے نام سے مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ میرین بھی گوئٹے کو نہ بُھلا سکی۔ لطف یہ ہے کہ اس پُرجوش جذبۂ عشق نے اِس صحرائی حسینہ کو شاعرہ بنا دیا۔ اس واقعے کے بعد اُن کی خط و کتابت جاری رہی اور وُہ شعروں میں ایک دوسرے پر اپنی ناکامئ آرزو کا اظہار کرتے رہے۔ گوئٹے کے دیوان میں جو دیوانِ حافظ کی روش پر لکھا گیا ہے میرین کی چار نظمیں بھی شامل ہیں۔ اور اہلِ نقد و نظر انہیں اس دیوان کی چند بہترین نظموں میں شمار کرتے ہیں۔

[illegible] کی طرف سے جو پہلا خط گوئٹے کو ملا اُس میں اِس مطلب کے اشعار درج تھے:۔

آہ! میری حسرت نصیب محبت

اے نسیم! تیرے بازو پر کیف آور لمحات کا بار ہے

اور تیرے جھونکوں میں سرمدی راحت کا پیام نہاں ہے
لیکن میرے دلِ ناشاد کو تسکین کہاں؟
آ میرے کانوں میں سرگوشی کے لہجے میں کہہ دے:۔
"اس سے پہلے کہ شبِ تار کی زنگاری ردا
وادی اور دریا اور کوہستان کو ڈھانک لے
تجھے بھی اپنے محبوب کی آغوش ڈھانک لے گی"

گوئٹے نے مندرجۂ ذیل جواب لکھ کر بھیجا:۔

میرا دل جو زلفِ سیاہ کے پر پیچ حلقوں میں اسیر ہے
ہر وقت اضطراب اور بے کلی کی حالت میں رہتا ہے
لیکن میں اس قید کا جس پر آزادئ روح نثار کردوں اور ان بدمست
سانپوں کا جن پر شراب کی سیہ مستی فدا ہو جائے کیسے شکوہ کرسکتا ہوں
فصلِ بہار آگئی
مرغزاروں اور گلبنوں میں سبزے نے اپنی چادر بچھا دی
کوہِ آتش فشاں بھی سبزے سے ڈھک گیا
مگر اس کے سینے میں جہنم کی آگ بھڑک رہی ہے۔
اسی طرح جانِ من تمہارا عاشق محبت کی آتشِ خاموش میں جل کر بھسم ہوگیا۔
ان دنوں وہ کہیں راکھ کا ڈھیر دیکھ لو گی تو کہہ اٹھے گی
"اف بیچارہ۔ میری محبت میں جل مرا"

آپ نے دیکھا حافظ کے الہامی نغموں نے مغرب کے اس مفکّر اور حکیم کے دل و دماغ کو کس طرح متاثر کیا تھا۔ حافظ کا اثر اتنا سطحی نہیں تھا کہ وہ گوئٹے کے "دیوان" کے صفحات میں محدود ہو کر رہ جاتا۔ اسی برس کی عمر میں گوئٹے نے اپنا شاہکار فاوسٹ مکمل کیا۔ فاوسٹ کے آخری حصے میں جہاں کہیں معاملاتِ حسن و عشق بیان کئے گئے ہیں حافظ کے اس گہرے اثر کا کھوج ملتا ہے۔

عباس درویش

تضمین بر غزلِ حضرت بیدل رح

بگذر ز پیرہنِ کہن، بدرش کن و بکفن در آ   تو بغربت اے دلِ ناسزا چہ فتادۂ بوطن در آ
بجمالِ تن چہ نظر کُنی، بخیالِ جاں ہمہ تن در آ   ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیرِ سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن در آ

بہ محبتِ بتِ شعلہ خو مبر آبِ چہرۂ آبرو   مپذیر قربتِ گل رخاں مَطلب وصالِ رُخِ نکو
بسیہ دلانِ سپید رُو مفگن نظر بصدِ آرزو   پئے نافہائے رمیدہ بُو مپسند زحمتِ جستجو
بخیالِ حلقۂ زلفِ او گرہے خور و بختن در آ

بہ غمِ فراقِ تو ہم نفس! نفسے بہ رنج شمردہ ام   تنِ ناتوان وضعیف را ہمہ تن بمرگ سپردہ ام
بہوائے روئے شگفتہ ات چو فسردہ غنچہ فسردہ ام   غمِ انتظارِ تو بردہ ام برہِ خیال تو مُردہ ام
قدمے بہ پرسشِ من کشا نفسے چو جاں بہ بدن در آ

بگذشت عمرِ عزیزِ تو ہمہ تن بہ سستی و کاہلی   لبِ دجلہ جائے گرفتی و بہ لبانِ خشک چو ساحلی
بہ تصوّرِ بتِ سادہ رُو، کہ بیادِ زہرہ شمائلی   بہ کدام آئینہ مائلی کہ ز فرصت ایں ہمہ کاہلی
تو نگاہِ دیدۂ بسملی مژہ وا کن و بکفن در آ

رہِ زردبانِ غنا طلب، چہ فتادۂ بگو عنا   قدمے بصدق و صفا بنہ بگریز از ہمہ ماسوا
بدر آر پنبہ ز گوشہا ہمہ گوش شو دلِ ناسزا   ز سروشِ محفلِ کبریا ہمہ وقت می رسد ایں ندا
کہ بخلوتِ ادب و وفا ز درے برُوں نشدن در آ

مبر امجد! از کسِ بیکساں، مبر احتیاج بہ پیشِ کس   تو ہمائے اوجِ سعادتی مفگن نظر بہ پرِ مگس
نفسے گزار بہ خوش دلی۔ بگذر ز کشمکشِ نفس   بدر آئے بیدل ازیں قفس اگر آں طرف کشدت ہوس
تو بغربت آں ہمہ خوش نۂ کہ نگویت بوطن در آ

احمد حسین امجد

سلام

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو
ہم کو ہے طبل و پرچم لشکر کی آرزو

بامِ جدال و گردِ رہِ عزم کا ہے شوق
اورنگ کی ہوس ہے نہ افسر کی آرزو

کانٹوں پہ حق پرست بدلتے ہیں کروٹیں
بالش کا اشتیاق نہ بستر کی آرزو

تعویذ کیا کروں گا کہ اِن بازوؤں کو ہے
اژدر شکار قوتِ حیدر کی آرزو

کرنا ہے اپنے خون میں ہم کو شناوری
تسنیم کی تڑپ ہے نہ کوثر کی آرزو

اُس آرزو سے میرے لہو میں ہے جزر و مد
دشتِ بلا میں تھی جو بہتّر کی آرزو

رنگیں مزاجیوں کا نہیں ہے محل ہنوز
دل کو ہے خونِ مرحب و عنتر کی آرزو

بادِ مراد، آبِ طرب کا نہیں ہے وقت
طوفاں کا اشتیاق ہے صرصر کی آرزو

رقصِ پری وشان، خرامِ صبا حرام
دل کو ہے ضربِ فاتحِ خیبر کی آرزو

ہاں عمرِ جاوداں کی ہمیں بھی نوید دے
اے موت، اے جوانیٔ اکبر کی آرزو

جوشؔ اُس سبوئے قلب پہ کون و مکاں نثار
غلطاں ہو جس میں ساقیٔ کوثر کی آرزو

جوشؔ ملیح آبادی

سماج

بچپن میں بھوتوں اور پریوں کی فرضی کہانیاں سننے کے بعد جب سچ مچ کی کہانیاں پڑھیں تو ان میں عموماً ایک مشکل سا لفظ آیا کرتا۔ ساری کہانی سمجھ میں آجاتی لیکن وہ لفظ سمجھ میں نہ آتا۔ وہ دن — اور آج کا دن، اُس لفظ کا پتہ ہی نہ چل سکا۔

وہ لفظ ہے "سماج"۔ یوں تو یہ لفظ آسان ہی ہے، اس کے معنی "برادری" کے ہوں گے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس جماعت کے لوگ بستے کہاں ہیں اور کیوں بات بات پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ لوگوں کو کچھ کرنے نہیں دیتے۔ کسی کو آرام سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ نہ جانے اِس جماعت کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ اور یہ لوگ کیوں سکون کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی ہم نے سُنا — ظالم سماج، خوفناک سماج، مکرُوہ سماج، — !

اُن دنوں ہمیں یوں معلوم ہوتا جیسے سماج شیطان کے بھائی بندوں میں سے کوئی بیہودہ سا آوارہ گرد شخص ہے جس کا کام دن بھر ظلم کرنا اور لوگوں کو ڈرانا ہے۔ چنانچہ بچپن میں ہم جتنا شیطان سے ڈرتے اُتنا ہی سماج سے ڈرا کرتے۔

پھر کچھ اور دماغی تصویریں بن گئیں۔ یہ لفظ بڑے بڑے دکھائی دینے لگے — "سماج کا شکار" — "سماج کے تیز پنجوں میں حقیری جان" — "سماج کے بھیانک منہ کا نوالہ" — !

کئی سال تک ہمارے سامنے سماج ایک ڈراؤنا سا جانور رہا، جو اونٹ کی طرح بے تُکا، ریچھ کی طرح مکّار اور بھدّا اور چیتے کی طرح خطرناک تھا — اب آپ کہیں گے یہ اونٹ، ریچھ وغیرہ اکٹھے کیسے ہوگئے؟ — تو بس سمجھ لیجئے کہ یونہی ہو گئے، بچپن ہی تو تھا — اور پھر سماج کوئی سادہ چیز تو تھی ہی نہیں، خیر! کتنے ہی دنوں ہم سماج کو خوفناک درندوں میں گنتے رہے!

اس کے بعد ذرا عقل مند ہوئے اور اب سماج پر ایک نقاد کی طرح جو غور کیا تو چند اور الفاظ دل میں کھٹکنے لگے — "سماج کے ٹھیکیدار" — "سماج کے اجارہ دار" — نتیجہ جو نکلا تو افسوس ہوا کہ اب تک ہم سماج کو بالکل غلط سمجھے رہے۔ سماج تو ایسی چیز ہے جس کا ٹھیکہ بھی لیا جا سکتا ہے، کوئی تجارتی جنس ہوگی — یا شاید نباتات یا معدنیات میں سے کچھ ہو، جو کچھ بھی تھا بہر حال ہمیں یہ پتا ضرور چل گیا کہ سماج کا ٹھیکہ لینا کوئی آسان کام نہیں — بڑے دل جگرے کا کام ہے۔ لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ کیونکہ بچہ بچہ ان کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے۔ ساری خلقت ان کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑی ہوتی ہے۔

کتنے ہی دنوں ہمیں یہ تلاش رہی کہ کسی "سماج کے ٹھیکیدار" کا بغور ملاحظہ کریں۔ بازاروں میں تلاش کی، گلی کوچوں میں پھرے، ہر قسم کے ٹھیکیدار دیکھے — کوئلے کے، لکڑی کے، مزدوروں کے، اور نہ جانے کس کس چیز کے — لیکن اِس قسم کا ٹھیکیدار کہیں نہ ملا۔ کئی سیانے حضرات سے کہا کہ قبلہ آپ ہی یہ مشکل آسان کر دیجے۔ کئی لاحول پڑھنے لگے۔ بعض تو سے بولے "میاں جاہل ہو!" پھر ایک خاتون سے جن

کے ہر مضمون کے ہر صفحے پر ہر پانچ چھ سطروں کے بعد سماج کا لفظ آتا تھا ملنے گئے۔ اور بڑی عاجزی سے کہا کہ محترمہ آپ کو تو ان ٹھیکیداروں کا اتا پتا معلوم ہوگا اگر آپ ان میں سے کسی کو اِس خاکسار سے ملا دیں تو ایک بوجھ میرے سینے سے اُتر جائے۔ باوجود اس قدر سنجیدگی کے وہ یہی سمجھیں کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔

سماج کی کہانیوں میں عموماً ایک مزدور کی محبت ایک امیر لڑکی سے ہو جاتی ہے، فریقین مختلف ذات (جات پات) کے ہوتے ہیں۔ آنکھ جھپکتے ہی محبت ہو جاتی ہے ــــ پریم کی شراب نینوں میں چھلکنے لگتی ہے، پریم کے تیر نینوں کو چیر کر دلوں میں کھُب جاتے ہیں۔ پھر رسوائی ہوتی ہے ــــ اور رسوائی کیا اچھی خاصی پبلسٹی کی جاتی ہے، ہیرو اور ہیروئن زور زور سے آہیں بھرتے ہیں، مختلف طرز کے گانے گاتے ہیں ــــ پھر سماج بیچ میں آجاتا ہے ــــ سماج کے ٹھیکیداروں سے اپیل کی جاتی ہے ــــ پھر بغاوت ہوتی ہے اور ہیرو ہیروئن کو لے کر بھاگ نکلتا ہے۔ اگر ہیروئن پوچھے کہ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟" تو جواب ملتا ہے کہ "دُور ــ دُور ــ! اس مکر و فریب کی دنیا سے بہت دُور ــ! جہاں آشائیں مچلتی ہیں۔ جہاں اُمنگیں پنپتی ہیں ــ جہاں سماج کا خوفناک پنجہ ــــ معصوم روحوں کا تعاقب نہیں کرتا........!" وغیرہ

یقین مانیئے مجھے اِس قسم کی جگہ کی بڑی تلاش رہی ہے ــــ خاص طور پر امتحان کی تیاری کے دنوں میں، تاکہ یکسوئی سے پڑھ سکوں۔ کوہ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے سی۔ پی کے جنگلوں تک، اور وہاں سے سندھ کے ریگستانوں تک جا کر دیکھ لیا، لیکن اِس قسم کی پُرسکون جگہ کہیں نہ ملی ــــ جہاں بھی گیا وہاں وہی "مکر و فریب" کی قسم کی دُنیا ملی۔

جی ہاں! ــ تو فرض کیا وہ دونوں چل پڑے ــــ اب کہانی لکھنے والے کا فرض ہے کہ وہ یا تو دونوں سے ورنہ کم از کم ایک سے تو ضرور ہی خودکشی کرادے، ورنہ پھر کہانی ہی کیا رہی۔ اور اگر ایک انتقال کر گیا (یا کر گئی) تو دوسرے کا انجام بھی نزدیک ہی ہے۔ عموماً یہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں اکٹھے سماج کے جنگل میں آجاتے ہیں اور شہیدانِ محبت کی لاشیں کسی دریا میں تیرتی ملتی ہیں ــــ یا یوں ہوتا ہے کہ ایک کچھ دیر پہلے مرتا ہے اور دُوسرا اُس کی لاش پر چیخ مار کر گرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اب صاحب اِس قسم کا مرنا بہت مشکل ہے، مشکل کیا ایک حد تک ناممکن ہے، خیر! پھر یہ فقرہ آتا ہے ــــ "اُن معصوم ہستیوں کی یاد میں جو سماج کے بھینٹ چڑھ گئیں" اور آخر میں سماج پر دل کھول کر لعنت بھیجی جاتی ہے، اُسے خوب کوسا جاتا ہے، گالیاں دی جاتی ہیں۔

ایک بات اور میں نہیں سمجھا۔ بھلا ایک مزدور کو کس حکیم نے کہا ہے کہ وہ ضرور ایک سیٹھ کی لڑکی سے محبت کرے، بالفرض محبت کر بھی لے تو پھر ضرور ہی اُس سے شادی کرنے پر اُتر آئے۔ کم از کم یہی سوچ لے کہ اُسے لا کر بٹھائے گا کہاں۔ خالی محبت تو ایک دو مہینے تک چلے گی بس۔

اِس قسم کے لوگ سماج کو کوسنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ٹھنڈے دل سے عملی باتوں پر غور کر لیا کریں تو اُن کو کسی قدر افاقہ ہو جائے۔

ایک دن میرے ایک بدشکل سے کلرک دوست آئے جنہوں نے خلافِ معمول لمبے لمبے سانس لئے ——— میں سمجھا کسی ڈاکٹر نے پھیپھڑوں کے لئے ورزش تجویز کی ہے۔ پھر اُنہوں نے بار بار پیٹ پر ہاتھ رکھنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ سینے کی بھی مالش کرنے لگے۔ مجھے رحم آنے لگا کہ بیچارے بیمار ہیں ——— درد ہوگا کہیں۔ ابھی میں ہمدردی کے لئے الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ وُہ اُٹھ کر چلے گئے۔

دوسرے دن اُن کا یہی پروگرام بڑی سرگرمی سے شروع ہوا۔ پوچھا کہ بھئی اب تک درد اچھا نہیں ہوا؟ ایک روز فاقہ کرلو تو بہتر ہے۔

بولے "یہ درد تو اب جان لے کر ٹلے گا"۔ میں ڈر گیا۔ پھر بولے "کیا کبھی تمہیں کسی سے پریم ہوا؟"

میں نے چمک کر کہا "میرے دُشمنوں کو ہو پریم، مجھے کیا مصیبت پڑی ہے ——— !"

وُہ مُنہ بسور کر بولے "ہائے تم کیا جانو اس آگ کو، کیا سچ مچ تمہیں پریم نہیں ہوا؟"

"ارے بھئی بتا تو دیا ایک دفعہ کہ نہ تو ہوا ہے اور نہ ارادہ ہی ہے۔ مجھے خُوب نیند آجاتی ہے، سارے کھیل کھیل لیتا ہوں، دوسرے تیسرے دن سینما دیکھ لیتا ہوں ——— میرے پاس ایک موٹر سائیکل بھی ہے، خوب تندرست ہوں، مگن رہتا ہوں ——— یہاں تو پریم کی گنجائش ہی نہیں نکلتی ——— !"

وُہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر اُنہوں نے رُک رُک کر اپنی خونچکاں داستانِ حُسن وعشق سنائی کہ کس طرح اُنہیں دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کی حسین لڑکی سے محبت ہوگئی ہے اور وُہ بھی ان کی طرف دیکھ کر مُسکرایا کرتی ہے۔

میں نے پوچھا "مسکرایا کرتی ہے؟ ——— کس بات پر؟"

وُہ بولے "میرے گھائل ہردے پر مرہم لگانے کے لئے ——— !"

"تو پھر تم چاہتے کیا ہو ——— ؟"

"اُس فرشتے کو اپنا بنانا چاہتا ہوں ——— !"

"کس فرشتے کو؟ ——— ابھی تو تم سپرنٹنڈنٹ کی لڑکی کا ذکر کر رہے تھے ——— !"

"اسی کو ——— اُس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں ——— !"

میں نے پوچھا "تو پھر رُکاوٹ کس بات کی ہے؟"

بولے "ظالم سماج! ——— یہ ہندوستان کی مصیبت، یہ لعنت ——— ذلیل سماج! ——— سماج کے ٹھیکیدار جنہوں نے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ سماج کے اس مقتل میں معصوم زندگیاں ذبح ہو رہی ہیں ——— سماج کا بیڑا غرق ہو ——— !"

میں نے جلدی سے کہا "بچ بچ ——— یوں سماج کی گردان مت کرو۔ پہلے یہ تو بتاؤ تمہاری آمدنی کیا ہے؟"

بولے "بیالیس روپے دس آنے، پانچ پائی ——— !"

"اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کی؟"

"ساڑھے سات سو ——!"

"تو تم یہ چاہتے ہو کہ سماج تمہاری تنخواہ اتنی بڑھا دے کہ تم اُن کی لڑکی سے شادی کر سکو —— ؟"

"نہیں تو ——! یعنی کہ —— وُہ دیکھئے نا میرا مطلب ہے کہ سماج ——!"

"فضول گفتگو سے پرہیز کرو ——! بہتر ہوگا کہ تم اِن بیالیس روپے، دس آنے اور پانچ پائیوں ہی پر قانع رہو۔ اور پھر تم نے کبھی غور سے اپنی شکل کسی اچھے سے آئینے ہیں ——!"

"آہ! تم نہیں جانتے، پریم شکل وصورت، آمدنی —— اور تنخواہ وغیرہ سب سے بلند ہے ——!"

"یہ سب فضول ہے —— نکمّی باتیں ہیں —— میں نہیں مانتا۔ تم اسی وقت اپنی صورت کسی آئینے میں ——!"

"آہ! ظالم سماج ——!"

میں نے سماج کی طرف داری کرتے ہوئے کہا "خبردار! اگر اب تم نے سماج کو بُرا بھلا کہا تو میں شاید تمہارے کان کھینچنے پر مجبور ہو جاؤں گا"

بہت سے حضرات دیکھے، جو افسانے کو پڑھنے سے پہلے صفحات کو جلد جلد اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں، اور اگر انہیں کہیں سماج کا لفظ نظر آجائے تو فوراً وہ افسانہ چھوڑ کر دوسرے کا پوسٹ مارٹم شروع کر دیتے ہیں۔ اگر پوچھیں کہ "یہ کیا ——؟" جواب ملتا ہے "جناب اِس کا پلاٹ تو پہلے ہی معلوم ہوگیا۔ یقین نہ ہو تو سُن لیجئے ——!" اس کے بعد وہ پلاٹ بھی سنا دیں گے تو قریب قریب صحیح ہی نکلے گا۔

پانچ چھ سُرخیاں تو ہیں ہی —— بے جوڑ محبّت —— امیری اور غریبی کا رونا، مزدور کے بیوی بچوں کی علالت —— فاقہ کشی —— رسوائی —— بغاوت —— اپیل —— خودکشی ——! دوسرے نمبر پر بوڑھے آدمیوں کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ کہ کس طرح ایک غریب ضعیف آدمی پر مصیبتیں ٹوٹتی ہیں۔ وُہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اُسے دوا تک کو پیسے میسّر نہیں ہوتے پڑوس کے محل میں جشن ہو رہا ہے —— نغموں کی صدا اتنی بلند تھی کہ اُس نے بوڑھے کے کراہنے کی مدھم آواز کو دبا لیا —— اُدھر مسرّت تھی مستی تھی، سرمایہ داری نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی —— اِدھر ایک غریب دم توڑ رہا تھا —— اُس کی کمزور ہڈیاں چٹخ رہی تھیں، ہاتھ پاؤں میں رعشہ تھا، داڑھی پر آنسو بہہ رہے تھے۔ وُہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا، اور زمین کھودنے لگا، جس میں سے ایک زنگ آلودہ صندوقچی نکلی، اور اُس میں کیا تھا ——؟ —— آہ! اس میں ایک حسین لڑکی کی دھندلی سی تصویر تھی —— بوڑھے نے ایک سرد آہ کھینچی، اُس کے ہونٹ ہلے —— وہ بولا "آہ ظالم سماج!" —— اور ایک لمحے میں اُس کا بے جان جسم زمین پر پڑا تھا —— اور پڑوس میں نغموں کی صدائیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں ——!" —— اب اِس ہی سماج کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔

ایک تو یہ کہ وُہ شخص بوڑھا کیوں ہُوا؟ —— ہمیشہ جوان ہی کیوں نہ رہا؟ —— تو صاحب بوڑھا تو آخر ہر کوئی ہوتا ہے اس میں کسی کا کیا بس ——! جو جوانی میں چھلانگیں لگاتا پھرے وُہ ایک دن بوڑھا بھی ہوگا۔ دوسرے یہ کہ وہ بوڑھا بیمار کیوں ہُوا ——؟

ضرور سماج کی شرارت ہے ـــ سو عرض ہے کہ طبی کتابیں پڑھئے تو پتا چلے گا کہ بوڑھے آدمی عموماً بیمار رہتے ہیں ـــ اور بڑھاپا بذاتِ خود ایک بیماری ہے۔

پھر یہ کہ وہ بوڑھا اتنا غریب کیوں تھا؟ ـــ اب بتائیے اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کہ اُسے جوانی میں جو محبت تھی اُس میں سماج نے خواہ مخواہ اپنی ٹانگ کیوں اڑائی؟ کیوں اُس کی محبوبہ کو اُس سے چھین لیا ـــ کیا حق تھا سماج کو دو پریم کے متوالے دلوں کو توڑنے کا؟ اور ہاں ایک بات میں بھول گیا ـــ وہ یہ کہ پڑوس میں ایک محل کیوں تھا؟ ـــ اور سماج کی سازش سے اُس میں اُسی رات جشن کیوں ہُوا؟ (مرثیہ گوئی کیوں نہ ہوئی؟) ـــ سو یہ محلِ وقوع کا قصور ہے۔ حدودِ اربعہ کا قصور ہے۔ اور اُس امیر کے پروگرام کا قصور ہے۔ اب خود ہی خیال فرمائیے کیا یہ افسانے ایسے نہیں ہوتے جنہیں پڑھ کر اچھے بھلے انسان کو مالیخولیا ہو جائے دُنیا میں قہقہے بھی ہیں، مسکراہٹ بھی ہے! ـــ مسرت بھی ہے۔ لیکن اس کی تلاش نہیں کی جاتی۔

یا شاید سماج اُس طاقت کا نام ہے جو کسی شخص کو اپنا مقصد پورا کرنے سے روکتی ہے۔ ایک غریب کو امیر ہونے سے روکتی ہے۔ بدشکل آدمیوں کی محبت میں حائل ہوتی ہے ـــ ایک اَن پڑھ مزدور کو کار میں بیٹھنے سے باز رکھتی ہے ـــ! کسی کوشش کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا، یا کوئی احمقانہ حرکت کر بیٹھے تو بجائے لاحول پڑھنے کے کہہ دیا کہ ظالم سماج کا قصور ہے۔

اگر اسی طرح ہر بات میں غریب سماج کو قصوروار ٹھہرایا گیا تو وہ دن دُور نہیں جب کسی کو بخار چڑھے گا تو وہ مُنہ بسور کر کہے گا کہ یہ سماج کا قصور ہے۔ کوئی صاحب دُبلے رہ گئے تو کہیں گے کہ یہ سماج کی بُرائی ہے۔ اور اگر کوئی صاحب بہت موٹے ہو گئے تو بھی سماج ہی کو کوسا جائے گا۔ نالائق لڑکے امتحان میں فیل ہونے کی وجہ سماج کی کھوکھلی بنیادوں کو قرار دیں گے۔ یہاں تک کہ گالیاں بھی یوں دی جائیں گی ـــ کہ "خدا کرے تجھ پر سماج کا ظلم ٹوٹے" "یا اللہ اسے سماج کے پنجے میں گرفتار کر" ـــ یا "پرماتما نے چاہا تو سماج سر چڑھ کر بولے گا" اور دعائیں بھی اِس قسم کی ہوں گی "پیسہ دیتا جا بابا خدا تجھے سماج سے بچائے ـــ!" "یا میرے اللہ مجھے سماج کی ہوا سے بچائیو" وغیرہ

یہ دیکھا گیا ہے کہ سماج کے متعلق زیادہ سوچنے والوں یا "مریضِ سماج" لکھنے والوں میں زیادہ تعداد کمزور، چڑچڑے، اور غمگین حضرات کی ہے۔ تندرست اور ہنس مکھ آدمیوں کو کبھی سماج کی غیبت کرتے نہیں سُنا گیا، اوّل تو وہ جانتے ہی نہیں کہ سماج کس چڑیا کا نام ہے، اور اگر انہیں کوئی اس کی بُرائیاں بتا بھی دے تو یہ حسبِ معمول سماج کی تعریفیں ہی کریں گے۔ اس سے ثابت ہُوا۔ کہ سماج کے متعلق سوچتے رہنا ایک بیماری ہے جس کا تعلق خُون کی کمی، اعصاب کی کمزوری اور ہاضمے کی خرابی سے ہے۔ یہ بیماری اُس وقت تک دفع نہیں ہوتی جب تک دیگر شکایات رفع نہ کی جائیں۔ اور اگر اس بیماری کو یونہی چھوڑ دیا جائے تو مریض کی حالت خطرناک ہوتی جاتی ہے۔ ذرّے ذرّے میں اُسے سماج کی کرشمہ آرائیاں نظر آتی ہیں ـــ رنگ برنگ کے پھُول دیکھ کر اُسے افسوس ہوتا ہے کہ یہ مسرور کیوں ہیں، سوکھے ہوئے پتوں کو دیکھ کر اُس کا کلیجہ مُنہ کو آجاتا ہے ـــ سوچتا ہے کہ یہ سوکھے ہوئے کیوں ہیں۔ کوّوں کو دیکھ کر

غمگین ہو جاتا ہے کہ یہ کالے کیوں ہیں۔ کسی کو ہنستے دیکھ کر اُس کا خُون کھولنے لگتا ہے اور یوں منہ بناتا ہے جیسے کہہ رہا ہو ——" ہنستا ہے بے؟ ابھی کہہ دوں گا سماج سے ۔ ہاں!" اُسے خواب بھی عجیب وغریب دکھائی دیتے ہیں جیسے ہندوستان ایک بہشت ہے، جس میں نہ جنگل ہیں، نہ پہاڑ، نہ صحرا ہیں نہ دریا، نہ کسی دوسرے ملک کو یہاں سے کوئی راستہ جاتا ہے۔ بس ایک پیارا پیارا دیش ہے، جدھر نظر دوڑاؤ اُونچی اُونچی عالیشان کوٹھیاں ہیں، جھونپڑوں کی قسم کی کوئی چیز نظر نہیں آتی، آدمیوں میں جات پات کی تمیز مٹانے کے لئے اُنہیں نمبروں سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً ابّا کا نمبر ہے تین سو پچاس الف/ہ، بڑا بیٹا سولہ سو تیس ج ہے اور چھوٹی بچّی پندرہ سو سولہ 'ل' ہے ۔ سب کے سب ایک ہی قد کے ہیں، ایک ہی رنگ ہے شکلیں بھی اتنی ملتی ہیں کہ بس نمبروں سے پہچانے جاتے ہیں —— چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔

کارخانوں میں مزدُوروں کا نام ونشان تک نہیں مشینیں خود بخود چل رہی ہیں —— اور جو کام ایسے تھے جن میں مزدُوروں کی اشد ضرورت تھی وہ بند کر دیئے گئے ہیں ۔

ہر ایک ہندوستانی کے پاس ایک خوبصورت سی کار ہے اور ایک حسین بیوی —— کار کی پچھلی کھڑکی میں چند بکریاں بیٹھی جگالی کر رہی ہیں ۔

لوگ جہاں چاہیں، جس وقت چاہیں، جس سے چاہیں —— بلا روک ٹوک " پریم " کر سکتے ہیں اور شادی کر سکتے ہیں۔ قرض لے سکتے ہیں، لڑ جھگڑ سکتے ہیں، سماج کا نام لینے والا جلا وطن کر دیا جاتا ہے۔

اب ذرا آپ سوچیئے اوّل تو یہ سب ہو کس طرح سکتا ہے، اور جو بالفرض یوں ہو بھی جائے تو ایک دم دنگا فساد مچ جائے اور سارا ہندوستان زیر وزبر ہو جائے ۔ تو اِس قسم کے " بیمارِ سماج " حضرات کا علاج —— لوہے کا ٹانک، مچھلی کا تیل، فروٹ سالٹ، تازہ پھل اور سبزیاں، ورزش اور تبدیلیٔ آب وہوا ہے۔ بہتر ہوگا اگر ان کے ٹانسل نکلوا دیئے جائیں اور خراب دانت بھی —— !

اِن سے زبردستی ورزش کرائی جائے اور انہیں ہنس مکھ حضرات کی صحبت میں رکھا جائے ۔ افاقہ ہونے پر انہیں تاکید کی جائے کہ اپنی صحت برقرار رکھیں مبادا کہیں پھر دورہ پڑ جائے

کیا آپ خود نہیں محسوس کرتے کہ یہ " سماج " کا مذاق بہت پُرانا ہو چکا ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سماج (جو کچھ بھی وہ ہے اور جہاں کہیں ہے) —— کی وہ مٹی پلید ہوتی ہے جس کی انتہا نہیں ۔ اب مارے شرم کے اس نے اپنی بہت کچھ اصلاح کر لی ہے اب وہ پشیمان ہے، آپ کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے، اُس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو رواں ہیں ۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں ۔ وہ سچے دل سے معافی کا خواستگار ہے ۔ کیا آپ اُسے معاف نہ کر دیں گے؟ —— اُسے ضرور معاف کر دیجئے ۔ اور اس کا ثبوت اس صورت میں مل سکتا ہے کہ اب افسانوں میں غریب سماج کو لعنت ملامت نہ کی جائے بلکہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، افسانوں میں خودکشی کی وارداتیں ذرا کم ہو جائیں ۔ اور مزدور امیروں کی لڑکیوں سے محبت کرنا چھوڑ دیں اور پریم کے

متوانے اگر پریم کرکے ضرور ہی ثواب لوٹنا چاہیں تو اپنی حیثیت کے مطابق اپنی ہی جات پات میں محبت کیا کریں۔ اور محبت کرنے سے پہلے ذرا کسی اچھے سے آئینے میں اپنا چہرہ بھی بغور ملاحظہ فرما لیا کریں۔

باقی رہے سماج کے ٹھیکیدار ۔۔۔ سو جب سماج ہی میں وہ بات نہ رہے گی تو اُن کی ٹھیکیداری کیا خاک چلے گی، سارا کام ٹھنڈا پڑ جائے گا، خود سیدھے راستے پر آجائیں گے۔

یہ سب کچھ ہو سکتا ہے ۔۔۔ للہ آپ سماج کی خطائیں معاف کر دیجئے!

شفیق الرحمٰن

زندگی

(قطری بن الفجاءۃ کی ایک عربی نظم کا ترجمہ)

جب میری روح جنگجو سپاہیوں کے خوف سے کانپ رہی تھی
میں نے اُسے باہمت بننے کے لئے کہا:۔
اگر تو چاہے کہ موت اپنے مقررہ وقت سے ایک دن کے لئے بھی ٹل جائے
تو یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکے گی
موت کا سامنا کرتے وقت صبر سے کام لے
زندگیٔ جاوداں حاصل کرنا ناممکن ہے
ہمیشہ کی زندگی کا لبادہ عزت کا لبادہ نہیں
اگر ایسا ہوتا تو یہ ہر حقیر انسان سے چھین لیا جاتا
ہر زندہ انسان کو موت کے راستے سے گزرنا ہے
موت اہل دُنیا کو شکار کرنے میں برابر مصروف ہے
جو انسان جوانی میں موت کا مزہ نہیں چکھتا
بڑھاپا اُسے زندگی سے بیزار کر دیتا ہے اور وقت اُسے موت کے حوالے کر دیتا ہے
انسان کے لئے زندگی میں کوئی مزہ نہیں رہ سکتا
اگر اُس کا شمار دنیا کی بے کار چیزوں میں ہو

ذکی الدین

برسات کی صبح

خوش رنگ وخوش آہنگ وفسوں خیز ہے موسم!!
مستانہ وگل ریز وجنوں بیز ہے موسم!!

جلووں میں دل افروز ملاحت کا اثر ہے
کس سانولے محبوب کے مانند سحر ہے؟
بھیگی ہوئی ظلمت جو ہے لہرائی ہوئی سی
ہر چیز نظر آتی ہے سنولائی ہوئی سی
آنکھوں کو لبھاتی ہے بہ عنوانِ ضیافت
خنکی ہیں سموئی ہوئی شب رنگ ملاحت
ہر سمت ہے چھایا ہوا ساون کا اندھیرا
ہے شام سے ملتا ہوا نمناک سویرا

خوش رنگ، وخوش آہنگ وفسوں خیز ہے موسم!!
مستانہ وگل ریز وجنوں بیز ہے موسم!!

(۲)

خوش رنگ وخوش آہنگ وفسوں خیز ہے موسم!!
مستانہ وگل ریز وجنوں بیز ہے موسم!!

آنکھوں کو دکھا دیتے ہیں پریوں کے قرینے
اُڑتے ہوئے بادل کے گہر بار سفینے
سبزے پہ مچلتی ہیں نم آلود ہوائیں
پانی کا خزانہ لئے بوجھل ہیں گھٹائیں
اللہ ری جاں بخش ترشح کی بہاریں
بوندیں، کبھی جھالا ہے، کبھی نرم پھواریں
بوندوں سے ٹپکتی ہے گھٹاؤں کی جوانی
ہر چیز پہ مستی ہے، ہر اک شے ہے سہانی

خوش رنگ وخوش آہنگ وفسوں خیز ہے موسم!!
مستانہ وگل ریز وجنوں بیز ہے موسم!!

ذوقی

تارے

اے آکاش پہ رہنے والو دھیمے دھیمے بہنے والو
کاہکشاں میں بسنے والو مجبوروں پر ہنسنے والو
دُور پار ہے دیس تمہارا تم سے جھلمل عالم سارا
آپس میں آنکھیں مت مارو مجھے دُکھی کہکر نہ پکارو
تم کیا ہو؟ یہ کوئی نہ جانے انجان۔ جانے پہچانے
پھر بھی ہیں اور تم سے باتیں تم سے جگمگ میری راتیں
کتنے ہو! گنتا رہتا ہوں جی لگتا ہے۔ سچ کہتا ہوں
شاعر کے جذبے بکھرے ہیں مطرب کے نغمے نکھرے ہیں
"اُس" کی افشاں چھوٹ پڑی ہے حور کی مالا ٹوٹ پڑی ہے
چھوٹے تارو اچھے تارو میرے دل پہ تیر نہ مارو
کوئی میٹھا راگ سناؤ بے کھٹکے بے لاگ سناؤ
ٹوٹے دل کی بات بنالو کوئی ایسی راہ نکالو

ہاتھ آجائے پریم کنارا
جاگ اُٹھے قسمت کا تارا

شاد عارفی

بمبئی کی ایک رات

یوں تو ہندوستانِ جنت نشان میں ایسے "جہانیاں جہاں گشت" بھی موجود ہیں جنہوں نے عمر آگرے میں بسر کی اور بھول کر تاج محل نہ دیکھا لیکن جس ہندوستانی کو حقیقتہً سیاحت کا شوق ہے اس نے بمبئی کی زیارت ضرور کی ہوگی۔ فورٹ کی سر بفلک عمارات اپالو بندر کا دل فریب منظر جوہو کی چہل پہل نئی چوپاٹی کی گہما گہمی پُرانی چوپاٹی کی رنگینیاں ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ انہیں ایک مرتبہ دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کو دل نہ چاہے۔

میں نے ہندوستان کی اِس رومان خیز سرزمین کی سیر پہلی دفعہ اکتوبر ۱۹[illegible]ء میں کی۔ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لینے کے بعد ہندوستانیوں میں بھی کچھ احساسِ تفوق سا پیدا ہو جاتا ہے۔ میں بھی اس احساسِ تفوق سے خالی نہ تھا اور تمام درجے پر اس طرح قبضہ کئے ہوئے تھا جیسے کسی دوسرے مسافر کے آنے کا امکان ہی نہ ہو۔ اس طلسمِ تفوق کو بیانہ جنکشن پر ایک کرخت آواز نے پاش پاش کر دیا۔ دروازے کا ہینڈل پکڑے ہوئے ایک فربہ اندام انسان نہایت درشت لہجے میں کہہ رہا تھا "ہٹائیے صاحب اپنا اسباب آپ نے تو پورے درجے پر قبضہ کر رکھا ہے"، اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ایک خاص وقار کے ساتھ — جو موٹے آدمیوں سے مختص ہوتا ہے — انہوں نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اور ان کے دُبلے پتلے ساتھی نے جو اس سے قبل ان کی ضخامت و جسامت کی وجہ سے میری نظر سے پنہاں تھے حیرت خیز عجلت کے ساتھ میرا مختصر لیکن بے ترتیبی سے پھیلا ہوا سامان میری برتھ کے نیچے رکھ دیا۔

اپنا سامانِ راحت درست کرنے کے بعد وقت کاٹنے کے لئے یا شاید دلجوئی کی غرض سے انہیں فربہ اندام صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کہاں تک جائیں گے اور جب انہیں معلوم ہُوا کہ میں بمبئی جاؤں گا تو یکا یک پیکرِ خلوص بن کر ارشاد فرمایا "پھر تو خوب لطف سے گزرے گی میں بھی محمود صاحب کے ساتھ بمبئی چل رہا ہوں"۔ ان کی اس قلبِ ماہیت کے بعد محمود صاحب کے پانوں اور خود ان کے سگرٹوں نے مجھے بھی اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا اور بمبئی پہنچ کر میں بھی زمان صاحب اور محمود صاحب کے ساتھ گرگام روڈ کے ایک ہوٹل میں مقیم ہو گیا۔

دوسرے دن "جم دیا" تھا اور سچ پوچھئے تو بمبئی کی دیوالی ہی دیکھنے کے لئے میں نے اکتوبر کا مہینہ اس سفر کے لئے پسند کیا تھا حالانکہ مجھے میرے بعض احباب متنبہ کر چکے تھے کہ اکتوبر میں بمبئی کا موسم نہایت ناگوار ہوتا ہے۔

صبح ہوئی تو زمان صاحب کچھ بے چین سے نظر آئے۔ میں نے وجہِ اضطراب پوچھی تو کہنے لگے "جی کوئی خاص بات تو نہیں ہے مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ آج سیر سپاٹے سے ذرا جلدی واپس آجائیں تاکہ کھانا دانا کھا کر ایک دو بجے سے شام کی تفریح میں مصروف ہو جائیں"۔ اور اگرچہ اس وقت میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ شام کی تفریح کے لئے اس مہتم بالشان تیاری کی کیا ضرورت ہے لیکن سہ پہر کو

معلوم ہوگیا کہ زماں صاحب کے تیار ہونے کے لئے واقعی تین چار گھنٹے بھی ناکافی ہیں۔ زمان نے سب سے پہلے اپنی ان نصف تراشیدہ مونچھوں پر ہاتھ صاف کیا جن پر دور سے سیاہ تتلی کا دھوکا ہوتا تھا پھر ڈاڑھی کی باری آئی اور جب تک میں نے اور محمود نے قسمیں کھا کر یقین نہیں دلا دیا کہ کوئی کھونٹی باقی نہیں رہی زماں نے استرا ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ حجامت اور غسل سے فارغ ہوئے تو قمیص ٹائی رومال اور جرّاب کے میچ کا سوال پیش ہوا اور جب یہ مرحلہ بھی محمود کی توجہ سے طے ہوگیا تو خدا خدا کر کے زمان صاحب نے نیا سوٹ ملبوسِ بدن فرمایا۔ محمود صاحب کا سنگار نسبتاً مختصر تھا۔ ان کی تمام تر کاوشیں اس بات کے لئے تھیں کہ ان کی شیروانی کا کالر کسی طرح ان کی گردن کے دلدل کو چھپا لے اور جب کالر کو کھینچنے اور اونچا کرنے کے باوجود داد کی بیداد نہ مٹ سکی تو ایک یاس آمیز "اونھ" کے ساتھ بناؤ ختم کر دیا گیا۔ غرض اپنے زعمِ ناقص میں ہم لوگ سامانِ قتلِ عام مہیا کئے ہوئے ساڑھے پانچ بجے ایک وکٹوریا پر سوار ہو گئے۔ غروبِ آفتاب سے قبل تو اس آوارہ گردی کا واحد مقصد خود بینی و خود نمائی تھا لیکن شام ہونے کے بعد خود نمائی کے ساتھ لطفِ نظّارہ نے ایک کیف پیدا کر دیا۔

کافرادایانِ بمبئی اپنی تمام کافرسامانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھے اور ان کی ہر نظر میں دعوتِ نظّارہ مضمر تھی۔ ہم لوگ ہر جلوے پر نقدِ جاں دینے کو آمادہ تھے لیکن کثرتِ جلوہ سے فرصتِ نظّارہ مفقود سی ہوگئی تھی۔ چرنی روڈ جنکشن پر پہنچے تو یہ احساس پیدا ہوا کہ موٹروں اور گاڑیوں کی لامتناہی قطار میں پھنسے رہنے سے بہتر یہ ہوگا کہ وکٹوریا کو خیرباد کہی جائے۔ چنانچہ وکٹوریا والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا اور ہم لوگ خراماں خراماں لطفِ نظّارہ حاصل کرنے لگے۔ اسپتال کے پاس ایک وکٹوریا کے بیٹھنے والوں نے کچھ اس طرح دعوتِ نظّارہ دی کہ چار و ناچار تھوڑی دور تک تعاقب کرنا پڑا۔ وکٹوریا والے نل بازار سے رومال ہلا کر دوسری طرف مُڑ گئے اور ہم لوگوں نے اپنی حرماں نصیبی کا انتقام نل بازار کے کٹھرے میں بیٹھنے والوں سے لیا۔ دیوالی یہاں بھی تھی لیکن افلاس کا خونیں رنگ دیوالی کے رنگ و بو پر غالب تھا۔ کبھی کبھی پھولوں کی خوشبو بھی آجاتی تھی لیکن ایڈوفارم کی بدبو اور مکانوں کی عفونت پھولوں کی لطیف خوشبو کو بہت جلد فنا کر دیتی تھی۔ ملّاح قلی اور مزدور لوہے کی سلاخوں کے پاس کھڑے ہوئے رومان انگیزی کی یاس آمیز کوشش کر رہے تھے اور لوہے کی سلاخوں کے اِدھر سے ناز و ادا کرشمہ و غمزہ کا ناکام مظاہرہ بھی کیا جا رہا تھا مگر اس تمام سین میں کچھ ایسا تصنّع سا معلوم ہوتا تھا کہ بے اختیار کسی دل جلے کا قول یاد آجاتا تھا کہ رومان اور آسودگی لازم و ملزوم ہیں! اس یاس آمیز رومان سے اُکتا کر ہم لوگ پاس کے ایک پارک میں چلے گئے۔ بینچ پر ایک نورانی صورت کے بزرگ رونق افروز تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر انہوں نے اپنا بٹوا کھولا، روپے گنے اور چشم و ابرو سے نفرت کا اظہار فرماتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ایک خوش پوشاک نوجوان تشریف لائے اور ہمارے پاس بیٹھ کر باقاعدہ وقفے کے ساتھ ٹھنڈی سانسیں بھرنا شروع کیں۔ جب ہم لوگوں نے خلافِ توقع اس "آہِ سرد و لبِ خشک" کی وجہ نہیں پوچھی تو انہوں نے خود سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔ کہنے لگے آپ لوگ یو۔پی کے معلوم ہوتے ہیں اور ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر فرمانے لگے "میں بھی یو۔پی کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام شاہد ہے۔ بمبئی کی سیر کرنے آیا تھا۔ آج دیوالی کے ہجوم میں کسی نے میرا بٹوا غائب کر دیا۔ اب میرے پاس واپسی کے ٹکٹ کے علاوہ ایک پیسہ بھی نہیں ہے جو کھانا کھا سکوں" زمان پر اس داستانِ غم کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ہاتھ

کہ شاہد صاحب نے شاید تکمیلِ داستان کی غرض سے جیب میں سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور کہنے لگے دیکھئے صاحب یہ ہے بمبئی سے واپسی کا ٹکٹ۔ محمود نے ان کے سنبھلنے سے پیشتر وُہ کاغذ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور بجلی کے کھمبے کے پاس جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دادر سے واپسی کا ٹکٹ تھا۔ زمان کی ہمدردی بہت جلد نفرت اور حقارت سے بدل گئی اور شاہد کی اس تاویل کے بعد بھی کہ دہلی سے واپسی کا ٹکٹ کہیں گر گیا زمان انہیں بدمعاش اور دغاباز کہتے رہے۔ شاہد کے جانے کے بعد تعلیم یافتہ دنیا کی غدّاری کا ماتم کرتے ہوئے ہم لوگ بھی اُٹھے تو دفعتہً میری نگاہ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی روشنی میں دیکھا تو بمبئی سے واپسی کا ٹکٹ تھا۔ زمان صاحب کا جذبۂ ہمدردی پھر عود کر آیا اور کہنے لگے کہ محمود کی بدگمانی نے مجھے بھی بدگمان کر دیا تھا ورنہ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ شاہد کسی شریف گھرانے کا فرد ہے چلو بھائی اسے ڈھونڈ کر اس کا ٹکٹ اسے دے دیں۔

شاہد کی تلاش خلافِ توقع آسان ثابت ہوئی۔ پارک سے پچاس قدم کے فاصلے پر وُہ کسی مارواڑی سیٹھ سے باتیں کر رہا تھا۔ ہم لوگوں کو آتا دیکھ کر وُہ کچھ گھبرا سا گیا اور جب زمان نے اسے اشارے سے بلایا تو وہ بجبر واکراہ ہمارے پاس آیا اور کچھ کھسیانا ہو کر کہنے لگا "کہئے صاحب کیا حکم ہے"، زمان نے خجالت آمیز انداز سے ٹکٹ واپس کرتے ہوئے کہا "شاہد صاحب میری سخت کلامی کو معاف فرمایئے یہ لیجئے اپنا ٹکٹ اور یہ دس روپے میری بدگمانی کا کفّارہ سمجھ کر قبول کیجئے" شاہد نے ایک معنی خیز تبسّم کے علاوہ رسمی شکریہ بھی غیر ضروری سمجھا اور تیز قدم بڑھاتا ہوا بہت جلد ہماری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ ہم لوگ پارک میں واپس آئے تو وہی نورانی صورت بزرگ جو ہمیں آتا دیکھ کر پارک سے چلے گئے تھے بنچ کے پاس کوئی چیز ڈھونڈ رہے تھے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ اُن کا بمبئی سے دہلی تک کا واپسی کا ٹکٹ گم ہو گیا تھا!

طالب صفوی

۷ راگست ۱۹۴۱ء

جمعرات کا دن اگست کی ۷ رتاریخ۔ فضائے ہند میں چھائی ہوئی کافوری ٹھنڈک۔

یکایک سکوت ٹوٹا۔ اور قیامت بپا ہو گئی۔

علم نے کہا:۔ میرا تاجدار مجھ سے خفا ہو گیا۔

فلسفی نے کہا:۔ زندگی اور موت کے اسرار کا راز دار ہم سے روٹھ گیا۔

اہلِ دل یوں گویا ہوئے:۔ وُہ روح کو وجد میں لانے والے گیت سنانے والا ہم سے جُدا ہو گیا۔

سیاست دان چلایا:۔ میرا دستِ راست ٹوٹ گیا۔

مزدور نے آہ کی:۔ میرا ہمدرد بچھڑ گیا۔

غریب پکارا:۔ میرا سہارا ٹوٹ گیا۔

سب مل کر چیخ اُٹھے:۔ آہ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

شفیق احمد بریلوی

شعر و شاعری

طبعِ موزوں کے لئے کم تو نہیں ہیں یہ سوال،
کیسے اشعار کہوں، اُن کی زمیں کیسی ہو،
کون سی بحر ہے موزوں مرے نغموں کیلئے،
کیسے الفاظ خیالات کے مظہر ہوں گے، —
سوچتا ہوں کہ گراں تو نہیں گزرے گی یہ بحر
"فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن"
بیشتر جس میں تخیّل مرا ڈھل جاتا ہے —
چاہتا ہوں کہ بیاں میں ہو لطافت ایسی
کہ اُسے پڑھتے ہی اک کیف سا محسوس کریں
وُہ غزلخواں جنہیں اندازِ کہن بھاتا ہے —
رقص کرتے ہوئے الفاظ ہوں جن کے گھیرے
ذہن میں حلقے بناتے ہوئے پرواز کریں —
میری تخئیل میں جادو کا اثر ہو پیدا
میرے انداز میں مہکے ہوئے نغمے ہوں نہاں
جو سماعت میں اُترتے ہی قیامت ڈھائیں۔
چاہتا ہوں کہ تصوّر میں تخیّل کی جھلک
ایک دُنیا نئی تخلیق کرے دُنیا میں —
اِن خیالات کی اُلجھن میں گرفتار ہوں میں
میری خواہش ہے کہ میں راہ کروں ہر دل میں
اور لوگوں کے لئے شاعرِ فن کار بنوں —

(۲)

سوچنا یوں تو بھلا ہے مگر ایسا کیا سوچ
جس سے بیدار نہ ہو جوہرِ ذاتی اپنا —
ہیچ ہے 'غیرِ مقفّٰے' و 'مقفّٰے' کا خیال
مجھ کو کیا اِس سے کہ شعروں میں مرا ذوقِ نظر
ہے وہی جو مجھے ممتاز کرے دنیا میں۔

کیا مجھے اپنے خیالوں کے ادا کرنے کو
اُسی رفتار سے چلنا ہے کہ جس سے اب تک
دھیرے دھیرے مرے ہم عصر چلے جاتے ہیں؟۔
کیا مجھے شہرت و عزت کے لئے جینا ہے؟
داخلِ فرض ترنّم بھی ہے شاعر کے لئے؟۔
گرد آلودہ جبیں اور گریباں صد چاک
شاعری کے لئے کیا یہ بھی ضروری ہوگا۔
اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں؟۔
یہ نہیں ہوگا — نہیں ہوگا — نہیں ہو سکتا!
میں مداری تو نہیں ہوں کہ پٹاری لے کر
کھیل دکھلاتا پھروں شعبدہ بازوں کی طرح،
میں تو خود اپنا پیمبر ہوں کہ میرے نغمے
میرے احساس کی تصویر ہوا کرتے ہیں،
میرے شعلے تو مری روح کی آوازیں ہیں —
کتنی کم ظرفیٔ فطرت ہے مرا سوچ، کہ میں
اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں —
فاعلاتن، فعلاتن سے غرض کیا مجھ کو،
قافیہ کیا، میری تخئیل کو کوئی طاقت
پابجولاں نہیں کر سکتی غلاموں کی طرح
کون کہتا ہے کہ اشعار ہیں میرے الفاظ
یہ تو اک خام خیالی ہے جہاں والوں کی۔
میں تو جو سنتا ہوں نظروں سے تری کہتا ہوں
یہ الگ بات ہے مفعول، فعولن، فعلن
یا فعولن، فعلاتن میں بیاں ہو جائے۔

یوسف ظفر

یہ حسرت تھی

کبھی موجوں سے ٹکراتا کبھی لہروں پہ لہراتا
تلاطم خیز گردابوں کا سینہ روندتا ہوتا

نسیمِ صبح بن کر شوخیاں کرتا گلستاں میں
گلوں کو گدگداتا کونپلوں کو چھیڑتا ہوتا

گھروں میں یاس کی کرتا امیدوں کا کنول روشن
کسی بیمارِ غم کا مونسِ شامِ بلا ہوتا

اک ایسی بانسری ہوتا کہ جس کے کیفِ نغمہ سے
جھپکتی آنکھ تاروں کی زمانہ سو گیا ہوتا

قلوبِ سخت کی سنگین دیواروں سے ٹکراتا
سکوتِ شب میں اک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہوتا

ڈبو کر کشتیِ سرمایہ داری قعرِ دریا میں
میں مغروروں کی حسرت کا تماشا دیکھتا ہوتا

غریبوں کے محلے میں چراغِ رہ گذر بن کر
(ق) اندھیرے جھونپڑوں کو بھیک اپنی دے رہا ہوتا

چراغِ رہ گذارِ بیکسی جس کے اُجالے میں
کسی مزدورِ فاقہ کش کا بچہ کھیلتا ہوتا

بہشتِ قیصر و فغفور کے سنسان کھنڈروں میں
بغاوت اور تباہی کا ترانہ گا رہا ہوتا

پتنگوں کو حرارت شمع کو سوزش عطا کر
اگر جلنا ہی تھا دل کو تو اک آتشکدہ ہوتا

مگر افسوس فطرت نے اسے شاعر بنا ڈالا
نہیں تو اشک اپنی آرزوؤں کا خدا ہوتا

احسن احمد اشک - کلکتہ

ہم دُعا کیوں مانگتے ہیں؟

دعا ایک التجا یا خواہش کا نام ہے جس کا اظہار کوئی بندہ اپنے معبود سے کرے۔ ہماری زندگی میں باوجود ہماری ہٹ دھرمیوں اور خود پسندیوں کے قدم قدم پر ایسے مواقع آتے ہیں کہ ہماری پیش نہیں جاتی اور خُدا کی امداد کے بغیر ہمارا کام کسی صورت چلتا ہی نظر نہیں آتا۔ بعض سیدھے سچے لوگ تو بغیر دعا درود کے لقمہ بھی نہیں توڑتے۔ لیکن آپ کو حیرت ہوگی یہ سن کر کہ اس بے ضرر مسئلہ میں بھی دوسرے مسئلوں کی طرح کافی کھینچا تانی اور کافی آنا کانی ہے اور بہت سی اُلجھن کی باتیں نکل آئی ہیں۔ وہ لوگ جو مادہ پر جان چھڑکتے ہیں اور روحانیت وغیرہ کو نہیں مانتے اور وہ جو مذہب کو اب ڈھونگ سمجھتے ہیں وہ تو سرے سے کسی خدا یا ذاتِ یکتا کے قائل ہی نہیں۔ ان کے نزدیک دعا کرنا یا دراصل کسی خدا یا بڑے کرتار یا داتار سے امداد طلب کرنا یقیناً شخصیتِ انسانی کو بےجان دبے پر بنا دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک سائل یا منگتے کی حیثیت اس کی کم مائیگی اور بے حوصلگی کی دلیل ہے۔ خواہ سائل کسی نوع کا ہو اور صاحبِ کرم کسی مرتبہ و مقدرت کا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہماری زندگی کا نصب العینِ حقیقی تو پن چکی کی طرح چلنا، چلنا، مدام چلنا، ٹھہرا ہے یعنی سعیٔ پیہم اور جہدِ مسلسل۔ نتیجے خود مرتب ہوتے چلے جائیں گے اور فطرت اور قوانینِ فطرت اپنا کام کریں گے۔ تو پھر اس نصب العینِ حقیقی کو حاصل کر لینے کے بعد لازمی نتائج کو کسی ان دیکھی ذات کے رحم و کرم پر اُٹھا رکھنا اور اس کے لئے گڑ گڑا گڑ گڑا کر فضول بھیک سی مانگنا اور بیکار سہارے ڈھونڈنا انتہائی سیدھا پن اور ڈھکوسلا ہی تو ہوا۔

اس قسم کی دلیلوں کی روشنی میں تو یہی معلوم ہوگا کہ دعا مانگنے کی خواہش ایک اچھے خاصے خود مختار انسان کی کمر توڑ دیتی ہے اور اس کی قوتِ ارادی کو بننے سے پہلے بگڑنا سکھا دیتی ہے۔ لیکن اگر ذرا فکر کو وسعت دی جائے اور دعا کے صحیح نفسیاتی اور اخلاقی پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ دعا کو فی الواقع غلط معنی نہ پہنائے جائیں تو اس کے مانگنے سے نہ تو قوائے انسانی پر فالج کا اثر ہوتا ہے اور نہ انسانی اختیار و عظمت کو بٹہ لگتا ہے۔

دُعا تو جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا ایک التجا یا خواہش کے اظہار کا نام ہے اور اس کا مذہبی معتقدات سے گہرا تعلق ہے۔ اس لئے کہ کسی پکار کے سُننے والے کے بغیر کیا پُکار؟ کہاں کی التجا اور کیسی دُہائی؟ مگر اس سلسلہ میں ایک سیدھی سی بات یہ بھی ہے کہ ہر مخلوق کے لئے خالق کا ہونا، ہر چیز کے لئے ایک بنانے والے کا ہونا اور ہر کوزہ کے لئے کسی کوزہ گر کا ہونا اسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ اثرات کے لئے اسباب و علل کا یعنی آخر دُنیا کی اس بھری سبھا کا کوئی سبھاپتی اور اس نوچندی کا کوئی چاند بھی تو ہونا چاہئے! اس جلوہ گاہِ ناز کے لئے کوئی شاہدِ رعنا بھی تو ہو، خواہ اُسے کسی نام سے پکاریں، رام کہیں یا رحیم یا خالق باری سرجن ہار، کچھ ہی نام دھر لیں۔ مدعا یہ ہے کہ صانعِ مطلق کی

حقیقت سے انکار کرنا ایسا پرلے درجہ کا بُخلِ باطنی اور کذبِ عظیم ہے کہ بس اولادِ آدم ہی کو سزاوار ہے ورنہ واقعہ تو یہی ہے کہ اگر ہم خدا یا حقیقت الحقائق کا وجود ہی نہ مانیں گے اور اِس ذات کو مکمل و اکمل ہی قرار نہ دیں گے تو توانائی انسانی اور شخصیتِ انفرادی ہی محتاجِ تشریح رہ جاتی ہے اور یہ تمام نظام سچ مچ دیوانے کا سپنا بن کر رہ جاتا ہے جسے نہ کوئی سمجھے نہ سمجھا سکے۔ شاید روسو نے اسی لئے تو کہا ہے کہ جو لوگ خُدا کو نہیں مانتے انہیں بھی ضرورۃً کسی نہ کسی چیز کو اپنا خدا تو قرار دینا ہی پڑے گا جس سے اس نظامِ کائنات کی آفرینش کو منسوب کیا جا سکے۔ ہمارے یہاں مرزا غالب نے کیسے سہل انداز میں اس مشکل مسئلہ کو حل کر کے رکھ دیا ہے، ملاحظہ ہو :-

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟!

خیر یہ قصہ تو بڑا بیڈھب اور یہ بحث بڑی پُرانی ہے اور شاید رہتی دُنیا تک رہے گی بلکہ جوں جوں انسان کے پر پرزے نکلتے جائیں گے خُدا کی خُدائی پر یہ غلّہ بازی اور زیادہ شعُور اور زور شور کے ساتھ کی جائے گی۔ میرا مقصد یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ ہماری التجاؤں اور دعاؤں کے سننے والے خدا کا وجود جس کی ذات کو ہم غیر محدود مانتے ہیں بھلا کس طرح ہمیں معذور و ضعیف بنا سکتا ہے؟۔ ایک لا محدود سے لامحدود، ممکن سے واجب، غیر متعین سے متعین بلا شبہ بہت کچھ پا سکتا ہے بلکہ یہی بات آخر الذکر کے لئے باعثِ بہجت و افزائش ہے کیونکہ ہمیشہ رہنے والی اُمیدوں کا سوت وہی ہُوا۔ فلسفۂ زندگی کے لئے بھی یہ شرطِ اول ہے کہ وُہ انسانی ترقی کا ضامن و معاون ہو ورنہ ظاہر ہے کہ نطشہ کا فوق البشر (Superman) بھی معراجِ ارتقا اور منازلِ ارتفاع سے محروم ہی رہ جائے گا۔ پس ایسے خدا سے جسے ہم اپنے آپ سے ہر طرح بڑا، زیادہ طاقتور اور جگ داتا مان رہے ہوں کسی امداد و کرم کی التجا کرنے میں ہماری بات نیچی ہوتی ہے کہ اونچی ہو جاتی ہے اور ہمارا اوم خم گھٹتا ہے کہ بڑھ جاتا ہے؟

دُعا کی اہمیت آپ کی سمجھ میں آ جائے گی اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ انسانی قوائے عملی کی فاعلیت دو صورتیں اختیار کرتی ہے، ایک کو جہدِ ظاہری کہہ لیجئے اور دوسری کو جہدِ باطنی۔ جب جہدِ ظاہری پورا پورا ظاہر ہو چکا ہوتا ہے اور ہماری ظاہری دوڑ دھوپ کی سب ممکن بازیاں لگ چکتی ہیں تو پھر جہدِ باطنی کی باری آتی ہے۔ مثلاً ایک کسان اپنا خون پسینہ ایک کر کے اور اپنی ہڈیاں پیل کر اپنی کھیتی جب بو جوت چکتا ہے تو پھر اس کے مَن میں اُمید کی موجیں اُٹھنا شروع ہوتی ہیں اور وہ اپنے رب سے، جس کے قبضہ میں اس کے اعتقاد کے نزدیک اور باسبابِ ظاہر تمام آفاتِ ارضی و سماوی ہیں اور جو چاہے تو بادِ سموم کے ایک جھونکے میں ہری بالیوں کو جُھلسا کر رکھدے، لَو لگاتا ہے۔ اسی لَو لگانے کو میں نے جہدِ باطنی کہا ہے۔ اس کے ذیل میں جمعیتِ قلب، شکر و یقینِ محکم ایک جذبۂ بے اختیار بن کر دل کی گہرائیوں سے اُٹھتے ہیں اور اُمیدِ حاصل کی لہریں اس جہدِ خاموش کو ایک ہیجانی کیفیت میں بدل دیتی ہیں۔ اس کیفیتِ ہیجان و اضطراب کے اثر سے ظاہری اعضاء بھی نہیں بچتے۔ اُس وقت کبھی جہدِ ظاہری کی کوتاہیاں یاد آ کر دل پر سانپ سا لوٹنے لگتا ہے کہ ہائے فلاں بات کرنی

رہ گئی، ہائے یوں کرتے تو یوں ہوتا، اور کبھی مستقبل کی تابناک تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے تو چہرے پر مسرت کھیلنے لگتی ہے۔ غرض اسی کشمکشِ سکون و اضطراب کے ماتحت لب بے اختیار جنبش میں آجاتے ہیں آنکھیں اُٹھ اُٹھ کر اُسی اپنے من مانے خدا کی رحمتِ کاملہ سے التجائے خموش کرنا شروع کرتی ہیں اور پھر ہاتھ جو ہمارے جسم میں سب سے زیادہ چلبلے واقع ہوئے ہیں بے ساختہ اُٹھ جاتے ہیں کہ رحم کی بھیک اُس داتا سے اگر ہو سکے تو مجازی طور پر بڑھ کر لے لیں، وہ بھیک نہیں بلکہ انعام جس کے ملنے کا یقین ہی تمام جہدِ عملی کی تاویل تھی اور اپنا ایمان۔ اسی جہدِ باطنی، اسی کشاکشِ دروں اور تمنائے دلی کا اظہار جس نہج پہ ہو جائے اُسے ہی ہم دراصل دعا کہتے ہیں۔

تو آپ سمجھ لیجئے کہ یہ جو ہم لوگ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اور گود پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگا کرتے ہیں یہ اُسی کیفیت میں گم ہو جانے کی ایک وجدانی شکل ہے جو اب محض رسم بن کر رہ گئی ہے ورنہ آسمان سے کوئی من و سلویٰ تھوڑا ہی برستا ہے کہ ہم ہاتھ نہ پھیلائیں تو اُسے لپک ہی نہ پائیں! اس نقطۂ نظر سے یہ شیوۂ دعا ایک شعورِ ایمان اور تہذیبِ نفس ہے کہ اس سے تسلیم و رضا کی بو آتی ہے اور خو بڑھتی ہے۔ اسی چیز کو پھل آشا بھی کہتے ہیں

لیکن یہاں آکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دُعا کا نظریہ صحیح بھی ہی، لیکن کیا درحقیقت محض دعا سے مقدر کا لکھا مٹ سکتا ہے یا آنے والی بلائیں ٹل جاتی ہیں؟ اس کے جواب ہی میں اِس عقدہ کو حل چھپا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کو زمین کی بادشاہت اور خدا کی خلافت ضرور بخشی گئی ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ یہ حضرت اس خلافت کی گدی کو سنبھالے، جھوٹے توکّل پر تکیہ کئے تقدیر پر شاکر بیٹھے رہیں، نہ کچھ کریں نہ دھریں۔ بجز اس کے کہ آسمان کو تکا کریں اور ضربیں لگایا کریں کہ یا اللہ بھیج چھپّن کروڑ کی چوتھائی، نہیں ہرگز نہیں۔ اس کی زندگی کا مدار اس کے عمل پر ہے نہ کہ بے عملی پر۔ قنوط و نومیدی جینے کی شرط نہیں۔ مثال کے طور پر قرآن شریف ہی میں مسلم کی زبان سے دین دنیا کی سرخروئی کے لئے بارہا دعائیں بلند کرائی گئی ہیں اور خدا کو دعاؤں کا سننے والا کہا گیا ہے لیکن صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ تمہاری کمائی کا حصہ تمہاری مساعی پر ملے گا۔ کسی کی محنت رائگاں نہیں جاتی، اس مقولہ میں سچائی ہی سچائی بھری ہے۔ من چنگا اور کٹھوتی میں گنگا والی بات بھی بس یہی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں

پس دُعا اک شعارِ ایمانیہ ہے اور جو دعائیں بغیر کوشش اور عمل کے مانگی جاتی ہیں وہ اس کسوٹی پر پوری ہی نہیں اُترتیں ورنہ تمام فلسفۂ حیات ہی غارت ہو جائے اور دُنیا میں عمل کے نام تو بس مکھیاں ہی بھنکا کریں، انسان دعا کے بھروسے پر ایک جیتی جاگتی مٹی کی مورت بن کر رہ جائے جس میں نہ حرکت رہے نہ احساس، نہ خودی نہ خود داری۔ کوشش کے بغیر انجام کی دعا کرنا یا تمنا رکھنا ایسا ہی ہے جیسے بغیر دوا کے صحت کی آس لگانا، بیج ڈالے بغیر پھل کھانے کی جستجو کرنا۔ اگر توفیقِ خداوندی اتنے سستے داموں نصیب ہو جایا کرتی تو پھر تو سارے کام خدا ہی بنے پڑا کرتے اور انسان تو کام چور نوالہ حاضر الغنۃ بن کر رہ جاتا۔ علامہ اقبال نے اس نکتہ کو یوں واضح کیا ہے ؎

مسلم از دُنیا سوئے حق رم کند — از دُعا تدبیر را محکم کُند

یعنی دُعا تو تدبیر کو تیز تر بنا دیتی ہے، جیسے تلوار پر صیقل۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تدبیر تو نہ ہو اور محض دعاؤں کے گنڈے پر بیٹھے رہیں، گویا تلوار تو غائب اور آلاتِ صیقل ہی سے کاٹ کا کام لینے کی سعی کی جائے!

اسی غلط نظریہ کا نتیجہ ہے کہ لوگوں نے دعاؤں کو عجیب قسم کا افسوں اور اُنچھ سمجھ رکھا ہے جس کے ذریعے سے غیب کے خزانے لوٹ لائیں۔ دُنیا کی خاصی آبادی اور بالخصوص ایشیائی ممالک کا بڑا حصہ اب بھی اسی دھوکے فریب کا شکار ہے اور یہ فن سوداگری آج کل ہمارے ملک میں تو بہت ہی فروغ پر ہے۔ یہ بھلے مانس نہیں سوچتے کہ محض خالی پھیکی دعاؤں سے تقدیریں نہیں بدلتیں بلکہ تقدیر کی کاٹ تو صرف تدبیر ہی کر سکتی ہے۔ دُور کیوں جائیے؟ اسی جنگ کو دیکھ لیجئے۔ اگر غنیم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو عملی ناکہ بندی سے روکنے کے بجائے انگریز صرف آرچ بشپ آف کنٹربری سے کہہ دیں کہ جناب ذرا اپنا سر کھول کر خدا سے یہ دُعا فرما دیجئے کہ ابن مریم کے صدقے میں دشمن کی توپوں میں کیڑے پڑ جائیں اور اُس کو ڈھائی گھڑی کا ہیضہ ہو جائے تو کیا آپ کے نزدیک یہ منتر کافی ہوگا؟ نہیں اور قیامت تک نہیں۔ یہاں تو جو مارے سو میری کا مضمون ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ہندوستانیوں نے تو اس نکتہ کو بالکل نہیں سمجھا اور دعاؤں کو بُری طرح زمانہ سازی اور ریاکاری کا آلہ بنا رکھا ہے۔ ملک میں ایک بڑا گروہ اس ڈھب کے لوگوں کا ہے جن کا کام دعاؤں کے جھانسے دینا اور خدا کے نام پر ضعیف الاعتقاد غرباء کی جیبوں پر ڈاکا ڈالنا ہے۔ ان نیم مذہبی ٹھگیتیوں کے اڈے ہر شہر میں اور ہر قریہ میں موجود ہیں اور کھلے بندوں زبانی اور تحریری دونوں طریق پر خدا سے معاملے طے کرائے جاتے ہیں۔ کیسی ہی کٹھن گتھی کیوں نہ پڑ جائے یہ اپنی دعا کے زور سے اُسے چٹکی بجاتے میں کھول کر دھر دیں گے بشرطیکہ آپ اس کرامات کا مناسب ہدیہ پیش فرما دیں۔ جس طرح دنیا میں ضروریات کے اعتبار سے اور بہت سے آزاد پیشے ہیں، مثلاً وکیل مقدمے لڑاتے اور انسانوں میں سر پھٹول کراتے ہیں، حکیم ڈاکٹر بیماروں کو اچھا اور اچھوں کو بیمار کرتے ہیں، بھٹیارے روٹیاں تھوپتے اور ساقی لکھنؤ اور دلّی والوں کو شراب کی بجائے حُقّے پلاتے پھرتے ہیں، بالکل اسی طرح اس قبیل کے لوگوں کو بھی سمجھئے کہ خدائی ٹنڈیل ہیں جنہوں نے دربارِ الٰہی میں دُنیا بھر کی طرف سے صفائی و ترجمانی کا کام اپنے سر لے لیا ہے۔ ان کی زبان گویا تاثیر کی ڈبیا ہے کہ ذرا ہلی اور تیر نشانہ اجابت پر جا لگا!

یہ گروہ چشم بد دُور ہمارے نام نہاد پیروں فقیروں، قلندروں مچھندروں، مجاوروں، مہنتوں اور سائیں باباؤں کا ہے جن کی ساری کائنات لمبی لمبی تسبیحیں اور مالائیں اور نقشِ سلیمانی و علاج الغربا جیسی دو چار کتابیں ہیں اور کچھ اُلٹے سیدھے ٹوٹکے ٹونے، اشلوک منتر، جھاڑ پھونک جنہیں وہ دُعا اور آشیرباد کے نام دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے دعا کو گھیرے کا پینترا بنا رکھا ہے جس کے ذریعے سے یہ براہِ راست خدا کو گھیر لیتے ہیں یا شاید یوں ہوگا کہ یہ پیشہ ور دعاگو قسم کے لوگ ان نالائق بیرسٹروں کی طرح جو مجسٹریٹوں سے اپنی ذاتی دوستی کی ڈینگیں مار مار کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے پھرتے ہیں، اللہ میاں کے ایجنٹ ہوں گے جو اس کی رحمت اور حمایت کا رعایتی قیمت پر پروپیگنڈا کرنے کے لئے چھوٹے ہوئے ہیں، جنہیں نہ قومی لیڈر روکیں، نہ پنچایتیں ٹوکیں، نہ انجمنوں اور کمیٹیوں والے للکاریں۔

اب وقت ہے کہ اس لغویت کا سدباب کیا جائے اور بندوں کو اُن کے خدا پر اور خدا کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے!

فضل احمد صدیقی

(حسبِ اجازتِ نشرگاہ بمبئی)

سراب

نہ مسکرا مری صورت سے گر عیاں ہے ملال
نہیں شکست کا احساس گو حزیں ہوں میں
نہ دید کا مجھے ارماں نہ آرزوئے وصال
غمِ فراق میں کھویا ہوا نہیں ہوں میں

نہ گو سماتا کبھی میرے دل میں تیرا خیال
مگر کیا تھا مجھے تو نے پیار یوں جیسے
کوئی تھکا ہوا درماندہ بے خبر راہی
ہجومِ یاس میں منزل کے پاس جا پہنچے

معاً اُٹھائی تھیں جب تو نے سُرمگیں پلکیں
تری نگاہوں میں پاکیزگی تھی سر بسجود
ترے لبوں پہ لرزتے تھے ناتمام الفاظ
خلوصِ جذبِ محبّت کی تھی جبیں پہ نمود

مرا سکون، مرا چین چھن گیا مجھ سے
تھا تیرے جذبۂ بے لوث میں اثر اتنا
اسی جنوں میں گزرتی تمام عمر مری
نہ ہوتا گر تری فطرت میں بے وفا ہونا

زبوں نہیں ہوں اگر تو نے پھیر لیں نظریں
ترے بغیر بھی قائم تھی زندگی میری
جہاں میں اور بھی دُکھ درد سہہ رہا تھا میں
پیامِ موت نہیں مجھ کو بے رُخی تیری

ملول ہوں کہ وہ معصوم پیار کا پرتو
جہانِ خاک سے جس کو نہ ہو کوئی نسبت
طلسمِ خواب کی مانند ٹوٹ کر رہ جائے
ہو اک سراب حقیقت میں جذبۂ الفت

خود اپنے دل سے مجھے اب نہیں کوئی اُمید
جو زخم تو نے دیا ہے نہ بھر سکوں گا میں
کسی کے حُسن پہ شاید کبھی نظر اُٹھے
مگر کسی سے محبت نہ کر سکوں گا میں

مسعود پرویز

غالب کا ایک خط

حضرت ارسطو جاہ بہادر مرحوم کے نام غالب نے بہت سے خطوط لکھے ہیں جن میں سے اکثر شائع ہو چکے ہیں۔ ایک خط جو سر سید مرحوم کی مشہور تصنیف آثار نادید بھیجنے وقت لکھا تھا مجھے آثار کے اوراق سے اُس وقت ملا تھا جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ بہت احتیاط سے میرے پاس رکھا ہوا تھا۔ جب میرے محترم دوست چودھری غلام رسول مہر کی مشہور کتاب "غالب" کا اشتہار نکلا تو اُس کا عکس میں نے اُن کی خدمت میں بھیج دیا۔ چنانچہ وہ اُن کی کتاب میں شائع کیا گیا۔ وہ خط نامطبوعہ تھا اور پہلی مرتبہ "غالب" میں شائع ہوا۔ غالباً جب فارسی اور اُردو کے رقعات غالب کی زندگی میں چھپے تھے اس وقت بعض خطوط کی نقلیں نہیں بھیجی گئیں۔ اگرچہ ایک خط سے جو مجھے ارسطو جاہ بہادر مرحوم کے پُرانے مسودات سے ملا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اردوئے معلی کی طبع کے وقت اُردو خطوط خود غالب کے ایما پر بغرض طباعت حضرت ارسطو جاہ بہادر مرحوم سے طلب کئے گئے تھے چنانچہ میر فخر الدین مہتمم اکمل الاخبار دہلی نے ۱۷ ارجون ۱۸۶۸ء کو حضرت ارسطو جاہ بہادر مرحوم کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں۔ بندہ نے بہ ایمائے جناب مرزا صاحب قبلہ مرزا نوشتہ صاحب غالب رقعۂ اُردو جناب ممدوح کے اطراف و جوانب سے منگائے ہیں۔ چنانچہ بہت سے جمع ہو گئے ہیں۔ اور عنقریب اُن کے طبع کرنے کا ارادہ ہے۔ آج بزبانی مشفقی و مکرمی جناب منشی رائے جواہر سنگھ صاحب دریافت ہوا کہ حضرت کے پاس بھی بہت رقعۂ اُردو جناب ممدوح کے جمع ہیں۔ لہذا گذارش ہے کہ براہِ عنایت و کرم جس قدر رقعے آپ کے پاس موجود ہوں بندہ کے پاس ارسال فرمایئے تا اس میں شمول کئے جائیں۔ اور بروقت چھپنے کے ایک جلد آپ کے پاس بھی پہنچے گی اور صحت کا التزام جناب مرزا نوشتہ صاحب کے ذمہ ہے اور نام اُردوئے معلی رکھا گیا ہے، غرضکہ آپ جلد تر براہِ بندہ نوازی رقعے مرزا صاحب کے عنایت فرمایئے اور بعد نقل کے رقعے خدمتِ عالی میں واپس بھیجے جائیں گے۔

یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ نقل ہونے کے بعد واپس بھیجے گئے یا نہیں۔

ماہ جون ۱۹۴۰ء میں میں رخصت پر گھر گیا تھا وہاں پُرانے خطوط پڑھتا رہا۔ اتفاق سے سب سے پہلا خط جو بطور تعارف کے لکھا گیا ہے مجھے مل گیا۔ اُس کا عکس اِس مہینے "ہمایوں" کے صفحۂ آئندہ پر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی غالب کے اندازِ تحریر کا بہترین نمونہ ہے۔ چونکہ فارسی خطوط سے شاعر کے ماحول پر کافی روشنی پڑتی ہے اِس لئے میں نے گوارا نہ کیا کہ ہمارے سب سے بڑے شاعر کے مداح اس تحریر سے محروم رہیں۔

سید آغا حسین

روز غرقاب ہو رہے ہیں جہاز　　روز نایاب ہو رہے ہیں جہاز
قصۂ خواب ہو رہے ہیں جہاز　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ناکہ بندی کے دام چار طرف　　قحط اور موت عام چار طرف
صبحِ ہستی کی شام چار طرف　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

روز طیارے لائے جاتے ہیں　　روز لشکر بڑھائے جاتے ہیں
قہر پر قہر ڈھائے جاتے ہیں　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جب ہوائی جہاز آتے ہیں　　آتش افروز بم گراتے ہیں
خاک کے ڈھیر چھوڑ جاتے ہیں　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

سیکڑوں اسلحہ ہیں آتش بار　　لاکھوں آلات اُگل رہے ہیں شرار
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جس طرف جاؤ اُٹھ رہا ہے دُھواں　　سقف و دیوار و در ہیں شُعلہ فشاں
آتشیں غُسل کر رہا ہے جہاں　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

اِن خطرناک یورشوں کے سوا　　حملہ آور ہے ایک اور بلا
یعنی فتنہ پروپیگنڈے کا　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

اِس وغا میں ہے یہ بلا بھی شریک　　یہ وبال اور یہ وبا بھی شریک
یہ بھی اور اس کا ارتقا بھی شریک　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

کوششِ نشرِ مدح و ذم بھی شریک　　ناشر و کاتب و قلم بھی شریک

اور بدقسمتی سے ہم بھی شریک — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور یہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

حربہ ہائے زباں بھی شامل ہیں — حملہ ہائے بیاں بھی شامل ہیں
یاں بھی شامل ہیں، واں بھی شامل ہیں — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور یہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

دم بھی، دھوکا بھی، افترا بھی ہے — جھوٹ بھی، مکر بھی، دغا بھی ہے
اور بھیس سچ کا ادّعا بھی ہے — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور یہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

سب و شتم بہم دگر بھی ہے — طعن و تشنیعِ تلخ تر بھی ہے
کوششِ از دیادِ شر بھی ہے — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور یہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ریڈیو، ٹیلی فون، تار، اخبار — بن چکے ہیں وغا کے آلۂ کار
جنگ کا بھوت ہے سروں پہ سوار — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور یہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جنگ زا ذکر، جنگ زا تقریر — جنگ زا فکر، جنگ زا تحریر
بارک اللہ! جنگ کی تقدیر — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور یہ صدر عذرِ لنگ برپا ہے

مغربی بادشاہیوں کا جہاں — نو بہ نو حرص زائیوں کا جہاں
بن چکا ہے لڑائیوں کا جہاں — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور یہ صدر عذرِ لنگ برپا ہے

نئے اقدام ہیں نئی پیکار — نئے آلات ہیں نئے ہتیار
بحر و بر ہیں نئی بلا سے دوچار — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور یہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

قوم پر قوم کھا رہی ہے مات — ملک کے ملک کھو رہے ہیں ثبات
سخت نازک ہے صورتِ حالات — سخت خوں ریز جنگ برپا ہے

اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جرمنی کے بڑے سہی دم خم
"جان بل" بھی نہیں کچھ اُس سے کم
جو وُہ سہراب ہے تو یہ رستم
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

اِس طرف چرچل، اُس طرف ہٹلر
دونوں خوددار، خودنگر، خودسر
ایک سے ایک ضد میں بڑھ چڑھ کر
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

دونوں صاحب عساکرِ جرّار
دونوں احقاقِ حق کے دعویٰ دار
دونوں اک دوسرے کے دشمنِ کار
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

چارسو عالمِ تباہی ہے
قتل و غارت کی بادشاہی ہے
کیا نرالی جہاں پناہی ہے
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

اِک طرف حکمِ عامِ بربادی
اک طرف اذنِ تامِ بربادی
ہر طرف اہتمامِ بربادی
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ہر طرف قتلِ عام جاری ہے
ہر طرف نہب تام جاری ہے
اور بہ صد انتظام جاری ہے
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

نوعِ انساں ہے اور تباہی ہے
ظلمِ دوراں ہے اور تباہی ہے
امنِ گیہاں ہے اور تباہی ہے
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

روز دو دو کروڑ سکۂ زر
مفت برباد ہو رہا ہے مگر
پھر بھی اِس بے پناہ نقصاں پر
سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

جنگ وحشت میں بڑھتی جاتی ہے　　زور و شدت میں بڑھتی جاتی ہے
اور وسعت میں بڑھتی جاتی ہے　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

کیا خبر، اب یہ کس طرف کو جھکے　　کیا خبر، اب کہاں یہ جا کے رُکے
کیا خبر، کیونکر اب یہ قصہ چکے　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

صلح کی کیا اُمید بر آئے　　صلح کی کیا کوئی خبر آئے
کوئی دیتا بھی تو نظر آئے　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

سعیٔ صلحِ بہم غلط ہے ہنوز　　اِس طرف ہر قدم غلط ہے ہنوز
لا صحیح اور نعم غلط ہے ہنوز　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

گو فریقین مردِ میداں ہیں　　گو حریفین فردِ گیہاں ہیں
سخت ترساں ہیں سخت لرزاں ہیں　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

کیا پتا، کس کی صف اُلٹ جائے　　کیا پتا، کس کا نام کٹ جائے
کون رہ جائے، کون چھٹ جائے　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

ہند والو! کچھ اب تو ہوش میں آؤ　　فرصتوں کو نفاق میں نہ گنواؤ
وقت ہے وقت، متحد ہو جاؤ　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

وقتِ فرصت کو مغتنم سمجھو　　خدمتِ ملک کو اہم سمجھو
ورنہ اپنے کو کالعدم سمجھو　　سخت خوں ریز جنگ برپا ہے
اور بہ صد عذرِ لنگ برپا ہے

آزاد انصاری

کوئٹے کا زلزلہ

(۱)

میٹرک کرنے کے بعد میں نے سوچا، کہ بھئی آج کل ملازمتوں کا تو کچھ ٹھیک نہیں، بجائے انگریزی تعلیم جاری رکھنے کے کوئی فنی صیغہ اختیار کرنا چاہیئے، یہ سوچ کر طبیہ کالج دہلی میں داخل ہوگیا، دو سال خیریت سے گذرے، تیسرا سال شروع ہوا تھا، کہ بیماری نے آگھیرا، مجبوراً آگرہ واپس آنا پڑا، صحت بحال ہوئی تو دہلی جانے کو جی نہ چاہا، باغبانی کی تعلیم حاصل کرنے سہارن پور چلا گیا۔

باغبانی کا نصاب پورا کرنے کے بعد فکر ہوئی ملازمت کی، بہتیری دوڑ دھوپ کی کوئی جگہ نہ ملی، والد ماجد سے کہا، اگر آپ کچھ خرچ دیں تو کراچی جا کر تجارت کروں، یہ تجویز اُنہیں پسند آئی، تین سو روپیہ بطورِ زادِ راہ دے کر فرمایا، فی الحال اتنی ہی رقم لے جاؤ، راستہ میں ضائع ہونے کا احتمال ہے، وہاں پہنچ کر جتنی ضرورت ہو لکھنا، یہاں سے منی آرڈر کر دیا جائے گا۔

کراچی میں بڑی دقت پیش آئی، نیا شہر جہاں کوئی جان پہچان نہیں، کس سے صلاح لوں، کیا کروں، ہفتہ عشرہ یوں ہی نکل گیا، کہ دن بھر ہوٹل میں پڑا رہا، شام کو اُٹھا اِدھر اُدھر چکر کاٹ کر چلا آیا، اور خیالاتِ پریشاں کی اُدھیڑ بُن میں اُلجھ گیا۔

ایک روز ذرا بندرگاہ کی طرف جا نکلا، حیران رہ گیا، جدھر نگاہ اُٹھتی وہیں کی ہو رہتی، کچھ دیر مبہوت رہنے کے بعد سیرِ دریا کی سوجھی، کرایہ کی بے شمار کشتیاں موجوں سے لڑتی بھڑتی دوڑی دوڑی پھرتی تھیں، اور ملاحوں نے ایک ہڑبونگ مچا رکھا تھا، کنارے تک پہنچتے پہنچتے بے طرح لپٹ پڑے، جوں ہی میں نے ایک کشتی میں قدم رکھا، وہ ساحل چھوڑ سمندر کے رُخ روانہ ہوگئی۔

کیا سیر تھی۔ ایک طرف بندرگاہ کی چہل پہل، دوسری طرف نیچے پانی اوپر آسمان۔ پانی کی حد، نہ آسمان کا اور چھور۔ یہ کائنات کس قدر وسیع ہے۔ کشتی موجوں میں ہچکولے کھاتی رواں دواں تھی، نزدیک و دُور ماہی گیروں کی کشتیاں بادبان کھولے قطار در قطار پھیلی ہوئی تھیں، جیسے کسی جھیل پر قازوں کی ڈاریں اُتر رہی ہوں۔

ان کشتیوں کی نظارہ و محویت میں، مجھے یکایک خیال آیا، کہ اچھا.... مچھلی کی تجارت ٹھیک رہے گی اور دل ہی دل میں جوڑ توڑ لگا کر بہت جلد فیصلہ کر لیا، کہ پہلے مچھلی کے کسی تاجر کی ملازمت کرنی چاہیئے، پھر جیسا ہوگا دیکھا جائے گا۔

(۲)

معمولی ہی کوشش سے مچھلی کے ایک بڑے آڑھتی کے یہاں روزگار لگ گیا، چونکہ حوصلہ افزا اُمیدیں وابستہ تھیں، میں نے خوب جی لگا کر کام کیا، دن رات کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا، کہ پورا سال نہ گذرا تھا اس کاروبار کا مجھے پورا پورا تجربہ ہوگیا، اُدھر آڑھتی صاحب کو بھی مجھ پر اعتماد کُلی حاصل ہو چکا تھا، انہوں نے اپنی ایک شاخ قائم کرنے کی غرض سے مجھے کوئٹہ بھیج دیا۔

میں نے وہاں بھی نہایت دیانتداری ذہن وہی سے کام کیا، مقامی ضروریات اور میری کوششوں کے سبب سے وُہ فرم بہت کامیاب رہی، ان کارگذاریوں کے بعد میں نے کاغذی گھوڑے دوڑائے تنخواہ میں اضافے کی کتنی ہی درخواستیں بھیجیں، مگر انہوں نے کچھ پروانہ کی، وُہ ہی کراچی کی تنخواہ پچپن روپیہ رہنے دی، مجھے اس تجارت کی رکانیں تو معلوم ہو ہی چکی تھیں، ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنا کام شروع کر دیا۔ اب میں نے دریائی سمندری مچھلی کے علاوہ ایک مُرغی خانہ کھول لیا اور انڈا مرغی بھی بہم پہنچانے لگا، اس طرح آج کچھ کل کچھ میرا کاروبار ترقی کرتا گیا۔

کاروبار کی رفتار کے ساتھ مراسم بھی دن دونے رات چوگنے ہوتے گئے، ان اُلجھنوں کی وجہ سے مجھے آگرہ جانے کا موقع نہ ملا، حالانکہ ہم دو بہنیں اور چھ بھائی ہیں، پھر بھی ماں کی ماتا، والدہ ماجدہ نے مجھ کو بار بار یاد فرمایا، خطوں کی ڈاک بٹھادی، ان خطوط میں میری شادی کے متعلق بھی کچھ اشارے ہوا کرتے تھے، آگے چل کر اس ایما کا صاف صاف اظہار کیا جانے لگا، مگر میں ان تحریکوں کو کھٹائی میں ڈالتے ڈالتے ۴۲ء تک لے آیا کہ ایسی جلدی بھی کیا ہے، ذرا کاروبار کی طرف سے اطمینان ہو پھر جو مرضی ہو کیجیے گا۔

جب خط و کتابت سے خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا، تو اُنہوں نے بڑے بھائی صاحب کو بھیجا، اور سخت تاکید کی کہ جس طرح بھی ہو اُسے لے کر ہی آنا!

بھائی صاحب کوئٹہ تشریف لائے، لیکن میری مصروفیت دیکھ کر زیادہ زور نہ ڈال سکے، یوں ہی واپس چلے گئے۔

کاروبار کے علاوہ اپنے کوئٹہ نہ چھوڑنے کا ایک اور راز بھی ظاہر کر دوں، جو اس افسانہ کی جان ہے!

بات یہ ہوئی کہ گاہکوں میں ایک صاحب میرے پاس اکثر آنے جانے لگے، یہ میل ملاپ بڑھتا گیا، جب گری چھننے لگی، تو ایک بار انہوں نے میری دعوت کی، گھر لے گئے اور اپنے والدِ ماجد سے ملایا، ان بزرگ کی عمر یو۔ پی میں بسر ہوئی تھی پنشن کے بعد کوئٹہ جو آئے تو یہیں کے ہو رہے، اپنا وطن پنجاب بھی ترک کر دیا، اور عموماً کسی سے ملتے جلتے نہ تھے، البتہ کسی کو یو۔ پی کا سُن پاتے، تو بہت اخلاق سے پیش آتے، مجھ ناچیز پر بھی شفقتِ بزرگانہ فرمائی، کہنے لگے برخودار! یہاں تمہارا کون ہے، غریب خانہ کو اپنا گھر سمجھو، ان بچوں کے ساتھ کھانا کھایا کرو! یہ سُن کر میں بڑا جھجکا یا یوں ہی کچھ ہوں ہاں میں ٹال مٹول کر کے رہ گیا۔

مگر بزرگوں کی باتیں کچھ دنیا دکھاوے کی تھوڑا ہی ہوتی ہیں، اس روز کے بعد سے وُہ کچھ نہ کچھ کھانے پینے کی چیز بھجوا دیتے تیسرے، چوتھے ضرور دعوت کرتے، رفتہ رفتہ انہوں نے مجھ وحشی کو رام کر لیا، کچھ ایسا مانوس کیا، گھر بھُلا دیا، اُن کی بیوی صاحبہ بھی اس درجہ شفیق تھیں کہ مجھے اُن پر اپنی سگی ماں کا سا شبہ گذرنے لگا۔

ان بزرگ کے دولت کے تین لڑکیاں تھیں، بڑی لڑکی سیانی ہو چلی تھی، بزرگوار خدا رسیدہ تارک الدنیا لوگوں کی طرح سہ منزلے پر اللہ اللہ کیا کرتے تھے، مائی صاحب گھر کے کام کاج میں رہتیں، بڑی لڑکی ہی میرے ہم سن دوست اپنے بڑے بھائی کو اور مجھے کھانا کھلایا کرتی تھی، وُہ کچھ اس ذوق و شوق سے خندہ پیشانی میری خاطر تواضع کرتی، گویا یہ بھی کوئی عبادت ہے۔

غرض اِس خاندان کے چھوٹے بڑے سب ہی نے ایسا اچھا برتاؤ کیا، کہ ان کی یگانگت میرے تخیل میں پیوست ہو گئی، اور یقین ہونے لگا، کہ بس اب ان ہی میں میرا مرنا جینا ہے۔

طرفہ یہ کہ اس درجہ گھُل مِل جانے کے باوجود اُس لڑکی اور میرے درمیان ایک لطیف حجاب حائل تھا، اتفاقاً کبھی آنکھیں لڑتیں بھی تو فوراً منتشر ہو جاتیں، اور مجھے صریحاً محسوس ہونے لگتا تھا، کہ ظاہری و باطنی فضائیں پُراسرار افسانوں سے معمور ہیں۔

(۳)

میں نے صرف ڈھائی سو روپیہ سے بیوپار شروع کیا تھا، چھ سال میں مال اور تجارتی پھیلاوا چھوڑ کر ساڑھے بارہ ہزار روپیہ نقد بنک میں جمع ہو گیا، مراجعتِ وطن کا خیال خوابِ فراموش ہو چکا تھا، میونسپلٹی سے ایک قطعہ منظور کرا کے ذاتی مکان بنوانے کی فکر تھی، اپریل ۱۹۳۵ئہ کے آخری ہفتہ میں بھائی صاحب کا ایک خط موصول ہوا، لکھا تھا والدۂ ماجدہ علیل ہیں، ڈاکٹروں نے تبدیل آب و ہوا کا مشورہ دیا ہے، آگرہ آکر اُنہیں لے جاؤ۔

کہاں کا آنا کہاں کا جانا، اُس وقت مجھے اپنی دُھن میں کچھ نہ سوجھتا تھا، لکھ دیا آپ تو میری مصروفیتیں دیکھ ہی گئے ہیں، سر کھجانے کی فرصت نہیں، آگرہ کیونکر حاضر ہو سکتا ہوں، ذرا آپ ہی اُن کو یہاں پہنچا جائیں۔ بھائی صاحب کو جواب لکھ کر میں نے والدۂ ماجدہ کے لئے ضروری انتظامات کر لئے، تاکہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، اور خوش تھا کہ اچھا ہے، اُنہیں بھی اُس خاندان سے ملا دوں گا، اس زمانے میں ایسے مخلص اور شریف النفس انسان کہاں ملتے ہیں، یقین ہے میری طرح متاثر ہو کر وُہ بھی اس گھرانے میں مستقل تعلقات قائم کرنے کی آرزومند ہو جائیں گی۔

۱۷ یا شاید ۱۸ مئی ۱۹۳۵ئہ کو ان کے تشریف لانے کی خبر تھی، اُس کے تیسرے چوتھے دن دوسرا خط آیا جس میں لکھا تھا، کہ دفعتہً چھوٹے بھائی کی طبیعت ناساز ہو گئی، اس واسطے فی الحال سفر ملتوی کیا گیا۔

اُن دنوں مجھے کچھ عجیب عجیب خواب دکھائی دینے لگے تھے، جن سے اُس وقت تو میں بہت متاثر ہوتا تھا، پھر کچھ نہیں، مثلاً ۲۰ مئی ۱۹۳۵ئہ کو ڈاکٹر محمد طاہر صاحب لاہوری سے ملنے اسلام آباد گیا، ہم دونوں میڈیکل ہال میں بیٹھے شطرنج کھیلتے رہے، رات کے گیارہ بجے اُن کے یہاں سے واپس آیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

پچھلی رات دیکھا، کہ پریشاں روزگار ہوں، ایک جواں سال دوست کہتے ہیں، کہ مجھے بھی کوئی نوکری چاکری نہیں ملتی، آئیے مصر چل کر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کریں، امید ہے کہ وہیں کوئی ملازمت بھی مل جائے گی۔

ہم مصر پہنچ گئے، میں نے چار سال میں ڈاکٹری کا کورس ختم کر کے سند حاصل کر لی، ملازمت ملی نہیں، میری قیام گاہ کے قریب ہی ایک بزرگ رہتے تھے، انہوں نے رائے دی، کہ میرا ذاتی مکان ہے، اس کے نیچے کا حصّہ بغیر کرایہ کے خالی کر دوں، اُس میں اپنی پریکٹس شروع کر دو!

میں اس بات پر تیار ہو گیا، پریکٹس کرنے لگا، کام چل نکلا، دو سال میں میرے پاس تین ملازم ہو گئے۔

ایک روز دوپہر کا کھانا کھا کر کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا، وہ بزرگ تشریف لائے، باتوں باتوں میں فرمانے لگے،۔

برخوردار! تمہاری شادی ہو گئی؟

میں نے جواب دیا۔ جی نہیں!

بولے۔ تو میری خواہش ہے، کہ اپنی اکلوتی لڑکی تم سے بیاہ دوں!

میں نے گذارش کی۔

والدین کی اجازت بغیر میں از خود کچھ نہیں کر سکتا۔

فرمایا۔ اچھا! اُن کا پتا لکھوا دو، پھر ہم جانیں وُہ جانیں!!

میں نے گھر کا پتا لکھوا دیا، انہوں نے خط وکتابت کر کے منظوری منگوالی، اور میرے والد کی تحریر دکھا کر کہا۔ کیوں برخوردار! اب تو عذر کی گنجائش نہیں؟

مجھے خاموش ہونا پڑا، انہوں نے اپنی لڑکی سے میرا عقد کر دیا، شادی کے دوسرے سال ایک لڑکا پیدا ہوا، مزے سے گذر رہی تھی، ان بزرگ نے انتقال فرمایا، اس کے چند روز بعد میری طبیعت خراب ہو گئی، اور جلد جلد صحت گرنے لگی، ڈاکٹروں کو دکھایا تو انہوں نے مرض خطرناک بتایا۔

ایک روز گھر میں مرد عورت کا ہجوم ہو گیا، وُہ میری اہلیہ کے عزیز واقارب تھے، ناگہاں میرے کان میں بھنک پڑی، ان کی طرف سے مایوسی ہے، ڈاکٹر صاحب کا انتظار تھا، تھوڑی دیر میں وُہ تشریف لائے اور نا اُمیدی ظاہر کر کے چلے گئے، بیوی بچے مجھے حسرت سے تکنے لگے، پھر سُنا کہ آہ! بیچارے کا انتقال ہو گیا، ایک کہرام بپا تھا، میں چُپکا پڑا دیکھتا رہا، کہ اب کیا ہوتا ہے۔

تختہ لایا گیا، اور غسلِ میت کے لئے مجھے اُٹھایا جانے لگا، مارے خوف کے میں نے اپنے ہاتھ جھٹکے، پٹیوں پر کہنیاں لگیں، آنکھ کھلی تو معلوم ہوا، اُسی کوئٹہ والے گھر میں اپنی چارپائی پر پڑا ہوں، یہ ایک متوحش خواب تھا، آنکھ کھلنے پر بھی میرا ڈر دُور نہ ہُوا، زور زور سے دل دھڑکتا رہا، صبح تک پلک سے پلک نہ لگی، اور تین چار دن کہنیوں میں درد رہا۔

(۴)

۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کو میں نے وُہ خواب دیکھا، جس نے ایک بھری پُری بستی ملیا میٹ کر دی، اور تاریخ ہند میں ایک عبرتناک یادگار چھوڑ گیا۔

بے خبر پڑا سو رہا تھا، کیا دیکھتا ہوں، کہ یکایک کرۂ ارض کسی سیارے سے ٹکرایا، آسمان اُڑ گیا، زمین پاش پاش ہو گئی، مخلوق کی روحیں واویلا کرتی منڈلاتی پھرتی ہیں، اور میرا لاشہ تحت الثریٰ میں سما گیا ہے۔ ایک بجلی سی گری، گھبرا کر آنکھیں کھول

دیں، دوڑ کر برآمدے سے باہر کو جھانکا، دنیا گہری نیند میں غرق تھی، کمرے کی طرف رُخ پھیرا تو کلاک کی سوئی ایک سے چند منٹ آگے نظر آئی، کچھ دیر دہیں بے جان سا کھڑا رہا، پھر پیر گھسیٹتا ہوا بستر پر آگرا۔

کمرے میں کلاک کی ٹِک ٹِک یا میرے دل کی دھڑکن کے سوائے بالکل سکوت تھا، اس وقت کلاک کی ٹِک ٹِک کوئی زندہ سی چیز معلوم ہوئی، گویا چیخ چیخ کر آگاہ کر رہی ہے، کہ اے غافل انسان ہلاکت آفریں مستقبل سر پہ آپہنچا، ہوشیار! ہوشیار!! ہوشیار!!!

جب ذرا آنکھ بند کرتا، دل کی دھڑکن سے روح بے چین ہونے لگتی، اور میرا قیاس ہے، کہ اگر اس مجبور (دل) کے ہاتھ پاؤں ہوتے، تو ضرور مجھے اُٹھا کر نہ جانے کہاں پٹخ آتا، اب بچارہ سوائے اس کے کیا کر سکتا تھا، کہ زور زور سے سینہ میں ٹھو کے دے اور رہ جائے۔

کلاک کی ٹِک ٹِک مجھے بیدار کرتی رہی، دل کی دھڑکن نے ہزار فریاد کی لاکھ سر دُھنا، ان تحریکوں سے بار بار جی گھبرایا وحشت اُٹھی، روح پر ایک ہیجان طاری تھا، مگر میری سمجھ میں کیونکر آتا، عقل پر تو پردہ پڑا ہوا تھا، آخر انگاروں پر لوٹتے لوٹتے جھپکی لگ گئی۔

تن بدن کی سُدھ نہ تھی، کسی نامعلوم اضطراب کے اثر سے یکایک چونکا، کمرے میں کچھ عجیب وحشتناک بے رونقی تھی اور ہر چیز تہ وبالا ہوتی پائی گئی[1]، میں نے اُٹھ کر بھاگنا چاہا، مگر کیا ہوتا، وقت نکل چکا تھا، قدم نہ جما[2] معاً ایسی گرج کے ساتھ گویا بڑے بڑے پہاڑوں میں تصادم ہو گیا، سامنے کی دیوار مجھ پہ آرہی، اور فوراً ہی باقی دیواریں بھی باہر کے رُخ ڈھے پڑیں۔

جیسے ہزاروں مشین گنیں چل رہی ہوں، شش جہات میں ایک شورِ قیامت خیز بپا تھا، آندھی میں اُڑنے والے تنکے کی طرح زمین اُلٹ پُلٹ ہو رہی تھی، اور میں منوں ملبے کے نیچے دبا پڑا تھا[3]۔

(۵)

توبہ .... توبہ .... توبہ ہے، اُس عقوبت ناک وقت کا اندازہ لگائیے، جبکہ بسلامتیٔ ہوش وحواس ایک انسان سر سے پیر تک کچلا کچلایا، ہر طرف سے شکنجہ کی طرح جکڑا، موت کے لئے بے چین ہو، لیکن دم کے دھاگے ٹوٹیں، اور نہ چھٹکارے کی صورت نظر آئے۔

ایسی حالت میں کہ تڑپنا تو درکنار سانس لینا دشوار تھا، تنگ سوراخوں سے آنے والے گرد وغبار میں دَم گھٹتے گھٹتے ہو گئے، زندگی کے تصورات ماند پڑ چکے، والدۂ ماجدہ بالکل ساکت آسمان پر ٹکٹکی لگائے نظر آئیں، کچھ ڈھارس بندھی، اُسی وقت

---

[1] اس وقت خیال آیا، کہ بھئی یہ کیسا خواب ہے، جو ابھی تو دیکھا تھا، اور ابھی پھر دکھائی دینے لگا۔

[2] دو جھٹکے آچکے تھے، تیسرے جھٹکے پر میری آنکھ کھلی۔

[3] رات کے تین بجے تھے۔

میرے منہ کے قریب والی بلی کو جنبش ہوئی جس سے جبڑے ہل گئے، معلوم ہوا دانتوں نے جگہ چھوڑ دی۔ البتہ سانس لینے کی کچھ گنجائش ضرور نکل آئی، مدد کے لئے میں زور زور سے چیخا، اس بلی سے کوئی سولجر ٹکرا گیا تھا، اسی وقت کچھ کھٹ کھٹ ہونے لگی، چند منٹ میں آسمان جھلکا، اور دو تین سولجر دکھائی دیئے، انہوں نے مجھ زندہ درگور کو باہر نکالا، اب جو دیکھتا ہوں تو ؎

مکیں رہے نہ مکاں طرفہ کارخانہ ہوا

زمیں اُلٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا   میر انیس

اس وقت سولجر کی رسٹ واچ دن کے تین بجا رہی تھی، گویا بارہ گھنٹے قضا کا مہمان رہ کر میں اسی جگہ پلٹ آیا جو کل تک بہشت ارضی تھی اور آج حسرت و ارمان کا مدفن، جہاں لکھوکھا اجل رسیدوں کی طرح میری اُمیدیں خاک بسر ہو چکی تھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، وُہ جیتا جاگتا شہر جس کی سڑکوں پر کھوے سے کھوا چھلتا تھا، ہو کا میدان نظر آیا، ایک بڑے میاں میرے قریب کھڑے تھے، سولجر مجھے فوجی کیمپ میں لے جانے لگے، بڑے میاں بھی ساتھ ہو لئے، موقع پاکر انہوں نے میرے کان میں کہا۔

خبردار! وہاں مت جانا، بہت بُری حالت ہے، ہر لحہ زخمیوں میں اضافہ ہوتے جانے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحبان دیکھ بھال سے مجبور ہو رہے ہیں، جو لوگ وہاں مر جاتے ہیں، اُنہیں پہاڑی کے دامن میں پٹرول ڈال کر جلا دیا جاتا ہے۔

سولجروں کا شکریہ ادا کر کے میں نے کہا۔

مجھے یوں ہی چھوڑ دیجئے، میں اپنا بندوبست خود کر لوں گا، مگر وُہ نہ مانے، ایک مکان کے زینہ کا کچھ حصّہ باقی رہ گیا تھا، اس کے نیچے سے چند آدمی گزرنے لگے، اسی وقت زلزلے کے جھٹکے سے وہ زینہ اُن کے اُوپر آ رہا، گورے اُنہیں سنبھالنے کو دوڑے، ادھر میں بڑے میاں کے ساتھ فٹ بال گراونڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہاں کے مکان والوں کا بھی کچھ حال معلوم ہے؟

انہوں نے جواب دیا۔ اُس خاندان کی دو عورتیں اور ایک بچّہ زخموں سے چُور فوجی کیمپ کو لے جاتے دیکھے تھے، اگر زندہ ہیں تو وہیں ہوں گے۔

میں نے منّت کی۔ ذرا مجھے وہاں پہنچا دیجئے۔

وُہ ترس کھا کر بولے چلئے!

ایک نوک دار لکڑی میری پیٹھ میں گھنپ کر اندر اُتر گئی تھی، وہ جیوں کی تیوں رہی، اس کے علاوہ جوڑ جوڑ ٹوٹا ہُوا، لیکن دل کی مجبوری سے کیا سوجھتا، قوتِ ارادی کے زور سے قدم اُٹھایا، سخت جستجو پر ناکامی ہوئی، ہم دونوں سر پھر کر رات تک اُسی فٹ بال گراؤنڈ میں آ کھڑے ہوئے۔

؎ یہ معمولی جھٹکا تھا۔

اصغر کا روزنامچہ

۱۲؍جنوری ۱۹۳۹ء

آج کا دن اہم واقعات سے بالکل خالی ہے۔

۱۳؍جنوری

سو اب میں پھر آکسفورڈ آگیا ہوں۔ بہت پُر لطف ہے یہاں پھر آجانا اور پھر اُنہیں خوش آئند چہروں کو دیکھنا۔ میں اب روز بروز یہ سمجھ رہا ہوں کہ میں نے اتنا کام نہیں کیا جتنا مجھے چھٹیوں میں کرنا چاہیئے تھا۔

۱۴؍جنوری

کچھ سُستی اور کچھ عدیم الفرصتی کی وجہ سے آج میں اِس قابل نہیں کہ کسی بات پر رائے زنی کرسکوں

۱۵؍جنوری

وہی کل والی بات۔

۱۶؍جنوری

ایضاً۔ ایضاً

۱۷؍جنوری

مجھے یہ روزنامچہ لکھنے کا کام شروع ہی نہ کرنا چاہیئے تھا۔

۱۸؍جنوری

میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے یہ فضول کام چھوڑ دینا چاہیئے۔

۱۹؍جنوری

میرا اب بھی اس کی نسبت یہی خیال ہے۔

۲۰؍جنوری

وہی حال ہے

۲۱؍جنوری

میں نے بالکل کام نہیں کیا۔ میں بیزار ہوں۔

۲۲ر جنوری

میں اب بھی بیزار ہوں۔

۲۳ر جنوری

بہت زیادہ جیسے اوڈ ٹینس اور سکواش کے کھیل۔ میں کام کب کرنے لگوں گا؟

۲۴ر جنوری

مجھے معلوم نہیں

۲۵ر جنوری

مجھے اب بھی معلوم نہیں

۲۶ر جنوری

بھلا اس سب کچھ کا فائدہ کیا ہے؟

۲۷ر جنوری

مجھ سے بہتر آدمیوں کو بھی اس کا کچھ جواب نہیں ملا کم از کم کوئی مناسب جواب۔ خیر کچھ بھی ہو۔ کسے پروا ہے؟

۲۸ر جنوری

مجھے تو نہیں

۲۹ر جنوری

مجھے اب بھی نہیں

۳۰ر جنوری

بہتر ہے کہ میں کچھ توجہ کروں۔ کیا کہتے ہو؟

۳۱ر جنوری

کیوں؟

یکم فروری ۱۹۳۹ء

میں نہیں جانتا

۲ر فروری

تو پھر فکر کاہے کی؟

سب سے پہلے یہ سوال پیش آتا ہے کہ شعر کو ہم اُس کے مضمون کی وجہ سے اچھا کہتے ہیں۔ یا طرزِ بیان کی وجہ سے۔ اور شعر کی ترکیب میں ان دونوں کی اہمیت اور باہمی تعلق کیا ہے؟ شاعری کے عمل پر نظر ڈالنے سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ شاعر پہلے کچھ کہنا چاہتا ہے اور اس کے بعد اُسے الفاظ کی جستجو ہوتی ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وُہ پہلے الفاظ ذہن میں رکھ لے اور پھر ان میں مضمون ڈالنے کی کوشش کرے۔ اس لئے کہ جذبات اور خیالات الفاظ کے بغیر بھی ذہن میں آ سکتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات انکا الفاظ میں سمانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن الفاظ اپنے معانی کے بغیر ذہن میں نہیں آ سکتے یہ تو ہو سکتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں پہلے سے کوئی جذبہ یا خیال موجود ہو اور بعد میں وُہ اُسے الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اُس کے ذہن میں الفاظ موجود ہوں لیکن مضمون کا پتہ نہ چلے۔ اگر الفاظ ذہن میں آ جائیں تو مضمون لازماً ذہن میں آ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ الفاظ اور مضمون بیک وقت ذہن میں آ جائیں۔ لیکن یہ بھی زیادہ قرینِ قیاس نہیں مضمون بہت سے الفاظ سے مل کر بنتا ہے اور شعر میں ان الفاظ کی کوئی ترتیب بھی ہونا چاہیے۔ کیسے ممکن ہے کہ بہت سے باترتیب الفاظ یک دم دماغ میں آ جائیں۔ اور مضمون پیدا ہو جائے۔

عموماً ہوتا یہی ہے کہ مضمون یعنی کوئی تجربہ یا خیال پہلے سے موجود ہوتا ہے اور اس کے بیان کی باری بعد میں آتی ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ مضمون کو فنّی اعتبار سے طرزِ بیان پر فوقیت حاصل ہے۔ البتہ یہ معلوم ہو گیا کہ شاعری کے نفسیاتی عمل میں مضمون پہلا قدم ہے اور طرزِ بیان دوسرا یا دوسرے الفاظ میں طرزِ بیان محض مضمون کے اظہار کا آلہ ہے۔

اب یہ بھی طے کر لیا جائے کہ فنّی اعتبار سے فوقیت کے کیا معنی ہیں۔ جب ہم کوئی اچھا شعر یا اچھی نظم پڑھتے ہیں یا سنتے ہیں تو ہمیں ایک قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اگر فلسفہ کا کوئی معقول نظریہ ہماری نظر سے گزرے۔ یا ہم ریاضی کا کوئی مشکل سوال حل کریں تو بھی ہمیں ایک مختلف قسم کی فرحت میسّر آتی ہے۔ ان دونوں فرحتوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ فلسفہ کے نظریئے یا ریاضی کے سوالات ہمیں خالص دماغی فرحت بہم پہنچاتے ہیں لیکن شاعرانہ فرحت پر جذباتی رنگ ہوتا ہے۔ آپ پوچھیں گے یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ شاعر اپنے اشعار کے ذریعے کوئی جذباتی تجربہ آپ تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وُہ کچھ دیکھتا ہے، کچھ سنتا ہے یا کچھ محسوس کرتا ہے۔ اُس کے دل پر ایک جذباتی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وُہ چاہتا ہے کہ اُس کے پڑھنے والے بھی اِس کیفیت میں شریک ہوں۔ اُسے خواہش ہوتی ہے کہ آپ نہ صرف اُس کے تجربہ کو سمجھیں بلکہ اُس سے متاثر بھی ہوں اور اُس کے تجربہ کا جذباتی عنصر آپ تک اُسی شدت اور گہرائی سمیت پہنچے جس سے شاعر کا اپنا دل متاثر ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اگر شعر کامیاب ہے تو اُس کے مجموعی تاثر میں یہ جذباتی عنصر بھی شامل ہو گا۔ اب آپ یہ کہیں گے کہ شاعر کے تجربات کا جذباتی ہونا کیوں ضروری ہے شاعر فلسفیانہ مسائل کیوں نہ بیان کرے یا ریاضی کے عمل کیوں نہ سمجھائے؟ اس کا جواب یہی ہے۔ کہ اگر شعر سے ہمیں وُہ مخصوص فرحت حاصل نہ ہو جو ہم شعر سے متعلق کرتے ہیں تو شعر گفتن چہ ضرور؟ شاعری کوئی حکمِ الٰہی تو ہے نہیں کہ ہر بات شعر ہی میں کی جائے۔ اگر آپ محض کوئی ذہنی عقیدہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ یا کسی کو محض عقلاً قائل کرنا چاہتے ہیں تو نثر میں کر لیجیے۔ شاعری کے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ اِس سے میری یہ مُراد نہیں کہ شاعری میں فلسفیانہ مسائل کا ذکر ہی نہ ہونا چاہیے شاعری میں ہر مضمون سما سکتا ہے بشرطیکہ شاعر کے ذہن میں

اُردو زبان میں بہترین

قانونی کتابیں

ملنے کا پتہ:-

مطبع راست گفتار جنرل لاء بکس ایجنسی - ہال بازار - امرت سر

قائم شدہ ۱۸۸۹ء — فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

۱۹۴۱ء کی ہنگامہ خیز تصنیف

ایک عیاش والیٔ ریاست کی پرائیویٹ زندگی کے لرزہ خیز واقعات اِس سال کی تازہ ترین تصنیف مؤرخ کے افسانے میں پڑھیے بیان لیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ صاف اور لرزہ خیز واقعات آج تک دنیا کی کسی زبان میں شائع نہیں ہوئے ہیں جناب سید محمود صاحب مؤرخ بی اے کے ایک درجن بہترین مختصر افسانے اس کتاب میں پڑھیے کتابت و طباعت عمدہ ضخامت ۱۲۸ صفحے قیمت فی کاپی ایک روپیہ۔

زہریلی مکھی:- جناب سید محمود صاحب مؤرخ بی اے کے گراں بہا مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ اس کا ہر افسانہ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اس کا مقدمہ دہلی کے مشہور ادیب جناب خواجہ محمد شفیع صاحب بی اے نے لکھا ہے اس کا ٹائٹیل دو رنگی اور جاذب توجہ ہے۔ کتابت طباعت بہترین ضخامت ۱۴۲ صفحے قیمت صرف عمر علاوہ محصول

شہر خموشاں اُردو کی سب سے زیادہ لرزہ خیز اور حیرت انگیز کتاب۔ اس میں جناب سید محمود صاحب مؤرخ بی اے کے سات سائنٹیفک افسانے ہیں یہ کتاب ایک اچھوتی چیز ہے۔ اس کا مقدمہ جناب شاہد احمد صاحب بی اے مدیر مجلہ ساقی دہلی نے لکھا ہے قیمت صرف ایک روپیہ علاوہ محصول

(نوٹ) خریداران مجلہ "ہمایوں" رسالہ کا حوالہ دے کر تینوں کتابیں صرف دو روپے میں منگوا سکتے ہیں۔ مگر محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔

پتہ:- منیجر گلفروش پبلشنگ ہاؤس لال کنواں بازار دہلی۔

دنیائے طب کی لاثانی دوا

طبی بورڈ یونان کیمیکل ورکس کی گراں قدر کوشش کا نتیجہ

سینڈوجن: تھکے ہوئے انسان کی بجھی ہوئی زندگی میں خوشگوار انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ سر سے پیر تک انسانی جسم کے تمام اعضاء کی نشو ونما کرتی ہے کمزوری خواہ کسی وجہ سے ہو دور کرتی ہے۔

معدہ۔ انتیں اور جگر کے فعل خاص کو باقاعدہ کرتی ہے۔

غذا کو جزو بدن بناتی ہے نظام اعصاب کی خرابی کو دور کر کے دل و دماغ کی طاقتوں کو بحال کرتی ہے۔ آلات ہضم کی اصلاح۔ تازہ اور صاف خون کی پیدائش اور جسم کا وزن بڑھانا اس کا خاص فعل ہے۔

ہر عمر میں ہر شخص کو ہر موسم میں مفید ہے غرض سینڈوجن کے عجیب و غریب فوائد ہیں جو ہر قسم کے مریضوں پر ظاہر ہوئے۔

پروفیسر جج۔ وکیل۔ بیرسٹر۔ طالب علم اور دفتروں کے کلرک حضرات دن و دماغی محنت کی وجہ سے طرح طرح کی شکایتوں مثلاً ہضم کی خرابی، دل، دماغ اور اعصاب کی کمزوری میں مبتلا تھے وہ سینڈوجن سے دور ہو گئیں۔ قیمت فی شیشی تین روپے۔

ملنے کا پتہ:- یونان کیمیکل ورکس دریا گنج دہلی۔

سید عبداللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ "ہمایوں" ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

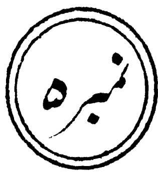
اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

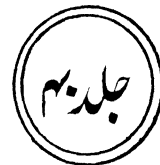
اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے



فہرستِ مضامین



"ہمایوں" بابت ماہِ نومبر ۱۹۴۱ء

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول)   قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

جہاں نما

نوّاب زادہ لیاقت علی خاں

مسلم لیگ کے سکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں بہت خاموش کام کرنے والوں میں سے ہیں۔ باوجود ذاتی پروپیگنڈے کا کافی موقع میسر ہونے کے انہوں نے کبھی اِس طرف مطلق توجہ نہیں کی۔ انہیں محض اپنے کام سے کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام مسلمان اُن کے حالات سے بہت کم باخبر ہیں۔ حال ہی میں کلکتے کے اخبار "سٹار آف انڈیا" نے مسلمان رہنماؤں کے حالاتِ زندگی کے ایک سلسلے کی اشاعت شروع کی ہے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے متعلق ذیل کی معلومات اُسی سلسلے کے ایک مضمون سے اخذ کی گئی ہیں:-

جو تعلق مسٹر بریڈن بریکن کو مسٹر چرچل سے ہے (اگرچہ اب وُہ برطانی وزیرِاعظم کے سکرٹری نہیں بلکہ وزیرِ اطلاعات کے عہدے پر فائز ہو چکے ہیں) یا جو تعلق مسٹر سٹیو نز ارلی کو پریزیڈنٹ رُوزولٹ سے ہے وہی تعلق نواب زادہ لیاقت علی خاں کو مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ سے ہے۔

بریکن اور ارلی کی طرح لیاقت علی خاں بھی عملی آدمی ہیں۔ اُن کی معاملہ فہم طبیعت بہت جلد بات کی تہ تک پہنچ جاتی ہے اور کام کی کوئی تفصیل اُن کی دقیقہ رس نظر سے چھپی نہیں رہتی، نہ کوئی فروگزاشت اُن کی نظر سے بچ سکتی ہے۔

مسٹر جناح نواب زادہ لیاقت علی خاں کے بہت گرویدہ ہیں اور اُن کی شخصیت فی الواقع ہے بھی بہت پسندیدہ۔ مسلم لیگ کے صبر آزما کام میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کی شرکت قائدِ اعظم کے لئے بڑی مدد کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ نواب زادہ صاحب نہ صرف صاحبِ حیثیت، محنت پسند اور کام سے نہ تھکنے والے آدمی ہیں بلکہ اِن سب صفات سے بڑھ کر اُن میں اخلاص کی صفت بھی ہے اور وُہ مسلم لیگ کے کام کو اور نتیجۃً اسلامی ہند کے ہر کام کو یکساں عزیز رکھنے کے ساتھ قابلِ تقلید وفاداری اور اشتیاق سے اپنے سردار کے کام کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش میں بھی لگے رہتے ہیں۔

ایک اتنی بڑی اور ملک بھر میں شاخ در شاخ پھیلی ہوئی جماعت کی معتمدی کا کام آسان نہیں۔ ایسا کام جتنا گراں بار ہوتا ہے اتنا ہی نازک بھی ہوتا ہے کیونکہ سکرٹری کو بعض ایسے معاملات میں نمایاں حصہ لینا پڑتا ہے جو دوسروں کے لئے ہمیشہ خوشگوار ہی نہیں ہوتے۔ ایسے معاملات کو کامیابی سے سنبھالنے کے لئے بہت ہوشیاری اور بیدار مغزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلاشبہ نواب زادہ لیاقت علی خاں گوناگوں صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اُن کی نظر کی طرح اُن کی ہمدردی کا دائرہ بھی وسیع ہے۔ وُہ اپنے موجودہ کام کے لئے جو چند سال سے اُنہوں نے اپنے ذمّے لے رکھا ہے بہت موزون ہیں اور اس سے عہدہ برا ہونے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں۔ اُن میں دوست بنانے کی غیر محدود صلاحیت ہے۔ جو شخص اُن سے ملتا ہے اُن

کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ کسی شخص کو اُن سے کسی قسم کی شکایت نہیں ہوتی۔

بہت سے بڑے آدمی اپنی کامیابی کے تذکرے میں ازراہِ شکرگزاری اپنی بیویوں کی مدد کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً مہاتما گاندھی شریمتی کستورابائی کی رفاقت کو اپنی کامیابی کا حصہ دار جانتے ہیں اور پنڈت جواہر لعل نہرو اپنی سوانحعمری میں جگہ جگہ مسز کملا نہرو کی وفادارانہ رفاقت کا ذکر کرتے ہیں۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے بارے میں بھی بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی عظمت میں اُن کی لائق رفیقۂ حیات کا بہت کچھ حصہ ہے۔ بیگم لیاقت علی خاں بہت ذہین اور شائستہ خاتون ہیں۔ وُہ نسوانی معاشرتی تحریکوں میں ہمیشہ عملی حصہ لیتی رہی ہیں۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں صوبجاتِ متحدہ کے ایک امیر گھرانے کے چشم و چراغ اور آکسفرڈ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ وُہ بہت مساعد حالات کے اندر سیاسیات کے میدان میں داخل ہوئے۔ جلد ہی صوبجاتِ متحدہ کی سیاسیات میں اُنہوں نے نام پیدا کر لیا اور مانٹیگو چیمسفرڈ اصلاحات کے ماتحت وُہ اپنے صوبے کی مجلسِ وضعِ قوانین کے رکن ہی نہیں بلکہ اُس کے ڈپٹی پریزیڈنٹ بھی بن گئے۔ اس دوغلے نظامِ حکومت کے خاتمے پر کچھ عرصہ لیاقت علی خاں خاموش رہے۔ اس زمانے میں اُن کے پیشِ نظر کوئی خاص کام نہ تھا۔ اِسی اثناء میں وُہ مسٹر جناح کے زیرِ اثر آئے اور اپنی خدمات انہیں پیش کر دیں۔ اب وُہ قائدِ اعظم کے نہایت معتمد مددگار ہیں۔ جن دو بڑے مکانوں کی چھتوں کے نیچے مسلم لیگ بعض بہت اہم فیصلے کر چکی ہے، اُن میں سے ایک بمبئی میں مسٹر محمد علی جناح کا مسکن ہے اور دوسرا دہلی میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کا۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے خوبصورت بنگلہ "گلِ رعنا" ہی میں جو ہمایوں کے تاریخی قلعے کے روبرو واقع ہے لیگ نے وائسرائے کی کونسل کی توسیع کے متعلق اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کیا تھا۔

"سٹار آف انڈیا" کے نامہ نگار نے آخر میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کو اور زیادہ عملی آدمی بننے کی تلقین کی ہے۔ اُس کا مطلب یہ ہے کہ نواب زادہ صاحب عوام سے زیادہ تعلق پیدا کریں۔ اب تک وُہ صرف اپنے منصبِ بلند کی وجہ سے عوام میں روشناس ہیں۔ انہیں مسلمانوں کے عام مذہبی و سیاسی اداروں سے مزید دلچسپی پیدا کر کے پوری طرح عام مسلمانوں کا آدمی بن جانا چاہئے۔ نسبتہً کم عمر ہونے کی وجہ سے انہیں یہ موقع حاصل ہے کہ وُہ اُن باتوں میں بھی کامیاب ہو سکیں جن میں مسٹر جناح کامیاب نہیں ہو سکتے۔

بعض مشہور ہندوستانی

ڈاکٹر امبیدکار

ڈاکٹر امبیڈکر ڈاکٹر امبیدکار ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ وُہ پی ایچ ڈی۔ ڈی۔ ایس سی اور بیرسٹرایٹ لا ہیں۔ اُن کا تعلق اُس

طبقے سے ہے جسے اُن کے ہم قوم اپنے ایک آدمیت سوز نقطۂ نظر کے مطابق "اچھوت" کہتے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے مہاراجہ بڑودہ کے وظیفے سے کولمبیا یونیورسٹی میں معاشیات اور عُمرانیات کی تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وُہ علمی تحقیق کے لئے ایک سال لنڈن میں بھی رہے اور "انڈیا آفس" کے کتب خانے سے مستفید ہوتے رہے۔ وُہ ۱۹۱۷ء میں ہندوستان واپس آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مالیات اور ذات پات کے متعلق متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ انہوں نے اچھوتوں کی ترقی کے لئے بھی ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے اور ہندوستان کے اچھوتوں کے مسئلہ رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بمبئی کی مجلس وضع قوانین کے نامزد کردہ رکن ہیں ۳۲-۱۹۳۰ء میں "گول میز کانفرنس" اور "جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی" کے رکن مقرر ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ہم قوموں کو کئی دفعہ یہ دھمکی دی کہ چونکہ تم ہم کو اچھوت سمجھتے ہو اس لئے میں اپنے تمام پیروؤں کو ساتھ لے کر اپنا مذہب بدل لوں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھمکی محض سنسنی پیدا کرنے کے لئے دی جاتی تھی کیونکہ وُہ اب تک اپنے مذہب پر قائم ہیں اور اُن کے ہم قوم انہیں برابر اچھوت کہتے ہیں۔ حال میں انہوں نے پاکستان کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے مسلمانوں کو بہت وحشی اور درندہ صفت ظاہر کیا ہے اور ہندوؤں کو رائے دی ہے کہ بہتر ہے انہیں پاکستان دے کر الگ ہی کر دیا جائے۔ یہ اس قابل نہیں کہ انہیں اپنی قوم میں شامل رکھا جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام ۱۸۸۸ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کا بچپن عرب میں گزرا۔ اُن کی دینی تعلیم قاہرہ کی جامعۂ ازہر میں ہوئی۔ اُن کے والد ماجد دہلی کے رہنے والے تھے مصر سے واپس آنے کے کچھ سال بعد انہوں نے بہت نوعمری میں امرتسر کے "وکیل" کی ادارت کے فرائض اپنے ذمے لئے۔ اس دوران میں وہ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے رہے۔ ۱۹۱۱ء کے قریب انہوں نے خود کلکتہ سے اپنا مشہور ہفتہ وار اخبار "الہلال" جاری کیا۔ اُردو میں اُن کا عربی آمیز اندازِ تحریر مسلمانوں میں بہت مقبول ہُوا۔ اُن کے مذہبی و سیاسی مضامین اُن کی بصیرت کے گواہ ہیں۔ "الہلال" کا نام اب تک بہت عزت سے لیا جاتا ہے۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے آغاز کے وقت اسلامی ممالک کے متعلق اُن کے مضامین اُن کی نظر بندی کا سبب بنے۔ آزادی کے بعد اُنہوں نے جناب گاندھی صاحب کے زیرِ قیادت تحریکِ خلافت میں بہت کچھ حصہ لیا۔ وہ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۳۰ء میں کانگرس کے صدر رہے اور اب پھر صدر کانگرس کی حیثیت سے ستیہ گرہ کر کے قید ہو چکے ہیں۔ مولویوں میں اُن کے سے صحیح الدماغ آدمی کا وجود الشاذ کالمعدوم ہے۔ افسوس ہے کہ اُن کی مستقل مزاجی نے انہیں موجودہ اسلامی سیاسیات سے بالکل الگ کر رکھا ہے اور ہندوؤں کی کانگرس سے وہ اُس زمانے سے وابستہ ہیں جب وُہ خالص ہندو جماعت نہیں رہی تھی اُنہیں اپنا رہنما نہیں سمجھتے۔ اسی لئے اُن سے یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ وُہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا کوئی سمجھوتا کرانے میں کامیاب ہوسکیں گے حالانکہ ایسے سمجھوتے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ سمجھوتا اُسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ یا تو ہندو مسلمانوں کے غلام بننے پر آمادہ ہوسکیں یا مسلمان ہندوؤں کے غلام بن جائیں اور یا دونوں قومیں اپنے اپنے تہذیبی و تمدنی

مراکز میں اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کر کے دفاعی و تجارتی ضروریات کے لئے آپس میں کسی قسم کا اتحاد کر لیں۔ اگر مولانا ان صورتوں میں سے کسی ایک کو قابلِ عمل بنا سکیں تو اُن کی صدارتِ کانگرس مفید ہو سکتی ہے ورنہ بیکار ہے کیونکہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں سے کوئی ایک قوم اپنی الگ تھلگ کوششوں سے غلامی کی زنجیریں توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

سر اکبر حیدری

محمد اکبر نذر علی حیدری المخاطب بہ نواب حیدر نواز جنگ و سر اکبر حیدری ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ بمبئی کے ایک مشن کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۸۸۸ء میں ہندوستان کے فائینلس ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے اور اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل (صوبجاتِ متحدہ) ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل (بمبئی و مدراس) ایگزیمنر گورنمنٹ پریس اکاؤنٹس، کنٹرولر آف ٹریژریز انڈیا، فائنشل سکرٹری و سکرٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا اور اکاؤنٹنٹ جنرل ریاست حیدر آباد (۱۹۰۵ء) اکاؤنٹنٹ جنرل بمبئی (۱۹۲۰ء) فائنس وریلوے ممبر حیدر آباد دکن (۱۹۲۱ء) کے فرائض بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۷ء میں وہ "آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کے صدر مقرر ہوئے۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کا خیال پیدا کر کے اسے جامۂ عمل پہنانے کا سامان کیا۔ یہ پہلی یونیورسٹی ہے جس کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ اُنھوں نے حیدر آباد میں محکمۂ آثارِ قدیمہ قائم کیا۔ تین دفعہ گول میز کانفرنس میں حیدر آباد کے نمائندوں کی قیادت کی۔ جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ وُہ بہت سی کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں ۱۹۳۷ء میں سر کشن پرشاد کے بعد وُہ حیدر آباد کے وزیرِ اعظم یعنی صدرِ بابِ حکومت کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔

حال ہی میں سر اکبر کو وائسرائے نے اپنی ایگزیکٹو کونسل میں لے لیا ہے اور وُہ حیدر آباد کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ اعلیٰ حضرت خسروِ دکن و برار نے اپنے ایک فرمان کے ذریعہ سے اُن کے لئے تین ہزار روپے (برطانی سکہ) ماہوار پنشن مقرر کی ہے اس کے علاوہ چونکہ صدارتِ بابِ حکومت کے دوران میں سر اکبر نے اپنے حقِ رخصت سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا تھا اُن کے لئے پوری تنخواہ کے ساتھ سات مہینے کی رخصت بھی منظور ہوئی ہے۔ یہ پوری رقم پچاس ہزار روپے (برطانی سکہ) بہ طورِ حق الخدمت اُنہیں یکمشت ادا کر دی جائے گی۔ سر اکبر کے پانچوں پوتوں میں سے ہر ایک کا سو روپے عثمانی سکہ ماہوار منصب مقرر کیا گیا ہے۔ سوماجی گوڑہ میں سر اکبر کی موجودہ اقامت گاہ "دلکشا" جو ایک سرکاری عمارت ہے تاحینِ حیات سر اکبر کو دے دی گئی ہے تاکہ جتنی مرتبہ وُہ حیدر آباد جائیں اس عمارت میں قیام کر سکیں۔

بابو سبھاش چندر بوس

سبھاش چندر بوس ۲۳ جنوری ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئے۔ ریونشا کالج کٹک سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۴-۱۹۱۳ء میں

کے دوران میں جب زولا انگلستان بھاگ گیا تو اُسے زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے نہایت کڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈنمارک کا مشہور شاعر ہرمن بینگ ۱۹۱۲ء میں امریکہ میں مرا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی موت نہایت تکلیف دہ ہوئی کیونکہ وُہ اپنی معمولی ضروریات کو بھی سمجھانے کے ناقابل تھا۔

آج زبان کی واقفیت صرف بیوپاریوں۔ سائینسدانوں اور سیاحوں وغیرہ کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ ریڈیو کی ترقی کی وجہ سے ہر ایک انسان کے لئے لازمی ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں ہم لوگ انگریزی زبان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں گویا ہمارے لئے غیر انگریزی دنیا کا وجود تک نہیں۔ ہم دنیا کو انگریزی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر ہماری سیاسی آزادی کے ساتھ ہمارے سیاسی۔ تمدّنی تعلیمی اور اقتصادی تعلقات کے دائرہ کا وسیع ہونا لازمی ہے ہم جلد محسوس کرنے لگیں گے کہ انگریزی زبان ہماری تمام ضروریات کو پورا کرنے کے ناقابل ہے۔ کوئی قومی زبان دُنیا کی متحدہ زبان نہیں ہو سکتی پچھلی لڑائی کے بعد جب جمعیتہ الاقوام کی بنیاد پڑی تو زبان کا مسئلہ نہایت پیچیدہ تھا۔ دُنیا میں ڈیڑھ ہزار کے قریب بانیں بولی جاتی ہیں صرف یورپ میں ایک سو بیس کے قریب زبانیں مُروّج تھیں۔ فرانسیسی زبان کا سب سے زیادہ زور تھا۔ انگریزی بھی نہایت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ انگریزوں اور فرانسیسوں نے مل کر امریکہ کی مدد سے لڑائی جیتی تھی نتیجہ یہ ہُوا کہ ہر دو زبانیں جمعیتہ الاقوام کی زبانیں قرار دی گئیں۔ اس سے دونوں کا اختیار و اقتدار تو بڑھ گیا۔ مگر باقی قومیں کچھ منحرف سی رہیں۔ ہر معاملے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کو نامناسب فائدہ رہتا تھا۔ ایسے بھی اگر ایک جاپانی نمائندے کی انگریزی تقریر کا ایک اطالوی نمائندے کے لئے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ تو اس تقریر کا کیا رہ جاتا ہے۔ لیگ کو تیس کے قریب مترجم متعین کرنے پڑے جن کی صرف تنخواہوں پر اُنیس ہزار آٹھ سو پونڈ سالانہ خرچ آتے تھے۔ ان کے علاوہ درجنوں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ لکھنے والے مقرر تھے۔ جمعیتہ الاقوام کا مقصد اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک ایک ایسی زبان دنیا میں رائج نہ ہو جو کسی ملک سے تعلق نہ رکھتی ہو۔ جو آسان ہو اور جو دقیق سے دقیق مسئلے پر بحث کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

ایسی زبان کی ضرورت اُسی وقت محسوس ہونے لگی تھی جب تحریکِ احیائے علوم (Renaissance) کے بعد لاطینی زبان کا انحطاط ہُوا۔ قومی زبانوں نے زور پکڑا اور پچاس ہی سال کے عرصے میں یورپ کا ادب فلسفہ ملکی و لسانی حدود کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ لسانی اختلاف کے مسئلے کا حل سب سے پہلے فرانس کے مشہور فلاسفر، موجودہ فلاسفی کے بانی ڈیکارٹ نے ۱۶۲۹ء میں پیش کیا اور اس وقت سے لیکر آج تک اس میدان میں ہزاروں کوششیں ہو چکی ہیں۔ کوئی تین سو کے قریب مثالیں ابھی تک موجود ہیں مگر یہاں مجھے ان میں سب سے کامیاب اور مقبولِ عام کا ذکر کرنا ہے جو ڈاکٹر لوئی لیزارس زمین ہاف (Dr. Louis Lazarus Zamenhof) کی سعی جمیلہ کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر موصوف ایک روسی خاندان میں پولینڈ کے بیلوسٹاک نامی شہر میں ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ وارسا میں پڑھا کرتے تھے۔ وارسا میں چار قومیں روسی۔ پول۔ یہودی اور جرمن آباد تھیں جن کی زبانیں مختلف تھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں ابھی طالب علم ہی تھا جب مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہاں انسان نہیں رہتے۔ قومیں رہتی ہیں جن کا آپس میں کچھ تعلق نہیں۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں وُہ مختلف قسم کی تجاویز سوچنے لگے۔ اور آخر کار ۱۸۸۷ء میں اُنہوں نے ایک نئی زبان نکالی جس کے موجد کا فرضی نام ڈاکٹر ایسپرانتو (ڈاکٹر باامید) رکھ

کر اُسے شائع کر دیا۔ اِس سے اس زبان کا نام ہی ایس پیرانتو پڑ گیا۔ زبان نہایت سادہ اور میٹھی تھی۔ یورپ کی مختلف زبانوں پر مبنی تھی۔ جلد ہی زور پکڑ گئی۔ اُسی سال جرمنی کے نیورم برگ شہر سے "الایس پرانتستو" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا گیا۔ ۱۸۹۸ء میں فرانس میں اور ۱۹۰۲ء میں انگلستان میں ایس پیرانتو انجمنیں قائم ہو گئیں۔ ۱۹۰۵ء میں ایک عظیم الشان بین الاقوامی ایس پیرانتو کانفرنس فرانس کے شہر بولن میں منعقد ہوئی جس میں فرانسیسی گورنمنٹ کی طرف سے ڈاکٹر زیمن ہاف کو اعزازی خطابات عطا کئے گئے۔ کانفرنس نہایت کامیاب تھی۔ مختلف اقوام کے نمائندے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار نئی زبان کے ذریعے ہر قسم کے پیچیدہ مسائل پر بحث کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مولیر کا مشہور ڈراما (La Mariage Force) ایس پیرانتو میں اسٹیج کیا گیا جس میں چھ قوموں کے شوقیہ ایکٹروں نے کام کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دُنیا کے لسانی اختلافات کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اِس کے بعد ہر سال دنیا کے مختلف ممالک میں کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

پہلی۔ ۱۹۰۵ء ۔ بولن ۔ فرانس

دوسری۔ ۱۹۰۶ء ۔ جینوا ۔ سوئٹزرلینڈ

تیسری۔ ۱۹۰۷ء ۔ کیمبرج ۔ انگلستان

چوتھی ۔ ۱۹۰۸ء ۔ ڈریسڈن ۔ جرمنی

پانچویں۔ ۱۹۰۹ء ۔ بارسیلونا ۔ ہسپانیہ

چھٹی ۔ ۱۹۱۰ء ۔ واشنگٹن ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ

ساتویں۔ ۱۹۱۱ء ۔ انٹورپ ۔ بلجیم

آٹھویں۔ ۱۹۱۲ء ۔ کراکو ۔ پولینڈ

نویں۔ ۱۹۱۳ء ۔ جنوا ۔ اٹلی

۱۹۱۴ء کی کانفرنس پیرس میں منعقد ہونا قرار پائی۔ تحریکِ ایس پیرانتو کمال تک پہنچ چکی تھی۔ ایک سو سے زیادہ رسائل مختلف ملکوں میں جاری تھے۔ نئی زبان کے جاننے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں نمائندے شریک ہونے والے تھے۔ کئی ایک پہنچ بھی چکے تھے۔ ڈاکٹر زیمن ہاف راستے میں تھے اور اُن کے لئے شاہانہ استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ لڑائی چھڑ گئی اور تمام نمائندے اپنے اپنے ملکوں کو بھاگ گئے۔

دورانِ جنگ میں مردم کشی کے علاوہ دنیا کی تمام تحریکیں بند رہیں۔ ایس پیرانتو کے رسالوں کی تعداد سو سے بیس تک آپہنچی۔ کانفرنسوں کا تانتا ٹوٹ گیا۔ ۱۴ اپریل ۱۹۱۷ء کو ڈاکٹر زیمن ہاف کا بھی انتقال ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بین الاقوامی زبان کی ایک اور کوشش رائگاں گئی مگر جنگ کے بعد تحریک نے پھر سر اُٹھایا۔ رسالے تقریباً تمام پھر جاری ہو گئے کانفرنسیں بھی ہونے لگیں۔

۱۹۲۲ء میں جو کانفرنس پراگ میں منعقد ہوئی اس میں دو ہزار تین سو کے قریب ڈیلیگیٹ دور دراز ملکوں سے شریک ہوئے۔ انجمنیں پھر قائم ہو گئیں۔ ۱۹۲۹ء میں صرف یورپ کے پندرہ ملکوں میں ۶۲ مقاموں سے ایس پیرانتو میں براڈ کاسٹ ہونے لگا۔ ریڈ کراس سوسائٹی اور روٹری سرکل کی مرکزی انجمنوں نے اس کی حمایت کی۔ لارڈ بیڈن پاول نے سکاؤٹ اور گائیڈ انجمنوں سے سفارش کی کہ وُہ بین الاقوامی ضرورت کے لئے نئی زبان کا استعمال کیا کریں۔ انگلستان میں پچاس سے اوپر تجارتی انجمنوں نے اس کے حق میں تجاویز پاس کیں۔ فرانس کی ۱۱۲ انجمنوں کے صدر نے اس کی پُرزور سفارش کی۔ آج کل (یعنی موجودہ جنگ کے شروع ہونے سے پہلے) اس کا استعمال غیر ممالک کی تجارتی کمپنیوں میں بڑھ رہا ہے۔ بیس کے قریب شارٹ ہینڈ کے طریقے نکل چکے ہیں۔ انگلستان، جرمنی، فرانس، سوئٹزرلینڈ، پولینڈ، روس، ریاستہائے متحدہ امریکہ جاپان وغیرہ میں سکولوں میں پڑھائی جاتی ہے اور باقاعدہ ڈپلومے وغیرہ بھی دیئے جاتے ہیں۔

ایس پیرانتو کے حق میں سب سے زیادہ زبردست دلیل یہ ہے کہ اس نے عملی معاملات کے میدان میں کئی مشکلات کا حل کر دیا ہے۔ جن بین الاقوامی جلسوں میں ایس پیرانتو کا استعمال نہیں کیا جاتا اُن کا نقشہ ہی عجیب ہوتا ہے۔ کوئی دوسرے کی بات کو نہیں سمجھتا۔ جب جرمن زبان میں تقریر ہوتی ہے تو غیر جرمن نمائندے سو جاتے ہیں۔ جب اطالوی زبان بولی جاتی ہے تو غیر اطالوی ڈیلیگیٹ اونگھنے لگتے ہیں۔ ایسے ہی ایک جلسے کا حال یوں بیان کیا جاتا ہے "اٹلی کا ایک نمائندہ فرانسیسی زبان میں ایک دستاویز پڑھ رہا تھا، مگر طرزِ ادا عجیب تھی۔ فرانسیسی نمائندے بھی اُسے نہ سمجھ سکے"۔ ایک اور جلسے کی بابت ایک انگریز نمائندے کا بیان ہے "ہر ایک آدمی انگریزی بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند کو کامیابی ہوئی۔ میں کئی جاپانیوں جرمنوں اور روسیوں کی انگریزی نہ سمجھ سکا"۔ بیسیوں شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ لسانی اختلاف کی وجہ سے تمام بین الاقوامی علمی، ادبی، اقتصادی، سیاسی، تمدنی، تاریخی، تحقیقی، منطقی یا مذہبی کانفرنسیں مضحکہ خیز ہو جاتی ہیں۔ اِن کے برعکس کسی ایک ایس پیرانتو کانفرنس کا حال پڑھئے تو حیرت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کلارک صاحب لکھتے ہیں "میرے دل میں ولولے اُٹھتے تھے جب میں دیکھتا تھا کہ ہال کے ہر ایک کونے سے مختلف ممالک کے نمائندے اُٹھتے تھے اور دقیق سے دقیق مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ ہر روز مباحثے، تقریریں، سائنس کے مختلف صیغوں کے جلسے ہوتے تھے زبان فہمی میں رتی بھر تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لسانی مشکلات کا خاتمہ ہو گیا ہے"۔ ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ میں ایس پیرانتو کانفرنس کو بابل کا مینار تصور کرتا ہوں جس میں لسانی اختلافات سدِ راہ نہیں ہیں۔ یہ ایک ہفتہ کا خواب تھا جسے میں ہمیشہ مسرت کے ساتھ یاد کیا کروں گا"۔ میں خود ۱۹۳۸ء میں لنڈن میں ایس پیرانتو کی تیسویں کانفرنس میں شریک ہُوا۔ دُنیا کے ہر حصے سے ہزاروں کی تعداد میں نمائندے آئے ہوئے تھے اور ایک ہفتہ کے لئے اپنی اپنی مادری زبان کو بھول کر ایس پیرانتو ہی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ چونکہ ایس پیرانتو کا تلفظ اور لب و لہجہ ایک ہی ہے۔ اِس واسطے روسی، اطالوی اور جاپانی نمائندے ایک دوسرے کی بات بخوبی سمجھتے تھے۔ علمی، تمدنی، منطقی اور سائنٹیفک ہر قسم کے معاملات پر غور و خوض ہوتا رہا۔ ہر قسم کے خیالات آسانی کے ساتھ ظاہر کئے گئے۔ ناچ دعوتیں وغیرہ بھی ہوتی رہیں جن میں ایس پیرانتو کے علاوہ ہر زبان ممنوع تھی۔ ایس پیرانتو میں ایک ڈراما اور ایک فلم بھی دکھائی گئی۔ تفریح کے لئے مختلف مقامات کی سیر کا انتظام کیا گیا۔ گاور سٹریٹ کے نزدیک دکانداروں نے کام چلانے کے لئے ہفتے دو ہفتے میں کچھ ایس پیرانتو سیکھ لی۔ ایس پیرانتو

پولیس تعینات کی گئی۔ ایسپرنٹو ڈاکخانے کھول دیئے گئے۔ کئی اخباروں کے پوسٹر بھی ایسپرنٹو میں نکلے۔ یہ اصلی معنوں میں بین الاقوامی جلسہ تھا جہاں کم از کم ایک ہفتہ کے لئے تمام لوگ رنگ و رسم، قوم و زبان کے اختلاف کو بھول گئے اور گو وُہ کانفرنس موجودہ جنگ کو روکنے کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ تاہم اس نے مستقبل کے امن کا راستہ دکھا دیا۔

ایسپرنٹو نہایت سادہ اور آسان زبان ہے۔ اس کے حروف کے تلفظ اور لہجے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ یعنی جو شخص ایسپرنٹو قطعی نہیں جانتا۔ وُہ بھی اسے ٹھیک پڑھ سکتا ہے۔ قواعد کے صرف سولہ اصول ہیں۔ جو "ہمایوں" کے ایک صفحے پر چھاپے جا سکتے ہیں۔ اور جو استثنا سے بالکل بری ہیں۔ یعنی مذکر سے مونث بنانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ اور اگر وُہ طریقہ ایک فقرہ میں لکھ دیا جائے۔ تو تذکیر و تانیث کا مکمل باب ختم ہو جاتا ہے نیز اگر باپ، بھائی، شوہر کے لئے الفاظ ہوں تو اُن کی تانیث ظاہر کرنے کے لئے دوسرے الفاظ یعنی ماں، بہن، بیوی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اُسی طریقے سے الفاظ بنائے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کام کرنے کے لئے ایک لفظ ہے تو محنت کرنا، مشقت کرنا، مزدوری کرنا، کاروبار کرنا، روزی کمانا، تعاون کرنا، سستی کرنا، محنتی آدمی، سست آدمی، قیدِ مشقت، کارخانہ وغیرہ سب اُسی لفظ سے بنتے ہیں۔ چند نہایت سادہ طریقے ہیں جن کی رو سے ہر قسم کا لفظ ہر قسم کے معنوں کے لئے بنایا جا سکتا ہے اس سے زبان نہایت مختصر بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر زمین ہاف کی لُغت میں صرف دو ہزار پانچ سو اسّی الفاظ ہیں۔ اکیلے شیکسپیئر نے تقریباً پچیس ہزار الفاظ کا اور ملٹن نے آٹھ ہزار الفاظ کا استعمال کیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسپرنٹو اظہارِ خیالات میں ناقص ہے۔ انگریزی ادب میں خیالات یا احساسات کے تعمق کے لحاظ سے ہملیٹ سے کوئی بلند تر کتاب نہیں ہملیٹ کا ترجمہ خود ڈاکٹر زمین ہاف نے نہایت فصاحت سے کیا ہے جو کئی بار کامیابی کے ساتھ اسٹیج ہو چکا ہے۔ تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ چونکہ ایسپرنٹو ایک نپی تُلی زبان ہے اور اس کا ہر ایک لفظ جانچ تول کر بنایا جاتا ہے، اس واسطے ترجمہ کرنے میں کئی الفاظ یا فقرے جو اصل زبان میں مبہم یا مذبذب ہوتے ہیں صاف ہو جاتے ہیں۔ اس وقت دُنیا کے بہترین اصنافِ ادب کا ترجمہ ایسپرنٹو میں ہو چکا ہے ہومر، ورجل، دانتے، شیکسپیئر، راسیس، مولیئر، گوئٹے، ٹالسٹائی، پشکن اور درجنوں اور نامور ادباء کی تصانیف ایسپرنٹو میں ملتی ہیں۔ بائبل کا ترجمہ بھی مکمل ہے۔ اس کے علاوہ نثر و نظم میں کافی بلند پایہ ابتدائی لٹریچر بھی کافی مقدار میں موجود ہے۔ پچاس سال کی زبان سے بہت توقع تو نہیں کی جا سکتی۔ مگر اس قلیل عرصے میں سینکڑوں کتابیں ہر قسم کے مضامین پر لکھی جا چکی ہیں۔ یہ نئی قسم کا لٹریچر ہے جو قومی تعصب سے دور، مذہبی تفرقات سے بالاتر، فرقہ وارانہ آلودگیوں سے پاک اور سیاسی اور اقتصادی کشمکش سے پرے، نہایت وسیع معنوں میں بین الاقوامی درجہ رکھتا ہے۔ آدمیت اور انسانیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ انسانی فراخدلی کا عکس ہے۔ اور انسانی احساسات کا نچوڑ۔ ایسپرنٹو صرف بین الاقوامی زبان ہی نہیں ہے یہ ایک اصول ہے ایک عقیدہ ہے۔ ایک ضابطۂ حیات ہے جو نسلی اور لسانی امتیاز کو مٹا کر، مذہبی اور سیاسی تنگدلی سے نکال کر انسان کو اصلی معنوں میں انسان بناتا ہے۔ آج دُنیا شخصی اور قومی حرص کا شکار بنی، خونریزی اور مردم کشی میں غرق ہے۔ جلد ہی اہلِ مغرب ہوش میں آئیں گے۔ امن پھر قائم ہوگا۔ اور امن قائم ہونے کے ساتھ امن کو پائدار بنانے کی خواہش بھی پیدا ہوگی۔ اس وقت ان تمام امور میں جو امن کو پائدار بنانے میں ممد ہونگے، بین الاقوامی زبان کا درجہ نہایت اُونچا ہوگا۔ جو ان گمراہ یا گمراہ کردہ قوموں کو ایک دوسرے کا نقطۂ نگاہ سمجھائیگی۔ دنیا میں یگانگی پیدا کرے گی۔ اخوت کا مذہب پھیلے گا۔ خدا وہ دن جلد لائے۔

ایش کمار

اُسی جگہ میری راہ تکنا!

جہاں سپہر بریں بھی جھک کر   زمیں کی پیشانی چُومتا ہے
جہاں صنوبر کا دُھندلا سایہ   چمن کے سبزے پہ جھومتا ہے
اُسی جگہ میری راہ تکنا!
اُسی جگہ میری راہ تکنا!

جہاں کے چشموں کے پانیوں کو   بہاریں آ آ کے چومتی ہیں
جہاں سرور آفریں ہوائیں   حسین پھولوں میں گھومتی ہیں
اُسی جگہ میری راہ تکنا!
اُسی جگہ میری راہ تکنا!

جہاں کی صبحِ حسیں کے رُخ سے   سیاہ آنچل ہٹا ہوا ہے
جہاں کی شبنم کے موتیوں کو   ستارۂ صبح تک رہا ہے
اُسی جگہ میری راہ تکنا!
اُسی جگہ میری راہ تکنا!

اُن آبشاروں کے پاس تُم کو   وفا کے نغمے سناؤں گی میں
تمہارے بازو پہ سر کو رکھ کر   خوشی کے آنسو بہاؤں گی میں
اُسی جگہ میری راہ تکنا!
اُسی جگہ میری راہ تکنا!

میں توڑ کر سازِ زندگی کو   تمہاری ہی سمت آرہی ہوں
میں ہو کے آزاد بندِ غم سے   خوشی کے پیغام لارہی ہوں
اُسی جگہ میری راہ تکنا!
اُسی جگہ میری راہ تکنا!

نجمی رحمت اللہ علیہ بی اے
از ڈلہوزی

معقولیت ناممکن نہیں

میں ایک معقولیت پسند ہوں اور چاہتا ہوں کہ میری طرح سب معقولیت پسند ہو جائیں مگر معقولیت پسندی کا حال ان دنوں بہت پتلا ہے۔ اس پر ہر طرف سے جان لیوا حملے ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں پہلے تو یہ جاننا ہی دشوار ہے کہ معقولیت پسندی سے مراد کیا ہے؟ اور یہ معلوم ہو بھی جائے تو دریافت طلب یہ ہے کہ آیا وہ قابلِ حصول بھی ہے؟ معقولیت پسندی کے پہلو دو ہیں ۱۔ نظری اور ۲۔ عملی معقول رائے کیا ہے؟ اور معقول عمل کیا ہے؟ نتائجیت رائے کی غیر عقلیت پسندی پر زور دیتی ہے اور تحلیلِ نفسی عمل کی غیر عقلیت پسندی پر۔ بنا بریں بہت لوگ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ معقولیت کا کوئی معیار ہی نہیں جس کی مطابقت فکر اور عمل میں کی جائے نتیجہ یہ کہ مجھ میں اور آپ میں اگر کسی بات پر اختلاف رائے ہو تو دلیل یا کسی غیر جانبدار ثالث سے رجوع کرنا بیکار ہے بلکہ ہمارے لئے واحد کھلا راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی مالی قوت اور فوجی اسپرٹ کے موافق پروپیگنڈا اور جنگ سے کام لیں۔ یہ ایک خطرناک نظریہ ہے اور آخر میں تہذیب و تمدن کے لئے مہلک۔ لہٰذا میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ معقولیت کا معیار ان خیالات سے جو اس کے لئے مہلک باور کئے جاتے ہیں قطعاً متاثر نہیں ہوتا اور یہ کہ وہ فکر اور عمل کی رہبری کے لئے آج بھی اتنا ہی اہم اور ضروری ہے جتنا کہ پہلے تھا۔

فکر و نظر کی معقولیت سے مراد یہ ہے کہ کسی رائے کے قائم کرنے سے پہلے جملہ متعلق شہادت پر پوری طرح توجہ کی جائے۔ جہاں تیقّن کا حصول ناممکن ہوتا ہے وہاں ایک معقولیت پسند انسان سب سے زیادہ اغلب رائے کو سب سے زیادہ وزنی قرار دیتا ہے اور دوسری رایوں کو جو نمایاں طور پر ممکن ہوتی ہیں مفروضات کی حیثیت میں قائم رکھتا اور بعد میں شہادت سے اگر ان کی تائید ہو تو انہیں ترجیح دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم اکثر بیشتر واقعات اور امکانات کو معروضی اسلوب کے ذریعے سے دریافت کر سکتے ہیں — ایک ایسے اسلوب کے ذریعے سے دریافت کر سکتے ہیں جو دو محتاط اشخاص کو ایک ہی نتیجے پر پہنچا سکتا ہے۔ اس چیز کو عموماً محلِ نظر خیال کیا جاتا ہے۔ بہتیرے اشخاص کہتے ہیں کہ عقل کا واحد فعل یہ ہے کہ وہ فرد کی خواہشات اور ضروریات کی تسکین اور تکمیل میں سہولت بہم پہنچائے The Plebs Textbooks committee نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے Outline of Psychology اس کے مصنفین لکھتے ہیں کہ "عقل پاسداری کا آلہ ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ جو افعال فرد یا نوع کیلئے مفید ہوں وہ انجام پائیں اور جو کم مفید ہوں وہ روک دئے جائیں" (ص ۶۸)

لیکن یہی اہلِ قلم اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ "مارکس کے پیرو کا عقیدہ مذہبی عقیدے سے بیّن اختلاف رکھتا ہے مؤخر الذکر خواہش اور روایت پر مبنی ہے اور اول الذکر معروضی حقیقت کی اصولی تحلیل پر" (ص ۱۲۳) اور ان کا یہ خیال عقل کے متعلق ان کے مذکورہ بالا خیال سے قطعاً بے میل ہے الا اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ مارکسی عقیدہ کی قبولیت عقل پر مبنی نہیں بہرحال چونکہ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ "معروضی حقیقت کی اصولی تحلیل" ممکن ہے لہٰذا یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ ایسی رائیں قائم کی جا سکتی ہیں جو معروضی مفہوم میں معقول ہوں۔

غیر عقلیت پسندی کے زیادہ قابل حامیوں مثلاً نتائجی فلسفیوں کی گرفت اتنی سستی اتنی آسان نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ معروضی واقعے جیسی کوئی چیز موجود ہی نہیں جس کی مطابقت ہماری رایوں کی صحت اور صداقت کا معیار ہو۔ ان فلسفیوں کے نزدیک رائیں تنازع للبقاء کے آلات ہیں لہٰذا جو رائیں بقاء میں مدد دیتی ہیں وہی سچی ہیں۔ یہ نظریہ جاپان میں چھٹی صدی عیسوی میں رائج تھا۔ اس زمانہ میں بدھ مت پہلی مرتبہ اس سرزمین

پروارد ہوا حکومتِ وقت کو اِس نئے مذہب کی صداقت پر کچھ شبہ تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے ایک درباری کو حکم دیا کہ وُہ اس مذہب کو تجربۃً اختیار کرے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ وُہ اسے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مرفہ الحال بناتا ہے یا نہیں نتیجہ اگر خاطر خواہ برآمد ہو تو سمجھا جائے گا کہ مذہب سچا ہے اور پھر اسے عام طور سے قبول کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ یہی وہ اسلوب ہے جسے موجودہ زمانے میں تاجیّین کچھ ضروری ترمیم کے ساتھ جملہ مذہبی مباحث میں استعمال کرتے ہیں۔ بایں ہمہ آج تک کسی نے بھی یہودی مذہب اختیار نہیں کیا حالانکہ وُہ اَور مذاہب کے مقابلہ میں انسان کو بہت جلد ایک کامیاب مہاجن بنا دیتا ہے

لیکن تاجیّ فلسفی "حق" کے بارے میں ایک بالکل انوکھا خیال رکھنے پر بھی روزمرّہ کے عملی معاملات میں اپنے مسلّمہ معیار کو نہیں برتتا۔ بلکہ ایک قطعاً جداگانہ معیار استعمال کرتا ہے قتل کے کسی مقدمہ میں اگر یہ تاجی دوست جیوری میں شامل ہو تو وہ شہادت کو اسی طرح ضروری سمجھے گا اور جانچے گا جیسا کہ اس کا کوئی غیر تاجی ساتھی کرتا ہے حالانکہ اگر وہ اپنے فلسفہ کی پوری پوری پابندی کرے تو اسے سوچنا چاہئے کہ آبادی میں کس کو پھانسی دینا زیادہ مفید ہوگا۔ اور نہ یہ کہ زیادہ سچا ہوگا۔ بعض اوقات ایسی تاجیّت وقوع میں آتی ہے۔ امریکہ اور روس میں بہتیری خفیہ سازشوں کو اسی طرح کچلا گیا ہے مگر ایسی صورتوں میں اخفا کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ ورنہ رسوائی کا ڈر ہوتا ہے۔ اخفاء کی یہ کوششیں بتلاتی ہیں کہ پولیس کو بھی معروضی حق کا یقین ہوتا ہے۔ اسی قسم کے معروضی حق کو سائنس میں تلاش کیا جاتا ہے اور مذہب میں بھی جہاں تک کہ اس کے ہاتھ آنے کی توقع ہوتی ہے۔ جب ایک سیدھے سادھے مفہوم میں مذہب کو سچا ثابت نہیں کیا جا سکتا تبھی یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وُہ ایک نو ایجاد مفہوم میں سچا ہے۔ غیر عقلیت پسندی یعنی معروضی واقعے کی بے اعتباری عموماً یا تو کسی ایسی چیز کا دعویٰ کرنے کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے جس کیلئے کوئی شہادت موجود نہیں یا پھر کسی ایسی چیز کا انکار کرنے کی خواہش سے جس کیلئے بڑی اچھی شہادت موجود ہے۔ لیکن معروضی واقعے کا یقین عملی معاملات میں یکساں قائم رہتا ہے مثلاً ملازم کے رکھنے میں یا کسی کام میں روپیہ کے لگانے میں اور اگر واقعہ ہمارے یقینیات کا معیار ہے تو اسے ہر جگہ معیار ہونا چاہئے۔ اب ہیں ایسی صورتیں جہاں اس کا انطباق نہیں ہوتا وہاں لاادریت پر عمل ہونا چاہئے۔

اُوپر کی بحث اپنے مقصد کے لئے غالباً ناکافی ہے۔ واقعہ کی معروضیت کا مبحث فلسفیوں کی بدحواسیوں سے بے حد پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اس مسئلہ سے تفصیلی بحث کا یہ کوئی محل نہیں۔ مگر یہ بے خطر فرض کیا جا سکتا ہے کہ واقعات ہیں۔ ان میں سے بعض کا علم ہو سکتا ہے اور بقیہ کے متعلق اِن قابلِ علم واقعات کے لحاظ سے امکان کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم یہ۔ یقینیات اکثر خلافِ واقعہ ہوتے ہیں لہٰذا فکر و نظر کی معقولیت عبارت ہے امورِ واقعہ کے متعلق یقینیات کو خواہشات، تعصبات اور روایات پر نہیں بلکہ شہادت پر مبنی ٹھہرانے سے۔

بعضوں کا خیال ہے کہ تحلیلِ نفسی نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم اپنی رایوں میں معقول نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بیشتر اشخاص میں ان کا سرچشمہ عجیب اور مجنونانہ ہوتا ہے۔ میں تحلیلِ نفسی کا بڑا معتقد ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ وُہ انسانیت کی بہت اہم خدمت انجام دے سکتی ہے مگر عام طور پر اس کے اصلی مقصد و منشاء کو کسی قدر بھلا دیا گیا ہے۔ فرائڈ اور اس کے پیروؤں کی جدید نفسیات ہسٹیریا اور جنون کی مختلف قسموں کا ایک طریقہ علاج ہے وہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں لڑائی کے عصبی فسادوں کا ایک مؤثر ترین علاج ثابت ہوئی ریورز کی مشہور کتاب Instinct and the unconscious گولہ باری کے اُن صدموں سے بحث کرتی ہے جو دماغ یا گویائی کو پہنچے۔ اس میں خوف کے فاسد اثرات کی بڑی اچھی تحلیل کی گئی ہے۔ بتلایا گیا ہے کہ جب خوف کے تہیّج کی سیدھے صاف طور سے تکمیل نہیں ہوتی نہیں ہو سکتی تو اسی کے اثرات فساد انگیز بن جاتے ہیں۔ وہ بڑی حد تک غیر عقلی ہوتے ہیں اور مختلف اقسام کے فالجوں اور جسمانی تکلیفوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ فی الوقت ہمیں ان سے

سے بحث نہیں بحث دراصل ہمیں عقلی اختلافوں سے ہے اور ان کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ مجنونوں کے بہتیرے توہمات جبلّی مزاحمتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کا علاج ذہنی طریقوں سے ہو سکتا اور کیا جاتا ہے یعنی مریضوں کو وہ تمام واقعات یاد دلائے جاتے ہیں جنہیں انہوں نے دبا یا بھلا دیا ہے۔ اس طرح یہ طریقۂ علاج اور وہ نظریہ جس پر یہ طریقۂ علاج مبنی ہے دونوں دماغی صحت کے ایک معیار کے قائل ہیں مریض ان کے نزدیک اسی معیار سے جدا ہو جاتا ہے اور وہ اُسے اسی معیار پر واپس لاتے ہیں۔ یہ تو اس غیر عقلیت پسندی کا عکس ہے جس کا بعض لوگ ڈھنڈورا پیٹتے ہیں مگر یہ حضرات صرف یہی جانتے ہیں کہ تحلیل نفسی بتلاتی ہے کہ غیر عقلی یقینیات عام ہیں یعنی انہیں یہ نہیں معلوم یا وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تحلیل نفسی ایک خاص طریقۂ علاج کے ذریعے اس پھیلاؤ کو کم کرنا چاہتی ہے۔ اسی سے ملتا جلتا ایک طریقۂ علاج ان اشخاص کی نامعقولیتوں کو دور کر سکتا ہے جو مسلّمہ مجنون نہیں مثلاً آمری ممالک کے مختارِ مطلق، جمہوریتوں کے صدر یا پارلیمانی حکومتوں کے وزرائے کابینہ، سلطنتوں کے فرمانروا، سیاسی جماعتوں کے قائد اور مشاہیر مگر شرط یہ ہے کہ وہ علاج کے لئے خود کو ایسے معالجوں کے پاس پیش کریں جو ان کے توہمات سے پاک ہوں۔ اس شرط کی بہت کم تکمیل ہوتی ہے اور یہ خطرناک دیوانے سدا لاعلاج رہتے ہیں۔

یہاں تک تو معقولیت پسندی کے نظری پہلو سے بحث تھی۔ اب عملی پہلو کو لیجیے جو نسبتہً زیادہ دقیق اور دشوار ہے عملی معاملات میں اختلافِ رائے عموماً پیدا ہوتا ہے ایک تو اشخاص کی خواہشوں کے اختلاف سے اور دوسرے ان خواہشوں کے ذرائعِ تکمیل کی تجویزوں کے اختلاف سے آخری قسم کے اختلاف حقیقتہً نظری ہیں۔ آج کل جنگ ہو رہی ہے فرض کیجیے کہ کسی متحارب فریق کے بعض عہدہ دار یہ کہتے ہیں کہ ان کا پہلا خطِ دفاع جنگی جہازوں پر مشتمل ہونا چاہیے اور دوسرے کہتے ہیں کہ نہیں وہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں پر مشتمل ہونا چاہیے یہاں مجوزہ مقصد یعنی قومی یا وطنی دفاع کے متعلق کوئی اختلاف نہیں اختلاف ہے صرف ذرائعِ تکمیل کے متعلق ایسی صورت میں اصولی طریقہ پر استدلال کیا جا سکتا ہے کیونکہ اختلاف واقعات سے تعلق رکھتا ہے ایسی تمام مثالوں پر معقولیت پسندی کی نظری منطبق ہوتی ہے۔

لیکن اس قسم کی متعدد نظیروں میں ایک نہایت اہم عملی دقت رونما ہوتی ہے ایک شخص ایک خاص طریقے پر کام کرنا چاہتا ہے اور خود کو یہ باور کراتا ہے کہ وہ اس طرح کام کر کے ایک پسندیدہ مقصد کی تکمیل کر رہا ہے حالانکہ وہ اگر ایسا نہ چاہے تو پھر اس یقین کی کوئی بنیاد نہیں رہتی۔ وہ امورِ واقعہ اور احتمالات کے متعلق اس شخص سے جو بالکل مختلف خواہشات رکھتا ہے بالکل مختلف رائیں قائم کرتا ہے جواری ان اصولوں کے متعلق جو آخر میں کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں انتہائی غیر عقلی یقینیات رکھتے ہیں۔ سیاسیات سے شغف رکھنے والے یہ باور کرتے ہیں کہ ان کی جماعت کے قائد بڑے دیانتدار ہیں اور کبھی ان فریب کاریوں کے مرتکب نہیں ہو سکتے جو مخالف سیاستدانوں کا طغرائے امتیاز ہیں۔ اربابِ نظم و نسق یہ خیال کرتے ہیں کہ رعایا کے ساتھ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کا سا سلوک نہایت موزوں ہے تمباکو کی لت رکھنے والے سمجھتے اور سمجھانا چاہتے ہیں کہ وہ اعصاب کو سکون عطا کرتا ہے اور شراب کے دلدادہ یہ فرماتے ہیں کہ اس سے عقل و فہم میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح جو تعصب پیدا ہوتا ہے وہ واقعات کے متعلق افراد کی رایوں کو بگاڑ دیتا ہے اور کچھ اس طرح بگاڑ دیتا ہے کہ اس کا ادراک اور اس سے اجتناب مشکل ہے۔ اعصاب پر شراب کے اثرات کی نسبت ایک عالمانہ مقالہ بھی فوراً یہ ظاہر کر دے گا کہ مصنف تارکِ مسکرات ہے یا نہیں۔ ہر صورت میں وہ واقعات کو اس زاویۂ نظر سے دیکھے گا جو اس کے اپنے عمل کا پیدا کردہ اور اس سے ہم آہنگ ہے۔ سیاسیات اور مذہب میں ایسے امور نہایت اہم ہو جاتے ہیں بہتوں کا خیال ہوتا ہے کہ وہ سیاسی رایوں کے قائم کرنے میں فلاحِ عامہ کے جذبۂ بلند سے متحرک ہوتے ہیں دراں حالیکہ سو میں سے ننانوے انسانوں کی سیاست ان

کے طرزِ معیشت و معاشرت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس پر سے بعض یہ دعویٰ اور بنیر ے عملاً یہ یقین کرنے لگے ہیں کہ ایسے معاملات میں واقعیت پسند ہونا محال ہے اور یہ کہ متعارض جذبات کے طبقوں میں رسّا کشی کے سوا اور کوئی طریقِ استدلال ممکن یا مستحسن نہیں۔

لیکن انھیں معاملات میں تحلیلِ نفسی خصوصیت سے مفید ہے کیونکہ وُہ ہمیں اپنے غیر شعوری تعصبات اور رجحانات سے آگاہ کرتی ہے اور ایک ایسی فنی قابلیت ہم میں پیدا کرتی ہے جس کی بدولت ہم خود کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اپنے متعلق ہماری یہ رائے بہت کم غیر منصفانہ ہوتی ہے سائنٹفک ذہنیت اور اس فنی قابلیت دونوں کے ملنے سے انسانوں میں امورِ تعمیر اور کسی مجوزہ فعل کے ممکن اثر کی نسبت موجودہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ معقولیت پسندی پیدا ہو جائے گی اور جب وُہ ایسے معاملات میں مختلف الرائے نہ ہوں گے تو جو اختلافات باقی رہ جائیں گے ان میں دوستانہ مطابقت آسانی سے پیدا کی جا سکے گی۔

پھر بھی ایک جزو ایسا باقی رہ جاتا ہے جو عقلی استدلال کو قبول نہیں کرتا۔ ایک فرد کی خواہشات دوسرے کی خواہشات سے میل نہیں کھاتیں ہر شخص چاہتا ہے کہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ میں رہے عملی معاملات میں اختلافِ رائے کا یہ سب سے بڑا اور اہم سرچشمہ ہے لیکن معقولیت پسندی یہاں بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ وُہ نقصان کی وسعت اور شدت کو ممکن حد تک کم کر دیتی ہے۔ ہم غیر عقلیت پسند اُس آدمی کو کہیں گے جو کسی خاص جذبہ کے تحت کام کرتا ہے وُہ نامعقول ہے اس لئے کہ یہ بھول جاتا ہے کہ کسی وقتی شدید خواہش کی تکمیل میں اسے اپنی دوسری خواہشوں کو دبانا ہوگا جو ممکن ہے آگے چل کر اس کے لئے زیادہ اہم اور قیمتی ثابت ہوں۔ اگر جملہ انسان معقولیت پسند ہوتے تو اپنی اغراض کا وُہ موجودہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ صحیح اندازہ کرتے۔ اگر وُہ روشن خیال خود غرضی سے کام کرتے تو دُنیا بہشت ہوتی جس میں افراد عمرانی تعلقات کو قائم اور برقرار رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو کم سے کم آزار پہنچاتے۔ ہر چند عمل کے لئے خود غرضی کوئی اعلیٰ محرک نہیں لیکن اگر وہ روشن خیالانہ ہو تو ایثار اور بے نفسی کی طرح محمود اور مستحسن ہے کسی منظم جماعت میں کوئی فرد ایسا کام نہیں کریگا جو دوسروں کے لئے بہت زیادہ نقصان رساں ہو۔ ایک نامعقول شخص ہی یہ ادراک نہیں کر سکتا کہ وُہ چیزیں جو دوسروں کو نقصان پہنچاتی ہیں خود اُسے بھی نقصان پہنچاتی ہیں کیونکہ نفرت اور حسد اس کی عقل پر پردہ ڈال دیتے ہیں لہٰذا روشن خیال خود غرضی اگرچہ اخلاق کا کوئی اعلیٰ معیار نہیں تاہم کم سے کم اگر وہی عام ہو جائے تو ہماری یہ دنیا جو آجکل تمدن کا دوزخ بنی ہوئی ہے واقعی دار السلام بن جائے۔

کردار اور عمل کی معقولیت سے مراد یہ ہے کہ ہم کسی فوری خواہش کے زیرِ اثر کام نہ کریں بلکہ پہلے اپنی جملہ متعلق خواہشات کا جائزہ لیں اور ان کی طرف متوجہ ہوں۔ فکر و نظر کی معقولیت کی مانند کردار و عمل کی معقولیت بھی درجہ کی چیز ہے مکمل معقولیت ایک ناممکن الحصول نصب العین ہے لیکن پاگل خانے اور جیل خانے بہ اصرار یہ بتلاتے ہیں کہ ہم میں سے بعض دوسروں سے زیادہ معقول ہیں۔ دنیا کی ترقی کا راز صرف معقولیت پسندی کی اشاعت اور توسیع میں مضمر ہے بے نفسی کے اخلاق کی تلقین محض بے سود ہے۔ وہ صرف اُن اشخاص سے اپیل کر سکے گی جو پہلے سے ایثاری جذبات رکھتے ہیں اور ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا جو ایسی خواہشات سے عاری ہیں لیکن معقولیت پسندی کی تبلیغ ایک بالکل دوسری چیز ہے وُہ ہمیں اپنی تمام خواہشوں کے حصول میں مدد دیتی ہے جس شخص کی عقل اس کی خواہشوں پر جس قدر زیادہ اطلاع اور قابو رکھتی ہے اسی قدر زیادہ وہ شخص معقول ہے۔ افعال پر عقل کا یہ اقتدار ایک نہایت اہم چیز ہے آج سائنس تیزی سے ان ذرائع میں اضافہ کر رہی ہے جن سے ہم اپنے ہمجنسوں کو بڑے پیمانے پر تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں افعال پر عقل کا یہی اقتدار عمرانی زندگی کی بقاء کا ضامن ہو سکتا ہے سیاسیات، تعلیم، صحافت اور مذہب —— مختصر یہ کہ دنیا کی تمام بڑی قوتیں آج غیر عقلیت پسندی کی جانب ہیں۔ وہ ان افراد کے ہاتھوں میں ہیں جو ہمیں تباہی، فساد اور انتشارِ مطلق کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اس کا علاج کسی انقلاب کسی خاص عقیدہ کو اسلحہ یا معاشی دباؤ کے ذریعہ ختم کرنے میں نہیں بلکہ افراد کی انہی ان کوششوں میں ہے کہ اپنے ہمسایوں اور دُنیا والوں کے ساتھ اپنے تعلقات کا ایک زیادہ متوازن اور سنجیدہ زاویۂ نظر قائم کریں۔ عقل ہی زیادہ سے زیادہ عام ہو کر ان آلام اور تکالیف کا خاتمہ کر سکتی ہے جنھوں نے ہمارے اس حقیر مگر انتہائی بدبخت کُرہ کو اپنی آماجگاہ بنا لیا ہے دُنیا پر جو گہری تاریکی چھائی ہوئی ہے اسے یہی ایک شعاع دور کر سکتی ہے۔

[illegible] احمد

فانی بدایونی

ہمالیہ کے پربتوں کے دامن میں روہیلکھنڈ کا سرسبز و شاداب خطہ ہے۔ اسی روہیلکھنڈ کے آغوش میں بدایوں کا چھوٹا سا شہر صدیوں کی پرانی بستی ہے۔ اس کا ایک ایک ذرہ مسلمانوں کی پرانی عظمتوں کی یاد دلاتا ہے اور اس کی ایک ایک عمارت ہمارے دل میں ان کی مٹی ہوئی شان و شوکت کا نقش جما دیتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ بستی ہمیشہ مسلمان بادشاہوں کی آماجگاہ بنی رہی، اور اس کی خاک نے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہوں کا دل لبھایا۔ اس کی مردم خیزی میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسی خاک سے ایسے ایسے صوفیائے کرام اٹھے جن کی عظمت مسلم ہے اور جن کے مزارات آج بھی ہزاروں انسانوں کی زیارت گاہ ہیں۔ اسی سرزمین میں شاعر بھی پیدا ہوئے۔ در بعض تو ان میں سے بہت اچھے شاعر تھے لیکن ان کی گوشہ نشینی اور خاکساری نے انہیں زیادہ مشہور نہ ہونے دیا۔ مذاق میاں ایک بزرگ بدایوں کے رہنے والے اپنی نظیر آپ تھے۔ ان کا ضخیم دیوان موجود ہے۔ راقم الحروف کا خاندان ہمیشہ ان کا پرستار رہا۔ نعت اور تصوف میں بہت بلند پایہ کہنے والوں میں تھے۔ لیکن زمانہ کا رجحان اس طرف نہ ہونے کے باعث انہیں زیادہ شہرت نصیب نہ ہوئی۔ ان کی شاعری زیادہ تر ان کے متعلقین تک محدود رہی اور ان کا مطبوعہ دیوان آج بھی ان لوگوں کے گلوں کا تعویذ ہے۔ قمر بدایونی کو کون نہیں جانتا جن کا حال ہی میں انتقال ہوا لیکن بدایوں کے سب سے بڑے شاعر جن پر بدایوں کی سرزمین ہمیشہ فخر کرے گی اور اردو غزل گوئی جن کے بار احسان سے کبھی بھی سبکدوش نہ ہو گی وہ فانی تھے جن کی "شب فرقت"، ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کو حیدرآباد میں کٹی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صبح عدم سے ہم آغوش ہو گئے۔

فانی نے اسی بدایوں کی سرزمین پر ۱۸۷۹ء میں آنکھ کھولی۔ ان کی زندگی کی مختصر کہانی انہیں کی زبانی سنیئے۔

"میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو دنیا میں لایا گیا۔ اب تک کہ دسمبر ۱۹۴۰ء ہے زندہ سمجھا جاتا ہوں۔ نسلاً پٹھان ہوں۔ اصلی وطن کابل ہے اس طرح کہ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانے میں میرے مورث اعلیٰ اصالت خاں نامی ہندوستان آئے۔ دربار دہلی نے انہیں اور ان کے جانشینوں کو بہت کچھ نوازا۔ ممتاز عہدوں پر فائز کئے جانے کے علاوہ جاگیرات۔ خطابات منصب وغیرہ سے سرفراز ہوئے۔ نواب نبات خان رت مرحوم جو میرے دادا تھے، صوبہ بدایوں کے گورنر تھے۔ تقریباً دو سو مواضعات پر ان کی جاگیر مشتمل تھی مگر زمانے کے انقلاب نے رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچا دی کہ میرے والد محمد شجاعت علی خاں صاحب جو مورث اعلیٰ سے چھٹی پشت میں تھے پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے چنانچہ قلیل آمدنی کے سہارے پر مرحوم نے اپنی ساری زندگی شرافت، دیانت، عزت اور جرأت کے ساتھ گذار دی۔ میری جوان لڑکی۔ نے ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا۔ میرے دو لڑکے سعادت علی خاں اور وجاہت علی خاں کے نام سے موسوم ہیں۔ مذہباً میں حنفی ہوں۔"

"میں نے ۱۹۰۱ء میں بی اے کی ڈگری لی اور ۱۹۰۸ء میں ایل ایل بی کی ڈگری لی ۱۹۲۳ء تک لکھنؤ میں اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء تک آگرہ میں وکالت ذریعۂ معاش رہا۔ کچھ سال بدایوں اور بریلی میں بھی وکالت کرتا رہا۔ ۳۲ء سے ۱۹۳۹ء تک دکن میں صدر مدرس رہا۔ ۳۹ء کے بعد سے اب تک بیکار ہوں۔ آئندہ کیا ہوگا معلوم نہیں۔ مختصر اً ننگ خاندان بھی ہوں اور بار زمین بھی۔ میری ہستی کسی اور کے لئے تو کیا مفید ہوتی خود میرے لئے نہیں۔"

"میری موجودہ تصنیفات "دیوانِ فانی"، مطبوعہ نقیب پریس بدایوں ۱۹۲۰ء "باقیات فانی" مطبوعہ آگرہ اخبار پریس ۱۹۲۶ء اور "عرفانیاتِ فانی" مطبوعہ لطیفی پریس ۱۹۳۹ء ہیں۔ باقی تصانیف تلف ہوگئیں۔" — نگار جنوری ۱۹۴۱ء

یہ چند سطریں ہیں جن میں فانی نے اپنی زندگی کی مختصر کہانی بیان کی ہے۔ ہر پڑھنے والا اس کو محسوس کرے گا کہ فانی کے ان جملوں میں کس قدر درد ہے کس قدر سوز و گداز ہے۔ یہ کسی "دل جلے" کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ "اب تک کہ دسمبر ۱۹۴۰ء ہے زندہ سمجھا جاتا ہوں"۔ اس جملہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا زندگی سے بیزار ہے۔ اس کو اس جہانِ فانی میں زندگی کا کوئی لطف حاصل نہیں اور حقیقتہً یہ سچ بھی ہے۔ فانی نے اپنی ساری زندگی اسی طرح بیزاری کے عالم میں کاٹی۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی زندگی کو بیکار ہی سمجھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں "آئندہ کیا ہوگا معلوم نہیں۔ مختصراً ننگ خاندان بھی ہوں اور بار زمین بھی۔ میری ہستی کسی اور کے لئے تو کیا مفید ہوتی خود میرے لئے نہیں۔" الغرض فانی کی عمر کچھ اس طرح گزری کہ انہیں کبھی خوشی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اور ظاہر ہے کہ جب ان کی زندگی خود ان کے لئے ہی بیکار تھی تو دوسروں کے لئے کیا مفید ہو سکتی تھی۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو ننگِ خاندان اور بارِ زمین سمجھتے رہے۔

فانی نے جن دنوں ہوش سنبھالا ہے۔ نئی تہذیب کی بجلیاں ہندوستان کے آسمان پر اچھی طرح چمک رہی تھیں مغربیت کا سیلاب تیزی سے اُمڈا چلا آتا تھا۔ ہر طرف نئے خیالات کی اشاعت جس کو دیکھو نئے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ فانی نے زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کی رفتار کو دیکھا اور پہچانا اور یہ سب اسی کا طفیل تھا کہ بدایوں کے ایک پٹھان خاندان کے چشم و چراغ نے اُس زمانے میں علیگڈھ کالج سے بی اے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ ورنہ اس زمانہ میں روہیلکنڈ کے پٹھانوں میں کب اس بات کا رواج تھا۔ وہاں تو تعلیم کو اچھی نظر سے دیکھا ہی نہ جاتا تھا۔ بہر حال فانی کی تعلیم اچھی طرح ہوئی۔ علی گڑھ کی صحبتوں نے ان پر بہت اثر ڈالا۔ انہوں نے شاعرانہ طبیعت پائی تھی اور اس کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ دوسرے ملکوں کے ادبیات کے مطالعہ نے اس آتشِ شوق کو اور بھی بھڑکا دیا اور ان کی شاعری کی ابتدا صحیح معنوں میں علی گڈھ سے ہوئی۔

فانی کے زمانے میں اُردو شاعری کی کیا حالت تھی؟ اس کا جواب دینا ان کی شاعری پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے ۱۹۰۵ء میں نواب مرزا خاں داغ کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن ان کے رسیلے نغمے دہلی۔ رام پور اور حیدر آباد سے اُٹھ کر سارے ہندوستان میں گونج چکے تھے۔ اور ہندوستان کے شہروں کے گلی کوچوں میں ان کی غزلیں گائی جاتی تھیں آزاد حالی اور اکبر جدید قسم کی شاعری کا پرچم بلند کر چکے تھے۔ ہر چیز میں جدت درکار تھی حالی کا ہر چہار طرف ڈنکا بج رہا تھا۔ انہوں نے غزل گوئی

میں بھی ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا جس سے اُردو کا کوئی ہونے والا غزل گو شاعر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فانی کا شباب حالی کا بڑھاپا تھا۔ اور وُہ رختِ سفر باندھے اس دُنیا سے جانے کے لئے تیار ہی بیٹھے تھے۔ ان کی ہستی اُردو شاعری کے لئے بہت کچھ کر چکی تھی۔ ہر شخص کی زبان پر حالی حالی تھا۔ فانی حالی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ حالی نے اُردو غزل گوئی میں جو ایک جدت کی روح پھونکی تھی اس کو فانی نے اچھی طرح سوچا سمجھا اور اس پر عمل بھی کیا۔ فانی نے غزل ہی کو اپنی طبع آزمائی کے لئے موزوں خیال کیا۔ کیونکہ انہیں اس کی وسعت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ وُہ سمجھتے تھے کہ غزل کی شاعری ہمیشہ برقرار رہنے والی ہے۔ وُہ کبھی مٹ نہیں سکتی۔ بشرطیکہ اس کو قاعدے سے برتا جائے۔ انہوں نے غزل کو اپنے ہاتھ میں لے کر غزل گوئی کی ایک بالکل نئی راہ نکالی جو انہیں کا حصہ ہے۔

فانی کے زمانے میں لکھنوی شاعری ایک ایسے دور سے گزر رہی تھی جو اس دبستان کی قدیم شاعری کا ردِّ عمل تھا۔ انگیا چوٹی اور سرمہ مسی کی شاعری موت کی نیند سو چکی تھی۔ مرثیہ نے اپنی دھاک بٹھا دی تھی حتیٰ کہ غزل بھی مرثیت کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ ان دنوں لکھنؤ کے شاعروں کو گورِ غریباں، یاس و حرماں اور گریہ و ماتم وغیرہ کے علاوہ اور کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ سب اس رنگین شاعری کا ردِّ عمل تھا جو عرصہ تک لکھنؤ کو گرما چکی تھی۔ اب اس کا ردِّ عمل ہُوا تو یہاں کے شاعروں نے اس کو بھی انتہا پر پہنچا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس میں بھی ایک طرح کی بناوٹ پیدا ہو گئی۔ ہرچند اس زمانے میں ایسی شاعری کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ اودھ کی سلطنت پر فرنگیوں کا یونین جیک لہرانے لگا تھا۔ جانِ عالم پیا واجد علی شاہ اختر لکھنؤ کو سونا کر کے مٹیا برج سدھار چکے تھے اور اُن کے جانے کے بعد لکھنؤ کی تمام رنگین صحبتوں پر اوس سی پڑ گئی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ حزن و یاس اور رنج و الم کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیئے تھا چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ لیکن لکھنوی شاعروں کی انتہا پسندی نے اس کو بھی بناوٹ کا رنگ دیئے بغیر نہ چھوڑا۔ جس کی وجہ سے بعض اوقات ان کی یہ شاعری بھی ہمیں اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ بہر حال یہ لکھنؤ میں بالکل ایک نئی چیز تھی۔

فانی اس لکھنوی شاعری سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ان کی طبیعت رنجیدہ قسم کی واقع ہوئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات کا وہ تیر کی طرح اپنے دل پر اثر لیتے تھے۔ زندگی کی پیہم ٹھوکروں نے ان میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی جس سے وُہ ہمیشہ ملول رہا کرتے تھے۔ اور اسی لئے ان میں ٹامس ہارڈی کی طرح ایک قسم کی قنوطیت پیدا ہو گئی تھی۔ فانی نے جب اُردو شاعری کا مطالعہ کیا تو ان کی نظر لکھنؤ کی "مرثیت آمیز" شاعری پر پڑی۔ اِس نے ان کے دل کو موہ لیا۔ لیکن وُہ لکیر کے فقیر ہو کر رہنے والے نہ تھے۔ بس انہوں نے اس کی بناوٹ کو چھوڑ اپنی افتادِ طبیعت سے بالکل ایک نیا رنگ ایجاد کیا جو ان کا خاص رنگ ہے اور وہ اس میں اُردو کے سارے شاعروں سے الگ نظر آتے ہیں۔ یہ سب فانی کی انفرادیت کا طفیل تھا۔ انہوں نے سوچ سمجھ کر اُردو غزل گوئی میں ایک ایسے باب کا افتتاح کیا جس کا کبھی کسی نے خواب بھی نہ دیکھا تھا۔

ہرچند فانی نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس سے یہ بات ظاہر ہو سکے کہ شاعری اور آرٹ کے متعلق ان کے خیالات کیا تھے لیکن ان کے کلام کو پڑھنے کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وُہ المیہ آرٹ کو پسند کرتے تھے اور

کچھ ایسی ہی ان کی افتادِ طبیعت تھی۔ اس معاملہ میں وُہ Marc Andre کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں جو شاعری کی تعریف یہ کرتا ہے کہ "شاعری رنج والم کی بہن ہے۔ ہر وُہ شخص جو تکلیف میں مُبتلا ہوتا ہے اَور آنسو بہاتا ہے شاعر ہے۔ ہر آنسو ایک شعر ہے اَور ہر دل ایک نظم"۔ فانیؔ کا آرٹ المیہ ہے۔ ان کے دل سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وُہ کسی دکھے ہوئے دل کی ٹیس ہے جو انتہائی کرب و اضطراب برداشت کرنے کے بعد آہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ان کا سارا کلام اسی قسم کے اشعار سے بھرا ہوا ہے[۵]

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وُہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

سینۂ فانیؔ ہے یا جولانگہِ برقِ فنا
دل ہے یارب یا بلائے آسمانِ اضطراب

فانیؔ اس عالمِ ظاہر میں سراپا غم تھا
چھپ گیا خاک میں تو ہم غمِ پنہاں سمجھے

فانیؔ وُہ بلاکش ہوں غم بھی مجھے راحت ہے
میں نے غمِ ہستی کی صورت بھی نہ پہچانی

طاقتِ دل دے چکی جواب پر اب تک
قوتِ غم رو بہ انحطاط نہیں ہے

جو تابِ دلنوازیٔ درماں نہ لا سکے
میں ہوں وُہ دردِ غمکدۂ روزگار میں

فانیؔ کی ذات سے غمِ ہستی کی تھی نمود
شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا

لیکن یہ سب کیوں ہُوا؟ بات یہ ہے کہ فانی کی زندگی کچھ اس ڈھب سے گزری جس میں مسرت کا کہیں گزر ہی نہ تھا۔ انہیں ناکامیوں کی پیہم ٹھوکریں کھانی پڑیں جس کا اثر یہ ہوا کہ انہیں ساری دُنیا میں رنج وغم کا راج نظر آنے لگا۔ ہر شخص کا دل انہوں نے رنج وغم سے دوچار دیکھا۔ دنیا ان کے نزدیک رنج والم کا ایک گہوارہ تھی فانیؔ کی زندگی کی ساری تفصیلات اِس چیز کو بخوبی ظاہر کریں گی۔ زندگی میں ناکامیوں کا منہ دیکھنے کے علاوہ انہیں کچھ ایسے صدمے اُٹھانے پڑے جن کا وہم وگمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں ان کی جوان لڑکی کی وفات نے ان کی دنیا اجاڑ دی۔ فانیؔ کو اس سانحہ سے بے انتہا صدمہ پہنچا۔ اِس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی

زندگی سے متعلق چند سطریں لکھتے وقت اس واقعہ کو فراموش نہیں کیا۔ اپنے آباؤ اجداد کا حال لکھنے کے فوراً ہی بعد لکھتے ہیں "میری جوان لڑکی نے ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ محمد حسین آزاد کو بھی ایک ایسا ہی سانحہ پیش آیا تھا جس نے ان کو مجنون کر کے چھوڑا۔ فانی مجنون تو نہ ہوئے لیکن جب تک زندہ رہے ہمیشہ سُلگتے رہے ——— پھر حیدر آباد میں زندگی کے آخری ایام جس حالت میں انہوں نے کاٹے ہیں وُہ یقیناً بہت افسوسناک ہے۔ خود ان کی مذکورہ صدر خود نوشتہ سوانح عمری کے الفاظ اس کے گواہ ہیں۔ حیدر آباد کا مشہور اخبار پیام لکھتا ہے۔

"حیدر آباد کے عصرِ حاضر میں اس سرزمین پر شاید ہی کوئی ایسا صاحب کمال اس کس مپرسی کی حالت میں دفن ہُوا ہو جس حالت میں کہ فانی نے اپنی زندگی کے چند آخری سال گزارے"

یہ تو ہیں اُن کی آخری زندگی کے واقعات۔ لیکن جوانی میں بھی انہوں نے ایسے صدمے اُٹھائے جنہوں نے ان کے دل کو ایک ویران بستی بنا دیا تھا" ہماری زبان" نے نوجوانی کے صدموں کا ذکر کیا ہے معلوم نہیں کہ یہ جوانی کے صدمے کیا تھے جنہوں نے ان کو ہمیشہ مجسم رنج والم بنائے رکھا اور وُہ زندگی بھر ایسی آگ میں سُلگا کئے جس کی وجہ سے ان کو ساری دنیا میں رنج و غم بسیرا لیتے نظر آئے ؎

اِک بے قرار تڑپا اِک بے قرار دیا ——— کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں

دل غم سے غم ہے دل سے مقابل جگہ جگہ ——— غم اصلِ کائنات ہے دل جوہرِ حیات

سرچند یہ تمام واقعات ان کے حق میں بُرے تھے لیکن انہوں نے ان کی شاعری کو ایک ایسا رنگ دیا جو ادب کی دنیا میں ہمیشہ سے نہایت مقبول رہا ہے اور رہتی دنیا تک مقبول رہے گا۔ وہ المیہ آرٹ ہے اس آرٹ کو ہمیشہ خواص و عوام نے پسند کیا ہے۔ اور اکثر بڑے بڑے شاعروں نے اسی قسم کے آرٹ کو آرٹ اور شاعری کی معراج سمجھا ہے اور حتی الوسع اپنے کلام کو اس کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ انگریزی کا مشہور شاعر شیلے کہتا ہے۔

"We look before and after
And pine for what is not
Our Sincerest laughter
With some pain is fraught
Our Sweetest songs are those that tell of Saddest thought"

ترجمہ:۔ "ہم اپنے آگے پیچھے دیکھتے ہیں اور جو چیز ہمیں نہیں ملتی اُس پر کڑھتے ہیں اور افسردہ و رنجیدہ ہوتے ہیں۔ ہماری سچی سے سچی ہنسی بھی رنج و غم سے معمور ہوتی ہے۔ ہمارے سب سے میٹھے اور رسیلے گیت وُہ ہوتے ہیں جن میں سب سے زیادہ رنج و غم کے خیالات کا اظہار ہو"

یقیناً فانی کے ایسے نغمے ہمیشہ ہمیشہ دل جلوں کی محفلوں میں مقبول رہیں گے اور دنیا انہیں کبھی بھی فراموش نہ کرے گی۔ کیونکہ ان میں فانی نے ایسے جذبات و احساسات کی تصویر کھینچی ہے جن سے آئے دن ہر انسان کو سابقہ رہتا ہے۔ اور جو ہر لمحہ انسان کے دم کے ساتھ رہتے ہیں۔ سارے اُردو شاعروں نے اس کو سوچا سمجھا ہے میر و درد کی مقبولیت کا بڑا سبب یہی ہے۔ جس طرح میر و درد کی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی شاعری مٹنے والی نہیں اُسی طرح فانی کی شاعری کی بہار میں بھی کبھی خزاں کی بادِ سموم نہ چل سکے گی اور ان کی شاعری کا گلشن سدا بہار رہے گا۔

غزل گوئی کو صرف عشق و محبت کے بیان کے لئے وقف کر دینا یقیناً غزل کی وسعت کا خون کرنا ہے۔ جو لوگ غزل کو صرف عورتوں سے باتیں کرنے تک محدود کر دینا چاہتے ہیں وُہ غزل کی روح کو سمجھے ہی نہیں۔ غزل ایک وسیع میدان ہے جس میں ہر قسم کے مضامین کو جگہ دی جا سکتی ہے اور بڑے بڑے غزل گو شعراء نے دی ہے میر کے ہاں رنج و غم، افلاس، محبت، کرب، بے چینی کے علاوہ فلسفے کا بیان بھی ملتا ہے۔ تصوف کے راز ہائے سربستہ بھی بے نقاب ہوتے ہیں۔ غالب کی شاعری کا موضوع اگر صرف عشق و محبت سمجھ لیا جائے تو ان کی شاعری میں بہت تھوڑے سے اشعار ملیں گے۔ وُہ بھی عشق و محبت کے ساتھ ساتھ اخلاق، تصوف اور فلسفے کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں اور فلسفہ تو ان کی شاعری کی جان ہے۔ فانی کا بھی یہی حال ہے۔ انہوں نے "جوانی کے صدموں" سے متاثر ہو کر صرف عشق و محبت ہی کو اپنی شاعری میں جگہ نہ دی بلکہ طرح طرح کی اور چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت کے بیان کا اچھا خاصا حصّہ موجود ہے اور یقیناً وُہ اشعار بہت بلند ہیں کیونکہ فانی بناوٹی شاعری نہیں کرتے تھے۔ وُہ شاعر پیدا ہوئے تھے، شاعری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ جب خیالات و احساسات شعر کہنے کے لئے انتہائی مجبور کرتے تھے تو شعر کہہ دیتے تھے۔ ان کے عشق و محبت کے اشعار میں ہمیں کہیں بھی تصنع کا احساس نہیں ہو سکتا۔ وُہ عشق و محبت کے جذبات کی سچی تصویریں ہیں ؎

جب ترا ذکر آ گیا ہم دفعتہً چپ ہو گئے
وُہ چھپایا رازِ دل ہم نے کہ افشا کر دیا

دل سراپا درد تھا وُہ ابتدائے عشق تھی
انتہا یہ ہے کہ فانی درد اب دل ہو گیا

مری اک عمر فانی نزع کے عالم میں گزری ہے
محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

موت ان کا منہ ہی تکتی رہ گئی
جو تری فرقت کے صدمے سہہ گئے

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

کچھ نہ کہنا وُہ کسی مجبورِ خاموشی کا ہائے
وُہ جتانے پر ترا کہنا خفا کیوں ہو گئے

لیجئے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہئے
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گزری چھوٹ گیا

اب انہیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشم بد دُور دلھن بن کے شباب آتا ہے

سازِ خیالِ یار سے چھیڑ چلی ہی کیوں نہ جائے
نغمۂ آرزو سُنا نوحۂ یاس بھی سہی

بیداد کے اس تیور اس حُسن کے میں صدقے
ان کو مرے رونے پر آئی تو ہنسی آئی

یوں چرائیں اس نے آنکھیں سادگی تو دیکھئے
بزم میں گویا مری جانب اشارہ کر دیا

ادا سے آڑ میں خنجر کی مُنہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وُہ لائے دلھن بنائے ہوئے

قربان اِک ادائے تغافل پہ لاکھ بار
وُہ زندگی جو صرف ہوئی انتظار میں

لیکن ان اشعار سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ان کی محبت ناکام محبت ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں ان کے اشعار میں ایک ٹیس سی محسوس ہوتی ہے اور ہر شعر یہ بولتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ میں جس دل سے نکل کر آیا ہوں اس نے کبھی بھی کامیابی کا منہ نہ دیکھا۔ جو ایک ایسا چمن ہے جس میں کبھی بھی بہار نہ آئی اور جس کو ساری عمر خزاں سے کام رہا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فانی کی محبت حقیقی تھی یا مجازی؟ فانی کی مجازی محبت کی حدیں حقیقت تک پہنچ گئی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری میں تصوّف کو بھی دخل دیا ہے۔ تصوّف کا ان پر اثر ہونا لازمی تھا۔ انہوں نے ایسی بستی میں جنم لیا اور ہوش سنبھالا جہاں بڑے بڑے اولیاء اللہ رہے اور اب بھی ان کے مزار موجود ہیں۔ جہاں تک تصوّف کا تعلق ہے بدایوں کو اس سلسلہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ روہیلکھنڈ کے مسلم عوام کا یہ خیال ہے کہ اگر ہندوستان میں کعبہ ہوتا تو بدایوں میں ہوتا۔ آئے دن عرسوں کے چرچے، بڑے بوڑھوں کا اہلِ تصوّف سے لگاؤ، اِن سب چیزوں نے فانی پر بہت اثر کیا پھر وُہ مسلمانوں کے اِس فرقے سے تعلق رکھتے تھے جس کو حنفی کہتے ہیں۔ اولیاء اللہ کا احترام جتنا حنفی کرتے ہیں اتنا کسی اور فرقے کے لوگ نہیں کرتے۔ غرض فانی پر ان تمام چیزوں نے اثر کیا اور فانی

نے تصوّف سے دلچسپی لی۔ اس لئے ان کی شاعری میں تصوّف سے متعلق دو چار چھ نہیں بیسیوں شعر ملتے ہیں۔ ہم اس کے متعلق یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی مجازی محبّت کی حدیں حقیقت سے ملی ہوئی تھیں اور ان کی نظر تاریکیوں کے پردوں کو چیر کر اس جگہ پہونچ چکی تھی جہاں ہر عامی آدمی کی نظر جاتے ہوئے لڑکھڑاتی ہے۔

تاکید ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی   مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی

آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے   تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز

وادیٔ شوق میں وارفتۂ رفتار ہیں ہم   بے خودی کچھ تو بتا کس کے طلب گار ہیں ہم

صورِ منصور وطور ارے توبہ   ایک ہے تیری بات کا اندازہ

محتاجِ اجل کیوں ہے خود اپنی فنا ہو جا   غیرت ہے تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہو جا

اِس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے وہم   بلبلا ہے عین دریا پھر بھی دامن چیدہ ہے

فانی کی شاعری میں ایسی عشق و محبت کی کیفیات کے دوش بدوش ہمیں فلسفہ کے مسائل بھی ملتے ہیں — فلسفہ کے وہ مسائل جو آئے دن اُن کے دماغ میں موجیں مارا کرتے تھے۔ اور جن کے متعلق سوچ بچار کرنا ہر حسّاس انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ فلسفیوں کے علاوہ جنہوں نے اپنے خیالات کے مختلف اصول قائم کر دیئے، ان چیزوں نے شاعروں کو بھی پریشان کیا ہے۔ اور شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس کے کلام سے یہ مترشح نہ ہوتا ہو کہ اس نے ان سوالات پر غور نہیں کیا۔ وُہ سوالات یہ ہیں کہ زندگی کیا ہے؟ موت کس کو کہتے ہیں؟ انسان کس لئے دنیا میں آتا ہے؟ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ وغیرہ۔ ہر کسی نے ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ فانی کو بھی اِن چیزوں نے پریشان کیا اور انہوں نے بھی اِن سوالات کے جواب دیئے ہیں۔ وُہ غالب سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن غالب سے بہت زیادہ مختلف۔ فانی فلسفیانہ خیالات کو بڑی سہولت سے ادا کر دیتے ہیں:۔

ہوش کا سرمایہ وحشت کے سوا ممکن نہیں   عالم اِک مجموعۂ ذرّاتِ صحرا بیز ہے

دنیا جسے کہتا ہے زمانہ فانی   ہے ایک طلسمِ اجتماعِ اضداد

ہر مژدۂ نگاہ غلط جلوہ خود فریب — عالم دلیلِ گمرہیِ چشم و گوش ہے

زندگی خود چیز کیا ہے یہ تو کیا کہئے مگر — موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم — مری ہستی ہے غیب کی آواز

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں — آنکھ کھُلی تو دُنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

مراد جو دہے میری نگاہِ خود نشناس — وُہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا

جبر و اختیار کا مسئلہ ہمیشہ سے بحث طلب رہا ہے چنانچہ اس پر لوگوں کے دو گروہ ہی بن گئے ہیں۔ ایک جبر کا قائل اور دوسرا اختیار کا۔ اُردو شاعروں نے بھی اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فانی کے ہاں بھی اس موضوع پر اشعار ملتے ہیں جن سے ان کی رائے کا پتہ چلتا ہے۔ فانی مسلمان تھے اور حنفی مسلمان جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے اس لئے مسئلہ جبر و اختیار میں کم و بیش ان کا وہی نظریہ ہے جو ایک سچے مسلمان کا ہونا چاہئے۔ وُہ کسی انتہا پر جانا نہیں چاہتے۔ ان کی راہ ان دونوں کے درمیان ہے ؎

جسمِ آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح — خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی — سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

غرض فانی کی شاعری ان چیزوں سے خالی نہیں۔ لیکن فلسفے کے مسائل بیان کرتے وقت وُہ فلسفی نہیں ہو جاتے بلکہ ان کے ہاں نام کو بھی وُہ بات پیدا نہیں ہونے پاتی جس سے فلسفہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی خشکی "کھُرّا پن"، جو فلسفہ کا نام آتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ فانی کا بہت بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ان پیچیدہ مسائل کو انتہائی شگفتگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور غزل کی شان کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس میں کرختگی ذرا بھی پیدا نہیں ہونے پاتی۔ برخلاف اس کے ان کے بیان میں ایک عجیب قسم کی دل موہ لینے والی خصوصیت ہوتی ہے جس سے پڑھنے والا گرویدہ ہو جاتا ہے ان کا ہر بیان شعریت کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے۔ زبان اتنی صاف اور میٹھی کہ دوسرا اس کے استعمال کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ پھر اس میں ایک عجیب قسم کی گھلاوٹ۔ یہ سب فانی ہی کا حصّہ ہے اور شاید

خشک مسائل کو سیدھے سادھے پیرائے میں بیان کرنے میں فانی سے زیادہ (میر کو چھوڑ کر) کوئی شاعر بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ فانی اِس کے بادشاہ ہیں۔

اس موقع پر ایک یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ فانی نے فلسفہ کو اپنی شاعری میں دخل دیا تو آخر ان کا فلسفہ کیا ہے؟ یقیناً اُن کی شاعری سے ان کے نظریۂ زندگی کے متعلق بہت کچھ مواد ملتا ہے۔ ان کا فلسفہ نہایت سیدھا سادھا فلسفہ ہے۔ وُہ دنیا کو ایک "طلسمِ اجتماعِ اضداد" سمجھتے ہیں ان کے خیال کے مطابق اِس دنیا کی ہستی ایک افسانہ کی سی ہے جہاں رنج وغم کا دور دورہ ہے اور جہاں ایک پل بھی ایسا نہیں جو رنج والم کے ہاتھوں سے فگار نہ ہو۔ انہیں دنیا میں دور تک رنج وغم کی پُر ہول اندھیاری نظر آتی ہے۔ انسان اس میں بھٹکتا پھرتا ہے اور ایسی ایسی اذیتوں کا شکار ہوتا ہے جن سے زندگی میں نجات حاصل کرنا انتہائی دشوار بلکہ ناممکن ہے اگر ایک لمحہ کے لئے یہاں خوشی بھی ہوتی ہے تو اس کو بھی دائمی خوشی نہ سمجھ لینا چاہئے بلکہ اس پر بھی رنج والم کا سایہ رہتا ہے ؎

عیشِ جہاں باعثِ نشاط نہیں ہے — خندۂ تصویر انبساط نہیں ہے

لیکن شوپنہار کی طرح وُہ اس کو ایک "اندھی مشیت" کی کارفرمائی نہیں سمجھتے۔ بلکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہاں خاموش ہو جاتے ہیں ان کے خیال میں موت کے بعد ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے جس کو وُہ "سحر" سے تعبیر کرتے ہیں ؎

شبِ فرقت کٹی یا عمرِ فانی — اجل کے بعد آمد ہے سحر کی

مرنے کے بعد دنیا کی تمام تکلیفوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور انسان کو ان سے نجات ملتی ہے۔ خدا وحدہٗ لاشریک ہے وُہ دنیا میں سب کچھ کرنے والا ہے۔

فانی اپنی غزلوں میں انسانی نفسیات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ وُہ نفسیات کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ غزل گوئی میں اس کا خاص لحاظ رکھنا چاہیئے اگر غزل گو شاعر انسانی نفسیات کو اچھی طرح نہ سمجھ سکا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری شاعری کا خون کر دیا۔ اس کی شاعری کبھی بھی بقائے دوام کا تمغہ حاصل نہیں کر سکتی۔ فانی نے اس کو اچھی طرح سمجھا چنانچہ ان کی شاعری میں ہمیں نفسیات کی ایسی ایسی گہرائیاں ملتی ہیں جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئیں ان کا ایک شعر ہے ؎

ترکِ امید بس کی بات نہیں — ورنہ اُمید کب بر آئی ہے

انسان کا خاصہ ہے کہ ناکامیوں کی پیہم ٹھوکریں کھانے کے باوجود بھی وُہ مرتے دم تک اُمید کا دامن نہیں چھوڑتا۔ فانی نے اسی خیال کو مذکورۂ بالا شعر میں بیان کیا ہے یہ فانی کی بالکل الگ خصوصیت ہے کہ ان کو یاس کی تاریکی میں اُمید کی ہلکی سی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ وُہ کبھی نا اُمید نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری میں باوجود بے انتہا رنج والم کی کیفیتوں کے بیان کے ہمیں ایک امید کی جھلک نظر آتی ہے جو صاف کہہ دیتی ہے کہ فانی کی طبیعت نہیں کہ کبھی نا امید ہو سکے۔

جب ترا ذکر آ گیا ہم دفعتہً چپ ہو گئے — وُہ چھپایا راز دل ہم نے کہ افشا کر دیا

محبت کرنے والے انسان کا یہی حال ہوتا ہے۔ اگر کہیں اُس کے معشوق کا ذکر آتا ہے تو وُہ اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے معشوق کا ذکر اگر کسی محفل میں آتا ہے تو دوسرے لوگ اس پر طرح طرح کی خیال آرائیاں کرتے ہیں تنقید کرتے ہیں۔ آوازے کستے ہیں۔ غرض کوئی چیز ان کو خاموش رہنے پر مجبور نہیں کرتی۔ لیکن عاشق خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگتے ہیں اور یہی باعث ہوتا ہے اِس راز کے افشا ہونے کا۔ فانی نے مذکورہُ بالا شعر میں اسی خیال کو کس قدر عمدہ اور عام فہم پیرائے میں بیان کیا ہے۔

یا کہتے تھے کچھ کہئے جب اُس نے کہا کہئے   تو چپ ہیں کہ کیا کہئے کھُلتی ہے زباں کوئی

عاشق کو ہمیشہ اپنے معشوق سے شکوہ رہتا ہے اور وُہ شکوہ و شکایت کا دفتر لئے اس اُمید میں گھوما کرتا ہے کہ کہیں موقع ملے تو دل کھول کر اپنے محبوب کے سامنے ان کو رکھے لیکن جب معشوق سامنے آتا ہے زبان گونگی ہو جاتی ہے۔ وُہ تمام شکوہ و شکایت کافور ہو جاتے ہیں اور اُن کا بیان کرنا تو درکنار وُہ سرے سے ان کو بھول جاتا ہے۔ فانی نے اسی خیال کو کس خوبی سے نظم کیا ہے۔ غرض مثالیں کہاں تک دی جائیں۔ فانی کے ہاں اسی قسم کے بیسیوں اشعار ملتے ہیں جو ان کے ماہر نفسیات ہونے پر صداقت کی مہر لگاتے ہیں۔

فانی نے جگہ جگہ صرف چند الفاظ میں ایسی ایسی تصویریں کھینچی ہیں جن کو اچھے سے اچھا مصوّر بہترین رنگوں کو جمع کرنے کے باوجود بھی نہیں کھینچ سکتا۔ فانی صرف چند اشارے کرتے ہیں اور کسی ایک مخصوص ادا، ایک مخصوص منظر یا ایک مخصوص تیور کی تصویر ہماری آنکھوں میں پھر جاتی ہے ؎

نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو آہ   ادا وُہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

اُدھر مُنہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو اِدھر دیکھو   مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

صبح تک فانی وُہ آوازِ شکستِ دل کے ساتھ   کیا قیامت تھا وُہ تیرا جانبِ در دیکھنا

یوں چرائیں اُس نے آنکھیں سادگی تو دیکھئے   بزم میں گویا مری جانب اشارہ کر دیا

مذکورہُ بالا اشعار اس بات کی زندہ مثال ہیں کہ فانی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مصوّر بھی تھے جن کو الفاظ میں تصویریں کھینچنے کا ملکہ حاصل تھا۔

شاعری میں اندازِ بیان ایک خاص چیز ہے۔ یہی ایک ایسا جادو ہے جس سے ساحر فوراً ہی پڑھنے والے کو اپنی طرف رجوع کر لیتا ہے۔ دنیا کے ہر بڑے شاعر کا ایک الگ اندازِ بیان ہوتا ہے۔ ہمارے اُردو شاعروں میں میرؔ، دردؔ، سوداؔ، انشاؔ، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، آتشؔ غرض کہ ہر ایک شاعر کا ایک جُداگانہ طرز ہے لیکن میرؔ و مومنؔ کو اپنے خیالات ایک لطیف انداز میں بیان کرنے میں فوقیت حاصل ہے۔ مومنؔ کی شاعری کی بڑائی تو ایک حد تک ان کے اندازِ بیان ہی میں مضمر ہے۔ فانی کا اندازِ بیان بھی مومنؔ ہی کی طرح ایک خاص مرتبہ رکھتا

ہے۔ وُہ جو کچھ بھی کہتے ہیں کچھ ایسے تیور سے کہتے ہیں کہ خواہ مخواہ پڑھنے والے کو اچھا معلوم ہوتا ہے اور سیدھی سادھی بات میں بھی چار چاند لگ جاتے ہیں ؎

ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں ـــــ جان کیا دیں کہ بہت جان سے بیزار ہیں ہم

حشر میں حشر چاہئے حشر پہ حشر چاہئے ـــــ دفن ہیں سجدہ ہائے شوق ناصیۂ نیاز میں

اب جو ہوا ہوا مآل چھوڑ خدا پہ اندمال ـــــ زخمِ جگر پہ خاک ڈال تیر سنبھال رہ نہ جائے

ہائے دنیا وُہ تری سرمہ تقاضا آنکھیں ـــــ کیا مری خاک کا ذرّہ کوئی بیکار نہیں

الٰہی کیا خبر لاتا ہے قاصد وصلِ دلبر کی ـــــ بلائیں لے رہی ہیں میری تقدیریں مقدر کی

اِس اندازِ بیان نے اِن کی شاعری کو ایک عجیب قسم کا بانکپن دیا ہے جو کم شاعروں کو نصیب ہوتا ہے۔ فانؔی کی شاعری اِس وجہ سے بہت کافی بلند ہوگئی ہے۔

فانؔی کی شاعری کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا ہر شعر شعریت کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے۔ ان کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی شاعرانہ خوبی ضرور ملتی ہے۔ ان کے تمام دیوانوں میں شاید ایک شعر بھی ایسا نہ ملے گا جس میں کوئی نہ کوئی خوبی موجود نہ ہو۔ اس چیز نے ان کی شاعری کو ایک ایسی منزل پر پہونچا دیا ہے جس پر کم شاعر پہونچ پاتے ہیں۔ عموماً غزل گو شعراء کے ہاں یہ نقص ہوتا ہے کہ ان کی ہر غزل میں دو چار شعر انتخاب سے اچھے نکلتے ہیں اور بقیہ اشعار اس قابل نہیں ہوتے کہ مقبولیّت کی سند پا سکیں لیکن فانؔی کے یہاں یہ بات نہیں ان کی شاعری میں انتخاب کی گنجائش نہیں۔ ان کا ایک شعر بھی ایسا نہیں جو نظر انداز کیا جا سکے۔ فانؔی اس حیثیت سے بہت بلند ہیں۔

فانؔی کی طبیعت جدت پسند تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بعض فرسودہ خیالات، جن کو بیسیوں شعراء نے بار ہا باندھا اور اب بھی باندھتے ہیں، کچھ ایسے پیرائے میں ملتے ہیں کہ اُس طرح کسی اَور کو باندھنے کا خیال تک نہ ہوا۔ فانؔی کی طبیعت میں ایج تھی جس نے ان کو ہر فرسودہ سے فرسودہ خیال کو ایک جدید پیرائے میں ظاہر کرنے پر مجبور کیا۔ فانؔی نے ان تمام فرسودہ خیالات کو نظم کیا ہے جو ولؔی کے زمانے سے لے کر اب تک نظم ہوتے رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی ہمیں وہی حشر کا ذکر ملتا ہے۔ وہی چاکِ گریباں، شبِ فرقت، ہجر و وصل، گل و بلبل، شمع و پروانہ، طور و موسیٰ، و قیس و فرہاد وغیرہ کے افسانے ملتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک فانؔی کی اپنی چیز معلوم ہوتی ہے جس کی پیشانی پر جدّت کا ٹیکا لگا ہے۔ ہمیں پڑھتے وقت اس کا شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ کسی کی تقلید میں کہے گئے ہیں ؎

کچھ کھیل نہ تھا یوں بھی پروانہ کا جل بجھنا
جل کر نہ بجھے ایسے پروانے کو کیا کہیے

اب جفا ہے نہ وفا یادِ وفا باقی ہے
تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانوں کی

پھر گوشہ گیرِ حلقۂ زنجیر ہے جنوں
صحرا کو نذرِ تنگئ زنداں کئے ہوئے

پھر ابر میں وحشت کی تصویر نظر آئی
لہرائی ہوئی بجلی زنجیر نظر آئی

بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر
کچھ خاک سی اُڑی ہوئی سارے چمن میں تھی

رو رو کے ایک ایک قدم بڑھ رہا ہوں میں
ہنستی ہے مجھ پہ دورئ منزل جگہ جگہ

شب گریۂ غم کے طوفاں کا وُہ جوش وہ جوش ارے توبہ
ہر اشک اُمڈ کر کہتا تھا میں دل کے لہو کا دریا ہوں

اُس نورِ مجسم کے افسانے کو کیا کہیے
ہے شمع بھی پروانہ پروانے کو کیا کہیے

سحر ہوئی کہ وُہ یادِ شبِ بخیر آتا ہے
چراغ ہیں مری تربت کے جھلملائے ہوئے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہلِ زنداں کی
گریباں نے گلے لپٹا لیا ہے بڑھ کے داماں کو

کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانی
ملتی ہے گلے مل کے سحر شمعِ سحر سے

سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار نہ موجِ بوئے گل اُٹھتی نہ آشیاں ہوتا

ہے ہے وُہ اہلِ ذوق کی زنداں نوازیاں سر پیٹتا ہوں خانۂ زنجیر دیکھ کر

شاید کہ شامِ ہجر کے مارے بھی جی اُٹھے صبحِ بہارِ حشر کا چہرہ اُتر گیا

آرٹ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی انتہائی خوبی اس کے پوشیدہ رکھنے میں ہے جو آرٹسٹ اپنے آرٹ کو پوشیدہ رکھنا چاہئے گا وُہ صرف چند اشاروں سے اپنے مطلب کو ظاہر کرنے کی کوشش کرے گا یہی آرٹ سب سے بلند ہے۔ بڑے شاعروں نے بھی ایسا ہی کیا ہے ہماری اُردو میں غالبؔ کا پایہ اس میں بہت بلند ہے اور وُہ اس سلسلہ میں بہت کامیاب ہوئے ہیں لیکن غالبؔ کے بعد اگر کسی دوسرے شاعر نے اس حیثیت سے کمال حاصل کیا تو وہ فانیؔ ہیں۔ ان کے بہت سے اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں انہوں نے صرف چند اشاروں سے اپنا مطلب بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ پڑھنے والا بعض چھوٹی ہوئی باتوں کو اپنے ذہن کی مدد سے پورا کر لیتا ہے جو انتہائی لطف کا باعث ہوتا ہے

جنوں سہی اثرِ بے خودیٔ غم نہ سہی تمہیں خبر ہے کہ اپنی خبر نہیں ہے مجھے

صبح تک فانیؔ وُہ آوازِ شکست دل کے ساتھ کیا قیامت تھا وُہ تیرا جانبِ در دیکھنا

سُن کے افسانۂ دل پھر متبسّم ہو جا گریۂ شوق کو پھر دعوتِ طغیانی دے

عشق ہے جب جنوں تو پھر شاد ہوائے دلِ حزیں کوئی جگہ اُٹھا نہ رکھ کوئی سوال رہ نہ جائے

اللہ رے نوکِ نشترِ غم کی لگاوٹیں اِک اک لہو کی بوند پہ ظالم مچل گئی

اک فسانہ سُن گئے اک کہہ گئے میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

لبریزِ تموّج تھا اِک اِک خطِ پیمانہ محفل سے جو وُہ اُٹھے لیتے ہوئے انگڑائی

فانیؔ نے ہر جگہ زبان کا خیال رکھا ہے۔ اور جس موقع پر جیسی زبان کی ضرورت ہوئی ویسی ہی زبان استعمال کی ہے۔ ان کی زبان میں

ایک عجیب طرح کی شیرینی ہے جس سے خواہ مخواہ لطف آتا ہے۔ اس میں ایک عجیب قسم کی گھلاوٹ ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ وہ عربی فارسی کی بڑی بڑی ترکیبیں اور الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ محاوروں کا مناسب موقع پر استعمال ان کی خاص خوبی ہے۔ وہ چند الفاظ کو باہم یکجا کر کے ایک ترنم پیدا کر دیتے ہیں جو شاعری کی جان ہے۔ وہی روزمرہ کی بول چال ہے لیکن فانی کی زبان سے جب وہی کلمات وزن و قافیہ کے سانچے میں ڈھل کر نکلتے ہیں تو ہر پڑھنے والے کا دل موہ لیتے ہیں۔ مشکل خیالات کو آسان زبان میں بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ بڑے بڑے شاعروں کو یہاں سپر ڈالنی پڑتی ہے لیکن فانی کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ بڑے سے بڑے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو ایسی زبان میں بیان کرتے ہیں کہ بھلا معلوم ہوتا ہے اور بغیر کسی کوشش کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ غزل میں جیسی پیاری زبان کی ضرورت ہوتی ہے وہ فانی کا حصہ ہے۔

غرض فانی بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی خوبیاں کہاں تک بیان کی جائیں۔ انہوں نے اپنا ایک بالکل الگ رنگ قائم کیا جو اردو غزل گوئی میں بالکل ایک نئے باب کا افتتاح ہے۔ ان کی شاعری گوناگوں خوبیوں کا گلدستہ ہے۔ ان کے نغموں میں ایک عجیب کیفیت ہے۔ ہر چند انہوں نے اپنی دنیا الگ بنائی تھی لیکن ان کے تمام افکار ایک انسان کے افکار معلوم ہوتے ہیں ان پر بیتتے ہوئے دکھ درد کو ہم خود اپنا دکھ درد محسوس کرتے ہیں۔ ان کے نغموں کا ہر پڑھنے والا اپنے دل میں ایک ٹیس سی محسوس کرتا ہے۔ فانی کی ساری زندگی رنج والم کے گہوارے میں گزری لیکن ان کی شاعری کے یہ پھول کبھی خزاں کی صورت نہ دیکھ سکیں گے۔ وہ ایسے پھول ہیں جن کی خوشبو ساری فضا میں پھیلی ہوئی ہے —— ان کی شاعری بانسری کی ایک ایسی سریلی تان ہے جو اپنی سحر آفرین و درد آگیں صدا سے ساری دنیا کو مبہوت کئے ہوئے ہے۔ ادب کی دیویاں (Muses) اس پر اپنے تبسم کے پھول نچھاور کر رہی ہیں۔ اُن کی شاعری کا ماہتاب آسمانِ ادب پر جگمگا رہا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ جگمگاتا رہے گا اور اس کی چاندنی کی حسین مسکراہٹ سے ساری دنیا لطف اندوز ہو رہی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ ہوتی رہے گی لیکن کائنات کی ہر چیز ان کا نام آتے کے ساتھ ہی دھیمے سروں میں یہ گنگناتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ؎

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیئے تھا — فانی

عبادت بریلوی

تاریخِ وفات حضرتِ فانی بدایونی مرحومِ مغفور

ہے کیا تربتِ فانی پہ کتبہ — بہت حیراں تھے احباب پریشاں
کہا یہ صدق نے اے حق شناسو — فقط لکھ دو "غبارِ نا امیداں" (۱۳۶۰ھ)

صدق جائسی

رات

تخیّل کے طائر نے بازو سمیٹے
بسیرا لیا نیند کے آشیاں میں
چمکتے، جھمکتے ستاروں کی کلیاں
کھلیں، دور آکاش کے گلستاں میں
نشیلا اندھیرا طلسمی خموشی۔ خموشی میں جان بخش لوری کا جادو
ملائم سی خنکی، لچیلی ہوائیں۔ ہواؤں کی موجوں میں ہلکی سی خوشبو

وُہ رہ رہ کے مُڑتی ہوئی نرم شاخیں
وُہ تھم تھم کے بہتے ہوئے نرم جھونکے
وُہ کوئل کی دلدوز، مدھم صدائیں
وُہ جھیلوں میں لہروں کے خوابیدہ نغمے
کہیں گیت گاتی ہوئی جنبشیں ہیں، کہیں گنگناتی ہوئی سرسراہٹ
کہیں جگنوؤں کی گھڑی بھر چمک میں اندھیرے کی سہمی ہوئی مُسکراہٹ

خلاؤں میں رقصاں ہے شب کی حسینہ
ستاروں کا زرتار پرچم اُڑائے
نشیلے اندھیرے پہ چھائے ہوئے ہیں
سنہرے طربناک خوابوں کے سائے
پُراسرار ظلمت، وُہ رنگین سپنے، وُہ سپنوں میں جیون کی آشائیں لرزاں
جوانی کے سہمے ہوئے ولولوں میں فراغت کی دھندلی تمنائیں لرزاں

~~~~~~~~~~~~

یہ زنداں کی زنجیر ٹوٹی پڑی ہے!!
وُہ "افلاس کا دیو" سویا ہوا ہے!!
یہ "دکھ درد کا راکشس" سرنگوں ہے!!
وُہ "آزادیوں کا دریچہ" کھلا ہے!!
یہ دم بھر کو روحیں جو چونچال سی ہیں، وُہ سب خواب کی دلنشیں سیمیا ہے
نہ زنداں کی زنجیر ٹوٹی پڑی ہے، نہ افلاس کا دیو سویا ہوا ہے

~~~~~~~~~~~~

ذوقی

گُناہ

جیسے اندھیرا گرہن کا چھا جائے تو دیکھ کے جی گھبرائے
چاند بنے انگارا سا اور سُرخ بھیانک ہوتا جائے
ویسے ہی رُوح کو ظلمت مرتے وقت گناہ کی، آ کے ڈرائے

جیسے کوئی مرگھٹ کا راہی ڈرے کہ بھوت نہ آن دبائے
اُٹھے بونڈلا دبی راکھ کا، بھوت کی پرچھائیں بن جائے
ویسے ہی اپنا بھیانک سایہ مرتے وقت گناہ دکھائے

جیسے کسی مُردار پہ اِک دم جھنڈ گدھوں کا جھپٹ کے آئے
بولے کوّا گلا پڑی بولی اور چیل اُڑے چلّائے
ویسے ہی غول گناہوں کا مرتے دَم روح پہ آ منڈلائے

جیسے جُواری ہار کے اپنی پونجی ہاتھ ملے پچھتائے
جان سے اپنی رُوٹھ کے اپنے گھر والوں سے آنکھ چُرائے
ویسے ہی کَرنی اَن کَرنی کی مرتے دَم یاد آ کے رُلائے

سانس اُکھڑتے دَم جب مشعل روح کی بھڑکے اور بجھ جائے
کوئی پکارے اَبّا اماں اور کوئی بیرن کہہ چلائے
کھڑا گُناہ تماشا دیکھے، بدل پینترا آگے آئے

روح نکل کر جسم سے تن کی لوتھ کو دیکھ کے جب ٹھکرائے
پھیر کے مُنہ نفرت سے، یاد کرے کچھ، روئے اور اُڑ جائے
بھوت گُناہ کا گھیرا ڈالے پھاڑ کے مُنہ آنکھیں لہکائے[1]

مُنہ سے سیاہی چھوڑ کے جب یہ مُوذی روح کو اِس میں پھنسائے
آئے فرشتہ نیکی کا تب اِس عفریت کا زور گھٹائے
پھر بھی گُناہ نہ پیچھا چھوڑے، دانت دلے، گرجے غرّائے

برق کی تیزی سے یہ فرشتہ جنت تک جب روح کو لائے
کھول کے در فردوس کا اُس کو اُس کی منزل تک پہونچائے
تب بھی گناہ وہیں منڈلائے، سر جھٹکے، چیخے، چلّائے

منفوا احمدی

[1] یعنی خوفناک طریقے سے چمکائے

مچھلی

فرحت .... کوئی شخص ثروت .... اُس کی بیوی
شریف .... ان کا نوکر لطیف .... ان کے دوست کا نوکر

کھانا کھانے کا کمرہ وقت صبح نو بج کر دس منٹ

ایک نو فٹ مربع کمرہ جس کے درمیان ایک میز پر رومال سے کچھ ڈھکا پڑا ہے میز کے چاروں طرف کرسیاں سجی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ کھانا چنا گیا ہے مگر کھانے والے ابھی تک نہیں آئے۔ کمرے کے شمال میں ایک دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا ہے اور دوسرا مشرق کی طرف صحن میں مغربی دیوار میں ایک کھڑکی ہے جس کے پہلو میں بڑی الماری میں چینی کے برتن ترتیب سے سجے نظر آ رہے ہیں۔ دروازوں اور کھڑکی کے سامنے پھولدار پردے لٹک رہے ہیں۔

شریف بلور کے جگ میں پانی لئے مشرقی دروازے سے داخل ہوتا ہے ثروت اور فرحت کو کمرے میں نہ دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے اور دیوار پر لگی کلاک کو دیکھتا ہے اور خود بخود کہنے لگتا ہے۔ آج صاحب کھانا کھانے کیوں نہیں آئے شاید میں گھنٹی بجانی بھول گیا ہوں مگر اب تو دس منٹ دیر بھی ہو گئی ہے ...... میرے اللہ اب کیا بنے گا بیگم صاحبہ کا پارہ خدا جانے کس درجہ پر پہنچ جائے۔ آج ضرور کچھ نہ کچھ گل کھلیں گے۔ میرے پروردگار تیرا ہی آسرا ہے تو ہی۔ ہاں تو ہی سب کو روزی دینے والا ہے

(گھنٹی کا بٹن دباتا ہے)

ایک ہی لمحے بعد میاں بیوی مسکراتے ہوئے شمالی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھنٹی کے انتظار ہی میں تھے۔ ثروت اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے شریف کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہے۔

شریف۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) بیگم صاحبہ معافی کا خواستگار ہوں۔ گھر کے ایک معاملے میں اس قدر اُلجھ گیا تھا کہ گھنٹی بجانے کی سُدھ بدھ نہ رہی بیگم صاحبہ پہلی بار تو ضرور معاف کر دیجئے آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا میں غریب آدمی ہوں۔ آپ کے طفیل خدا مجھے بھی روزی دے رہا ہے۔

ثروت۔ اوہو شریف اتنا کیوں گھبراتے ہو (مسکراتے ہوئے) اب ذرا احتیاط سے کام کرنا غلطی آخر انسان ہی سے سرزد ہوتی ہے نا۔ چلو اب کے معاف کر دیا۔

(باہر کی گھنٹی بجتی ہے شریف باہر جاتا ہے اور دل میں کہتا ہے بڑی آئی ہے معافی دینے والی جیسے یہ ہی میری خدا ہے)

ثروت۔ آج کل بہت سست ہو گیا ہے ان غریبوں کو اگر پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے تو اپنی اوقات ہی بھول جاتے ہیں چار دن کھانے کو نہ ملے تو ساری سُدھ بُدھ ٹھیک ہو جائے۔

فرحت۔ ہاں تو۔ اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ساڑھے نو بجے گھر سے چلا جاتا ہوں پھر گھنٹی بجانی کیوں بھولے اب دس پندرہ منٹوں

میں کھانا کھانے کا خاک مزہ آئے گا اگر کبھی پھر ایسا کرے تو نوکری سے جواب دے دینا۔ نہ معلوم ....

(شریف اور لطیف داخل ہوتے ہیں ثانی الذکر کے دائیں ہاتھ میں ٹفن باکس ہے)

سناؤ لطیف کیسے آئے عقیل صاحب تو اچھے ہیں

لطیف۔ (ٹفن باکس دیتے ہوئے) سلام حضور عقیل صاحب نے مچھلی بھیجی ہے ان کی بیگم صاحبہ نے خود تلی ہے۔

جیب سے ایک رقعہ نکال کر فرحت کو دیتا ہے)

فرحت۔ بڑی تکلیف کی عقیل بھائی نے

(رقعہ پڑھتا ہے اور جیب سے قلم نکال کر اس پر کچھ لکھ کر لطیف کو واپس کر دیتا ہے)

ان سے کہنا کہ مچھلی نہایت ہی لذیذ ہے ساری عمر میں ایسی تلی ہوئی کبھی نہیں کھائی۔ دیکھو نا ثروت پیازی پیازی رنگ کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے

(لطیف سلام کر کے چلا جاتا ہے)

ثروت۔ (خاوند کی زبانی کسی دوسری عورت کی تلی ہوئی چیز کی تعریف سن کر اُس کا رنگ غصے سے سُرخ ہو رہا ہے مچھلی کو چھوتے ہوئے) آپ بھی تو کمال کرتے ہیں خواہ مخواہ تعریف کے پل باندھ دیتے ہیں۔ دیکھیں تو ذرا۔ مجھے تو یہ کچی ہی معلوم ہوتی ہے اور آپ کی زبان سوکھ گئی پیازی رنگ کے قصیدے کہتے کہتے۔

فرحت۔ (جو اپنی بیوی کی فطرت سے واقف ہے جھکہ کر) واللہ ثروت تم نے تو کمال کر دیا۔ ابھی اس سے تو واقعی بسائند اٹھ رہی ہے عقیل بھائی بھی کمال کرتے ہیں جو ایسی مچھلی بھیج دی۔

ثروت (طنزاً) شوق تو سب کو آتا ہے کہ طرح طرح کے کھانے پکائیں مگر ڈھنگ تو کسی کسی کو آتا ہے۔ کیوں جی کیسی تھی وُہ جو پچھلے ہفتے میں نے آپ کے لئے تلی تھی۔

فرحت (اپنے گناہ کی تلافی کا موقع پاتے ہوئے) واقعی وُہ تو ایسی عمدہ تھی کہ دل چاہتا تھا کھاتا ہی جاؤں۔ یہ پکانا بھی کوئی آسان کام نہیں اس میں تو ایک خاص ملکہ ہونا چاہیئے (زبان کو چٹخارتے ہوئے) مجھے تو اُس مچھلی کا مزا پھر سے آنے لگا۔

ثروت (فاتحانہ انداز میں) رشیدہ بھی کہتی ہوگی کہ میں نے آج کدو میں تیر مار لیا ہے۔ ابھی کل یہاں تھی مجھ سے ذکر کیا ہوتا تو ایسا طریقہ بتاتی کہ دنگ رہ جاتی۔ بھلا آپ کیوں اتنی خراب مچھلی کھائیں میں خود اس کو ٹھیک کر کے لاتی ہوں۔ آپ کو دیر تو جائے گی مگر میری خاطر ذرا دیر ہی سہی۔

فرحت۔ نہ بھئی تم پہلے کھانا تو کھا لو۔ شریف کو دو۔ وُہ اِس کو ٹھیک کر کے لے آئے۔ یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ آپ جیسی پکانے والی تو ہندوستان میں کوئی عورت ہی ہو گی۔

ثروت۔ نہیں نہیں میں خود ہی جلد ٹھیک کر کے لاتی ہوں دیکھنا تو اسی میں جان پڑی ہوئی معلوم ہو گی۔

(پلیٹ لے کر باہر چلی جاتی ہے)

فرحت۔ شریف جانا ذرا ان کو مدد دینا۔ ایسا نہ ہو کہ ہاتھ ہی جلا بیٹھیں۔

(شریف چلا جاتا ہے)

یہ عورت ذات بھی عجیب ہے ذرا سی تعریف کر دو تو مرنے مارنے کو تیار۔ لاکھ کہوں کبھی کام کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ آج ذرا دوسری کو کوس دیا ہے اور ان کی تعریف کر دی ہے تو کھانا تک بھی بھول گئی ہیں جیسے روز ہی مجھے پکا پکا کر کھلاتی ہیں اور پچھلے ہفتے جو کالی سیاہ مچھلی مجھے کھلائی تھی وُہ بھی کبھی بھول سکتی ہے۔ مفت میں گھی ضائع کر دیا تھا اور آج ہی خیر گزرے سے اچھی بھلی کا ستیاناس کرنے لگی ہیں۔

(گھڑی دس بجاتی ہے فرحت گھبرا کر اُٹھتا ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے وُہ کچھ کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر سمجھ میں کچھ نہیں آتا)

جابر عجمی

قطعات

شمیم اختر

مجھے رہ رہ کے کیوں تکتی ہے تو نھی شمیم اختر
نہیں جاتی تری آنکھوں کی حیرانی نہیں جاتی
ترے خاموش لب بے تاب [illegible] کہنے کو
یہ پہچانی ہوئی صورت ہے پہچانی نہیں جاتی

مجید لاہوری

آنسو

آہ کیا آج یہ نیرنگیٔ عالم دیکھی
اُن کی آنکھوں سے عیاں کیفیتِ غم دیکھی
عارضوں پر وُہ ڈھلکتے ہوئے آنسو توبہ!
میں نے شعلوں پہ مچلتی ہوئی شبنم دیکھی

ضیا ہلالی

خوشی

زندگانی کا یہ مقصد ہے کہ انسان خوش رہے
سچ تو یہ ہے ناخوشی کی زندگی اچھی نہیں
اور خوشی اچھی ہے وُہ جو ہو میسر غم کے بعد
جس خوشی کے بعد غم ہو وُہ خوشی اچھی نہیں

ضیا ہلالی

خامشی سے آنسوؤں کے درمیاں!

خامشی سے آنسوؤں کے درمیاں
جب ہوئے تھے ہم جُدا
دِل شکستہ اور برسوں تک نہ ملنے کے لئے،
تیرا چہرہ زرد تھا،
تیرے عارض سرد تھے،
سرد تر بوسہ ترا،
اور اُس لمحے کی پیشانی پہ تھے
دائمی غم کے نشاں!
صُبح کی شبنم مرے ابرو کے پاس
سرد ہو کر جم گئی؛
اور مجھ کو ہو گیا اُس دُکھ کی آمد کا یقیں
آج میں محسوس کرتا ہوں جسے

توڑ کر سب عہد و پیماں، کھو دیا تُو نے وقار،
تذکرہ تیرا جب آتا ہے کہیں
شرم سے گردن جُھکا لیتا ہوں میں
اِس طرح میں نام سُنتا ہوں ترا،
موت کا ناقوس ہو جیسے کہیں؛
کانپنے لگتا ہوں میں ———
کس لئے تُو اتنی پیاری تھی مجھے؟
کس کو یہ معلوم تجھ سے آشنا تھا میں کبھی
آشنا تھا خوب تجھ سے آشنا:
ایک عرصے تک پشیمانی میں روؤں گا تجھے
وُہ پشیمانی کہ ممکن ہی نہیں جس کا بیاں۔
ہم ملے تھے گوشۂ تنہائی میں:
کُنجِ خاموشی میں رونا ہوں میں آج،
بُھول بیٹھا تیرا دل کیوں کر مجھے؟
رُوح تیری دے سکی کیوں کر فریب؟
گر کبھی برسوں کے بعد ———
مل سکے ہم تم کہیں
خیر مقدم تیرا ہو گا کِس طرح؟ ———
خامشی سے آنسوؤں کے درمیاں!

(ماخوذ)

سعید احمد اعجاز

تتلیاں

آج بر خود غلط گلستاں کے
پھول کچھ اس طرح سے اترائے
جیسے زہرہ کے ہاتھ کی چوڑی
ٹوٹ کر آسماں سے گر جائے

رنگ و بو کے حسین جھرمٹ میں
کوئی نازک سی چیز لرزاں ہے
گر کے دوبارہ پھول کی پتی
شاخِ گل کی طرف خراماں ہے

جیسے قوسِ قزح کا اک ٹکڑا
آسماں کی فضاؤں سے آئے
اور پھر چوم کر گلستاں کو
آسماں ہی کی سمت اُڑ جائے

آسماں کی فضاؤں میں پریاں
جیسے بن ٹھن کے سیر کو آئیں
اور ماتھے سے ٹکلیاں سب کی
چھوٹ کر گلستاں میں گر جائیں

ایک حسینہ سے صاف پانی میں
جیسے مٹی کا تیل پڑ جائے
اور پھر سطح کا کوئی گوشہ
بس یونہی اپنے آپ اُبھر جائے

باغ میں جیسے ایک دوشیزہ
کوئی رنگین خط پڑا پا لے
اور پھر پڑھ کے ایک دو جملے
غصے میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے

دور، جمنا ندی کی لہروں میں
کرشن کی بانسری غزل خواں ہے
اور یہاں گوپیوں کا اک جھرمٹ
روپ میں تتلیوں کے رقصاں ہے

دوست! تم کہہ رہے ہو "ہم اور وہ"
پھر انہیں الفتوں میں کھو جائیں
ہاں! — اگر دوسرے جنم میں ہم
تتلیاں، گلستاں کی ہو جائیں!!

سلام

رکابی کیونکر ٹوٹی؟

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

افرادِ ڈراما

اعجاز ــــــ ایک اُنیس برس کا نوجوان جو کالج میں پڑھتا ہے

راشد ــــــ اعجاز کا باپ - ایک پولیس افسر

نجمہ ــــــ اعجاز کی سوتیلی ماں

اور گھر کے دوسرے افراد بچے - نوکر وغیرہ

موقع۔ راشد بڑے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹا ہوا ایک انگریزی ناول پڑھ رہا ہے ــــ حقہ ساتھ دھرا ہے ــــ نجمہ باورچی خانے میں مصروف ہے۔ اعجاز صبح سے کالج میں ہے۔

نجمہ۔ (باورچی خانے میں چیختی ہے) کہاں سو رہے ہیں آپ؟ چیخ چیخ کر گلا آ گیا ہے جو ذرا اپنے کانوں میں سے روئی نکالیں!

راشد۔ (لیٹے لیٹے حقے کا ایک لمبا کش لگا کر) کیوں کیا ہوا - ہاں سن تو رہا ہوں (نجمہ آگ بھبوکا بنی باورچی خانے سے کمرے میں آ جاتی ہے)

راشد۔ (کتاب بند کر کے) کیوں کیا ہوا ــــ؟

نجمہ۔ چولھے میں جائیں ایسے چونچلے - ایسا لاڈ پیار جو اولاد کو کوڑی بھر کا نہ چھوڑے - جو کہیں کوئی بات کہہ بیٹھتی ہوں تو گھنٹوں کٹی کٹی سی رہتی ہوں - کوئی یہ نہ سمجھے کہ لو نے سوتیلی ماں ہے بچے کی جان کی لاگو ہو رہی ہے - مگر پھر بھی کوئی حد ہوتی ہے کوئی ــــ

راشد۔ (بات کاٹ کر) مگر میرا مطلب یہ ہے کہ بات کیا ہے؟ (نجمہ کے جوشِ غضب میں ہلتے ہوئے ہاتھوں کو بغور دیکھتا ہے)

نجمہ۔ اور جو تنگ آ کر چھوٹی زبان سے نقطہ بھر لفظ نکال بھی دوں تو "کس پر برس رہی ہو - بات کیا ہے - یہ ہے وُہ ہے ــ"

راشد۔ (قدرے جھنجلا کر) ہاں اب بتا بھی تو کہ یہ تمہید ہی لیکچر کس موضوع پر ہے؟

نجمہ۔ لیکچر کا ہے کا سچی بات کہوں تو وہ لیکچر بن جاتا ہے - واہ رے مَن کی موج گھر تہ و بالا ہو رہا ہو - بھنگیوں کا تکیہ بن رہا ہو اور یہ پوچھے جاتے ہیں یہ لیکچر کس پر ہو رہا ہے -

راشد۔ (تنگ آ کر کتاب دوبارہ کھول لیتا ہے) بھئی بتانا ہے تو بتاؤ ورنہ ــــ

نجمہ۔ ورنہ - ورنہ یہی تو کہہ رہی ہوں کہ رات کو کورٹ انسپکٹر کے ہاں سے زردے کی ایک پلیٹ آئی تھی میں نے کہا اتنی رات گئے کون کھائے گا۔ صبح دوپہر کو گرم کر کے کھا لیں گے (ناک پر انگلی رکھ کر اور طنز سے) آپ کے فرزندِ رشید چپکے سے رات ہی رات کو سب کچھ اکیلے ہضم کر گئے اور یہی نہیں بلکہ کھانے کے بعد پلیٹ کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کرتے گئے۔

راشد۔ کیا سچ وہی کھا گیا؟

نجمہ۔ اور نہیں تو کیا جنات کھا گئے۔ آسمان کھا گیا۔ زمین نگل گئی ہمیرے فرشتے کھا گئے ——— وہی تو کھا گیا ہے ——— آدھی رات گئے اٹھا۔ "پیٹ میں درد ہوتا ہے امی جان چٹکی بھر سونف ہو تو دو" مجھے کیا معلوم یہ زردے کا درد ہے ورنہ کھلاتی اُسے سونف۔ پھر کچھ کہتی ہوں تو سو سو باتیں کرتے ہیں۔

راشد۔ (قدرے مسکرا کر سر کھجاتا ہے)

نجمہ۔ کیا مجھے پاگل سمجھتے ہیں آپ۔

راشد۔ (سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کسی گہرے سوچ میں مستغرق ہے)

نجمہ۔ یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ ان مہمانوں کے لئے رکھی ہوئی ساری کی ساری پیسٹری نکال کر کھا گیا۔ میں کسی کی دشمن تو نہیں ہوں آخر ماں ہوں۔ میرے بھی بچے ہیں۔ مگر ان روز روز کی شرارتوں پر کب تک آنکھیں میچے رکھوں گی ———

راشد۔ (کتاب بند کر کے اُسے انگلیوں سے ٹھونکتے ہوئے) مگر مگر اگر ——— میرا مطلب تم سمجھتی ہو گی کہ اگر زردہ کھا ہی گیا تھا تو پلیٹ کو کیوں توڑ دیا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔

نجمہ۔ اجی کیونکر سمجھ میں آئے بس خرمستی سمجھ لو۔ جوانی کا خمار جانو۔ نہ دیدوں میں ڈر نہ آنکھوں میں حیا۔ مرغے کی طرح اکڑتا پھرتا ہے اور پھر کوئی ذرا نصیحت کر کے تو دیکھے۔ بھئی مجھ سے نہیں سنبھالی جاتی اولاد آپ کی۔ اگر آپ اسی اولاد پہ پھولے پھرتے ہیں تو عاجز آئی میں بندی خدا کی۔ نیھے کو سنبھالئے اور ان دو کمبخت نامرادوں کو بھی میرا سلام ہے۔ (آواز بھرائی بنا کر) امی جان خدا جانے کتنی بیمار ہیں خط پر خط آ رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ یا اللہ میں ہی بدقسمت آپ لوگوں کی باندی بننے کے لئے رہ گئی تھی۔ سارا دن چولھا ہے اور ———

راشد۔ خیر اُس شریر کو آ لینے دو۔ باز پرس کریں گے!

نجمہ۔ ہاں ہاں شوق سے کیجئے باز پرس (طنز سے قہقہہ لگا کر) کیوں بیٹا وہ شرارت کیوں کی۔ کیوں بیٹا آئندہ تو ایسا نہ کرو گے نا۔ بچے یہ ہے بچے وہ ہے" آپ اُسے نصیحت دیتے ہیں یا پیار کرتے ہیں

راشد۔ نجمہ تم تو نری باولی ہی ہو۔ اول تو امجاز کوئی بچہ نہیں کہ چھڑی لے کر اُس کے سر ہو جاؤں دوسرے ——— (رُک جاتا ہے)

نجمہ۔ ہاں ہاں دوسرے ——— یہی نا کہ دوسرے ——— بولتے بولتے رُک کیوں گئے ———

راشد۔ کچھ یقین نہیں آتا کہ وہ اتنا خود سر ہو۔

نجمہ۔ (گہری آواز سے) خود سر ——— خود سر" اخاہ! امی جان میرے کوٹ کا ٹانکا ادھڑ گیا ہے ابا جان کا بوٹ پہنوں گا۔ امی جان کوٹ میلا ہو رہا ہے ابا جان کا پہن لوں گا" للہ سر پٹکتی ہوں کہ ان کے وردی کے جوڑے ہیں مگر وہ ہیں کہ (ذرا سانس لے کر بات بھول جاتی ہے) مگر وہ ہیں کہ ——— مگر وہ ہیں کہ ——— کیا ——— آخر دوسروں کے بھی بچے ہوتے ہیں کیا سدھے ہوئے من موہنی عادات میٹھی مسکراہٹیں۔ باادب نظریں نہ کہ چوبیس گھنٹے تنبورے کی طرح تنے رہیں ——— ابا جان کا ڈرائینگ روم ہے کہ ریڈیو گھور رہا ہے کہیں سے وہ کیا بنجو سیکھ آئے ہیں۔ سارا دن کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی (تقریر بے معنی ہوتی جاتی ہے) آخر پوچھو اس بنجو کا بھی بھلا کوئی سر ہے تان ہے ——— تن تن ——— تن تن ———

راشد۔ (چھیڑنے کے لئے) آخر بچہ ہے۔ ہارمونیم پر تیس روپے خرچ نہ کئے دو ڈھائی کا سستا سا دل بہلاوا خرید لیا۔ بنجو تو کوئی بیہودہ تقریر نہیں مطلب یہ کہ کوئی بیہودہ چیز نہیں ——— چیز نہیں۔

نجمہ ——— (خاموش ہو جاتی ہے ——— خدا جانے غصے سے یا ویسے

کوئی جواب نہیں سوجھتا)

راشد۔ (بات شروع کرنے کے لئے) مطلب یہ کہ زردہ کھا گیا اور پلیٹ توڑ گیا۔

نجمہ۔ (طنز سے سر جھٹک) ہوں۔!

راشد۔ مگر اتنی دیدہ دلیری کی کوئی معقول وجہ بھی تو ہونی چاہیے نا؟

نجمہ۔ (جوش سے پھر شروع ہو جاتی) وجہ۔ وجہ۔ میں تو ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ آج کل زمانہ ہی ایسا ہے ذرا کچھ پڑھ لکھ گئے تو خدا معلوم کیا تیس مار خاں بن جاتے ہیں۔ وُہ پُرانے زمانے گئے جب چار چار بچوں کے باپ بن جانے کے بعد بھی لڑکے ماں باپ کے سامنے اُف تک نہ کرتے تھے۔ آج کل ماں باپ کا پیسہ ہے۔ سکول کیا سینما گھر بن رہے ہیں ڈرامے ہوتے ہیں فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ روزانہ ورزش کے بہانے ایک آدھ گھنٹہ نٹوں میراثیوں کے کرتب سکھائے جاتے ہیں۔ اور جب سارا دن فضولیات پر مغز مارتے مارتے باہر نکلتے ہیں تو کبھی رومال سے بوٹ کی گرد جھاڑتے ہیں۔ کبھی ٹائی سیدھی کرتے ہیں۔۔۔ ماں باپ کے گاڑھے پسینے کی کمائی کی انہیں قدر ہو تو کیونکر ہو۔۔۔ جب تک کہ۔۔۔

راشد۔۔۔ تو پھر کیا پڑھائی چھڑا دوں۔۔۔؟

نجمہ۔۔۔ (قدرے اطمینان سے) پڑھائی چھڑانے کی تو بات نہیں بات تو فقط یہ ہے کہ ان خود سر لڑکوں کو احساس بھی تو ہو کہ یہ پیسہ کدھر سے اور کیونکر آتا ہے۔

راشد۔ یعنی کہیں نوکر کرا دوں؟

نجمہ۔ ہاں ہاں کہہ تو رہی ہوں کہ آج کل قسمت سے سرکاری بھرتی بھی کھلی ہے۔

راشد۔ (قدرے ناک بھوں چڑھاتا ہے)

نجمہ۔ (سانس لے کر قدرے آہستہ سے) آخر تو نوکری کرنی ہے۔ کیوں رہ گیا نا میرا لال جیسے کہیں کا کمشنر اسی کو ہونا ہے۔ سنتے ہیں (قدرے آہستہ سے) آخر وُہ امجد بھائی کا بیٹا احمد بھی تو وہیں کہیں گیا ہے نا۔۔۔ کیا نام ہے اُس جگہ کا۔۔۔ اوہ! یہی کچھ تو ہے۔۔۔ جل پور۔۔۔ جل پور۔۔۔

راشد۔۔۔ جبل پور۔۔۔؟

نجمہ۔۔۔ ہاں ہاں وہیں جبل پور ہی تو گیا ہے۔۔۔ وُہ چلا گیا تو اس میں کونسا سرخاب کا پر لگا ہے

راشد۔۔۔ مگر ایسے بھولے بھالے بچے کو ایسی گندی نوکری؟

نجمہ۔۔۔ (بات کاٹ کر اور لمبا سا ٹھنڈا سانس لے کر) اوہ اہو! بھولا بھالا۔۔۔ خُدا ایسا بھولا بھالا کاش ہمیں بھی بنا دیتا۔۔۔ یہ بھولا پن میکے ہی سے سیکھ آتے تو کاہے کو جوتیاں کھاتے پھرتے۔۔۔ اجی وہ تو بہروپیا ہے۔ پکا بہروپیا۔ آپ کو دیکھا تو بس بن گئے بگلا بھگت۔ مُنہ لٹکا لیا۔۔۔ آنکھیں نیچی کر لیں اور آواز گلے میں گم کر لی اور اندر سے کھول کر دیکھو تو۔۔۔

راشد۔۔۔ (بات بدلنے کیلئے) نوکر بازار سے سبزی اچھی لایا تھا یا کل ہی کی طرح ناقص ہے؟

نجمہ۔۔۔ (اپنی ہی دُھن) ہاں ہاں سبزی سبزی۔ اجی سبزی چھوڑ وہ تو چھلاوا ہے۔۔۔ سبزی سبزی۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔ کونسی سبزی۔۔۔ کدھر سبزی؟

راشد۔۔۔ نجمہ! پاگل تو نہیں ہو رہی ہو۔۔۔؟

نجمہ۔۔۔ ہاں! اب پاگل بننا ہی رہ گیا تھا۔ سو بن گئی۔ گھر کیا ہے پاگل خانہ بنا ہوا ہے۔ بھنگیوں کا تکیہ بن رہا ہے۔ وُہ شور۔۔۔ وُہ شور۔۔۔ وُہ دھما چوکڑی۔۔۔

راشد۔۔۔ (سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے) اچھا آنے دو شیطان کو۔

نجمہ ---- (بات دہرا کر) آپ اپنے دو شیطان کو ---- (طنز سے قہقہہ لگا کر) ذرا دو چار دن تم بھی پیل لئے ہوتے ---- کیسے جیسے آتے ہی اُسے کھا ہی تو جائیں گے ---- اور اور جب آمنے سامنے ہوں گے تو آؤ بیٹا ---- کھاؤ بیٹا ---- چلو بیٹا ---- سنو بیٹا ---- بیٹا ---- بیٹا ---- بیٹا ہی بیٹا ---- بیٹے کے لئے بچھے بچھے جاتے ہیں۔ بیٹے کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں ----

(اعجاز ہانپتا ہُوا اندر داخل ہوتا ہے۔ پسینے میں شرابور اور بوٹ پر گرد جمی ہوئی۔ بغل میں کتابوں کا بنڈل ہے)

اعجاز ---- امی جان سلام عرض کرتا ہوں ----

نجمہ ---- (آہستہ سے) جیتے رہو بیٹا ---- !

اعجاز ---- ابا جان سلام عرض ہے ---- !

راشد ---- خاموشی ----

(اعجاز قدرے جھجک کر کچھ خوف اور شک سے کنکھیوں سے والد کی طرف دیکھتے ہوئے دوسرے کمرے میں گھس جاتا ہے)

نجمہ دوپٹے سے منہ پونچھتی ہوئی باورچی خانے میں میں چلی جاتی ہے۔

راشد ---- (آواز دیتا ہے) اعجاز ---- !

اعجاز ---- جی ابا ---- آیا ----

(اعجاز کمرے میں داخل ہوتا ہے)

راشد ---- (ماتھے پہ تیوری ڈال کر اور بلند آواز سے جو باورچی خانے تک بخوبی سنی جائے) کیوں رے بہروپئے ---- وہ زردہ تو نے کھایا ہے ؟

اعجاز ---- (حیران نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) زردہ ---- ؟

راشد ---- (بلند آواز میں) ہاں ہاں زردہ کھالیا اور رکابی توڑ ڈالی ---- !

اعجاز ---- اور رکابی توڑ ڈالی ----

راشد ---- ہاں رکابی توڑ دی !

اعجاز ---- رکابی توڑ دی ---- یعنی میں نے ---- اور (آہستہ سے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) ---- مگر کون کہتا ہے ---- ؟

راشد ---- (بلند آواز میں) کھڑے ہو جاؤ ---- (اور زیادہ بلند آواز میں) تمہاری امی کہتی ہیں۔ بتاؤ یہ روز روز کی شرارتیں کب بند ہوں گی ؟

اعجاز ---- ابا جان ایمان سے کہتا ہوں مجھے تو زردے کی خبر ہی نہیں۔ کونسا زردہ اور کیسا زردہ اور کیسی رکابی۔ یہ کیا اسرار ہے۔ کونسا زردہ کونسی رکابی۔ کہاں پڑی تھی اور یہ کیا معاملہ ہے ---- ؟

(نجمہ چک اُٹھا کر اندر داخل ہوتی ہے)

نجمہ ---- زردہ تو خیر معمولی بات تھی۔ چیزیں کھانے پینے کے لئے ہی ہوتی ہیں۔ مگر پلیٹ اور وہ بھی پرائی توڑ دینا تو حماقت ہے ---- ۔

اعجاز ---- مگر امی جان میں تو سمجھ ہی نہیں رہا کہ بات کیا ہے ---- ؟

راشد ---- (رعب سے مونچھوں کو تاؤ دے کر) ہوں ---- کیسا زردہ اور کیسی رکابی ---- (بلند آواز سے) جرم کا اقبال کرتا ہے کہ نہیں ---- ؟

اعجاز ---- کیسا جرم ابا جان ---- ؟

راشد ---- رکابی اور زردے والا ----

اعجاز ---- (انگلی دانتوں تلے دبا کر سوچتا ہے) زردے اور رکابی والا جرم ؟

راشد۔ اور لاعلمی تیسرا جرم —

(نجمہ خاموشی اور اطمینان سے دوسرے پلنگ پر بیٹھ کر سوئے ہوئے ننھے کو پنکھا کرنے لگتی ہے)

راشد۔ (زمین پر زور زور سے پاؤں مارتا ہے) آج تمہیں ہرگز معاف نہیں کیا جاسکتا۔ بولو —! — جرم کا اقبال کرتے ہو نا؟

(اعجاز کی چھوٹی سوتیلی بہن صبیحہ دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی ہے اور اس عدالتی کارروائی کو دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہے۔ کبھی اعجاز کے چہرے کو دیکھتی ہے اور کبھی اپنے ابا کے منہ کو۔)

راشد۔ کیوں اقبال ہے نا —!

صبیحہ — اقبال — ہاں اقبال — (صبیحہ ہاتھ اٹھا کر اور منہ بنا بنا کر کہتی ہے) — اقبال تو روز مدرسے آتی ہے — میری بڑی اچھی سہیلی ہے۔ ہم دونوں اکٹھے بیٹھتے ہیں دیکھو نا اباجی ہماری استانی بڑی خراب ہے —

راشد۔ (صبیحہ کو گود میں اٹھا لیتا ہے اور اسے پیار کرنے لگتا ہے — ادھر اعجاز کو بیٹھ جانے کا اشارہ کرتا ہے اور وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

صبیحہ — (ابا کے پیٹ پر اچھلتے ہوئے) کیوں ابا کھایا نا زردہ — آج پھر کھائیں گے۔

نجمہ — (چونکنی ہو کر) کیسا زردہ ری لڑکی —؟

صبیحہ — (شوخی سے اچھل اچھل کر) رات ابا نے اور میں نے چوری چھپے پلیٹ میں رکھا ہوا سارا زردہ کھا لیا —

راشد۔ (سنجیدہ سی شکل بنا کر) اور پلیٹ اس نٹ کھٹ کے ہاتھوں سے چھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

(اعجاز حیرت سے ادھر ادھر دیکھتا ہے — نجمہ کھسیانی ہو کر قدرے مسکراتی ہے)

راشد — کیوں سمجھ گئے بیٹا۔ معاملہ کیا تھا —!

نجمہ — (کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے) رہنے بھی دیجئے — یہ شرارتیں کیا مجھ موئی کا دماغ چاٹنے کے لئے ہوا کرتی ہیں (پھر قدرے متین چہرہ بنا کر بات بدلتے ہوئے)

امی جان خدا جانے کتنی بیمار ہیں — بس اگلے پیر کو میں راولپنڈی چلی جاؤں گی۔

شمس الرحمٰن درانی

تصحیح۔ حضرت ادیب کنڈپوی نے اطلاع دی ہے کہ حضرت سیماب کی نظم مطبوعہ "ہمایوں" بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۱ء کا مطلع جس کے متعلق ہم نے کچھ شک ظاہر کیا تھا خود انہوں نے بدل دیا تھا ورنہ سیماب صاحب کا مطلع یہ تھا۔

کرتے ہو کیوں آہ و فغاں میری لحد پر آ کے تم — روتے ہو یا رات دن ناحق مجھے دفنا کے تم

غالب کا ایک خط۔ اکتوبر کے پرچے میں سید آغا حسین صاحب کے مضمون غالب کا ایک خط میں دو تین جگہ مرزا نوشتہ کا ذکر آتا ہے۔ ایک صاحب نے ہم سے مرزا نوشتہ کی حقیقت دریافت فرمائی ہے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ہمارے طباع خوش نویس صاحب نے اس مضمون میں غالب کے عرف مرزا نوشہ کے بجائے جگہ جگہ محض اپنا عرف لکھ دیا ہے اور کوئی بات نہیں۔ "ہمایوں"

کوہسار کی رنگیں وادی میں

تصویرِ گزشتہ دور کی اک آنکھوں میں سمائی جاتی ہے
کہسار کی رنگیں وادی میں اُف تیری یاد ستاتی ہے

چشموں کے دہانوں پر اب بھی وُہ کیف کا عالم ہوتا ہے
کہسار کے سبزہ زاروں میں پھولوں کا مُنہ کوئی دھوتا ہے
کچھ اُونچے درختوں کا سایہ پانی میں مزے سے سوتا ہے
اِس حُسن کے رنگیں منظر میں دن رات مرا دل روتا ہے

تصویرِ گزشتہ دور کی اک آنکھوں میں سمائی جاتی ہے
کہسار کی رنگیں وادی میں اُف تیری یاد ستاتی ہے

ندی کے بے خود نغموں کا ہے اب بھی پُرانا ساز وہی
پانی کے مچلتے دھاروں کا مخمور خرامِ ناز وہی
مدہوش فضاؤں میں اب تک الفت کے نہاں ہیں راز وہی
اور ڈھونڈتا ہے۔ دل میرا یہاں سجدے وہی، ذوقِ نیاز وہی

تصویرِ گزشتہ دور کی اک آنکھوں میں سمائی جاتی ہے
کہسار کی رنگیں وادی میں اُف تیری یاد ستاتی ہے

ہاں چاندنی راتوں میں اب بھی دلدوز نظارے ہوتے ہیں
آکاش کے تارے شبنم کے نورانی ہار پروتے ہیں
مسحور ہواؤں کے جھونکے بے ہوش کی دنیا کھوتے ہیں
اُف میری جان پہ بنتی ہے جب دونوں عالم سوتے ہیں

تصویرِ گزشتہ دور کی اک آنکھوں میں سمائی جاتی ہے
کہسار کی رنگیں وادی میں اُف تیری یاد ستاتی ہے

ش۔ا۔ شمیم جالندھری

بہ حضورِ اقبالؒ

(۱)

خودی کی چاہ سے واقف نہیں دل — ابھی اس راہ سے واقف نہیں دل
ابھی دل میں ہے خاشاکِ من و تو — کہ تیری آہ سے واقف نہیں دل

(۲)

ترے حقائقِ روشن ہیں بے نیازِ دلیل — ترے نکاتِ خودی ہیں بہت جلیل و جمیل
تری نظر سے حسین تر چمن میں لالہ و گل — تری نوا سے رواں تر فرات و دجلہ و نیل
فضائے عالمِ اُردو میں یوں ہیں شعر ترے — ہو جس طرح سے بیاباں میں ہجومِ نخیل
ترا کلام مری جانِ مضطرب کا قرار — ترا کلام مرے وہم کو پیامِ رحیل۔
ترے کلام کو دل معجزہ سمجھتا ہے — کثیر جس کے معانی ہیں اور لفظ قلیل

اندھیری[۱] رات میں گم کردہ راہ راہی کو
یہ تیری شعلہ نوائی ہے واقعی قندیل

جگن ناتھ آزاد

[۱] اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل — اقبالؒ

اصغر کی یاد

تقریباً سترہ مہینے ہوئے کہ اُس کی دائمی جدائی کا المناک واقعہ ہوا۔ میں کبھی کبھی اُس کی چیزوں سے اَور اُس کے کاغذات سے دل دُکھاتا رہا، اُس کے حالات یاد کر کے یا جمع کر کے دل بہلاتا رہا۔ ایک سال ہُوا جب ہم پہاڑ سے لاہور واپس آئے تو میں نے اِرادہ کیا کہ اب کی سردیاں حیاتِ اصغر لکھنے میں صرف کروں گا۔ چنانچہ اَور سب کاموں کو تہ کر کے رکھ دیا، کاغذات ایک جگہ جمع کر لئے، اُس کی چیزوں کو ترتیب دی، اِنہیں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ چند دوستوں عزیزوں کو اُس کے مزید حالات کے لئے لکھا، ولایت اَور خطوط لکھے جن میں سے بعض کا حال ہی میں جواب آیا ہے اَور اکثر کا اب تک جواب نہیں ملا، وہاں والے اپنی مصیبتوں میں گرفتار ہیں، کیا کریں،

یہ اکتوبر سنہ ۴۰ء کا واقعہ ہے لیکن جلد اس کام کو چھوڑنا پڑا، چھوڑ کیسے سکتا ہوں ملتوی کرنا پڑا۔ ہر ہفتے صاحبِ فراش ہو جاتا، سمجھ میں نہ آتا کیا بات ہے؟ آخر ایک دوست نے سمجھایا اَور اصرار کیا کہ فی الحال اس محبوب کام کو چھوڑ دو۔ میں نے بھی جی سے کہا کہ جینا ہے اپنے لئے دوسروں کے لئے محض جینے کیلئے بھی۔ لیکن نرا فلسفہ کام نہ آیا۔ آخر اپنے آپ کو چند ایسی باتوں میں ڈال دیا جن سے مجھے انتہائی دلچسپی تھی، اپنے خلاف سازش کی۔ اُردو زبان کے مسائل اور موجودہ حالت پر غور کیا، ایک طویل تبصرہ لکھ مارا، پنجاب میں ہندی والوں نے شورش بپا کی تھی، سو اُردو کی حمایت کا بیڑا اٹھایا کہ مجھے اسی میں سارے ہندوستان کی اَور مسلمانوں کی بہتری نظر آئی۔ پنجاب کے مسلم طلباء کی تنظیم ذمے لے کر اُنہیں بعض تعمیری کاموں میں لگانے کی کوشش کی۔ اس طرح اپنے آپ کو غم سے چُھڑا کر کچھ ہوش سنبھالا گو ابھی یہ معلوم نہیں کہ چھوڑے ہوئے کام کو پھر شروع کرنے کے قابل ہوا ہوں کہ نہیں۔ بہرحال اِرادہ ہے کہ اب اصغر کی چند انگریزی نظموں کو ایک ننھے سے مجموعے کی صورت میں پیش کر دیا جائے۔

جانے والا چلا گیا لیکن رہنے والے بھی اب وُہ پہلے سے نہیں رہے۔ اَور نہیں تو اُسے یاد ہی کرتے ہیں اُس کے لئے نہیں اپنے لئے۔ زندگی کے ہزاروں پہلو ہیں کوئی شخص چند کو بھی دیکھ سکے اَور سمجھ سکے اَور اُن پر غور کر سکے تو غنیمت ہے۔ اس عرصے میں کئی لوگوں کے دُکھ درد سے واقفیت ہوئی اَور جدھر کبھی نگاہ بھی نہ اُٹھتی تھی اُٹھی۔ نوعِ انسان کے دُکھ سُکھ کس قدر ملتے جلتے ہیں۔ ابھی پچھلے روز میں اپنے ادیب دوست اسد ملتانی صاحب کا وُہ نوحہ پڑھ رہا تھا جو اُنہوں نے اپنے ننھے بیٹے امجد کی یاد میں لکھا، اِس لاجواب مصرع کی تکرار نے عزیز تریں اصغر کو پھر سامنے لا کر کھڑا کر دیا، اُس کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔

"وُہ جی گیا بہت کچھ تھوڑی سی زندگی میں"

بشیر احمد

محفلِ ادب

سُلطان واجد علی شاہ اور فنِ موسیقی

ہندوستان میں موسیقی کو ترقی دینے میں سب سے زیادہ ہندو فرمانرواؤں نے حصہ لیا ہے۔ کیونکہ موسیقی ہندو مذہب کا بہت بڑا جزو ہے۔ لیکن ہندوؤں کے عہدِ حکومت کے بعد مسلمان بادشاہوں نے بھی کس طرح ہندوستان کے فنِ موسیقی کو چار چاند لگائے ہیں اس کا اندازہ سُلطان واجد علی شاہ کے مندرجۂ ذیل واقعات اور حالات سے ہو سکتا ہے۔

سُلطان واجد علی شاہ کو موسیقی کا نہایت درجہ ذوق تھا۔ اس میں ترقی کرتے کرتے بہت بڑے نائک بن گئے تھے بڑے بڑے استاد گویئے ان کی استادی کے قائل تھے اور ان کے سامنے کان پکڑتے تھے، اور بڑے مشہور گویئے بھی ان کے سامنے استادی میں پورے نہیں اُترتے تھے۔ موسیقی میں تو بادشاہ کا جواب ہی نہ تھا۔ ایسا کمال تھا کہ سینکڑوں کلاونتوں کے ہاتھ میں ناڑے بندھوا دیئے۔ دُتّی خاں جس نے کلکتہ میں بڑی شہرت حاصل کی تھی، اُس کی آواز اس بلا کی دلفریب تھی کہ کسی طوائف کا رنگ بھی اُس کے سامنے نہ جم سکتا تھا۔ وُہ مٹیا برج میں آدھی رات کو کسی کے یہاں گا رہا تھا۔ بادشاہ نے آواز سُنی تو بیتاب ہو گئے اور بڑے ذوق و شوق سے بلوایا۔ وُہ سمجھا کہ میری قسمت کھل گئی مگر بادشاہ نے اس کا گانا سنا تو کہا کہ اس کی آواز ہی آواز ہے گانا نہیں جانتا۔ اپنے عہد میں انہوں نے اس علم کو بہت ترقی دی۔ خود ستار ایسا بجاتے کہ روتے لوگ ہنس پڑتے اور ہنستے رو دیتے۔ لَے اس قدر رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی کہ پاؤں کا انگوٹھا سوتے میں بھی لَے پر چلنے لگتا۔ اسی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ فنِ رقص میں بھی کامل مانے جاتے۔ سے داری میں کوئی اعلیٰ درجہ کا گویا بھی بادشاہ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس کو قدرت کی دین کہنا چاہیئے۔ ناچ میں بادشاہ کا اُستاد دُرگا پرشاد کتھک اور شاگرد بندادین بتایا جاتا ہے، مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ کو ناچ میں صرف اتنی بصیرت حاصل تھی کہ اگر کوئی شخص ناچ میں اور اس کی گت میں غلطی کرتا، تو خود ہاتھ اُٹھا کے بتا دیتے کہ یوں نہیں، یوں ناچو۔ یہ جو مشہور ہے کہ بادشاہ خود ناچا کرتے تھے، بالکل غلط ہے۔ وُہ نہ کبھی لکھنؤ میں ناچے اور نہ مٹیا برج میں۔ معتبر ڈھاریوں سے جو سالہا سال بادشاہ کے ساتھ رہے اس کی تصدیق ہوتی رہی جس کی صحت میں مطلق شبہ نہیں ہو سکتا۔ اور بادشاہ کے ناچنے کی جتنی تصویریں دکھائی جاتی ہیں اور لندن تک پہنچ گئی ہیں سب فرضی، مصنوعی اور جھوٹی ہیں۔ یہ منجملہ ان کارستانیوں کے ہیں جو رزیڈنٹ نے بادشاہ کے بدنام کرنے کے لئے اختیار کی تھیں۔ انتزاعِ سلطنت کے وقت جہاں اکثر شاہزادے اور خاندانِ شاہی کے نامور افراد ان کے مخالف بنائے گئے، اور اُن کی واقعی اور غیر واقعی بُرائیاں طشت از بام کی گئیں، وہاں ناچنے کا الزام بھی اُن کے سر تھوپ دیا گیا۔ جو کچھ قیصر باغ کے میلوں کے موقع پر مشہور ہے اس کی اصلیت یہ ہے کہ بادشاہ ناچتے نہ تھے بلکہ کھیلتے تھے۔ تاریخوں میں ہندوستان میں کئی مسلمان بادشاہ موسیقی کے کامل استاد بتائے گئے

ہیں، مگر میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کسی کو بھی اتنی اعلیٰ معلومات حاصل ہوں جتنی واجد علی شاہ کو حاصل تھیں۔ جن ڈھاڑیوں کی بادشاہ تک رسائی تھی وُہ دری تھے جو موسیقی میں پورا کمال رکھتے تھے۔ ہاں گانے میں البتہ انہماک اور ناچ دیکھنے کا بے انتہا شوق تھا۔ مگر اس میں بھی کبھی کلکتہ کی کسی بازاری طوائف کا مجرا نہیں دیکھا۔ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے متوعات کے مختلف گروہ اور طائفے بنا لئے تھے ہر طائفے کو خاص انداز اور خاص قسم کا ناچ سکھایا جاتا۔ ایسے متعدد طائفے تھے، مثلاً نتھ والیاں، جھومر والیاں، لٹکن والیاں، نقل والیاں، رادھا منزل والیاں وغیرہ۔ ان سب کی تعلیم پر ڈھاڑی مقرر تھے، جو دونوں وقت تعلیم دیتے۔ بادشاہ کو جب ناچ دیکھنے کا شوق ہوتا، انہیں طائفوں کو جن میں سے اکثر بڑی خوبصورت، بانکی اور پری جمال عورتیں تھیں بُلوا لیتے۔

ایک مرتبہ کوٹھی اسد منزل میں بادشاہ نے پندرہ روز کا جشن کیا تھا۔ کوٹھی کے ہال میں چاندی کے پلنگ پر تکیے پر جھکے بیٹھے رہتے۔ گرد باز آفرین متوعات کا جھرمٹ ہوتا، جو فرش پر بیٹھی رہتیں۔ اور سامنے متوعات کے طائفے باری باری آکر مجرے کرتے۔ کسی سے بھاؤ یا گت میں کوئی غلطی ہو جاتی تو اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بتا دیتے۔ غضب کا طبلہ بجاتے تھے۔ اور بھاؤ غضب کا بتاتے تھے، جب کسی سے غلطی ہوتی اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے آنکھ سے بتا دیتے۔ ٹھمری ایسی کہی کہ ہندوستان میں کسی نے نہ کہی تھی۔ بادشاہ نے نئی راگنیاں ایجاد کیں، جن کے نام اپنی طبیعت داری سے جوگیا، کنٹر، جوہی، بادشاہ پسند وغیرہ رکھے۔ آواز اچھی نہ تھی، اور کسی قدر گراں گوش بھی تھے۔ موسیقی پر کتابیں تصنیف کیں۔ مثلاً ناجو، بنی، دُلھن وغیرہ۔ محرم کی ساتویں تاریخ آسمانی کوٹھی سے بادشاہی مہندی اُٹھتی۔ اس میں معمول تھا کہ تقریباً ایک گھنٹہ تک خود گلے میں تاشہ ڈال کے بجاتے، بڑے بڑے نامور اور مشہور گویئے گلوں میں ڈھول ڈال کر ساتھ دیتے۔ بادشاہ ایسی صفائی، سُبکی اور خوش اسلوبی سے اور ایسی خوشگواری کے انداز سے تاشہ بجاتے کہ ڈھاڑی واہ واہ کے نعرے بلند کرتے اور نہ جاننے والے بھی حیران و ششدر رہ جاتے۔

سب سے پہلا اُردو ڈراما اندر سبھا ہے، جس کو امانت نے عہدِ واجدی میں تصنیف کیا تھا۔ یہ ڈراما موسیقی وار کامیڈی ہے۔ اندر سبھا نہ تو واجد علی شاہ کے حکم سے لکھی گئی، نہ اس کا کھیل کبھی قیصر باغ میں ہوا اور نہ کبھی بادشاہ اس میں شریک ہوئے۔ بادشاہ کا راجہ اندر بننا بالکل بے اصل ہے۔ البتہ وہ مختلف پارٹ مختلف لوگوں کو تقسیم کر دیتے تھے۔ چونکہ قیصر باغ کا ذکر آگیا ہے۔ اس لئے ہم کسی قدر اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اس عالیشان اور یادگارِ زمانہ عمارت کو سلطانِ عالم نے اسی لاکھ روپے میں تیار کروایا تھا جو پہلے کے مقابلہ میں اب ایک کھنڈر کی سی حالت میں ہے۔ اسی قیصر باغ میں واجد علی شاہ نے نہایت پُرلطف میلہ کیا تھا جس میں تین روز تک مسلسل اسی ہزار و بندگانِ دامنِ دولت کو طعامِ خوشگوار عطا ہوا۔ بنیاد اس میلہ کی یہ تھی، کہ واجد علی شاہ کی چھٹی کی آرزو پیران کی ماں نے لڑکپن میں جو گیا لباس پہنایا تھا، اس کی سالگرہ اسی لباس میں ہوتی تھی۔ بادشاہ نے اپنے عہد سلطنت میں میلہ قرار دے دیا۔ قیصر باغ کے قریب ایک بڑا بھاری سایہ دار درخت تھا، اس کے نیچے گرداگرد سنگِ مرمر کا ایک نفیس گول چبوترہ بنایا گیا تھا جس پر قیصر باغ کے میلوں کے زمانے میں جہاں پناہ جوگی بن کے اور گیروے کپڑے پہن کے آتے اور دھونی رما کے بیٹھتے۔ اس

میلہ میں پبلک کو بھی قیصر باغ میں آنے اور جہاں پناہ کی عشرت پرستیوں کی بہار دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس دیکھا تھا اور سری کرشن جی کی معشوقانہ وش عاشقی اِس قدر پسند آگئی تھی کہ اُس رہس سے خود اپنا کھیل ڈراما کے طور پر ایجاد کیا تھا۔ اُس میں ناچ رنگ کی محفلیں گرم ہوتیں، موتیوں کو جلا کے بھبوت رمائی جاتی، اور فقیری میں بھی شاہی کے کرشمے نظر آتے۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی ہوگئی تھی میلہ میں شریک ہونے کی عام اہلِ شہر کو اجازت ہوجاتی مگر اس شرط سے کہ گیردے کپڑے پہن کے آئیں۔

اسرارحسن خاں طباطبائی — "دین دنیا"

ملاقاتی

کھٹ! کھٹ! کھٹ!
جنّت کا دروازہ کھولو!

مولانا!
دیکھنے والا کوئی نہیں
آدھی رات ہے مولانا
کھٹ! کھٹ!
ہاں ہاں میں شیطان ہوں بے شک
آپ کا خدمت گار پُرانا
مولانا!
کھٹ! کھٹ! کھٹ!

چوری چوری
آپ کے پاؤں
رات کو دابنے آیا ہوں۔
جنّت کا دروازہ کھولو ــــــــ مولانا!

مہدی علی خاں — "ادبی دنیا"

مطبوعات

دیس کی لیلا:- از میاں عبدالمجید بھٹی یہ مختصر سی کتاب میاں عبدالمجید بھٹی کے گیتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام گیت حبِ وطن کے موضوع سے متعلق ہیں۔ زبان ہندی آمیز اور شیریں ہے۔ لیکن بعض مقامات پر ہندی کے الفاظ بہت ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ جہاں بھرتی کی کوشش نہیں کی گئی وہاں ہندی اور اُردو کا یہ امتزاج مزا دے گیا ہے۔ قیمت ۴ر پتہ:- ہونہار بک ڈپو لاہور

متاعِ حرم:- از محترمہ زیب عثمانیہ۔ متاعِ حرم میں ادبی نظموں کے علاوہ اصلاحی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں محترمہ زیب عثمانیہ نے اقبال ؒ کا تتبع کرنے کی کوشش کی ہے مگر وُہ اس میں زیادہ کامیاب نہیں رہیں۔ اقبال ؒ کی سی وسعتِ نظر اور پختگیٔ فکر حاصل کرنا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں اصلاح کو پیشِ نظر رکھا ہے اور مقصد کو آرٹ پر ترجیح دی ہے مگر اقبال ؒ محض خشک پیغام بر ہی نہ تھے بلکہ آرٹ اور شعریت کے لحاظ سے بھی اُردو شاعری میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ اس مجموعہ کی ادبی نظمیں خوب ہیں۔ غزلیں بھی پاکیزہ ہیں۔ تغزل میں بھی شاعرہ نے اقبال ؒ کا تتبع کیا ہے۔ اور بعض غزلیں تو ایسی ہیں جو بالِ جبریل کی غزلیات کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہیں۔ ہماری رائے میں یہ روش کچھ پسندیدہ نہیں۔ زیب عثمانیہ کی بعض نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انہیں شاعرانہ صلاحتیں بخشنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ انہیں چاہیئے کہ وُہ اپنے اس جوہر کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں۔ قیمت ۱۲ر پتہ:- کریمی دواخانہ بازار شیخو پورہ لدھیانہ

زہریلی مکھی:- از سید محمود مورخ بی اے۔ یہ کتاب جنابِ مورخ کے مختصر افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ "گذارش احوالِ واقعی" کے عنوان سے جنابِ مصنف نے اپنے افسانوں کے پہلے مجموعہ "شہرِ خموشاں" کے متعلق "جامعہ" دہلی کی تنقید پر یوں تبصرہ فرمایا ہے — اس جاہل کو یہ بھی معلوم نہیں کہ طلسم ہوشربا اور سائنٹفک افسانوں میں کیا فرق ہے..... جاہل مُبصر نے لکھا ہے کہ..... مُبصر کو چاہئے کہ آئندہ کسی کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے مختصر افسانوں کے اصول اور ان کے اجزائے ترکیبی سے پوری واقفیت حاصل کر لے۔ مجھے حیرت اور سخت حیرت ہے کہ ماہنامہ "جامعہ" کے فاضل مدیر نے اِس قدر جاہلانہ تبصرہ شائع کرنا کس طرح گوارا کر لیا"

اِن سطور کے پڑھنے کے بعد اس کتاب پر تنقید کی ہمت نہیں پڑتی۔ کیونکہ مورخ صاحب کا "نقش ثالث" "نقش اوّل" سے کسی صورت میں بھی بہتر نہیں۔ اور "زہریلی مکھی" بھی "جاہلانہ تبصرہ" سے زیادہ کسی چیز کی مستحق نہیں۔ چونکہ راقم الحروف نہیں چاہتا کہ مصنف کو اپنے افسانوں کے چوتھے مجموعے میں "ہمایوں" کے فاضل مدیر کے متعلق "حیرت اور سخت حیرت" کا اظہار کرنا پڑے — اِس لئے اِس کتاب کے متعلق کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ کاغذ معمولی قیمت ۱۲ر پتہ: گلفروش پبلشنگ ہاؤس دہلی

ذکر و فکر:- از مقصود زاہدی۔ یہ کتاب مختصر افسانوں۔ خاکوں اور متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ مقصود صاحب ایک نوجوان اور نومشق ادیب ہیں۔ قیمت ۸ر پتہ:- زاہدی برادرز — ۱۶ — زاہدیاں میرٹھ

باغِ دلکشا، از ملکہ آفاق زمانی بیگم۔ یہ کتاب آفاق زمانی بیگم صاحبہ کا دیوان ہے۔ محترمہ پُرانے رنگ میں غزل کہتی ہیں۔ قیمت ۱ر پتہ:- ملکہ آفاق زمانی بیگم۔ کٹڑہ غلام علی امروہہ ضلع مراد آباد

جغرافیۂ دنیا:۔ از سید شرف الدین قادری۔ یہ ایک درسی کتاب ہے۔ اور مڈل سکولوں کے طلبا کے لئے لکھی گئی ہے پنجاب کے مڈل سکولوں میں جغرافیہ کی جو کتابیں رائج ہیں ان کے مقابلے میں یہ کتاب بہت مفید نظر آتی ہے۔ فاضل مؤلف کی محنت قابلِ داد ہے۔ قیمت عہ۔ پتہ۔ سید عبدالقادر اینڈ سنز حیدر آباد دکن۔

کارنامۂ پہلوی:۔ از سید محمد حسن بلگرامی۔ یہ کتاب ایران کی بیداری کی تاریخ ہے۔ فاضل مؤلف نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے ایران کے دورِ انحطاط، رضا شاہ کے عروج، اور ایران کی اصلاح کے لئے ان کی جدوجہد کی سرگزشت بیان کی ہے۔ اندازِ بیان سلجھا ہوا اور زبان سلیس ہے۔ واقعات کی چھان بین میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا کہ کس طرح رضا شاہ پہلوی نے جاں بلب ایران کو نئی زندگی بخشی۔ اس کٹھن کام میں ان کی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں تھیں اور کس طرح وُہ اپنے عزم و استقلال کی بدولت ان سب پر غالب آئے۔ ملاؤں کے اقتدار اور اس کے خاتمہ کے متعلق ابواب خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ فاضل مؤلف نے رضا شاہ کے عہد میں حکومتِ ایران کے تمام شعبوں کے متعلق بھی لکھا ہے ——

رضا شاہ اس وقت موریشیس میں ایک نظر بند کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فرنگ کے دار الافتا سے اُن پر غداری کا فتویٰ لگ چکا ہے اور ہندوستان و ایران کے بعض مجتہدین نے بھی اس فتویٰ پر اپنی مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے —— ممکن ہے ان امور کی روشنی میں "کارنامۂ پہلوی" محض عسکری صاحب کا دروغ بے فروغ معلوم ہو۔ لیکن بہر حال یہ کتاب پڑھنے کی چیز ہے۔ خصوصاً اُس ڈرامے کے بعد جو انہیں دنوں سرزمینِ ایران میں کھیلا گیا ہے اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ قیمت عہ۔ پتہ۔ نظامی پریس لکھنؤ۔

"ح نظامی"

نویدِ مشرق:۔ سوہن لال ساحر ایڈیٹر۔ کپورتھلہ سے نکلتا ہے۔ پہلا پرچہ جون ۱۹۴۱ء کا ہے۔ سالانہ چندہ پانچ روپے۔ فی پرچہ ۶ر۔ سر عبدالقادر نے نویدِ مشرق کا خیر مقدم لکھا ہے۔ فلک پیمانے "ہمارا ہندوستان" لکھا ہے۔ تاج مرش ملسیانی نظیر لدھیانوی اختر شیرانی تاجور وغیرہ بھی جلوہ گر ہیں۔

فردوس:۔ ہمارے دوست بزمِ اُردو جموں و کشمیر والوں کا دوسرا پرچہ جولائی ۱۹۴۱ء کا ہے۔ چندہ سالانہ ۴ روپے۔ دو چار کشمیر کی تصویریں بھی ہیں۔ جموں سے شائع ہوتا ہے۔

ب ۔ و

کیا خوب آدمی تھا:۔ "آل انڈیا ریڈیو" نے ملکی ادب کی بعض بہت قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ کوششیں خاص طور پر لائقِ تحسین ہیں جن کے طفیل ہماری بعض قدیم روایات، غیر مروج کتابیں اور بھولی بسری شخصیتیں از سر نو نظروں کے سامنے آئی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل دہلی سے "کیا خوب آدمی تھا" کے سلسلے میں متعدد تقریریں نشر ہوئی تھیں جن میں چند اصحاب نے بعض مشہور ادبی و سیاسی شخصیتوں کا تعارف کرایا تھا۔ اب یہ تقریریں حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" دہلی نے ایک مجموعے کی صورت میں شائع کر دی ہیں جس کا حجم سوا سو صفحات کے قریب ہے اور قیمت ۱۰ر مقرر کی گئی ہے۔

لکھنے والوں میں ملا واحدی، علامہ کیفی دہلوی، خواجہ غلام السیدین اور مولانا عبدالماجد شامل ہیں۔ جن کے متعلق لکھا گیا ہے اُن میں سے چند یہ ہیں۔ پریم چند، اقبال، اجمل خاں، راس مسعود داغ، چکبست، نذیر احمد

ح ع غ

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں "۲۲ لارنس روڈ لاہور" سے شائع کیا

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے



فہرستِ مضامین



"ہمایوں" بابت ماہِ دسمبر ۱۹۴۱ء

تصاویر (۱) ایڈورڈ ہنری پامر (۲) ڈاکٹر ٹیگور اور دیوندر ستیارتھی

ضروری اطلاع:۔ جواب طلب اُمور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بہ صورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں گے۔ مینیجر

قیمت فی پرچہ ۸ ر

بزمِ ”ہمایوں“

اس اشاعت کے ساتھ ”ہمایوں“ کی زندگی کا بیسواں سال ختم ہوتا ہے۔ آئندہ پرچہ حسبِ معمول سالگرہ نمبر ہوگا۔ یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ ”ہمایوں“ جن اصول و قواعد کو پیشِ نظر رکھ کر جاری کیا گیا تھا گزشتہ بیس سال میں اس نے اُن سے کبھی انحراف نہیں کیا اور اپنی انفرادیت کو حتی الامکان ہمیشہ قائم رکھا ہے۔

بیس سال کچھ بڑی عمر نہیں مگر ہندوستانی صحافت کی دُنیا میں اتنی عمر کو بھی بہت کم رسائل و جرائد پہنچتے ہیں۔ اس لحاظ سے ”ہمایوں“ شاید طویل العمری کا مدعی بھی ہو سکتا ہے۔

گزشتہ بیس سال میں ”ترقی پسندی“ ”اخلاقیت“ اور ”باقاعدگی“ ہمایوں“ کی نمایاں خصوصیات رہی ہیں۔ اگر ”ہمایوں“ کی طویل العمری کا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ بچپن سے لے کر ”بڑھاپے“ تک اس نے اپنی اشاعت میں کبھی ایک دن کی تاخیر بھی نہیں کی اور باقاعدگی اس کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔

”ہمایوں“ اپنے بلند مطمحِ نظر تک پہنچنے کی کوشش آئندہ بھی جاری رکھے گا مگر اس سلسلے میں جنگ کی پیدا کردہ مشکلات کے پیشِ نظر وہ اپنے معاونین سے بیش از بیش امداد و اعانت کا متوقع ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ موجودہ قارئین آئندہ سال بھی اپنی معاونت کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ ہم اُن حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو اپنی خریداری کے ساتھ کبھی کبھی ”ہمایوں“ کے لئے مزید خریدار بھی بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ ”ہمایوں“ کے مقاصد کی تبلیغ کے لئے ضروری ہے کہ اس کا حلقۂ اشاعت وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے۔

گزشتہ سال جن ادباء و شعراء کی قلمی اعانت ہمارے شاملِ حال رہی، ہم اُن سب کے شکر گزار ہیں۔ درحقیقت انہیں حضرات کی کوششوں سے ”ہمایوں“ ”ہمایوں“ بنا ہے۔ حضراتِ ذیل ہمارے خاص شکریے کے مستحق ہیں:-

والاشان شہزادہ نوابِ معظم جاہ بہادر شجیع، میاں عبد العزیز صاحب فلک پیما، حضرتِ جوش ملیح آبادی، حضرتِ کیفی، حضرتِ آزاد انصاری، مرزا محبوب بیگ صاحب، حضرتِ حمید نظامی، سید نذیر حسین صاحب ناشاد، پرنسپل رام پرشاد صاحب ناشاد، خواجہ غلام السیدین حضرتِ اثر صہبائی، حضرتِ ذوقی، مسٹر حسن عزیز جاوید، ناکام آرزو، حضرتِ اختر حیدر آبادی، حضرتِ نظر، ڈاکٹر محمد باقر، پروفیسر عبد الحمید، مسٹر سعادت حسن، مسٹر ہادی حسین، مسٹر عبد القادر، مسٹر منوہر لال ہادی، حضرتِ تاجور سامری، سید جمیل واسطی، احبابِ دیوندر ستیارتھی پیرزادہ احمد ندیم قاسمی، سید علی منظور، حضرتِ مقبول احمد پوری، حضرتِ ابر احسنی، حضرتِ صدق جائسی، حضرتِ رحمٰن مذنب، سید ظفر واسطی، حضرتِ شاد عارفی، حضرتِ عدم، ابن مریم، حضرتِ صادق قریشی، حضرتِ روش صدیقی، میاں عبد الحی، حضرتِ وجد، مسٹر محمد سمیع، ناصر الدین صاحب شمسی، ولی الرحمٰن صاحب، مرزا فہیم بیگ چغتائی، حضرتِ سلام مچھلی شہری، حضرتِ جگر قریشی، اے ایم خاں صاحب، مجید امجد صاحب، عبد القادر صاحب فاروقی، سید احسن صاحب، عبد الرزاق صاحب قریشی، خواجہ احمد فاروقی، سید آغا حسین، منشی شام موہن لال جگر، امر چند صاحب قیس، حضرتِ امجد حیدر آبادی، مسعود پرویز صاحب، سعید احمد صاحب اعجاز، سید رضا صاحب گردیزی، شفیق الرحمٰن صاحب، شیر محمد صاحب اختر، حضرتِ طالب صفوی، حضرتِ اسلم صدیقی، حضرتِ یوسف ظفر، عباس درویش صاحب، حضرتِ ماہر القادری، اسعد صاحب، فضل احمد صاحب صدیقی، پروفیسر الشں کمار، عبادت صاحب بریلوی، حضرتِ جارعجمی، شمس الرحمٰن صاحب، ودانی، جگن ناتھ صاحب آزاد، حضرتِ طالب شیرازی، حضرتِ سجاد، حضرتِ تبسم، حضرتِ مسعود یزدانی، حضرتِ جوہر فریادی، حضرتِ حرماں، محترمہ انیسہ بیگم شروانیہ، محترمہ صفیہ شمیم، محترمہ نجمہ رحمت اللہ، محترمہ سیدہ اختر، محترمہ سکینہ محمود، محترمہ نجمہ تصدق، محترمہ سیدہ شیریں نقوی، محترمہ صالحہ بیگم مخفی، محترمہ شمیم جالندھری، محترمہ کنور کول کنور۔

حامد علی خاں

جہاں نما

ٹیگور کی مصوّری

رابندر ناتھ ٹیگور کی گوناگوں قابلیتوں نے جہاں شاعری، افسانہ نویسی، ڈرامانگاری اور موسیقی وغیرہ کے فن میں اپنا جوہر دکھایا وہاں انہوں نے مصوّری کو بھی نہ بھلایا۔ اگرچہ ٹیگور کے دماغ کی ہر تخلیق میں اُن کی انفرادیت نمایاں طور پر جھلکتی ہے لیکن مصوّری میں یہ انفرادیت بلاشبہ انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی مصوّرانہ تخلیقات کو سمجھنا بے حد دشوار ہے۔ یہ تصاویر کسی دیکھی بھالی چیز کو متشکل نہیں کرتیں نہ غالباً کوئی سوچا سمجھا ہوا موضوع مصوّر کے دماغ سے اِن تصاویر میں منتقل ہُوا ہے۔ فن کا ایک جدید نظریہ یہ ہے کہ فن کار کو قدرت کا نقّال بننے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً ایک مصوّر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ صرف قدرتی اشیاء کا چربہ اتارا کرے۔ فن کار کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وُہ تخلیق کے کام میں قدرت سے مقابلہ کر کے خود اپنی تخلیقات کی ایک نئی دنیا پیدا کرے۔ ٹیگور نے اپنے اس فن کارانہ اختیار سے مصوّری میں پورا فائدہ اُٹھایا اور اپنے مُوقلم کو اپنے عجیب و غریب تصورات کی ترجمانی کیلئے کھلے بندوں کاغذ پر حرکت کرنے کی اجازت دے دی۔ اگر ہم ٹیگور کی تصاویر میں حقیقی اشیاء کا سُراغ لگانے کی کوشش کریں تو ہم کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ تصویریں اُن "خیالی اجسام" کی ہیں جو مصوّر کے دماغ کے پردوں کے سوا اَور کہیں نظر نہیں آسکتے۔ اگر اِن میں سے بعض تصاویر کسی قدرتی چیز سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتی ہیں تو یہ محض اتّفاقی بات ہے۔ مثلاً اگر کسی تصویر میں کسی عجیب و غریب درخت یا جانور یا انسان کی کوئی خفیف سی جھلک ہے تو یہ بھی مصوّر نے ارادۃً پیدا نہیں کی بلکہ اتفاقاً اُس کے مُوقلم کی آزادانہ حرکت سے ایک ایسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے مگر قدرتی چیزوں سے یہ مشابہت تصویر کو سمجھنے میں ہمیں کوئی مدد نہیں دیتی۔ بلکہ اس کی وجہ سے اُس میں ہمارے لئے اَور زیادہ حیران کن بجھارت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید یہ کہنا بجا ہو کہ یہ تصویریں کسی چیز کی عکّاسی یا کسی خیال کی ترجمانی کے لئے بنائی ہی نہیں گئیں۔ اِن کی حیثیت بچوں کی لوریوں یا اُن بے معنی نظموں کی سی ہے جو کوئی قابلِ ادراک مفہوم نہ رکھنے کے باوجود ہماری توجہ کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح ہم ایک نئی زبان کو محنت کے بغیر نہیں سمجھ سکتے یا جس طرح ہم کسی نئے فن کی خوبیوں کا اُسے پورے استغراق سے سیکھنے کے بغیر اندازہ نہیں کرسکتے اُسی طرح ہم ٹیگور کی تصاویر سے بھی اُس وقت تک پوری طرح مستفید نہ ہو سکتے ہوں جب تک ہم انہیں سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہ کر لیں مگر فی الحال ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ٹیگور کی "خود رنگ" مصوّری نے اِس خیال پر ایک ضربِ کاری لگائی ہے کہ فن کا مقصد صرف مظاہرِ قدرت کی نقّالی یا ترجمانی ہے۔ اُنہوں نے اپنی تصاویر سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ فن کار محض نقّال نہیں بلکہ خالق بھی ہوتا ہے۔

دُنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں

بعض چھوٹے چھوٹے ملکوں نے دُنیا کے بہت وسیع رقبوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ مثلاً فرانس کے مقبوضات کا رقبہ فرانس سے بائیس گنا زیادہ ہے۔ ہالینڈ کے مقبوضات کا رقبہ ہالینڈ سے ساٹھ گنا۔ بلجیم سے بلجیم کانگو کا رقبہ اسّی گنا اور برطانوی مقبوضات کا رقبہ برطانیہ سے ایک سو چالیس گنا زیادہ ہے۔

ذیل میں بعض بڑی بڑی سلطنتوں کا رقبہ درج کیا جاتا ہے:۔

سلطنت	رقبہ میلوں میں
جاپان اور اس کی نو آبادیاں	[illegible]
ہالینڈ اور اس کی نو آبادیاں	[illegible]
اٹلی اور اس کی نو آبادیاں	[illegible]
بلجیم اور اس کی نو آبادیاں	[illegible]
پرتگال اور اس کی نو آبادیاں	[illegible]
ممالکِ متحدہ امریکا اور نو آبادیاں	۳۷۳۸،۳۹۳
جمہوریۂ چین	۴۲۷۹،۱۷۰
فرانس اور نو آبادیاں	۴۴۵۰،۰۰۰
سوویٹ روس	۹۲۵۱،۷۹۶
سلطنتِ برطانیہ	۱۳،۲۵۵،۴۲۶

ٹالنے کا فن

نیویارک میں ایک ایکٹریس کسی مقدمے میں بطورِ گواہ پیش ہوئی۔ ایکٹریس کی عمر ۵۲ سال کی تھی مگر وہ چاہتی تھی کہ لوگ اسے چالیس سال سے زیادہ عمر کا نہ سمجھیں۔ مخالف وکیل نے اُس کی شہادت کو ناقابلِ اعتبار ٹھہرانے کے لئے یہ کوشش کی کہ اس کی عمر کے متعلق اُس پر جرح کر کے اُسے جھوٹا ثابت کر دے۔ ایکٹریس سچ بولنے کی قسم کھانے کے بعد جھوٹ سے بچنا چاہتی تھی۔

جرح کرنے والے وکیل نے دریافت کیا "آپ کی عمر کتنی ہے؟"

اُس نے فوراً جواب دیا "میں کچھ کہہ نہیں سکتی"

"کیا آپ کو معلوم نہیں؟"

"میں نے کبھی اپنی پیدائش کا سرٹیفکیٹ نہیں لیا ! نہ اپنی پیدائش کا رجسٹر دیکھا ہے "

جرح کرنے والے وکیل نے کہا "لیکن مس ۔ آپ کے والدین نے یقیناً آپ کو آپ کی عمر بتائی ہوگی ۔ اُنہوں نے آپ کی تاریخ پیدائش کیا بیان کی تھی "

ایکٹریس نے کہا " یہ تو سُنی سنائی بات کی شہادت ہوگی ۔ مجھے اُمید نہیں کہ آپ اُسے قابلِ قبول سمجھنے پر مُصر ہوں گے ۔

وکیل گھبرا کر کچھ کہنے کو تھا " لیکن ... لیکن " مگر اتنے میں ایکٹریس جج سے مخاطب ہوئی " حضور کیا میرا خیال درست نہیں ؟

جج نے ہنس کر کہا " آپ درست کہتی ہیں "

مطالعۂ کتب

ایک غیر مشّاق پڑھنے والا آدمی ایک مشّاق کتب بین شخص کے مقابلے میں کسی کتاب کے پڑھنے پر بہت زیادہ وقت صرف کرتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ عموماً کسی کتاب کے قابلِ مطالعہ اور ناقابلِ مطالعہ حصّوں میں امتیاز نہیں کر سکتے ۔ حالانکہ بہت ہی کم مصنّف یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اُن کی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے قابل ہے ۔ یہ پڑھنے والے کا فرض ہے کہ وُہ اپنی قوتِ تمیزی سے صرف قابلِ مطالعہ باتوں کی طرف توجہ کرے اَور غیر ضروری اور سطحی باتوں کو چھوڑ دے ۔

میکالے اس تیزی سے پڑھا کرتا تھا کہ اُسے مطالعہ کرتے دیکھ کر لوگ خیال کرتے تھے کہ وُہ محض ورق اُلٹ رہا ہے ۔ بات یہ تھی کہ وہ ایک ہی نظر میں یہ دیکھ سکتا تھا کہ پیشِ نظر صفحے میں کونسی خاص بات ہے ۔ اَور پھر اُس بات کو یاد بھی رکھ سکتا تھا ۔ مشق کرنے سے ہر ذہین آدمی یہ بات حاصل کر سکتا ہے ۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہر صفحے کو جلد سے جلد پڑھنے کی کوشش کی جائے اَور پڑھنے میں آرام پسندی کا خیال ترک کر دیا جائے ۔ پہلے یہ اندازہ کرنا چاہئے کہ کسی کتاب کا ایک صفحہ پڑھنے میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے ۔ پھر اس وقت کو ہر بار گھٹاتے جانے کی کوشش کرنی چاہئے ۔ مشق کے دوران میں آسان افسانے اَور ناول پڑھنے چاہئیں ۔ شروع میں اپنی مقررّہ رفتار سے تیز پڑھنا کچھ اُلجھن پیدا کرتا ہے مگر اس کی پروا نہ کرنی چاہئے ۔ کچھ عرصے کی مشق کے بعد یہ کیفیت جاتی رہے گی ۔ تیز پڑھنے کی مشق کے لئے وٹسن اَور نیوکومب نے جو دو مشہور ماہرینِ نفس ہیں یہ چند مفید طریقے سمجھائے ہیں :-

"پڑھتے وقت بڑبڑانے اَور ہاتھوں اَور ہونٹوں کو حرکت دینے سے پرہیز کرو ۔ اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دو ۔ جملوں فقروں اَور پیراگرافوں تک کو ایک اچٹتی نظر میں دیکھ لینے کی کوشش کرو ۔ خیالات کو اِدھر اُدھر آوارہ نہ پھرنے دو ۔ اگر پڑھتے وقت کوئی ایسا خیال آجائے جو غیر متعلق ہو تو مناسب وقت میں اُس پر غور کرنے کے لئے اُسے الگ لکھ لو ۔ مصنّف کا عندیہ شروع ہی میں معلوم کر لینے کی کوشش کرو اَور دیکھتے رہو کہ کیا وُہ تمہارے خیال کے مطابق چل رہا ہے ۔

اگر ان باتوں کی مشق ہو جائے تو پھر کسی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑ سکتی ۔

دُنیا کی بدترین کتابیں

امریکا کے ایک رسالے نے حال ہی میں وہاں کے بعض نامور ادیبوں سے فرداً فرداً اُس کتاب کا نام بتانے کی درخواست کی جو اُن کی رائے میں دُنیا کی بدترین کتاب ہے (یعنی وُہ کتاب جس کی قدر و قیمت کے اندازے میں سب سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے) اس شاندار عزت افزائی کے مقابلے میں دُنیا کی صرف وہی قدیم و جدید کتابیں شامل ہو سکتی تھیں جو عالمگیر شہرت حاصل کر چکی ہیں۔

مذکورۂ بالا ادباء کی رائے میں دنیا کی "بدترین" کتابیں یہ تھیں:-

(۱) "ڈینٹے کی" ڈیوائن کامیڈی"
(۲) گبن کی "ڈیکلائن اینڈ فال آف دا رومن ایمپائر"
(۳) ملٹن کی" پیراڈائس لوسٹ"
(۴) ملٹن کی" پیراڈائس ریگینڈ"
(۵) جیمز جائس کی" یولی سیز"
(۶) پراؤسٹ کی" سوانز وے"
(۷) ٹامس کارلائیل کی" سارٹر ریزارٹس"
(۸) گوئٹے کی" فاؤسٹ"
(۹) ہٹلر کی" مائن کامف"

ہوائی حملے سے بچنے کے لئے شیشہ گھر

کسی زمانے میں خود شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسرے کو پتھر مارنا پرلے درجے کی حماقت سمجھی جاتی تھی مگر سائنس نے اب یہ ممکن کر دیا ہے کہ شیشے کا گھر اس کام کے لئے سب سے موزوں سمجھا جائے۔ برطانی سائنسدان یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہوائی حملے سے بچنے کے لئے ایسی اعلےٰ درجے کی پناہ گاہیں بنائیں جو بموں کی سیدھی بوچھاڑ کے نیچے بھی محفوظ رہیں۔ ان سائنس دانوں کا خیال ہے کہ وُہ عنقریب ایسی پناہ گاہیں بنا لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لطف یہ ہے کہ یہ پناہ گاہیں شیشے سے بنیں گی۔

یہ شیشہ جو اِن پناہ گاہوں کی تعمیر میں صرف ہوگا اُس عام شکستنی شیشے سے مختلف ہوگا جس سے ہم اچھی طرح آشنا ہیں یہ شیشہ تہ در تہ جمائے اور مضبوط کئے ہوئے شیشے سے بنایا جائے گا۔ اس عمل میں یہ بہت مضبوط اور عام شیشے سے بہت زیادہ لچکیلا بن جائے گا۔ موجودہ شیشوں میں اس شیشے سے قریب ترین مشابہت رکھنے والا موٹر کاروں کا ہوا روک شیشہ ہے۔

مضبوط کردہ شیشہ اتنا مضبوط ابھی سے ہو چکا ہے کہ وُہ ایک ریلوے انجن کا بوجھ اُٹھا سکتا ہے، شدید ترین حرارت برداشت کر سکتا ہے اور

اگر اُس پر بم گرے تو ریزہ ریزہ ہوجانے کے بجائے اُس میں صرف بال آ۔ تے ہیں۔ اگر یہ شیشہ اَور زیادہ مضبوط بن سکا (جس کا سائنس دانوں کے نزدیک پورا امکان ہے) اَور اگر اِسے بنانے کا گرانبار خرچ کسی طریقے سے گھٹ سکا تو شیشے کی پناہ گاہیں عام ہوجائیں گی۔

سیاسیات اَور عمر

ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ وُہ لوگ جو گزشتہ سو سال کے عرصے میں انگلستان کی وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوئے کس کس عمر میں پارلیمنٹ کی رُکنیت حاصل کرتے رہے۔

نام	پارلیمنٹ میں داخلے کے وقت عمر
سر رابرٹ پیل	۲۱ سال
لارڈ جان رسل	۲۱ سال
لارڈ ڈربی	۲۱ سال
لارڈ ایبرڈین	۲۱ سال
لارڈ پالمرسٹن	۲۳ سال
مسٹر ڈزرائیلی	۳۳ سال
مسٹر گلیڈسٹون	۲۳ سال
لارڈ سیلزبری	۲۳ سال
لارڈ روزبری	۲۱ سال
مسٹر بالفور	۲۶ سال
سر ایچ کیمپبل بینرمین	۳۲ سال
مسٹر ایسکوئتھ	۳۴ سال
مسٹر لائڈ جارج	۲۷ سال
مسٹر بونرلا	۴۲ سال
مسٹر بالڈون	۴۱ سال
مسٹر میکڈانلڈ	۴۰ سال
مسٹر چیمبرلین	۴۹ سال
مسٹر چرچل	۲۶ سال

پیل سے لے کر بالفور تک ۸۴ سال کے عرصے میں صرف ایک وزیراعظم ۲۶ سال سے زاید عمر میں پارلیمنٹ کا رکن بنا۔ بعد کے آٹھ وزراء میں سے لائڈ جارج اور چرچل کو چھوڑ کر ہر وزیراعظم تیس اور چالیس سال سے زائد عمر میں پارلیمنٹ کی رکنیت حاصل کرتا رہا ہے۔

حامد علی خاں

ایڈورڈ ہنری پامر

ایڈورڈ ہنری پامر[1] مشہور و معروف انگریز مستشرق ۷ ر اگست ۱۸۴۰ء کو بمقامِ کیمبرج پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک پرائیویٹ سکول میں مدرس تھا۔ پامر نے پرس[2] کی مشہور درسگاہ میں تعلیم پائی۔ بچپن ہی میں اُس نے صحرائی اقوام کے حالات، زبان اور عادات و خصائل کا مطالعہ نہایت گہری نظر سے کرنا شروع کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُس نے لنڈن میں بطور کلرک کے کام شروع کیا۔ لیکن ہونہار مستشرق کو اِس دفتری زندگی میں خاک لُطف نہ آیا۔ اِس لئے اس نے بہت جلد ملازمت کو خیرباد کہہ کر فرانسوی و اطالوی زبانوں کا مطالعہ شروع کیا۔ اِن زبانوں کے سیکھنے کے لئے اُس نے نہایت آسان طریقہ اختیار کیا۔ یعنی جس ملک کی زبان سیکھنی مطلوب ہو اُس ملک کے عوام سے میل جول کیا جائے۔ اسی لئے وہ عموماً غیر ملکی لوگوں کی تلاش میں رہتا۔ اور یوں اُس نے مختلف زبانیں حاصل کیں۔ ۱۸۵۹ء میں وُہ کیمبرج واپس آگیا۔ اِن دنوں وُہ تپ دِق میں مبتلا تھا اور بظاہر بچنے کی کوئی اُمید بھی نہ تھی لیکن کیمبرج واپس پہنچ کر ۱۸۶۰ء میں اُس کو اِس خوفناک مرض سے شفائے کامل حاصل ہوگئی۔

اِس معجزانہ شفایابی کے بعد وُہ اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مولوی سید عبداللہ پروفیسر اُردو و فارسی دارالعلوم کیمبرج سے ملاقات ہوگئی۔ سید عبداللہ کے زیرِ اثر اُس نے مشرقی علوم کا مطالعہ شروع کیا۔ نومبر ۱۸۶۳ء میں اس نے سینٹ جان کالج سے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۶۷ء میں مشرقی زبانوں میں عموماً اور فارسی۔ عربی اور اُردو میں خصوصاً غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے وُہ یونیورسٹی کا فیلو مقرر کیا گیا۔ اُس نے سینٹ جان کالج کی طالب علمی کے زمانے میں عربی۔ فارسی۔ ترکی زبانوں کی قلمی کتب کی ایک نہایت بلند پایہ فہرست مرتب کی۔ اِس فہرست میں کنگ کالج اور ٹرنٹی کالج کی کتب کی فہرست بھی شامل ہے۔ (یہ فہرست میرے پردادا ارسطو جاہ بہادر کی خدمت میں بطورِ تحفہ بھیجی گئی تھی)

۱۸۶۷ء میں اُس نے ایک مبسوط رسالہ "تصوفِ مشرق" کے عنوان سے تحریر کیا۔ جس کی تکمیل میں عزیز بن محمد نفسی کی مشہور کتاب "مقاصد اقصیٰ" سے استفادہ کیا ہے۔ ۱۸۶۹ء میں صحرائے سیناء کے سروے کے لئے اُس کا تقرر ہوا۔ اِس مہم کو پیلسٹائین ایکسپلوریشن[3]

---

[1] Edward Henry Palmer
[2] Perse School
[3] Palestine Exploration

نوٹ۔ میں اپنے اِس مضمون کو اپنے بڑے بیٹے سید خلیل حسین سلمہ تعالےٰ متعلم جماعت دہم گورنمنٹ ہائی سکول فیروزپور کے نام معنون کرتا ہوں جس نے ترتیب و تکمیلِ مضمون کے سلسلے میں پُرانے مسودات۔ ارسطو جاہ بہادر کی بیاضوں۔ زمانۂ سفرِ دکن (بھوپال۔ گوالیار۔ ہوشنگ آباد) وغیرہ کی یادداشتوں اور ہزارہا خطوط کے پڑھنے میں میری امداد کی ہے +

آغا حسین

نے سرانجام دینے کا ارادہ کیا تھا۔ اگلے سال اس نے چارلس ڈریک کے ساتھ صحرائے تیہ[۱] کے حالات دریافت کرنے شروع کئے۔ اس نے ڈریک کی معیت میں اس سفر کی صعوبات کو پاپیادہ اور بغیر رہبر کے برداشت کیا اور اس خطرناک صحراء کو عبور کیا۔ دوران سفر میں پامر نے عرب کے بدو شیوخ سے گہرے روابط پیدا کئے۔ وہ اس کو عبداللہ آفندی کہہ کر پکارتے تھے۔ گویا اس نے اپنے شفیق استاد مولوی سید عبداللہ کی یاد اس صحراء نوردی میں بھی تازہ رکھی۔

لبنان وغیرہ سے گذرتا ہوا ۱۸۷۰ء میں براہ قسطنطنیہ اور ویئنا وہ واپس لنڈن چلا گیا۔ ویئنا میں اس کی ملاقات مشہور سیاح آرمی نیوس ویمبرے سے ہوئی۔ اس مہم کا نتیجہ ۱۸۷۱ء میں "ڈیزرٹ آف دی ایکسوڈس"[۲] کے عنوان سے شائع ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں اس نے ایک مضمون "شام کے پراسرار مذاہب" کے عنوان سے کوارٹرلی ریویو میں شائع کرایا۔ ۱۸۷۱ء کے اخیر میں وہ کیمبرج میں لارڈ ایلمونرز پروفیسر آف عربیک[۳] مقرر کیا گیا۔ اسی سال اس نے شادی کر لی۔ اس کی تنخواہ قلیل تھی۔ اس لئے حالات نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی۔ اس کی بیوی کو بھی بیماری نے آگھیرا۔ آخر ۱۸۷۸ء میں اس کی بیوی کا انتقال اسی بیماری سے ہو گیا۔ ۱۸۸۰ء میں اپنی دوسری شادی کے دو سال بعد وہ اخبار "سٹینڈرڈ" کے سٹاف میں شامل ہو گیا۔

۱۸۷۴ء میں اس نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۸۲ء کے اوائل میں گورنمنٹ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا وہ مشرق کی طرف سرزمین مصر کے قبائل کی امداد کے لئے جانا چاہتا ہے؟ مقصد یہ تھا کہ اس کے غیر معمولی رسوخ کی وجہ سے جو اس کو صحرائے تیہ کے قبائل میں حاصل ہے۔ قبائل کے شیوخ کو دوست بنایا جا سکے۔ گورنمنٹ کا منشاء تھا کہ وہ عرب شیوخ کو مصری باغیوں کے ساتھ شامل ہونے سے باز رکھے تا کہ وہ نہر سویز کی تیاری میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کر سکیں۔ وہ بغیر رہبر کی امداد کے غازہ چلا گیا اور اس صحراء کو عبور کر کے سویز کے کناروں پر پہنچ گیا۔ یہ ایک نہایت ہی دلیرانہ کارنامہ تھا۔ بدوؤں کے ساتھ معاملات طے کرنے میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ اس کے بعد وہ افواج مصر کا ترجمان خصوصی مقرر کیا گیا۔ سویز سے وہ پھر صحراء کی طرف بھیجا گیا۔ اس کے ہمراہ کپتان ولیم جان گل[۴] اور لیفٹننٹ سیرلڈ چیرنگٹن[۵] بھی تھے۔ اس کا مقصد قبائل اور شیوخ سے ملاقات کر کے امداد حاصل کرنے کا تھا، علاوہ ازیں یہ بھی خواہش تھی کہ شیوخ سے اونٹ خرید کر افواج کے لئے باربرداری کا ذریعہ مہیا کیا جائے۔ اس سفر میں اس کا اور اس کے ساتھیوں کا مقابلہ ایک مخالف قبیلے سے ہو گیا جس سے لڑتے ہوئے وہ بھی اپنے دیگر شرکاء کے ساتھ کام آیا۔ یہ واقعہ ۱۸۸۲ء میں پیش آیا۔ اس کی نعش جنگ کے بعد سر چارلس وارن کی کوشش سے دستیاب ہوئی۔ اور وہ سینٹ پال کے مشہور کلیسا میں سپرد خاک کیا گیا۔

۱۔ Eltih — ۲۔ Desert of the Exodus

۳۔ Lord Almoners' Professor of Arabic at Cambridge

۴۔ Captain William John Gill

۵۔ Flag Lieut Harold Charrington

پام کی مشہور تصانیف حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) ڈیزرٹ آف دی ایکسوڈس (۲) نظمِ بہار (۳) تاریخ یروشلم (۴) لغتِ فارسی (۵) انگریزی فارسی ڈکشنری (۶) ترجمۂ قرانِ مجید۔ انگریزی۔

ممکن ہے کہ اُس کا دیوانِ غزلیات چھپ گیا ہو لیکن ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ بعض تذکروں میں البتہ مختلف اشعار ملتے ہیں۔ پام کے شفیق استاد مولوی سید عبداللہ کیمبرج میں السنۂ شرقیہ کے مدرس تھے۔ پروفیسر مرحوم حضرت ارسطوجاہ بہادر کے شاگرد تھے۔ اُن کے پاس لاہور۔ دہلی اور جگراؤں میں تحصیلِ علم کرتے رہے تکمیلِ تعلیم کے بعد ارسطوجاہ بہادر مرحوم نے اپنے قابل شاگرد کو کیمبرج میں بھجوا دیا۔ سر جارج کلارک گورنر صوبۂ بمبئی اُس زمانے میں ہندوستان سے واپس جا چکے تھے اور وُہ ارسطوجاہ بہادر کے نہایت گہرے دوست تھے۔ ان کی سفارش سے سید عبداللہ کو کیمبرج میں جگہ ملی۔

ایڈورڈ ہنری پامر نے جو خطوط اپنے شفیق استاد کے نام تحریر کئے ہیں۔ وہ بھی مولوی سید عبداللہ مرحوم نے ارسطوجاہ بہادر کی خدمت میں بھیج دیئے تھے۔ ایک خط میں جو سید عبداللہ کے نام ہے پام لکھتا ہے :۔

مولوی سید اولاد علی صاحب ہنوز جواب نہ نوشتند۔ دو طرحِ غزل فرستادند۔ اصلاحِ اوشاں را برائے مطالعہ فرستادہ بودم۔ درحال فرصتِ غزل گفتن ندارم۔ از کپتان آر[۱] ملاقات شد۔ زبانِ ہندی مثل ہندیاں می زنند۔ چرا نہ باشد۔ در ہند نشو و نما یافتہ خصوصاً در ملازمتِ سرکارِ اودھ۔ از ہزار زبان ثناخوانِ آں برادر بودہ بنام گارساں دی تاسی چٹھی برائے ملاقات دادہ ام

ذیل کا خط حضرت ارسطوجاہ بہادر کے نام لکھا ہے :۔

مورخہ ۲۴ رمئی ۱۸۶۷ء

جنابِ فیض مآب خداوندِ نعمت با مروت ارسطو فطرت لقمان طینت مولوی سید رجب علی خاں بہادر سلامت !

بعد ادائے لوازمِ تسلیم عتبۂ تکریم و تمنائے ملازمتِ کیمیا خاصیت کے گذارش یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر بہ عروض تعلقات جسمانی نہیں ہوں۔

در ظاہر اگر وصالِ جسمانی نیست — غم نیست چو اتصالِ روحانی ہست

مدتِ مدید اور عرصۂ بعید کہ بہ زبانِ استاذی معظمی واخی المکرمی سید عبداللہ صاحب اوصاف شمائلِ حمیدہ واذکارِ اخلاق حسنہ سنا کرتا ہوں اور اب غایتِ استیلائے شوق سے نقدِ صبر و قرار زیادہ نہ تھا تھم نہ سکا۔ بے اختیار عرض رساں ہوں سے

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد — بسا کیں دولت از گفتار خیزد

---

[۱] کپتان آر سے غالباً وہی آر صاحب مراد ہیں جن کا ذکر ہمایوں اگست ۱۹۴۰ء میں بہ عنوان بادشاہ اودھ یورپینوں کے بے صد گرویدہ تھے مسٹر ہٹن نے کیا ہے۔

مکے باشد و کے کہ بدولت آپ کی ملازمت کی حاصل کروں ؎

عشقت اندر پس صد پردہ مرا مفتوں کرد

آں کہ دیدارِ ترا دید نہ دانم چوں کرد

تر صد کہ فدوی کو یکے از خیر خواہانِ صمیمی تصوّر فرمادیں۔ اب تھوڑا سا احوال اپنا گذارش کرتا ہوں کہ دارالعلم کیمبرج میں بیس برس تک تربیت پائی۔ عہدہ سول سروس ہند کا سات برس ہوئے کہ کمترین کو ہوتا تھا۔ وہاں کا احوال اور خرد ماغیٔ حکاّم سن کر نعمت کی کہ رزاقِ مطلق نے ڈال روٹی گھر بیٹھے بٹھلائے دی ہے۔ ماہِ فروری میں بعدِ امتحانِ سہ ماہہ ہر سال آخر کو امتحانِ خاتمہ سے فراغت پائی۔ اور خطابِ فضیلت بہ جلسۂ عالمانِ مدارس و رئوسایان اِس دارالعلم وگرد و نواح کے بمعہ جاگیر عطا ہوا۔ علوم لاطینی۔ یونانی۔ فلاسفی منطق۔ ریاضی۔ انگریزی جس طرح حاصل ہوا۔ پرچۂ ملفوفہ مطبوعہ اخبارِ نامدار ٹائمس مورخہ ۵ مئی سے واضح رائے زریں ہوگا ؎

ثنائے خود بہ خود گفتن نمے زیبد الخ

بندہ نے جب سید عبداللہ صاحب اِس دارالعلم میں درس عربی۔ فارسی۔ بنگالی۔ گجراتی دینے کے لئے آتے تھے، پڑھا اور کبھی لنڈن جا کر سبق لیا۔ مگر اب اس جگہ صورتِ قیام ہے اور سید صاحب سے کوسوں کا فاصلہ ہے۔

کمترین در نیولا ترتیبِ فہرستِ کتب عربی و فارسی میں دن رات مشغول ہے۔ عجیب و غریب کتابیں ہیں۔ بعدِ اختتامِ فہرست ایک فرد حضور کے ملاحظے کو روانہ کروں گا۔ کمترین کا قصد سیر و سیاحتِ سرزمینِ عرب کا ہے تاکہ وہاں سے سند فضیلت کی دستیاب کروں۔ اور جو خامی ہے پختہ ہو جاوے جتنی کتب درسیہ عربی ہیں۔ خام پڑھی ہیں۔ اور کلام اللہ بخوبی یاد کیا ہے۔ علاوہ بریں ترتیبِ فہرست کا بڑا جنجال ہے۔ بارہ گھنٹے تک دم مارنے کی مہلت نہیں ملتی۔ عرب میں بہ صحبت علماء و فضلاء کے خوب دل لگا کر پڑھوں گا۔ امیدوار ہوں کہ اِس نالایق خاک نشین کو اپنا تابعدار اور دام ناخریدہ تصوّر فرما کر گوشۂ خاطر سے نہ بھلادیں گے۔ اور مثل دیگر فرنگیوں کے جو مارے فاقوں کڑاکوں کے وہاں گئے ہیں۔ تصور نہ فرمادیں گے۔ حضور نے مجھے نہیں دیکھا ہے۔ مگر منشی بذل الرحیم صاحب زمیندار سیالدہ کلکتہ نوّاب اقبال الدّولہ بہادر وغیرہ بخوبی واقف ہیں۔ اور نسخہ مسمّٰی بہ "لالہ رُخ" دیوان مسٹر مُور مبرور کو انگریزی سے عربی نظم کیا ہے۔ اکثر فضلائے عرب نے جو یہاں آئے۔ پسند کیا اور اسناد عنایت کی ہیں۔ بعدہٗ آپ کو بھی عرضی لکھوں گا۔ ڈاکٹر لاطنر صاحب جو اب لاہور میں پرنسپل مدرسہ ہیں اگرچہ ظاہری ملاقات کی نوبت نہیں پہنچی۔ الّا وہ میرے نام اور تصنیفات انگریزی اور لاطینی سے واقف ہیں۔ اپنی تصویر بھی ملفوف کرتا ہوں۔ زیادہ بندگی اور آداب۔ فدوی کا نشان ذیل میں درج ہے۔ اِس پتے سے بخوبی آپ کا پروانہ مجھے ملے گا۔ فقط (اپنا نام اور پتہ انگریزی میں تحریر کیا ہے جو حسب ذیل ہے)

E. H. Palmer Esqr B.A. M.R.A.S. M.S.A.P

St. Johns College Cambridge

England

رقیمہ نیاز ایڈورڈ ہنری پامر عفی عنہٗ

مقام دارالعلم کیمبرج مورخہ ۲۴ مئی ۱۸۶۷ء

یاس سادہ اور سلیس اردو میں شعر کہتا تھا۔ یاس تخلص تھا۔ اپنے خطوط میں اکثر غزلیات لکھی ہیں۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کافی مہارت تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ غزل میں میرؔ کا رنگ خاص طور پر پسند تھا۔ کلام میں مشرقیت بہت نمایاں ہے۔ جو ایک مغربی شاعر کے لئے نہایت درجے آورد سے پیدا کی ہوئی چیز ہونی چاہئے۔ لیکن کلام پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر نے مہینوں نہیں بلکہ برسوں دہلی اور لکھنؤ کی گلیوں میں سیر کی ہے۔ مختلف زبانوں کے شوق میں اہلِ زبان سے عموماً ملنے کے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ اُردو اور فارسی ہندوستانی اور ایرانی شعراء کی طرح لکھتے ہیں۔ بعض قصائد میں عُرفی کا تتبع کیا گیا ہے۔ اُردو کے خطوط نہایت دل چسپ ہیں۔ فارسی کے بعض خطوط بھی ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ اُردو کی غزلوں میں عجیب سوز و گداز ہے۔ عموماً اُردو غزلیں نہایت سلیس اور سادہ زبان میں لکھی ہیں۔ ایک خط میں جو سید عبداللہ کے نام لکھا گیا ہے۔ آخر میں لکھا ہے۔ دریں ولا اتفاقِ گفتنِ غزلِ نرل در اُردو کہ محاورۂ اُور اگزاشتہ ام۔ حسبِ طرح نواب صاحب از پاریز افتاد لبطورِ اصلاح مے فرستم سے

جاں لب پہ آن پہنچی دلدار گھر نہ آیا ۔۔۔ ہم جاچکے جہاں سے پر وُہ اِدھر نہ آیا
دعوے مقابلے کا تھا سب بتوں کو لیکن ۔۔۔ جب سامنے ہُوا وہ کوئی نظر نہ آیا
تب تک نہ باز آیا رونے سے دل ہمارا ۔۔۔ آنسو کے ساتھ جب تک خونِ جگر نہ آیا
بیتابیوں سے عاشق لاکھوں موئے گئی ہیں ۔۔۔ لیکن وُہ جور پیشہ بیرونِ در نہ آیا
اُس چشمِ خوں فشاں سے کس دم لہو نہ برسا ۔۔۔ سیلابِ خُون ہمدم کب تا کمر نہ آیا
یاسِؔ سا اک نصاری تھا بے گُناہ مارا ۔۔۔ اے بُت خُدا کا تجھ کو ذرّہ بھی ڈر نہ آیا

دیگر

فغاں اُس در پہ ٹک تُو اے دلِ رنجور مت کیجو
بتوں کے شہر میں عاشق مجھے مشہور مت کیجو!!!
قسم ہے تجھ کو اپنے دین اور ایمان کی محرم
ہماری اُن کی صحبت کا کہیں مذکور مت کیجو!
ہزاروں آئینے تو توڑنا پتھر سے اے ظالم
پر اک سنگِ جفا سے شیشۂ دل چُور مت کیجو!
لگی ہے آنکھ اس محزون یاس کی سحر ہوتے
دلِ نالاں خدا کے واسطے ٹک شور مت کیجو۔

غزل فارسی

یارے کہ ندارد خبر از حالِ دلِ ما — ہر جا کہ بود سلمہ اللہ تعالےٰ
یارب کہ گماں داشت کہ آں دلبرِ بیرحم — زینگونہ فراموش کند اہلِ وفا را
شمعیم کہ ہر جا بہ ہماں سوز و گداز یم — ما را کہ چہ میخانہ چہ مسجد چہ کلیسا۔
از دوستیٔ سرو قدانم چہ کُنی منع — زاہد کہ نداری خبر از عالمِ بالا۔
پامر من و صوفی ہمہ شوریدۂ عشق ایم — عشق است کہ نگذاشت چہ دیوانہ چہ دانا

اِسی خط میں مولوی سید عبداللہ کے نام لکھا ہے :۔

آن برادر را ز احقر خواستہ اند کہ قصیدۂ بر طرح حضرت سودا "عجب ناداں ہیں وہ جن کو ہے عجب تاجِ سلطانی" نقش نویسم۔ ایں فراموش می فرمائند کہ از عرصہ اُردو را بالکل ترک کردہ ام۔ بر طرح حضرت مولانا عرفی مثل نامۂ اعمالِ خود سیاہ کردہ بودم۔ مطلعِ حضرتِ مغفور سہ

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ — گوہرِ ہر سُود در جیبِ زیاں انداختہ

ایں ہیچ مدان کج مج بیاں براں نوشتہ سہ

عشقِ اُو چوں اشکِ ما را از جہاں انداختہ — وانگہ از طاقِ دلِ من ابروِ آں انداختہ
روزگارے شد کہ سودائے سرِ زُلفِ بتاں — از دلم اندیشۂ سود و زیاں انداختہ
آہ ازاں بیرحمیٔ یارے کہ با آں معرفت — زہر در کام از لبِ شکر فشاں انداختہ
عقل از شوقِ سجودِ خاکیانِ درگہش۔ — بارہا خود را ز اوجِ آسماں انداختہ
فکرِ لنگِ من کجا و ذروۂ قدسش کجا — شہسوارِ عقل در راہش عناں انداختہ
شوقِ دامِ او کزاں ہرگز گرفتارے نرست — مرغِ جاں را آتش اندر آشیاں انداختہ

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں (راقم نے اُردو میں اصل فارسی عبارت کا خلاصہ درج کرتا ہوں) اس قسم کے اشعار سے زیادہ زحمت نہیں دینا چاہتا۔ آپ نے ہندوستان کے جرائد و اخبارات میں میرے اشعار ملاحظہ کئے ہوں گے۔ دنیا کے تفکرات سے ایک لمحہ کی فرصت نہیں کہ کسی اور کام کی طرف توجہ کروں۔ ہر ہندوستانی ڈاک سے شعراء اور ادباء اور اخبارات کے ایڈیٹروں کے خطوط میری عدم تحریر کے متعلق موصول ہو رہے ہیں۔ اور میں خجالت سے سر در گریباں ہوں حتیٰ کہ نجی اور خانگی معاملات میں بھی توجہ نہیں کر سکتا۔ آپ نے جو تعریف و ثنا میرے ترجمۂ اشعارِ حافظ کی فرمائی ہے اور خصوصیت سے میری نظم و نثر کی تعریف کی ہے اس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ حالانکہ من آنم کہ من دانم۔ انگریزی میری اصل زبان ہے۔ اِس میں عبارت درست لکھوں تو یہ کوئی تعریف نہیں۔ مسٹر ڈیون پورٹ نے میرے رسالے

"سورنگ اور تماشا" کو پسند کیا ہے۔ اُن کی مہربانی اور عنایت ہے۔ انگریزی میں ان کا طرزِ نگارش نہایت خوب ہے۔ اِس وقت گرجا کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ اِس لئے اِس عبارت کو ختم کرتا ہوں۔ اپنی بیگم صاحبہ کو میری طرف سے آداب کہیئے گا۔ فقط

رقیمہ نیاز اڈورڈ ہنری پامر عفی عنہ،

مورخہ ۳۰ر دسمبر ۱۸۶۶ء

ایک خط میں ارسطو جاہ بہادر مرحوم کو اس طرح خطاب کرتے ہیں:۔

جنابِ مستطاب معلیٰ القاب خداوندِ نعمت ارسطو جاہ سید رجب علی خاں دام اقبالہٗ۔

بعد سلام بغایت و نیازِ لانہایت واضح رائے بیضا می گرداند کہ بوسیلۂ جمیلۂ اخِ مشفق خود سید عبداللہ صاحب عنایت نامۂ آں جناب بمطالعۂ احقر افتاد . . . . جرأت دارم کہ عرضِ دیگر بحضورِ پُرنور گذارم۔ و آں این است کہ بندہ از صحبتِ تعلیم برادرِ موصوف در السنۂ شرقیہ اندک دخل کردہ۔ کتاب شاہنامۂ فردوسی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ را خواندن آغاز کردہ۔ امّا در ہجوے کہ بر شاہ محمود غزنوی نوشتہ یک بیت حائل شد کہ مطلبِ آں در فہم ناقص این ہیچ مداں بالکل نمے آید۔ و ہیچ یکے از زباں دانانِ این جا طاقتِ حلِّ این عقدہ ندارد۔ و نہ از کدامی کتاب شرحِ آں دریافت مے شود۔ لہٰذا رجوع بآں واقفِ اسرارِ حقیقی و عالمِ رموزِ دقیقی مے کنم۔ بیت مذکور در ذیل رقم می شود ؎

کفِ شاہِ محمود عالی تبار
نُہ اندر نُہ است و سہ اندر چہار

اگر عند الفرصت از جوابِ این عریضہ سرفراز و ممتاز خواہید فرمود۔ بعید از لُطف و عنایت نخواہد شد۔ باقی دعائے دولت ابد مدت و بقائے عمر باد۔

ایڈورڈ ہنری پامر عفی عنہ،
بمقام سینٹ جان کالج دار العلم کیمبرج انگلستان
مورخہ ۲۰ر مارچ ۱۸۶۷ء

۲۷ر مئی ۱۸۶۶ء کو ارسطو جاہ بہادر مرحوم نے ایک یادداشت آپ کے متعلق اپنی بیاض میں تحریر فرمائی ہے۔ (یہ یادداشت مع دیگر تصاویر وغیرہ کے میں نے بقول علامہ اقبال مرحوم کے اپنے بعض دیگر "نوادر"[1] کے ساتھ آل انڈیا ہسٹاریکل کانگریس لاہو

[1]: علامہ اقبال مرحوم نے میرے Collection کے بعض نوادر کے متعلق میرے والد ماجد میر سید مصطفےٰ احسن صاحب قبلہ جاگیردار جگراؤں کو تحریر فرمایا تھا "افسوس کہ جگراؤں آنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا۔ ورنہ آپ کے نوادر دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوتی"

آغا حسین

کی نمائش میں بھیجی تھیں۔ یہ تاریخی نمائش ایامِ کرسمس میں ڈاکٹر بروس کی زیرِ قیادت میو سکول آف آرٹ لاہور میں منعقد ہوئی تھی) اِس یادداشت کا ماحصل یہ ہے :۔

" ایڈورڈ ہنری پامر علومِ مشرقیہ میں دسترس رکھتے ہیں۔ عمر ۲۴ سال ہے۔ مشکلات بذریعۂ خطوط دریافت کرتے رہتے ہیں۔ اُردو عبارت خوب تحریر کرتے ہیں۔ ہندوستان میں کبھی نہیں آئے۔ جملہ زبانیں دارالعلم کیمبرج میں حاصل کی ہیں۔ زیادہ اتفاق شہر لنڈن میں رہنے کا ہوتا ہے۔ اپنی تصویر بطور تحفہ بھیجی ہے ۔"

اِس تاریخی یادگار تصویر کا عکس اِس مہینے "ہمایوں" میں شائع کیا جا رہا ہے۔ سید عبداللہ کے ایک خط میں ایڈورڈ ہنری پامر کا ذکر اور سر سید احمد خاں کے دورانِ قیامِ انگلستان کا ذکر آ گیا ہے۔ یہ خط ۲۴ ستمبر ۱۸۶۹ء کو لنڈن سے تحریر کیا گیا ہے۔ اِس میں نواب مرشد آباد۔ سر سید احمد خاں اور سید محمود خلف سر سید مرحوم کے حالات و واقعات سرزمینِ انگلستان پر بیان کئے گئے ہیں۔ اِس خط میں مولوی سید عبداللہ مرحوم ارسطو جاہ بہادر کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔" آپ کا ذکر اکثر آتا ہے۔ کل آپ کی عطیہ مہر پامر نے نواب صاحب کو دکھلائی بہت ہی عمدہ انگوٹھی طلائی پر نصب کی ہے۔ مولوی سر سید احمد خاں بہادر فرماتے تھے کہ حضور سے دہلی میں ملاقات کی تھی اور آپ کے نہایت مداح اور ثنا خواں ہیں اور کہا کہ خطۂ پنجاب میں آپ کا ثانی نہیں۔ بڑے فاضل اور زبردست مجتہد ہیں۔ اسی سبب سے میرے اور ان کے درمیان محبت ہے "

یہ بلند پایہ مستشرق عربی اُردو اور فارسی ادیب اور شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہنے کا مستحق ہے اس کے خطوط کے مطالعہ سے یہ امر ظاہر ہے کہ وُہ سختی کے ساتھ حکومت کرنے کو ناپسند کرتا تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ حکومت خلوص اور محبت کے ساتھ کی جائے۔ ایسی ہی حکومت کی بنیادیں مستحکم اور پائدار بھی ہوتی ہیں بقولِ پامر سہ

شمیم کہ ہر جا ہمہ سوز گدازیم
مارا کہ چہ میخانہ چہ مسجد چہ کلیسا

سیّد آغا حسین

ضمیمہ

حال ہی میں شعبۂ اطلاعاتِ حکومتِ ہند نے نئی دہلی سے ایک مختصر رسالہ" انگلستان اور عربی علوم و فنون" شائع کیا ہے۔ یہ فاضل مستشرقِ ڈاکٹر برنارڈ لوئیس کی اُن چھ تقریروں پر مشتمل ہے جو بی۔ بی۔ سی لنڈن سے عربی پروگرام کے سلسلے میں نشر کی گئی ہیں۔ اُس کا ایک پرچہ اتفاقاً مجھے مل گیا۔ اُس کے مطالعہ سے دو چار باتیں ایڈورڈ ہنری پامر کے متعلق اور معلوم ہوئی ہیں۔ جو ذیل میں درج ہیں :۔

پامر کا سنہ وفات ۱۸۸۲ء وہی سال ہے جس میں عرابی پاشا کی تحریک اٹھی تھی۔ پامر نے بیک وقت عربی۔ فارسی اور اُردو زبانوں کو سیکھنا شروع کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں یہی نہیں کہ انگریزی اشعار کا اپنی محبوب عربی زبان میں ترجمہ کرنے لگا بلکہ خود بھی عربی زبان میں شعر کہنے لگا۔ اُس نے اُن عربوں کے ساتھ تعلقات پیدا کئے جو اُس وقت انگلستان میں موجود تھے۔ اُن میں سے ایک شخص حلب کا رہنے والا تھا جس کا نام رزق اللہ حلبی تھا۔ اُس کے ساتھ پامر کے مراسم بہت بڑھ گئے۔ اور پامر کی شخصیت اور تحریر پر اُس کا نہایت گہرا اثر پڑا۔ پامر نے رزق اللہ سے بہت کچھ تعلیم حاصل کی۔ وُہ اُس کا بہت مدّاح تھا۔

۱۸۶۹ء میں اُس کو یہ موقع مل گیا کہ عربی زبان اور عربوں کے تمدن کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کرے اور اُس قوم سے بذاتِ خود تعارف حاصل کرے جس کی زبان اور ادبی سرمائے کو وُہ اتنا پسند کرتا تھا۔ اُس نے دو مرتبہ فلسطین کے آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کرنے والی ایک انجمن کی جانب سے مشرقِ قریب کا سفر کیا۔

اُس کا شمار یورپ کے اُن چند اہلِ علوم میں ہے جو مشرقی زبانوں میں نہایت صحت اور روانی کے ساتھ لکھ سکتے تھے۔ اُس کی اُردو کی کچھ تحریریں شائع ہو کر ہندوستان میں بہت مقبول ہوئیں۔ اُس نے انگلستان میں جو مضمون شاہِ ایران کی سیاحت پر اُردو زبان میں لکھا وُہ اُردو ادب میں یادگار خیال کیا جاتا ہے۔ پامر عربی۔ فارسی اور اُردو میں شعر کہتا تھا۔ بعض وقت وُہ انگریزی میں اظہارِ خیال کے لئے دقّت محسوس کرتا تھا اور یک بیک عربی میں لکھنے لگتا تھا۔ اُس کے ایک دوست اور رفیقِ کار جی۔ ایف۔ نکل (G. F. NICHOLL) نے جو آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر تھا اُس کے متعلق لکھا ہے۔ "اُس کے اُن خطوط سے جو اُس نے مجھے انگریزی میں لکھے' اکثر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُسے انگریزی میں اظہارِ خیال کرنے میں کچھ اُلجھن سی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وُہ فوری جذبات سے متاثر ہو کر یا نقد و تبصرہ کے وقت یک بیک عربی یا فارسی نظم و نثر شروع کر دیتا تھا۔ مثال کے طور پر پامر کے حسبِ ذیل عربی اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) لیت شعری ھل کفی ماقد جری — مذجری ماقد کفی من مقلتی

(۲) قدبری اعظم حزن اعظمی — دفنی جسمی حاش اصغری

ترجمہ:۔

(۱) کاش مجھے یہ معلوم ہوتا۔ کہ وُہ آنسو جو اب تک بہہ چکے ہیں نیز جن کی اس وقت تک جھڑی لگی ہوئی ہے۔ اب کافی ہوں گے۔

(۲) اس بھاری غم نے میری ہڈیاں گلا دی ہیں اور میرے جسم کو مٹا کر رکھ دیا ہے۔ ہاں ایک چھوٹی سی شے دل (یا زبان؟) باقی رہ گئی ہے۔

اُس نے اپنی موت سے پہلے بہا الدین زہیر مصری شاعر کا پورا کلام عربی متن اور انگریزی منظوم ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ اور اُس میں حواشی اور مقدمے کا اضافہ کیا۔

بیس برس کی عمر میں اُس کی ملاقات ایک ہندوستانی مسلمان سید عبداللہ سے ہوئی جو کیمبرج یونیورسٹی میں ہندوستانی زبان کا لکچرر تھا۔ اُسے سیّد عبداللہ ہی کی وجہ سے علوم مشرقیہ سے پہلے پہلے دلچسپی پیدا ہوئی۔

سید آغا حسین

بزمِ طرب

ایک چینی نظم کا ترجمہ

صُراحی میں شراب بھر کر میں گلستاں کو جاتا ہوں، تاکہ پھولوں میں بیٹھ کر شغلِ مے نوشی کروں۔

ہماری بزمِ طرب تین افراد پر مشتمل ہوتی ہے ——— مَیں، میرا سایہ اَور چاند۔

خوش قسمتی سے چاند پینا نہیں جانتا اَور میرے سائے کو پیاس نہیں لگتی۔

جب میں گاتا ہوں تو چاند خاموشی سے سُنتا رہتا ہے اَور جب میں ناچتا ہوں تو میرا سایہ بھی ناچنے لگتا ہے۔

ہر بزمِ طرب کے خاتمے پر ساتھی جُدا ہو جاتے ہیں مگر میرے ساتھی کبھی نہیں بچھڑتے۔

جب مَیں گھر جاتا ہوں تو چاند بھی میرا ساتھ دیتا ہے اور میرا سایہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔

میرزا طالب شیرازی

ٹیگور

"جانے نہیں دیں گے۔

یہ کتنی ناسمجھی کی بات ہے

دھرتی گنگا کو اپنی چھاتی سے لپٹا کر رکھنا چاہتی ہے،

آسمان گائے کے بچھڑے جیسے سفید بادل کو اپنی آنکھ کا آنسو بنائے رکھنا چاہتا ہے۔

سب کہتے ہیں، جانے نہیں دیں گے، جانے نہیں دیں گے،

پھر بھی جانے دینا پڑتا ہے،

پھر بھی لوگ چل دیتے ہیں!"

وُہ خود بھی چل دیا — رابندر ناتھ ٹیگور، ہندوستان کا شاعرِ اعظم خود بھی چل دیا۔ کئی صدیوں کے بعد ایسا جوہر کمال پیدا ہو تو ہو۔ روز روز تو ایسی شخصیت نمودار نہیں ہوتی جس کی تخلیق میں شاعری، ناول، افسانہ، ڈراما، تنقید، فلسفے اور سیاست نے یکساں طور پر ہاتھ بٹایا ہو۔ ۷ اگست کی شام کو گھر سے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اخبار فروش چلا چلا کر ضمیمہ بیچ رہے ہیں — "ڈاکٹر ٹیگور چل بسے ..... آج دوپہر کے بارہ بج کر تیرہ منٹ پر ..... کلکتہ میں ...... ڈاکٹر ٹیگور ....." اپنے کانوں کو جھٹلاتا ہوا میں تیزی سے قدم اُٹھانے لگا میو ہسپتال سے جو سڑک نیلے گنبد کی طرف جاتی ہے، اُس پر پہنچ کر میں رُک گیا۔ قریب ہی ایک تانگہ آکھڑا ہوا جس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب تازہ ضمیمہ پڑھ رہے تھے ...... میں نے ضمیمہ نہ خریدا۔ کانوں کے علاوہ آنکھوں کو جھٹلانا اور بھی مشکل میں ڈال دیتا۔ پھر اگلی صبح اخبار اُٹھایا تو دل پر غم کی بھاری سی سل آپڑی۔

شاعر ٹیگور کے الفاظ میرے ذہن کی گہرائیوں میں گونج اُٹھتے ہیں "پُن ہو یا پاپ، ذلت ملے یا عزت، ہر حالت میں، اے ماں، میں تیری گودی میں جنم لوں، بار بار جنم لوں" جغرافیائی حدود سے قطعِ نظر وُہ انسانی مساوات، اور اخوت کے حامی تھے۔ وطن کی غلامی بھی انہیں ہمیشہ یاد رہتی تھی۔ اور حق تو یہ ہے کہ بلند پایہ ادب کی تخلیق سے کہیں بڑھکر اُن کا رنامہ ہے جذبۂ حب الوطنی۔ روح کی آزادی کا نغمہ چھیڑتے ہوئے اُنہوں نے بار بار دیس کو ذلت اور بے چارگی سے چھٹکارا پانے کا پیغام دیا تھا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کی خبر ہے کہ موت سے تین دن پہلے ہی شاعرِ اعظم پر بے ہوشی طاری ہوگئی تھی ...... موت سے پہلے آخری رات کو بارہ بجے سانس بہت دشواری سے چلنے لگا۔ صبح ہوتے ہوتے صورت اور بھی نازک ہوگئی۔ سب نے جان لیا کہ وُہ دو چار ہی گھنٹوں کے مہمان ہیں ...... شاعر کے بچپن کے دوست راما نند چیٹرجی نے اُن کی صحت کے لئے دعا کی۔ مگر موت کو کون روک سکتا ہے؟ ..... شاعر کی ارتھی کے ہمراہ کوئی ایک لاکھ

لوگ ہوں گے سینکڑوں عقیدت مند روحیں، جن میں ہر عمر کے مرد اور عورتیں شامل تھیں، ننگے پاؤں چل رہی تھیں ..... شام کے سات بجے، دریائے ہگلی کے پانیوں پر اندھیرا چھا رہا تھا، شاعرِ اعظم کی لاش چِتا پر لٹا دی گئی۔ بندے ماترم کے نعرے بلند ہوئے اور ٹیگور کی جے، کا جے جے کار برابر گونج رہا تھا ..... کلکتہ کے نِمتلہ گھاٹ سے جہاں شاعر کا جسمِ خاکی جلایا گیا تھا، اُن کی راکھ شانتی نکتین میں بھیج دی گئی ہے اور وہاں اِس راکھ کو ایک کورے گھڑے میں ڈال کر اُس گھڑے کے قریب ہی، جس میں اُن کے والد مہرشی دیوندر ناتھ ٹیگور کی راکھ محفوظ ہے، دفنا دیا گیا ہے۔

شاعر کے صاحبزادے کے نام اپنے خط میں مَیں نے لکھا ہے:۔

"..... مجھے تو یقین نہیں آتا کہ گورودیو اِس دنیا سے چل بسے ہیں۔ مجھے تو وُہ اب بھی جگن ناتھ پوری میں سمندر کی طرف منہ کئے اُڑیسہ گورنمنٹ ہاؤس کی چھت پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں جہاں میں آخری مرتبہ اُن سے ملا تھا۔ میں نے اُن کو متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا سمندر کی لہریں دیو داسیوں کی طرح ناچ رہی ہیں۔ اُن کے ہونٹوں پر لطیف سی مسکراہٹ ناچ اُٹھی تھی۔ یہ مسکراہٹ اُن کی فطانت کا نچوڑ تھی اور وہ میرے ذہن میں اپنے پورے مفہوم اور مقصد کے ساتھ سدا زندہ رہے گی، سدا تھرکتی رہے گی ....."

شاعر کی صحبت میں ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ تازہ پہاڑی شہد نصیب ہو رہا ہے۔ جم کر اُن کے نزدیک رہنے کا تو کبھی سوال ہی نہ اُٹھا۔ شروع ہی سے مَیں ایک خانہ بدوش کی صورت میں اُن سے ملا تھا۔ مگر ہر بار مَیں نے اِس شہد کو خلوص میں بسا ہوا پایا۔ یہ پریم کا شہد تھا۔ ہر نیا تجربہ اور مشاہدہ ہمارے ذہن پر ایسے نقش بناتا رہتا ہے جن کا تعلق براہِ راست ہماری آپ بیتی سے ہو جاتا ہے۔ ہر آپ بیتی ایک دعوتِ فکر ہوتی ہے اور ہر دعوتِ فکر اِس شہد کے بغیر ادھوری ہی رہتی ہے۔

وُہ بولتے تو اُن کے الفاظ کھولنے سے معلوم ہوتے۔ اِن سے مانوس ہوتے دیر نہ لگتی کبھی کبھی بات چیت کے دوران میں اُن کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ غوّاص نے موتی کی تلاش میں ڈُبکی لگا دی ہے۔ پھر جب آنکھیں کھولتے تو اُن میں تصوف کی جھلکیاں نظر آنے لگتیں۔ اُن کا ہاتھ سیدھا سیپ تک پہنچتا تھا۔

اور باتیں پیچھے، اُن کے لطیف ذوقِ ظرافت کا ذکر مقدم۔ ایک بار اُنہوں نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا تھا۔

"جنوبی افریقہ سے لوٹ کر گاندھی جی شانتی نکتین تشریف لائے تھے۔ اُن دنوں اُنہوں نے دودھ پینا ترک کر رکھا تھا۔ کسی طرح انہیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ دودھ میں کسی قدر زہر ملا رہتا ہے۔ ایک دن وہ میرے پاس بیٹھے تھے۔ میرے لئے دودھ آیا تو میں نے کہا ــــ لیجئے آپ بھی ایک پیالی!

"گاندھی جی مسکرا کر بولے ــــ اِس میں تو زہر ہے۔

"میں نے فوراً ہی جواب دیا۔ سچ تو ہے۔ زہر تو اِس میں ہے ہی۔ پر یہ زہر اتنا کم ہے کہ نصف صدی کی عمر میں یہ مجھے تصف بھی نہیں

مار پایا . . . ."

ایک بار میں نے یہ واقعہ اپنے گاؤں میں ایک کسان کو سنایا۔ وُہ بیچارہ اِسے سمجھ ہی نہ سکا۔ پھر جب میں نے شاعر سے اِس کا ذکر کیا تو وُہ بولے — "تم نہیں ہارے یہ میری ہار ہے۔ گاندھی جی سے بازی لے جانے کے باوجود میں ایک کسان کے سامنے چاروں شانے چت گر پڑا ہوں۔"

شاعر کا ذوقِ ظرافت دھیمے دھیمے بہنے والے دریا کی طرح تھا۔ کوئی راجکماری اُن کا درشن کرنے آئی معلوم ہوتا تھا کہ اجنتا کے کسی غار سے کوئی تصویر شاعر کے پاس آنکلی ہے۔ شاعر کے بال ابھی سفید نہ ہوئے تھے۔ راجکماری بولی "آپ بہت سندر ہیں"۔ شاعر کو یوں محسوس ہُوا کہ کہیں پاس ہی گھنگرو بج اُٹھے ہیں۔ راجکماری کی بات سُنی اَن سُنی کر دی گئی۔ اُس نے اپنی بات دُہرائی۔ اس بار شاعر نے بڑے دھیان سے راجکماری کے روپ کا ملاحظہ کیا اَور کہا "راجکماری بھی تو سندر ہے"۔ اس واقعہ کی تصدیق ضروری تھی۔ مَیں نے خود شاعر سے پوچھا تو وُہ مُسکرانے لگے۔

"میں نے ضرور یہ بات کہہ دی ہوگی"۔

"پر مجھے تو یہ بات یوں ہی بنائی ہوئی معلوم ہوئی تھی"۔

"کہہ جو دیا۔ میری زندگی کی ایسی بیسیوں باتیں اَور بھی سننے کو ملیں گی . . . . . آخر مَیں بھی آدمی ہوں"۔

شاعری بڑی چیز ہے، فلسفہ بھی اور تصوف بھی۔ مگر لطیف ظرافت کی جھلکیوں میں بھی ہمیں زندگی کا جوہر نصیب ہو جاتا ہے۔ ایک بار کسی نوابی گھرانے کے ایک رُکن نے شاعر کو دیکھتے ہی کہا "واللہ! کیا نُورانی چہرہ ہے"۔ شاعر کے سکرٹری نے اِس جملے کا ترجمہ کر کے سنایا تو شاعر نے مُسکرا کر کہا "کون جانے اِن کی کیا رائے ہوتی اگر مجھے میری جوانی میں دیکھ لیتے!" وُہ صاحب پھر کچھ نہ بولے۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ جوانی میں شاعر کا چہرہ زیادہ نورانی ہوگا۔ اُن کے سفید بال نورانی چہرے کے معاون بن گئے تھے۔

چند برس پہلے وشوبھارتی نے شاعر کی بہترین نظموں کا ایک انتخاب شائع کیا تھا — "چینیکا"۔ اس انتخاب کا فیصلہ ووٹوں کے ذریعہ سے کیا گیا تھا۔ ووٹ دینے والے اصحاب میں شاعر کے بڑے بڑے مداح شامل تھے۔ مگر یہ انتخاب شاعر کو بہت پسند نہ آیا۔ کیونکہ اس میں کئی ایسی نظمیں بھی شامل ہونے سے رہ گئیں جو شاعر کو بے حد پسند تھیں۔ اُنہوں نے خود ایک انتخاب تیار کیا "سنچیتا"۔ جب وشوبھارتی نے اِسے شائع کیا تو شاعر کے دوستوں نے دیکھا کہ اِس میں کچھ ایسی نظمیں بھی شامل کر لی گئی ہیں جو اُن کے خیال کے مطابق اتنی بڑھیا نہ تھیں۔ ایک صاحب تو بہت خفا ہوئے۔ ایک نظم کی اہمیت دریافت کرنے کے لئے وہ شاعر کے پاس آپہنچے۔ شاعر نے جواب دیا "یہ سب باتیں مَیں نہیں جانتا۔ آپ سر رادھاکرشنن سے ملئے۔ اپنی شاعری مَیں خود بھی شاید اتنی نہیں سمجھتا۔ اِس کے فلسفہ پر اُنہوں نے ایک بڑی سی کتاب ہی لکھ ڈالی ہے"۔

"خان! ذرا دیکھوں تمہارا ہاتھ"۔ شاعر کی زبان سے یہ بات سُن کر خان عبدالغفار خاں کے لڑکے نے اپنا ہاتھ اُن کی طرف بڑھا دیا۔

یہ ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے جب یہ نوجوان پٹھان شانتی نکیتن میں نندلال بوس سے مصوری کی تعلیم پانے آیا تھا۔ بڑے غور سے شاعر اِس نوجوان کا ہاتھ دیکھا کئے اور بولے "پر یہ ہاتھ برش اُٹھانے کیلئے تو نہیں بنے، خان!" نوجوان پٹھان بولا" جناب! ایسی تصویر بناؤں گا جسے دیکھ کر ہر پٹھان بچہ اپنی بندوق سنبھال لے گا" اور شاعر نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

شاعر کی زندگی کی یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے زیادہ رس دے جاتی تھیں۔ فنی لحاظ سے شاعر کا ذوقِ ظرافت بہت بلند واقع ہُوا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ ظرافت کے بغیر زندگی کی تصویر ادھوری رہتی ہے۔ ہنسی کی لہریں تو زندگی کی جھیل میں اُٹھنی ہی چاہئیں۔ کوئی غم انہیں ہمیشہ کے لئے نڈھال کیوں کرے؛ لطیف ظرافت ہنسی کی لہروں کو اُبھارتی رہتی ہے۔ مبارک ہے وُہ شخصیت جسے انسانی کردار کا یہ جوہر نصیب ہُوا ہو۔

۱۹۳۶ء کا ذکر ہے۔ شاعر لاہور آئے تھے۔ ایک بنگالن اُن کے لئے اپنے صوبے کے ایک پکوان کی پلیٹ لے کر آئی۔ شاعر پکوان سے اُٹھتی ہوئی خوشبو کی طرف متوجہ ہوگئے اور اس کی تعریف میں اُنہوں نے کچھ کہا بھی۔ وہ عورت بولی "مہاراج! اب کچھ مُنہ میں ڈالیئے۔" شاعر نے جھٹ جواب دیا "یہ تعریف تبھی تک ہے جب تک مَیں اِسے کھا نہیں لیتا ـــ" وہ عورت ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ وُہ سمجھ گئی کہ جب شاعر یہ پکوان کھالیں گے۔ اُن کی طبیعت اتنی محظوظ ہو جائے گی کہ پھر اِس بارے میں مُنہ سے کچھ بھی کہنا بیکار ہوگا۔

اُس جواہر ریزے کی طرح جس کے ہر کونے سے ایک دلکش کرن پھوٹ پڑے، ظرافت کی جھلکیاں زندگی کے خام مواد میں بھی ایک نئی روح بیدار کر دیتی ہیں۔ مگر ہر زندہ ظرافت جدّت مانگتی ہے، جدّت ہی نہیں، ایک تخلیقی توانائی بھی۔ ٹیگور جو خود تخلیقی توانائی کا مجسّمہ نظر آتے تھے، ظرافت میں جدّت پسندی کے پورے پورے قائل تھے۔

پچھلی بار جب مَیں نے شاعر کے جنم دِن کی خوشی میں جگن ناتھ پوری کے گورنمنٹ ہاؤس میں اُن کی ایک تصویر اُنہیں پیش کی تو وہ اِسے دیکھتے ہی بول اُٹھے "یہ کیا کر ڈالا؛ مَیں تو یہاں کوئی سٹریا مسولینی نظر آتا ہوں"۔ یہ بات اُنہوں نے اپنی رُعب دار آنکھوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہی تھی۔ اِس تصویر کی ایک کہانی ہے:۔

اِسی واقعہ سے چند ماہ پیشتر کا ذکر ہے کہ خود اپنے کیمرے سے میں نے یہ تصویر تیار کی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ ایک دن میں شانتی نکیتن میں شاعر کو اپنے لئے ہوئے فوٹو دکھا رہا تھا۔ اُنہیں ایک سنتھال دوشیزہ کی تصویر بہت پسند آئی۔ میں نے کہا کہ وہ چاہیں تو یہ تصویر اپنے پاس رکھ لیں۔ اُن کے خیال کے مطابق یہ لڑکی دھرتی کی بیٹی تھی کیونکہ اُس نے اپنی باحیا آنکھیں دھرتی کی طرف جُھکا رکھی تھیں اور یوں نظر آتا تھا کہ اُس کی لاج کھیتوں کی لاج تھی جو دھان کی طرح اُگ آئی تھی۔ . . . . . . پھر مَیں نے اگلی صبح اُن کا ایک فوٹو لینے کی اجازت مانگی تو وہ بولے۔

"اپنا کیمرہ لیتے آنا، پر مجھے کمرے سے باہر نکلنے کے لئے نہ کہنا۔ یہیں اپنا کام کر لینا۔"

مَیں نے یہ شرط مان لی۔ مقررہ وقت پر وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ شاعر کے ایک انگریز دوست اُن سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ اُن سے میرا تعارف کراتے ہوئے شاعر نے میری شوقیہ فوٹو گرافی کا ذکر چھیڑ دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے:۔

"ایک فوٹو ان کا بھی لیتا"۔

میں نے خوش ہو کر کہا "اِس سے نہ چُوکوں گا میں"۔

پھر میں نے شاعر کے دوست سے کہا "میں تو بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ آپ کا فوٹو شاعر کے ساتھ لیا جائے"۔

اُن کے دوست نے جھٹ ہاں میں سر ہلا دیا۔ خود شاعر نے چپ سادھ لی۔ میں نے بات بڑھائی "لیکن میں چاہتا ہوں فوٹو باہر دھوپ میں لیا جائے، کاٹھ چمپا کے پیڑ کے قریب"۔

اتنے میں ہم نے دیکھا کہ نوکر باہر کرسیاں لگا رہے ہیں۔ شاعر نے گھور کر اُدھر دیکھا اور کہا۔

"معلوم ہوتا ہے ستیارتھی نے سازش کر رکھی ہے مجھے باہر لے جانے کے لئے"۔

اور پھر لطیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے "لیکن باہر فوٹو لیا جائے گا ضرور........"

کاٹھ چمپا کے قریب کھینچی ہوئی اسی تصویر کے ایک حصّے کو انیلارج کر کے شاعر کی وہ بڑی تصویر تیار کی گئی تھی۔

پروفیسر ہمایوں کبیر نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

"ابھی وُہ وقت نہیں آیا جب ہم ٹیگور کی فطانت اور اُس کے کاموں کی ستائش کر سکیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ ہم جس بنگال میں رہتے ہیں وہ ٹیگور کا تعمیر کردہ بنگال ہے۔ بنگال جو سوچتا ہے، جس زبان میں سوچتا ہے اور جن خیالات کو پیش کرتا ہے وُہ سب کے سب ٹیگور کے عطا کردہ ہیں۔ ہماری سرزمین دریاؤں کی سرزمین ہے جسے صدیوں سے دو بڑے دریا سیراب کرتے چلے آرہے ہیں۔ ایک لحاظ سے ٹیگور بھی بہت بڑا دریا تھا۔ جس نے بنگال کی ذہنی اور تمدنی سرزمین کو سیراب کیا۔ کسی فردِ واحد کو یہ افتخار کم نصیب ہوتا ہے کہ وہ ایک صوبے کی زبان کو جہاں گیر زبان کا رُتبہ بخش دے۔ میرے خیال میں ڈینٹے سے زیادہ ٹیگور کو اس مسئلہ میں کامیابی ہوئی۔ ٹیگور کو اُن مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا جو ڈینٹے کو درپیش نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود ٹیگور نے بنگالی زبان اور بنگالی ادب کو اس کی موجودہ شکل وصورت دی..... آج اس بات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ اُس کا تعلق اشرافیہ سے تھا لیکن وُہ اشرافیہ کا گرویدہ نہیں تھا۔ اِس میں حیران ہونے کی کونسی بات ہے۔ اُس کے لئے مقام اور پیدائش اتفاقی حوادث تھے۔ اُس کا اشرافیہ سے تعلق رکھنا ایک لحاظ سے خوش قسمتی تھی۔ کیونکہ اِس طرح اُس کے لئے وسطی اور قدیم ہندوستان کی تمدنی روایات کو اپنے اندر جذب کر لینا آسان ہو گیا تھا۔ جس زمانے میں ٹیگور پیدا ہوا تھا اُس زمانے میں دوسرے طبقات کے لوگوں کے لئے ایسا کرنا مشکل تھا۔ ٹیگور ایسے زمانے میں پیدا ہوا تھا جب ہندوستان پر بحرانی کیفیت طاری تھی اور نئے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ یورپی تہذیب اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ اِس زمانے میں سر وہ شور وغل موجود تھا جس کا تعلق انقلابی تغیر سے ہوتا ہے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہندوستانی زندگی دو غیر متعلق اجزا میں بٹ رہی تھی۔ اور یہ دو اجزاء اکثر متصادم ہوتے رہتے تھے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جنہوں

نے مغرب کی شے کو قبول کر لیا تھا ..... دوسری طرف وہ لوگ تھے جن کا مغرب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ٹیگور کے خاندان نے مغرب کے چیلنج کو قبول کیا اور بلا خوف و خطر ہندوستانی زندگی کے لئے بعض یورپی اقدار تسلیم کر لیں۔ حالات کے اِس اتحاد نے ٹیگور کی ذہنی کاوشوں کے لئے راہ نکالی .....۔"

مگر شروع سے بنگال میں ایک ایسا حلقہ موجود رہا ہے جو ٹیگور کے کارناموں کو مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس حلقے میں ایسے لوگ بھی نظر آجاتے تھے جن کی تعلیم مغربی طرز پر ہوئی تھی۔ بہت کم اختلافاتِ رائے ایمانداری پر مبنی ہوتے ہیں۔ رقیب کے زُمرے میں شامل ہو کر پھر دوستی کا دم بھرنا کٹھن ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اندرونی طور پر کسی کے مدّاح بن جانے پر بھی اِس بات کا اقرار کرنے سے ہم بچتے رہتے ہیں۔ مسٹر مجومدار کی بات مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ وہ ایم۔ اے پاس کر چکے تھے۔ ایک بار اُن کی خواب گاہ میں ٹیگور کا فوٹو دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہوئی۔ "ٹیگور نے بُری طرح پُرانے کلاسیکل ہندوستانی سنگیت کا ناک منہ توڑ ڈالا ہے!"۔ اپنا یہ خیال وہ اکثر دُہرایا کرتے تھے۔ پھر جب اُس فوٹو کا راز کھل گیا تو وہ جھینپ کر بولے "ٹیگور کی یہ تصویر پہلے میرے ڈرائینگ روم میں ہوتی تھی۔ چلتی چلتی یہ یہاں خواب گاہ کے اُس کونے میں آ پہنچی ہے۔ جلد ہی میں اسے یہاں سے بھی اُتار دوں گا"۔ میں نے ہنس کر کہا "مسٹر مجومدار! دیوار سے آپ شاعر کی تصویر اُتار سکتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی تصویر آپ کے دل میں بھی لٹک رہی اور اُسے آپ خود بھی نہ اُتار سکیں گے"۔

یہ نہیں کہ ٹیگور نے پُرانے ہندوستانی سنگیت کی مشق نہ کی تھی۔ لیکن اپنے گیتوں میں اُنہوں نے ایک نئے سنگیت کو جنم دیا۔ مشرقی اور مغربی تانوں کا یہ ملاپ ہندوستانی سنگیت کی تاریخ میں ایک ترقی پسند باب کھول چکا ہے۔ ٹیگور کے خود ساختہ وزن، جو اُن کی نظموں کا خاصہ تھے، قدیم وضع کے حامیوں کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتے رہے۔ اُن کے گیتوں کی اجنبی چال ڈھال بھی پُرانے لوگوں کو کھٹکتی رہی۔

شاعر نے ایک بار بتایا تھا کہ جب کبھی کوئی نیا گیت جنم لینے لگتا ہے وہ جھٹ اپنے بھتیجے دینیندر ناتھ[1] ٹیگور کو بلا بھیجتے ہیں اور وہ اپنے علمِ موسیقی پر اتنی دسترس رکھتے ہیں کہ خواہ یہ گیت جانے پہچانے راستے پر چلتا ہو خواہ نئے اجنبی راستے پر، وہ اسے سُن کر جھٹ "سُرلیپی" میں باندھ لیتے ہیں۔ کئی بار تو یوں بھی ہُوا کہ آدھی رات کے وقت شاعر کی آنکھ کھل گئی، کوئی تاثر پیدا ہُوا، کوئی نیا سُر جاگ اُٹھا اور گیت باہر آنے لگا۔ اِس وقت دینیندر ناتھ کو بلا بھیجنا ضروری ہو جاتا تھا۔ کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ گیتوں کے نئے سُر بہت چپل جانتے ہیں اور ایک بار ہاتھ سے نکل جانے پر اُن کا قابو میں آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شاعر کے نئے گیتوں کا استقبال کرنے کے لئے — یہ گیت دِن کو پیدا ہوں چاہے رات کو، دینیندر ناتھ سدا تیار رہتے تھے۔

راماننِد چیٹرجی، ایڈیٹر "موڈرن ریویو" نے لکھا ہے کہ ٹیگور کے گیت کل ملا کر دو ہزار سے بھی اوپر پہنچ جاتے ہیں[2]۔

ع[1] آپ شانتی نکیتن میں سنگیت بھون کے پرنسپل تھے۔ چند سال پیشتر آپ اِس دنیا سے کوچ کر گئے۔

ع[2] "انسائیکلوپیڈیا برٹینکا" (گیارھویں ایڈیشن) کے ایڈیٹر نے شوبرٹ کو دنیا کو سب سے بڑا کلاونت مانا ہے حالانکہ اُس کے گیت چھ سو سے زیادہ نہیں ہیں۔

شاعری اور موسیقی کے علاوہ ناٹک اور رقص کے میدان میں بھی شاعر کی تخلیقی قوت آگے بڑھتی رہی تھی۔ "چترانگدا"، اُن کا کامیاب اور اہم ناٹک ہے۔ اپنے ناٹکوں کی کارگزاری میں وُہ خود بھی کسی نہ کسی کردار کا روپ دھار کر سٹیج پر آجاتے تھے۔ اپنے ناٹکوں میں شاعر نے کتنے ہی خود ساختہ رقص پیش کئے ہیں۔ اِدھر بڑھاپے میں وُہ شانتی نکیتن کے طالب علموں کو رقص کی نئی تخلیق میں جسمانی مدد دینے سے معذور ہو گئے تھے تاہم اُن کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ کسی ناچنے والی کو ہاتھ یا آنکھ کے کسی اشارے سے یا کوئی کہانی سی سناتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ وُہ کسی نئے رقص کی راہ دکھا دیتے تھے۔

کسی تماشائی نے ٹیگور سکول کا رقص دیکھ کر اپنے تاثرات یوں بیان کئے ہیں۔

"۱۹۳۶ء اپنی تین چوتھائی زندگی ختم کر چکا تھا۔ اِس وقت رابندر ناتھ ٹیگور اپنی ڈراما پارٹی لے کر کلکتہ آئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے پروفیسر، اخباروں کے ایڈیٹر، مصنفین، فلم کمپنیوں کے مشہور سے مشہور ایکٹر اور ایکٹرسیں، سیاسی اور سماجی انجمنوں کے اراکین سب اپنی اپنی شان کے ساتھ جمع تھے اور پردے کی طرف اِس طرح تک رہے تھے گویا ہر ایک کی روح اُس کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔

"گھنٹی بجی۔ پردہ اُٹھا۔ سامنے ایک دیوار سی تھی جس کے آگے چھ نوجوان لڑکے اور دوسری طرف چھ نوجوان لڑکیاں ستار لئے بیٹھی تھیں۔ دونوں طرف کے چہرے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ بیچ میں ایک لڑکی تھی جس کا رنگ گرمیوں کی شام کی طرح سانولا تھا اِس پس منظر میں سٹیج کے سامنے ایک کوچ پر ایشیا کا عظیم الشان شاعر، جس کی روح کائنات کے ذرّے ذرّے سے ہم کلام تھی، زرد ریشمی لباس پہنے بیٹھا تھا۔ موسیقی کے باریک تار کی طرح لہراتی ہوئی ایک لہر شاعر کے سر کے بالوں، چہرے کی جھرّیوں، ڈاڑھی کی جھالر اور ریشمی عبا کی شکنوں میں ہوتی ہوئی پاؤں تک آ پہنچی تھی۔

"ڈھولک بولی، گڑ گڑ نار۔ ستار بولے، درردرا، درردرا، سانولی لڑکی نے ہلکی سی سانس لی معلوم ہُوا جل پری نے کسی آبشار کے پاس سسکی بھری۔

"شاعر کے منہ سے حمد کے بول پھُوٹے۔ جوان آواز، بڑھاپے کے تقدس اور سنجیدگی کی لے جو اُٹھی تو فوراً پس منظر کے گنگا جمنی روپ میں لپٹ کر فضا میں تیرنے لگی۔ یہ آواز جس اُتار چڑھاؤ پر چل رہی تھی اُس میں نہ کوئی گت تھی اور نہ اُس پر کوئی ساز بج سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی وُہ موسیقی تھی۔

"ایک طرف سے نیلے، زرد، سُرخ اور سنہرے رنگ کو اُڑاتی ہوئی ایک حسین لڑکی ناچتی نکل آئی۔ چند سیکنڈ گزرے تھے کہ معلوم ہُوا کہ وُہ ناچ نہیں رہی ہے بلکہ شاعر کے نغمے نے انسانی روپ دھارن کر لیا ہے۔

شاعر حمد گاتا رہا۔ لڑکی ناچتی رہی۔ سانولی کوئل سانسیں بھرتی رہی۔ حسین ستاریئے ستار چھیڑتے رہے۔ کہنے کو تو یہ اتنی چیزیں تھیں مگر حقیقت صرف ایک تھی ــــ ٹیگور[۱]

---

۱ "ہندوستان" ہفتہ وار (لکھنؤ) ۷ اگست ۱۹۴۱ء

"یہ ایک فیتے کی مانند ہے جسے کسی کنواری لڑکی نے کاڑھا ہو۔ پہلے زمانے میں اِس قسم کی لڑکیاں موجود تھیں۔ وُہ اپنی زندگی، اپنی جوانی کے حسین خواب کسی رنگین نقش کی صورت میں فیتے پر کاڑھ دیتی تھیں۔"

ــگورکی اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ یہ بات ٹالسٹائی نے اُس وقت کہی تھی جب وُہ چیخوف کے ایک افسانہ "دوشیشکا" کا ذکر کر رہا تھا یہ بات بہت حد تک ٹیگور کے کرداروں پر بھی صادق آتی ہے۔ ایک بار میں نے شاعر کو بتایا تھا کہ اُن کا کوئی ناول پڑھنے سے بہت پہلے گیتانجلی کا اردو ترجمہ میرے ہاتھ لگ گیا تھا مگر اُن کی طرف میری کشش اُن کا افسانہ "کابلی والا" پڑھنے کے بعد شروع ہوئی۔

اُنہوں نے پوچھا "کابلی والا بھی اُردو میں پڑھا تھا؟"

"نہیں۔ انگریزی میں۔"

"گیتانجلی کا اُردو ترجمہ ــــ ترجمے کا ترجمہ ــــ کافی خشک ہوگیا ہوگا۔ شاعری ترجمے کی چوٹ نہیں سہ سکتی، نثر سہ جاتی ہے۔"

"اپنے افسانوں میں آپ کو کونسا بہت پسند ہے، گور و دیو؟"

"یہ کٹھن سوال ہے . . . . . ہار جیت، مجھے کافی اچھا لگتا ہے۔ یہ میرے فلسفے کا نچوڑ ہے۔ زندگی کے امن وسکون میں اُداس سُر بج اُٹھتے ہیں . . . . . خوشی کتنی بھی کیوں نہ ہو، یہ اُداس سُر تو بجیں گے ہی۔"

"ہار جیت" ہے تو افسانہ مگر اس میں نظم کی خوبی بھی بدرجۂ اتم پیدا ہوگئی ہے۔ ایسے ہی کسی افسانے کو پڑھ کر ایک نقاد نے رائے دی تھی کہ معیاری افسانہ وہی ہو سکتا ہے جو اُس اشرفی کا ہم پلّہ ہو جو سانچے کی ایک ہی داب میں تیار ہو جاتی ہے۔ اِس کی ٹکسال کبھی کھوٹی نہیں ہوتی کیونکہ اس کی تیاری میں کھری دھات استعمال کی جاتی ہے۔ امرپور کے راجہ اُودے نارائن کا درباری شاعر شیکھر، جس نے راجکماری اپراجیتا کو کبھی دیکھا نہیں، دربار میں روز نئی نظم پڑھتا ہُوا اپنی آواز بلند کر لیتا ہے تاکہ پرے رنواس میں بیٹھی اپراجیتا بھی اُس کے تاثرات سمجھ لے۔ وُہ راجکماری کے سندر ٹخنوں کے سپنے دیکھنے لگتا ہے جن پر پہنی ہوئی پازیب ہر قدم پر کوئی راگ الاپتی رہتی ہے۔ اِسی پازیب کے تال پر وُہ اپنی نظم سنایا کرتا ہے۔ پھر ایک دن باہر سے کوئی شاعر شیکھر کا مقابلہ کرنے کے لئے آنکلتا ہے۔ بھری سبھا میں دونوں شاعر راجہ کے سامنے اپنا اپنا کلام سناتے ہیں۔ شیکھر کے سادہ شعر پنڈارک کے چٹپٹے کلام کے روبرو پھیکے پڑ جاتے ہیں اور وہ ہار مان کر اپنے گھر کی راہ لیتا ہے۔ اپنی نظموں کے سارے مسودے آگ کی نذر کر دیتا ہے اور شہد میں کسی پیڑ کا زہریلا رس ملا کر کھا لیتا ہے اور پھر راجکماری اپراجیتا آ پہنچتی ہے ــ وُہ بتاتی ہے کہ ہار پنڈارک کی ہوئی ہے نہ کہ راج کوی شیکھر کی۔ مگر راجکماری کے یہ الفاظ شیکھر کی موت کو نہیں روک سکتے۔

زندگی کی تلخ حقیقت شاید یہی ہو کہ اپراجیتا کبھی شاعر کے روبرو نہ ہوئی مگر ٹیگور نے اپنے خاص اختیار سے افسانے کو ایک ایسے مقام پر پہنچایا ہے جو اپنی ذاتی اہمیت کی اونچی سطح پر واقع ہے۔

فن کے ماتحت ہونے کی بجائے ٹیگور نے حقیقتہً فن کو اپنے ماتحت کر لیا تھا۔ بہت سے افسانوں میں بنگالی دیہات کی منہ بولتی تصویریں ملیں گی۔ دھرتی کے بیٹوں کے داعیہ کو شاعر نے اپنا بنا لیا تھا۔ بار بار انہوں نے دھرتی کو بالکل قریب سے دیکھ کر تخلیقی توانائی حاصل کی تھی۔ دھرتی ماتا کی پکار انہوں نے کبھی ان سنی نہ رہنے دی تھی۔ قدرت کی کھلی گود میں سانس لینا اُن کا نصب العین بنا رہا۔

خود مَیں نے بھی بنگال کے کچھ پُرانے زبان زدِ عام گیت جمع کئے تھے۔ زندگی اَور ادب کی آبیاری میں یہ گیت بہت مدد دیں گے۔ یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے تو بیچ ہی میں نہ چھوڑ دینا۔"

"اسے ہاتھ میں نہ لیا ہوتا تو شانتی نکیتن میں جم کر رہ پاتا۔"

"پریم اور سُندرتا کے میل سے تو آدمی جہاں چاہے نئے شانتی نکیتن کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔"

"اُس وقت مجھے وُہ واقعہ یاد آیا جب (جیسا کہ مَیں نے شاعر کے ایک دوست سے سُنا تھا) یورپ میں کسی نے شاعر سے پوچھا تھا کہ کیا ہندوستان میں کوئی اَور بڑا شاعر بھی ہے تو شاعر نے جواب دیا تھا "بڑا شاعر تو خود میں بھی نہیں ہوں، ہاں شاعروں کا ہمارے دیس میں کوئی کال نہیں ہے ..... چرخہ کاتتی ہوئی عورتیں بھی کچھ نہ کچھ گاتی رہتی ہیں۔ کسانوں کے گیت الگ ہیں ہمارے ملاحوں کے اُداس بھٹیالی گیت اَور باؤل بیراگیوں کے صوفیانہ گیت بھی کچھ کم اہمیّت نہیں رکھتے۔ اِن سب گیتوں میں ہماری شاعری کا زندہ لہو بہتا رہتا ہے۔"

اَور وُہ واقعہ مجھے کبھی نہ بھولے گا جب مَیں نے شاعر کو بتایا تھا کہ مَیں نے اپنی بیٹی کا نام کویتا رکھا ہے۔ انہوں نے ہنس کر کہا تھا "کوی[1] ہونے سے کویتا[2] کا باپ ہونا کچھ کم تو نہیں ہے!" مَیں نے جھینپ کر جواب دیا تھا "اب اِس جنم میں تو کوی بننے سے رہا" فوراً ہی اُنہوں نے میری بات کاٹ دی تھی! "کویتا خود اپنے باپ کو کوی بنا دے گی ایک دن۔"

ٹیگور کی روح کیمرے کی بے حد اثر پذیر فلم کی طرح تھی۔ آج سے بائیس برس پہلے جب امرتسر میں مارشل لا کی حکومت نے ظلم ڈھایا تھا تو اِس پر جلیانوالہ کے مظلوموں کا ہو بہو فوٹو کھنچ گیا تھا اَور اُنہوں نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے ۳۰ مئی ۱۹۱۹ء کے دن وائسرائے ہند کے نام ایک خط لکھ کر اپنا سر کا خطاب واپس کر دیا تھا۔ ابھی ابھی جب برٹش پارلیمنٹ کی ایک ممبر مِس راتھبون نے آزادی پسند ہندوستانیوں پر غدّاری کا الزام لگایا تو ہندوستان کے اِس بوڑھے شاعر نے بسترِ مرگ سے وُہ جواب دیا جو رہتی دنیا تک ہمارے دیس کی تاریخ میں زندہ رہے گا۔ اِسے پڑھ کر یقیناً مِس راتھبون کو اپنا بیان ایسے "فٹ پاتھ" کے روپ میں نظر آنے لگا ہوگا جس کی بجری اُکھڑ گئی ہو۔

ٹیگور صرف ایک عظیم فن کار ہی نہ تھے۔ اُن کی شخصیت آزاد ہندوستان کی ایک بڑی دلیل بن گئی تھی جیسا کہ وِل ڈیورنٹ نے اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "ہندوستان میں تمہاری ہستی ہی اُس کے حقِ آزادی کی دلیل ہے۔" اُن کی موت غریب ہندوستان کے لئے بہت بڑا صدمہ ہے۔

---

[1] شاعر

[2] شاعری

مہاتما گاندھی نے اپنے بیان میں کہا ہے؛

"ٹیگور کے انتقال نے اِس دور کے سب سے بڑے شاعر ہی سے نہیں بلکہ ایک سچے دیس بھگت اور انسانیت پرست شخص سے بھی ہمیں محروم کر دیا ہے مفادِ عامہ کا کوئی ایسا کام مشکل نکلے گا جس پر اُن کی زبردست شخصیت کا نقش نہ ثبت ہو چکا ہو۔ انہوں نے شانتی نکیتن اور شری نکیتن کو قوم کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے ترکے میں چھوڑا ہے۔ البشور اُن کی پوتر آتما کو شانتی دے اور شانتی نکیتن کے منتظمین کو صلاحیت دے کہ وہ اِس ذمہ داری کے اہل ثابت ہوں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈیرہ دون جیل سے یہ تار بھیجا ہے؛

"گورودیو کے انتقال نے ہم سب کو جنہوں نے اُن کی عالی شان ذہانت اور زبردست شخصیت کے سائے میں پرورش پائی ہے اور ان کی اعلیٰ تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے رہے ہیں، تنہائی اور تاریکی میں ڈال دیا ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا ستارہ جو صرف ہمارے ہی ملک کو نہیں بلکہ سارے عالم کو ماضی اور حال کے بیش بہا علوم کے نور سے روشن کر رہا تھا غروب ہو گیا ہے اور ہمارے دل خالی ہو گئے ہیں تاہم اُن کی آواز ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے اور اُن کے تازہ فرمودات کی روشنی ہماری رہنمائی کرے گی۔ ہندوستان کے پُرانے رشیوں کی طرح اُنہوں نے ہمارے لئے ایک لازوال ترکہ چھوڑا ہے۔ اور اُن کے انتقال کے موقع پر بھی ہم فخر، تشکر، محبت اور احترام کے ساتھ اِس عالی شان زندگی اور اُس کے عظیم الشان کارناموں کو دیکھتے ہیں۔ اِس بیش بہا ترکہ کو ہم محفوظ رکھیں گے۔ اور مجھے پورا بھروسا ہے کہ ہر ہندوستانی شانتی نکیتن اور وشو بھارتی کی ترقی کے لئے جو گورودیو کے بلند مطمعِ نظر کی نشانیاں ہیں، مدد دینا اپنا فرضِ منصبی سمجھے گا۔"

مسز سروجنی نائیڈو نے لکھا ہے؛

"اپنی فطانت، اپنے حُسن، اپنی حکمت، لطیف ظرافت اور اپنی خوش خلق شخصیت کی دلکشی اور ناموری کے لحاظ سے وہ اپنی زندگی میں رومان کی ایک یکتا اور دلربا مورت تھا۔ اب جبکہ وہ چل بسا ہے وہ ایک بلند پایہ مشہورِ عام داستان بن جائے گا ––– ہمیشہ کے لئے پریوں کی کہانی۔ مگر اُس کے گیت نسل در نسل بہار کے پہلے پھولوں کی طرح تازہ اور چاندنی رات کی ندی کے سنگیت کی طرح جادو بھرے رہیں گے۔ ایک ممتاز باغبان چل بسا مگر حُسن کی شاعری جسے اُس نے بویا تھا، ابد تک کھلتی رہے گی۔"

شاعر کی وہ تصویر، جس کی کاپی میں نے جگن ناتھ پوری میں اُن کی نذر کی تھی، میرے سامنے پڑی ہے۔ پھولوں سے لدی کا ٹھ چمپا کی ٹہنیوں نے اُن کے سر کے گرد ہالہ سا بنا رکھا ہے۔ اُن کے بال بدستور ہمالہ کی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ پیش کر رہے ہیں..... تصویر کی طرف دیکھتے دیکھتے میرے ذہن میں ان گنت چھوٹی چھوٹی چیزیں، جن کو اُن کا مقدس لمس نصیب ہوتا رہا تھا، جاگ رہی ہیں۔

"..... سب کہتے ہیں، جانے نہیں دیں گے، جانے نہیں دیں گے۔ پھر بھی جانے دینا پڑتا ہے۔ پھر بھی لوگ چل دیتے ہیں!"

––– آخر شاعر بھی چل دیا!

لاہور: ۱۹۴۱ء

دلنواز ستار تھی

صدائے آوارہ

دُور تک رات کا افسردہ فسُوں طاری ہے۔
چار سُو ٹھنڈے ستونوں سے نکل کر کرنیں
کس کی بیداری کی تصویر بنی بیٹھی ہیں؟
اَور میں بیٹھا ہوں اک پیڑ کے نیچے، خاموش،
کُہنیاں ٹیکے ہوئے، چہرہ ہتھیلی پہ دھرے،
محو ہُوں اپنے خیالات کے اُلجھاؤ میں۔
یعنی اُس طائرِ زخمی کی طرح جو خاموش
آشیاں سے ہو بہت دُور کہیں بے چارہ،
بے پر و بال، دل آزردہ، اکیلا، تنہا ــــــ
پاس دو راہے پہ بجری کی صدا ــ اُف توبہ!
لوہے کی جالی سے چھنتی ہوئی بجری کی صدا،
اس پہ جھنجلا نا ہوں رہ رہ کے، مگر کیا حاصل
بار بار ایک ہی انداز میں دہراتی ہے۔
لوہے کی جالی سے چھنتی ہوئی بجری کی صدا،
"چھیڑ! ہاں چھیڑ اُسے چھیڑ"، کا مبہم نغمہ
چپکے چپکے مرے کانوں میں ہوا لاتی ہے۔

ــــــ(۲)ــــــ

لیکن اس طرفہ ترنّم کی غرض کیا مجھ سے،
باریابی کی توقع ہی کہاں ہے مجھکو،
میرے ہاتھوں میں کہاں جرأتِ رندانہ کی تاب
میں تو ہوں طائرِ زخمی کی طرح جو خاموش
آشیاں سے ہو بہت دُور کہیں بے چارہ،

بے پر و بال، دل آزردہ، اکیلا تنہا،
پھر صدا آتی ہے، پھر آتی ہے، پھر آتی ہے
"چھیڑ ہاں چھیڑ اُسے چھیڑ"، کا مبہم نغمہ
چپکے چپکے مرے کانوں میں ہوا لاتی ہے ـــــ
ریت باریک ہے چھَن چھَن کے گری جاتی ہے
ٹوکری سے بھی گری ہوگی، چھنی ہو گی ضرور
لیکن اُس کی تو صدا تک نہیں آئی مجھ کو،
اور اِس بجری کا اندازِ ترنّم! ـــــ توبہ
کان سننے سے جھجکتے ہیں، مگر سنتا ہوں،
میری ہر رگ میں کوئی گاتا چلا جاتا ہے
"چھیڑ ہاں چھیڑ اُسے چھیڑ"، کا مبہم نغمہ ـــــ

(۳)

مجھ کو اُلجھاتا ہے آوارہ صداؤں میں خیال،
کتنا بے معنی و بیکار ہے یہ سوچ مرا ـــــ
روز سنتا ہوں اسی طور سے صدا بجری کی
لیکن اِن معنوں میں کب میں نے سُنا ہے اِس کو،
"چھیڑ ہاں چھیڑ اُسے چھیڑ"، یہ کیا نغمہ ہے؟
یہ تو ہے لوہے کی جالی پہ صدا بجری کی
ایک بے معنی سی آواز ہے ـــــ لیکن اے دل
آج اِس چھنتی ہوئی بجری کو کیا سوجھی ہے ـــــ
خیر چھوڑو بھی اِسے، جانے بھی دو، میں اِس وقت
محو ہوں اپنے خیالات کے اُلجھاؤ میں
کہنیاں ٹیکے ہوئے، چہرہ ہتھیلی پہ دھرے۔

یوسف ظفر بی اے

تصویریں

نصرت چند دن سے گھر میں کچھ کھسر پھسر سن رہی تھی۔ اِن دنوں میں اُس نے کتنی بار اپنی امّی اور بھائی جان کو سرگوشیاں کرتے دیکھا تھا۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ اِن سرگوشیوں کے دوران میں جب وُہ اِن کے پاس سے گزرتی یا اِن کے قریب آکر بیٹھ جانا چاہتی تو وُہ دونوں اِس طرح خاموش ہو جاتے جیسے اُس کے خلاف سازش کر رہے ہوں۔ نصرت اِس قدر غبی نہ تھی کہ اِن سرگوشیوں کا مطلب نہ سمجھ سکتی۔ وُہ جانتی تھی کہ جب کسی درمیانے طبقے کی نوجوان ہندوستانی لڑکی کے بزرگ گھر میں اِس سے علیحدہ ہو کر کانا پھوسی شروع کر دیں تو اُن کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کی ہم عمر لڑکیوں کے خلاف اُن کے والدین اور دوسرے اقارب اسی طرح سازش کرتے ہیں اور عام طور پر اِن سے مشورہ لئے بغیر انہیں چپ چپاتے ایک ایسے آدمی کے حوالے کر دیتے ہیں جو ان کے نزدیک اِتنا ہی ناقابلِ فہم ہوتا ہے جتنا روایتی اندھوں کے نزدیک ہاتھی۔ پھر اگر نصرت دل ہی دل میں اپنی امّاں اور بھائی جان کے طرزِ عمل پر جھنجلا رہی تھی تو اِس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ قدرتی طور پر اُس کے دل میں یہ جاننے کی خواہش تھی کہ وُہ کس آدمی کے پلّے باندھی جائے گی۔ لیکن یہ بات اُسے معلوم کہاں سے ہو۔ گھر میں امّی اور بھائی جان کے علاوہ ایک بوڑھی کھوسٹ نوکرانی رحمت تھی۔ جس نے اِسے گودی کھلایا تھا اور جو اُس کی سہیلیوں کے کپڑوں کی تراش خراش میں مین میخ نکالنا اپنا حق سمجھتی تھی اور جسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نصرت کا دوپٹہ کہیں اُس کے سر سے سرک تو نہیں گیا؟ نصرت کے والد ایران کی ایک انگریزی کمپنی میں ملازم تھے اور کئی کئی سال بعد وطن آتے تھے۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ نصرت نے اپنے والد کے بجائے ان کی تصویریں زیادہ دیکھی تھیں تو اس میں مبالغے کا کوئی دخل نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نصرت کی چچا زاد بہن رشیدہ ہر سال بڑے دن کی چھٹیوں میں اُن کے ہاں آجاتی تھی، اور پھر وہ سردیوں کی طویل راتوں میں ایک ہی چارپائی پر لیٹ کر دنیا جہان کی تمام باتیں کر ڈالتی تھیں۔ لیکن رشیدہ کے آنے میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا۔ پورا ایک مہینہ۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے ایک چھوٹی بہن کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی۔ اسے اپنی اُن تمام سہیلیوں پر رشک آرہا تھا جن کے چھوٹی بہنیں تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ چھوٹی بہنیں جاسوسی کے فن میں، اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ وُہ اِس تاک میں رہتی ہیں کہ کب اُن کے کانوں میں اپنی بڑی بہن کے شادی بیاہ کی بات کی بھنک پڑے اور وہ جا کر اُسے سنائیں اور ستائیں۔ یوں تو نصرت کے بھائی جان ایسے کھل کھرے یا سٹریل نہیں تھے بلکہ اُنہوں نے اپنی محبت سے اسے ایک دوسری بہن کی کمی کا احساس بہت کم ہونے دیا تھا، لیکن اِس بارے میں تو وہ بھی بڑے پُرانے خیال کے نکلے۔ کہنے کو تو وہ شادی بیاہ کے معاملے میں آزادیٔ رائے کے بڑے قائل تھے لیکن غالباً آزادیٔ رائے کا یہ حق وہ صرف مردوں کے لئے مخصوص سمجھتے تھے۔ ایک دو بار تو نصرت کے دل میں بھی خیال آیا کہ بھائی جان سے پوچھ ہی

رے کہ کیوں صاحب۔ آخر آپ نے گھر کے ماحول کو اس قدر پُراسرار کیوں بنا رکھا ہے؟ کیا مجھے یہ جاننے کا حق نہیں کہ آپ میری آئندہ زندگی کے بارے میں کیا فیصلہ کر رہے ہیں؟ کیا آپ کی روشن خیالی صرف الفاظ تک محدود ہے؟ لیکن یہ سوال کرنے کے لئے وہ زبان کس سے مانگ کر لائے۔ پھر اپنی شادی کے معاملے میں تو ہر ہندوستانی لڑکی کا شرمانا رواجاً ضروری سمجھا جاتا ہے اور نصرت کا اپنا حال تو یہ تھا کہ جب وہ کسی اخبار میں ایک نئے بیاہے ہوئے جوڑے کی تصویر دیکھتی تو خود بخود لجا جاتی اور حیران ہوتی کہ کس طرح ان لڑکیوں کے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔ یہ اس ڈھٹائی سے مُنہ کھولے دنیا کے سامنے اپنی شادی کا ڈھنڈورا پیٹتی پھرتی ہیں۔ ایک بار اسے خیال آیا کہ لکھ کر ہی پوچھ لے لیکن دل کی نامکمی کا کیا علاج؟ اُسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وُہ صرف منصوبے باندھنا جانتی ہے عمل کرنا کیوں نہیں جانتی۔ اس سوچ اور دبدا کی حالت میں ایک شام وہ باورچی خانے میں چولھے کے پاس بیٹھی سویٹر بُن رہی تھی اور اُس کی امّی اور بھائی جان صحن میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ نصرت اُن کی طرف پشت کئے بظاہر بے پروائی کے انداز میں بیٹھی تھی۔ لیکن اُس کے جسم کا ہر مسام کان بنا ہُوا تھا۔ امّی کہہ رہی تھیں۔

"بیٹا تم نے سرفراز اور اُس کے گھر والوں کا عندیہ تو معلوم کر لیا؟"

سرفراز! نصرت کو معلوم ہو گیا۔ کہ اُس کی زندگی کا ساتھی کون ہو گا۔ اس وقت اُس نے اور کچھ سننے کی پروا نہ کی۔ اُس کی مثال اُس صاحبِ ضمیر چور کی سی تھی جو نقدی کے صندوق میں سے صرف اپنی فوری ضرورت کے مطابق روپے چرا لیتا ہے۔ اُس نے سرفراز کو ایک بار دیکھا تو ضرور تھا لیکن اس طرح تو اُس نے خوانچے والے کو بھی گلی میں سے گزرتے دیکھا تھا۔ سرفراز اُس کے بھائی جان کا دوست تھا اور بارہا ان کے مکان پر آیا ہو گا۔ لیکن نصرت اپنے بھائی جان کے ہر دوست کو جھانکتی تھوڑا ہی رہتی تھی۔ البتہ اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ جب کبھی سرفراز اُن کے ہاں آتا۔ تو مردانے سے خوب خوب قہقہے بلند ہوتے۔ نصرت کے بھائی جان کو سرفراز کی دوستی پر بہت فخر تھا اور وُہ گھر میں کئی بار اس بات کا ذکر کر چکے تھے کہ سرفراز ہندوستان کی معاشرت پر ایک شاندار کتاب لکھ رہا تھا۔ نصرت نے سرفراز کے مشاغل پر غور کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی۔ اُس کے خیال کی دنیا میں اُس کے باپ اور بھائی کے سوا اور کوئی مرد داخل نہیں ہوا تھا۔ رات کو سوتے وقت اُس نے کئی بار دل ہی دل میں اپنے بھائی کی گوناگوں دلچسپیوں، آئندہ زندگی اور شادی کے متعلق کتنے ہی منصوبے باندھے تھے۔ کئی بار اُس نے تصوریں دیکھا کہ اُس کا باپ ہزاروں میل کے فاصلے پر ایک تنہا اور اُداس کمرے میں بیٹھا ہوا اپنے بال بچوں کی یاد میں محو ہے۔ لیکن اُس کے خیالات کی پُرشفقت چار دیواری میں ابھی تک کوئی تیسرا مرد داخل نہیں ہو سکا تھا۔ اُس دن جب وہ بستر پر لیٹی تو وہ سرفراز کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ایک اجنبی نے باپ اور بھائی کو اُس کے خیال کی دنیا سے باہر نکال دیا تھا۔ وُہ اپنے ذہن میں سرفراز کے نقوش اُجاگر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنکھیں؟ شاید بہت بڑی نہیں لیکن اچھی تھیں۔ ناک؟ ستواں! رنگ گندمی نہیں گندمی سے یقیناً کھُلتا ہُوا۔ اور قد تو بہت ہی اچھا ہے۔ بالوں کے متعلق تو وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ جب

اُس نے سرفراز کو دیکھا تھا تو اُس کے سر پر ٹوپی تھی۔ پھر جب نصرت کو یہ خیال آیا کہ سرفراز مصنّف بھی ہے۔ یا بننے والا ہے تو اُس کے دل میں ایک گُدگُدی سی ہوئی۔ اُس کی واقفکار عورتوں میں متعدد ایسی تھیں جو اپنے نام کے ساتھ اپنے خاوند کی ڈگریوں کو استعمال کرکے اپنی کم علمی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اُس کے اپنے محلے ہی میں مسز رفیع الدین مڈل فیل ہونے کے باوجود اپنے نام کے ساتھ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ لکھتی تھیں۔ حالانکہ یہ ڈگری خود اُن کے خاوند نے دو سال فیل ہونے کے بعد بڑی مشکلوں کے ساتھ حاصل کی تھی۔ نصرت نے سوچا، اگر سرفراز اپنی کتاب کو اُس کے نام معنون کردے تو کیا ہی اچھا ہو اور اُس کے ساتھ وُہ انتساب کے الفاظ سوچنے لگی۔

"نصرت کے نام"

محبت اَور شیفتگی کے ساتھ

یہ خیال اُس کے لئے کتنا روح پرور تھا۔ اُس کی روح مسرت کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔ اَور اِس احساسِ مسرت کے نشے نے اُسے سُلادیا۔ دوسرے دن اُٹھی تو اس کے دل میں ایک بالیدگی تھی۔ ایک اُٹھان۔ اُس نے سب سے پہلے رشیدہ کو خط لکھا کہ وُہ بڑے دنوں کی چھٹیوں کا ایک دن ضائع کئے بغیر فوراً اس کے پاس چلی آئے۔ خط لکھنے کے بعد اپنے خیالوں میں سرشار وُہ بے خیالی میں قلم کے ساتھ کھیلنے لگی۔ دفعتہً وُہ چونک پڑی۔ جیسے کسی نے اُس کے چٹکی لے لی ہو۔ اُس نے بے سوچے سمجھے پیڈ پر سرفراز کا نام لکھ دیا تھا! اَور پھر بیٹھے بیٹھے اسے خیال آیا کہ بھائی جان کے کمرے کو آج اُسے خود ہی صاف کرنا چاہئے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بھائی جان نے تو اپنے کمرے کو کباڑیئے کی دُکان بنا رکھا ہے۔ جب دیکھو کتابیں ادھر اُدھر بے ترتیب پڑی ہیں۔ تولیہ کُرسی پر لٹک رہا ہے۔ حجامت کا سامان تپائی پر بکھرا پڑا ہے اَور میلے کپڑوں کا انبار ایک کونے میں پڑا ہے۔ تو۔ یہ تو یہ ایسی بھی کیا بے پروائی ہے۔ بھائی جان کے کمرے میں پہنچ کر اُس نے محسوس کیا کہ اُن کے کمرے کی ابتری کے متعلق اس کا اندازہ ذرا مبالغہ آمیز تھا۔

اُس نے سب سے پہلے دیواروں پر لٹکی ہوئی تصویروں کو جھاڑا پونچھا۔ ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ وہی کشمیر کے دو ایک نظارے اور مونالیزا کی تصویر۔ لکھنے کی میز پر کتابوں کو ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد اس کے ہاتھ خود بخود درازوں کی طرف چلے گئے اَور وہاں ایک دراز میں بہت سے خطوں کے علاوہ تصویروں کا ایک البم بھی پڑا تھا۔ نصرت نے وہ البم اُٹھالیا اور ورق گردانی کرنے لگی۔ ایک تصویر پر اُس کا حافظہ کچھ ٹھٹکا اور پھر حاشیہ کی عبارت پر اس کی نظر پڑی۔ لکھا تھا

"مبادا تم بھول جاؤ"

سرفراز

نصرت کے چہرے پر ایک محویت، ایک انہماک کی کیفیت طاری ہوگئی۔ لیکن چند لمحوں کے بعد یہ کیفیتِ انہماک

ایک شریر تبسم میں تبدیل ہوگئی۔ جیسے کہہ رہی ہو" کیوں؟ کیسے قابو میں آئے؟ تم بالکل میرے بس میں ہو۔ جب چاہوں اور جتنا عرصہ چاہوں تمہیں دیکھوں۔ مجھ سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟ ہمارے مکان کی سنگین دیواریں، پردے کا رواج، دنیا کے آہنی قانون میں نے سب کو شکست دے دی ہے، اور ایک یہ مزے کی بات نہیں کہ میں تمہیں دیکھ رہی ہوں اور تم میرے دامن تک کی جھلک نہیں پا سکتے؟" پھر خدا جانے تصویر دیکھتے دیکھتے اُس کے جی میں کیا آئی کہ اُس نے تصویر کا مُنہ چڑایا۔ اور اپنی زبان باہر نکال دی۔ اپنی اس حرکت پر نصرت کو خود بخود بہت زیادہ ہنسی آئی۔ اور اس ہنسی ہی نے اسے اپنی محویت سے چونکا دیا۔ اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور البم کو دراز میں جلدی سے رکھ دیا۔

بڑے دنوں کی چھٹیوں میں رشیدہ کے آجانے سے نصرت کو بہت زیادہ سہارا مل گیا تھا۔ اب وہ رشیدہ کے ساتھ مل کر سرفراز کی تصویر بڑی بے فکری کے ساتھ دیکھا کرتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر بھائی جان کو یہ معلوم ہو بھی گیا کہ اُن کی میز کی درازوں کی ہر روز تلاشی لی جاتی ہے تو رشیدہ تمام ذمہ داری اپنے سر لے لے گی اور نصرت کو اس بات کا یقین تھا کہ اُس کے بھائی جان، رشیدہ کو کچھ نہیں کہیں گے۔ نصرت کو رشیدہ سے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اُس کی والدہ اور بھائی جان نے اُس کے والد کو اپنی تجویز سے مطلع کر کے منگنی کے لئے ان کی منظوری چاہی ہے۔ رشیدہ اور نصرت ہر روز ایران سے خط کا انتظار کرتیں رشیدہ نسبتہً زیادہ بے تاب تھی۔ وہ ہر روز کہتی "آپا! آج بھی چچا جان کا کوئی خط نہیں آیا" اور ایک دن جب نصرت نے اُسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

"تجھے کیا جلدی پڑی ہے منگنی تیری ہو رہی ہے۔ یا میری" تو رشیدہ بگڑ گئی۔ آخر کار ایران سے خط آیا۔ اِس سے پہلے جب کبھی اُس کے باپ کا خط آتا تو نصرت دوڑ کر اپنے بھائی جان کے پاس جا کھڑی ہوتی تھی۔ اُس کے بھائی جان اماں کو خط کا مضمون بلند آواز سے سُناتے اور وہ اُن کی پُشت پر کھڑی ہو کر اُن کے ساتھ ساتھ خاموشی سے پڑھتی رہتی۔ لیکن آج وہ بدستور اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ اُس کے بے تاب اظہارِ مسرت کی جگہ ایک گلا گھونٹنے والے اضطراب نے لے لی تھی۔

بہت دیر کے بعد رشیدہ آئی اور کہنے لگی "آپا! چچا جان کا خط آیا ہے" نصرت نے اپنی روح کی ساری بے تابی سے اُس کی طرف دیکھا...... "انہوں نے لکھا ہے کہ یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہ اس سے بہتر رشتے اُن کی نظر میں ہیں۔"

نصرت نے محسوس کیا۔ کہ چھت کا شہتیر اُس کے سر پر آ گرا ہے۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ رشیدہ کے آنسو بھی اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔ کچھ عرصے بعد جب بوڑھی رحمت اسے بلانے آئی تو اُس نے سر اُٹھا کر صحن کی طرف دیکھا۔ باورچی خانے کی انگیٹھی سے دھوئیں کے دبیز حلقے نکل نکل کر فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔

ان میلے حلقوں میں اسے سرفراز کی تصویر کے نقوش بکھرتے ہوئے معلوم ہوئے...... زندگی کی چاہت...... زندگی کے خواب اور تصویریں...... یکایک اسے احساس ہوا کہ اسے خوابوں اور تصویروں سے ہمیشہ کے لئے نفرت ہو گئی ہے۔

(بہ اجازت نشر گاہِ دہلی)

عطاء اللہ سجاد

برٹش میوزیم کا کتب خانہ

برٹش میوزیم کے کتب خانہ کی بناء اٹھارھویں صدی کے وسط میں پڑی۔ اس کی تعمیر نہ تو فلورنس کے اطالوی کتب خانہ (Biblioteca medico Laurenziana) کی طرح کسی انقلاب کا نتیجہ تھی اور نہ اس نے پیرس کی نیشنل لائبریری (Bibliotheque Nationale) کی مانند شاہی سرپرستی میں نشوونما پائی۔ انگلستان کے اِس مشہور کتب خانہ کا قیام دراصل ملک کے ایک دولتمند اور نامور طبیب سرہینز سلون (Sir Hans Sloan) کے ادبی ذوق اور علمی شغف کا رہینِ منت ہے۔ سلون کو کتابوں سے عشق تھا۔ ان کا کتب خانہ نادرِ روزگار سمجھا جاتا تھا۔ تقریباً پچاس ہزار کتابیں اور ساڑھے تین ہزار رسالے اس میں موجود تھے۔ سرہینز جس قدر علم کے دلدادہ تھے۔ اُسی قدر حبِ وطن کا جذبہ بھی ان میں موجود تھا۔ چنانچہ اپنے مرنے سے پہلے یہ وصیت کی تھی کہ ان کے بعد کتابوں کا یہ نایاب ذخیرہ اگر حکومت چاہے تو بیس ہزار پونڈ میں ان کے ورثاء سے خرید سکتی ہے۔ قیمت کے مقرر کرنے میں سلون نے بڑے ایثار سے کام لیا۔ سچ پوچھئے تو بیس ہزار پونڈ کی یہ مقرر کردہ رقم کتابوں کی اصل لاگت یا ان کی اُس وقت کی قیمت کی چوتھائی بھی نہ تھی۔ پھر بھی ان کی اس شرط کو حکومت نے بہت پس و پیش کے بعد قبول کیا۔ پارلیمنٹ نے کتب خانہ کو خریدنے کے لئے ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے ایک لاکھ پونڈ کی رقم بذریعہ لاٹری جمع کی گئی۔ ساتھ ہی ہارلین (Harlein) کے مخطوطات اور کوٹن (Cotton) کے مجموعہ کو بھی دس ہزار پونڈ میں اِس ذخیرے میں شامل کرنے کے لئے خرید لیا گیا۔ مزید برآں کتب خانہ کے آئندہ مصارف کے لئے تیس ہزار پونڈ کی رقم بطور ایک فنڈ کے محفوظ کی گئی جس کے منافع کے علاوہ پارلیمنٹ کی جانب سے بھی ایک معقول سالانہ امداد ملنے لگی۔ اس تمام آمدنی کے دخل و خرچ کا کلّی اختیار ٹرسٹیز یا نظماء کتب خانہ کو حاصل ہے۔

کتب خانہ کی انتظامی کمیٹی میں آرچ بشپ آف کنٹربری لارڈ چانسلر اور دارالعوام کے اسپیکر بحیثیتِ نظماء خصوصی نامزد کئے گئے۔ ان کے علاوہ اسقفِ لندن، رائل سوسائٹی اور رائل کالج لندن کے صدر۔ نیز سلون (Sloan) ہارلی (Harley) اور کوٹن (Cotton) خاندانوں کا ایک ایک رکن بھی مجلسِ انتظامی کے لئے منتخب کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اس مجلس کے اراکین میں رائل اکیڈمی آف آرٹس اور سوسائٹی آف اینٹی کیوریز (Society of Antiquaries) کے صدر کے ساتھ ٹونلی (Townley) پین (Payne) اور نائٹ (Knight) خاندانوں کے افراد اور نمایندۂ تاج کا مزید اضافہ ہُوا اور پندرہ ایسے ذی علم اصحاب بھی جو اعلیٰ ادبی اور علمی خدمات کے لئے مشہورِ زمانہ تھے بطورِ مشیرانِ خاص

کمیٹی میں شامل کر لئے گئے۔ مذکورہ اراکین کی تعداد چونکہ بہت زیادہ ہوگئی تھی اور بیک وقت ان سب کا یکجا ہو کر کسی معاملے کو طے کرنا خالی از دقت نہ تھا، اس لئے فوری کارروائیوں کے لئے ان لوگوں میں سے بیس منتخب افراد کی ایک مجلس بنائی گئی۔ اس کا اجلاس ماہانہ اب بھی ایک بار نیچرل ہسٹری میوزیم میں اور ایک دفعہ خود برٹش میوزیم میں منعقد ہوتا ہے۔ یورپ کے اور قومی کتب خانوں کی طرح برٹش میوزیم کے کتب خانہ کا محکمۂ تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نظمائے کتب خانہ اور حکومت کے کاروباری تعلقات وزیرِ مالیات کے توسط سے طے پاتے ہیں اور محکمۂ مالیات ہی کا پارلیمینٹری سکریٹری دار العوام میں میوزیم کے کتب خانہ کے متعلق سوالات کا جواب دیتا ہے۔

سر ہینز سلون کی وصیت میں یہ تجویز بھی شامل تھی کہ حکومت کی طرف سے کتابوں کے رکھنے کے لئے کسی معقول عمارت کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ۱۷۵۵ء میں لارڈ مانٹیگو (Lord Montague) کے محل میں کتب خانہ کو منتقل کر دیا گیا۔ یہ عمارت مشہور فرانسیسی آرکیٹکٹ پائرے پوجے (Pierre Puget) کے نفیس ذوق کا بہترین نمونہ تھی۔ ۱۷۷۰ء تک ضروریات کے لحاظ سے اس میں متواتر اضافے ہوتے رہے۔ مگر انیسویں صدی کے اوائل میں جب شاہ جارج سوم نے اپنا شاہی کتب خانہ میوزیم کو عطا فرمایا تو کتابوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی کہ عمارت اس کے لئے بالکل ناکافی نظر آنے لگی۔ علاوہ ازیں مصری عجائبات، یونان کے قدیم مرمری مجسمے (Elgin Marbles) مشہور اداکار و ڈراما نویس گیرک (Garrick) کے ڈرامے۔ برنی (Burney) کے جمع کئے ہوئے انگریزی اخبارات اور پرانی کتابوں کے بیش بہا مجموعوں کے اضافہ نے نظمائے میوزیم کو مجبور کر دیا کہ ایک اور عمارت جو بلحاظِ وسعت موجودہ عمارت سے دوگنی ہو فوراً تیار کرائی جائے۔ مانٹیگو ہاؤس (Montague House) میں گو اتنی گنجائش ابھی اور موجود تھی کہ ایک آدھ شعبہ کا اور اضافہ کیا جا سکے لیکن نظماء کی جدت پسند طبیعتوں نے ایک نئی عالیشان عمارت بنوانے کا فیصلہ کیا۔ اور عمارت کا نقشہ تیار کرنے کے لئے سر رابرٹ سمرک (Sir Robert Smirk) سے فرمائش کی گئی۔ سر رابرٹ کو یونان سے نئے نئے آئے ہوئے سنگ مرمر کے مجسموں نے کچھ ایسا متاثر کر دیا تھا کہ عمارت کا نقشہ بھی انہوں نے قدیم یونانی طرز پر بنایا۔ یہ چار متوازی حصوں پر منقسم تھا۔ اور وسط میں ایک وسیع مربع صحن چھوڑ دیا گیا تھا۔ بعد میں بلحاظِ ضرورت اس میں بھی مختلف تبدیلیاں اور اضافے ہوئے۔

موجودہ دار المطالعہ کا نقشہ انیٹونیو پنیزی (Antonio Panizzi) نے ۱۸۵۴ء میں تیار کیا۔ جو ہیئت کے لحاظ سے مدوّر ہے۔ یہ دار المطالعہ اب تک دنیا کے تمام کتب خانوں میں سب سے اعلیٰ اور عدیم المثال مانا جاتا ہے۔ میں نے فرانس اور جرمنی میں بعض مشہور ماہرین کو برٹش میوزیم کے دار المطالعہ کی عظمت اور شان کے متعلق یہ بیان کرتے سنا ہے کہ "جب کبھی ہم نے اس دار المطالعہ میں قدم رکھا چند لمحات کے لئے تو بالکل مرعوب اور مسحور ہو کر رہ گئے"، اور حقیقت

میں خود میں نے بھی اکثر سیاحوں اور خاص لندن کے رہنے والوں کی دارالمطالعہ میں داخلے کے وقت بعینہٖ یہی حالت دیکھی ہے۔

دارالمطالعہ میں حوالے کے کتابوں کی مجموعی تعداد (۶۵۰۰۰) پینسٹھ ہزار کے قریب ہے۔ قارئین کے لئے ساڑھے چارسو (۴۵۰) نشستوں کا انتظام ہے۔ نگراں کار اور لائبریری اسسٹنٹس کی نشست گاہ ہال کے عین وسط میں ہے: تاکہ پڑھنے والوں پر نظر رکھنے میں سہولت ہو۔ یہ نگراں کار اپنے فن کے اعلیٰ ماہر۔ بڑے مزاج دان، رہبر معلومات اور علم دوست ہوتے ہیں۔

اس امر کا تذکرہ بھی غالباً بے محل نہ ہوگا کہ کتب خانہ کی تعلیم کے لئے گو خود لندن یونیورسٹی میں ایک خاص مدرسہ قائم ہے اور اس مدرسہ کے تعلیم یافتہ طلبہ کا تجربہ اور قابلیت تمام یورپ اور دُنیا کے دیگر ممالک میں مستند مانی جاتی ہے لیکن برٹش میوزیم کے اربابِ اقتدار اپنے کتب خانہ کے ارکان کو بطورِ خود تعلیم دیتے ہیں اور عملی کام بھی سکھاتے ہیں۔ البتہ تعلیم کے لئے اُن لوگوں کو جو غیر ملکی زبانوں سے واقف ہیں زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔

میوزیم کے ریڈنگ روم میں صرف انہیں لوگوں کو مطالعہ کی اجازت مل سکتی ہے جن کی عمر کم از کم اکیس سال ہو، جو کوئی خاص تحقیقاتی کام کر رہے ہوں اور اس بات کا یقین دلائیں کہ یونیورسٹی یا کالج کے اور دوسرے مقامی کتب خانے ان کی مطلوبہ امداد پہنچانے سے قاصر ہیں اور ان کے لئے میوزیم کے دارالمطالعہ سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ انہیں پابندیوں کی وجہ سے دارالمطالعہ میں بیشتر علماء اور علمی تحقیقات کرنے والوں کا مجمع رہتا ہے۔ دارالمطالعہ میں آنے والوں کی روزانہ تعداد کا اوسط ۸سو افراد (۸۰۰) پر مشتمل ہے اور اندازہ کیا گیا ہے کہ سال بھر میں تقریباً دو لاکھ چالیس ہزار افراد صرف میوزیم کے دارالمطالعہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ مزید برآں اخبارات کے کمروں میں تقریباً اٹھارہ ہزار، مخطوطات کے حصہ میں بارہ ہزار اور شعبۂ مشرقی میں پانچ ہزار افراد سالانہ آمد و رفت رکھتے ہیں۔

کسی کتاب کو دارالمطالعہ سے باہر لے جانے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ نایاب کتابیں اور نادر مخطوطات لائبریری کے کسی مددگار کی موجودگی میں دکھلائے جاتے ہیں۔ کتابوں کی جلد بندی، بوسیدہ مخطوطات اور قدیم کاغذات کی مرمت اور درستی بھی خود میوزیم میں ہوتی ہے۔ اس کے لئے کتب خانے کے تہ خانہ میں ایک خاص شعبہ قائم ہے۔ جس کے تمام دروازے ہمیشہ مقفل رہتے ہیں۔ میوزیم کے ملازمین کے علاوہ تمام غیر اشخاص کو اندر جانے کی سخت ممانعت ہے اور خود ملازمین کو بھی آمد و رفت کے وقت اپنے پاس کا دکھانا ضروری ہے۔ اس شعبے میں ماہرینِ فن اور اُن کے مددگاروں کے علاوہ تقریباً سو آدمیوں کا عملہ کام کرتا ہے۔

شعبۂ جلد بندی کے ساتھ ہی عکاسی کا بھی ایک خاص شعبہ ۱۹۲۶ء سے قائم ہے جس میں کاغذات اور دستاویزات کی عام تصاویر کے علاوہ فوٹوسٹیٹس (Photostats) تصاویر کی مانگ روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور لوگ گراں بہا کاغذات اور مخطوطات کے یہ عکس بہت کم داموں میں بآسانی خرید سکتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر جے۔ ایم مینلی (J. M. Manly) نے ایک ایسا بجلی کا لیمپ کتب خانہ کی نذر کیا جس کی ہلکی نیلی اور سبز روشنی میں کاغذات و مخطوطات کے مدّھم حروف بآسانی پڑھے جا سکتے ہیں۔ اس لیمپ سے شعبۂ عکاسی کے کاموں میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اس کتب خانہ کو کتابوں کی خرید اور دیگر انتظامی امور کے لئے حکومت کی طرف سے اب تقریباً ایک لاکھ تینتیس ہزار پونڈ کی سالانہ امداد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں کاپی رائٹ یعنی حقِ تصنیف کے متعدد قوانین کی بنا پر سلطنتِ برطانیہ میں جہاں کہیں بھی کوئی اعلیٰ، مستند اور معیاری کتاب شائع ہوتی ہے، ناشر کو اس کا کم از کم ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ کو لازماً بھیجنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں دنیا کے ہر ملک اور ہر زبان کی بہترین کتابیں موجود ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو کتابوں کے خریدنے سے اور دوسری طرف قوانینِ حقِ تصنیف کی بنا پر فراہمیٔ کتب اور بعض شاہانِ انگلستان اور بے شمار علم دوست اصحاب کے عطایا سے یہ کتب خانہ اتنا مالا مال ہوا کہ اس کی کتابوں کی مجموعی تعداد چالیس لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔

اب میں چند خاص ذخیروں اور عطایا کا حال مختصراً عرض کرتا ہوں۔ ان میں سب سے اہم اور دلچسپ وہ مجموعہ ہے جو ہنری ہفتم شاہِ انگلستان نے سولھویں صدی کے وسط میں خانقاہوں کی تباہی کے بعد جمع کیا تھا اور جس میں ولی عہد جیمز اوّل یعنی شہزادہ ہنری ٹامس کرنیمر اور ارل ارنڈل کے کتب خانے بھی شامل ہیں۔ یہ تمام کتابیں جارج دوم نے میوزیم کے افتتاح سے قبل ہی اس کی لائبریری کے سپرد کر دی تھیں۔

جارج دوم کے بعد ان کے جانشین جارج سوم نے بھی اپنا نایاب ذاتی کتب خانہ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے میوزیم کے تفویض کر دیا تھا۔ اس ذخیرے میں کثیر کتابوں کی تعداد ایسی موجود ہے جن کے دیکھنے سے جرمنی، فرانس، ہالینڈ، اسپین اور انگلستان میں پندرھویں صدی عیسوی سے اُنیسویں صدی عیسوی تک چھاپے کی ایجاد و اختراع کی تاریخ پر بہترین اور تفصیلی روشنی پڑتی ہے علاوہ ازیں اُن تمام قدیم کتابوں کے نسخے بھی موجود ہیں جو اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ اور نوآبادیاتی ممالک میں انگلستان کے بعض صاحبِ ذوق اشخاص کی سعی سے طبع ہوئے تھے۔ چند پُرانے نقشے اور انگریزی موسیقی کے متعلق قدیم کتابیں بھی قابلِ دید ہیں۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں شاہ جارج پنجم نے بھی اپنے نامور اجداد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے موسیقی سے متعلق اپنا سارا لٹریچر بکمالِ سرپرستی میوزیم کے شاہی شعبہ کو عطا فرما دیا جس کی وجہ سے موسیقی کے مجموعہ میں قابلِ قدر اضافہ ہو گیا ہے۔

آنریبل ٹامس گرینول کا ذخیرہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس میں بعض قدیم ادبی قصے اور انگریزی تاریخ پر نایاب کتابیں ہیں۔ اکثر کتابوں کے ایک سے زائد نسخے ہیں۔ ان کو بھی بڑی احتیاط سے محفوظ کر لیا گیا ہے اور یہ عام طور پر پڑھنے والوں کو نہیں دئے جاتے۔

انقلابِ فرانس) کے متعلق کورکر کا مجموعہ بھی ۱۸۵۶ء میں خرید لیا گیا تھا۔ اس میں بے شمار نادر کاغذات ہیں میوزیم کے مشہور محافظ جی۔ کے فاٹیسکیو نے ان کی ایک فہرست بھی مرتب کی تھی۔ جو اب تک کتب خانہ میں نسبتہً مل سکتی ہے۔

انگلستان کے مشہور پادری کریکروڈ نے بھی اپنی محنت اور کاوش سے جمع کی ہوئی تمام کتابیں آخری وقت بطور یادگار کتب خانہ کی نذر کردی تھی۔ ان میں قدیم جلد سازی کے بعض اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔ جو قابلِ دید ہیں۔

شعبۂ مشرقی کا ذخیرہ بھی بڑا جامع اور وسیع ہے۔ یہ ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب مطبوعہ کتابوں اور تقریباً ۱۶ ہزار مخطوطات پر مشتمل ہے۔ عبرانی۔ فارسی، عربی، سنسکرت، پالی، تامل، تلنگی، چینی اور جاپانی وغیرہ غرض کوئی مشرقی زبان ایسی نہ ہوگی جس کی قدیم و مستند کتابیں اس کتب خانہ میں موجود نہ ہوں۔

مذکورہ ذخائر کے علاوہ اور بے شمار مجموعے اور نوادر یہاں ایسے پائے جاتے ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن فی الحال میں انہیں پر اکتفاء کرتا ہوں۔

آخر میں یہ بتا نا ضروری سمجھتا ہوں کہ برٹش میوزیم کے کتب خانے کی شہرت اور ترقی کا راز اُسی جذبۂ حب الوطنی میں مضمر ہے جو اس کے آغاز میں کار فرما تھا۔ اور گو اب اسے سلطنتِ برطانیہ کی امداد بھی حاصل ہے لیکن اس کے باوجود وہ درحقیقت قوم کی اخوت و یکجہتی کا علمبردار ہے مثلاً یہ تذکرہ بیجا نہ ہوگا کہ چند سال ہوئے جب روسی حکومت نے انجیلِ مقدس کا ایک قدیم عبرانی نسخہ ایک لاکھ پونڈ میں فروخت کرنا چاہا تو نہ صرف نظمائے برٹش میوزیم بلکہ تمام انگریز قوم نے متفقہ طور پر یہ محسوس کیا کہ یہ انمول نسخہ کتب خانۂ برطانیہ کی زینت بننے کے لائق ہے۔ قیمت اس قدر گراں تھی کہ تنہا لائبریری فنڈ سے اس کا ادا کیا جانا محال تھا۔ مگر سب کو اس کے خریدنے کی لو لگی ہوئی تھی اور قوم کے بچے بچے نے اس مقصد کے لئے چندہ فراہم کرنے میں اپنے انتہائی جوش و خروش کا اظہار کیا اور آخر کار اس نادرِ روزگار نسخے کو کتب خانۂ برطانیہ کے لئے خرید ہی لیا۔

مسعود یزدانی مہتمم کتب خانہ

~~(بہ اجازتِ ادارہ کی نشر گاہ حیدرآباد دکن)~~

اقوالِ زرّیں

۱:۔ جو انسان جاہلوں کو اپنی نیک ہدایت سے راہِ راست پر لانا چاہتا ہے وہ گویا شاخِ گُل سے ہاتھی کو باندھنے اور برگِ گُل کی نوک سے ہیرے میں سوراخ کرنے اور کھاری سمندر کو ایک بوند رس سے شیریں کرنے کی بیکار کوشش کرتا ہے۔

۲:۔ خاموشی کو خدا نے ظرفِ کم عقلی کا سرپوش بنایا ہے۔ یہ داناؤں کی مجلس میں بیوقوفوں کے لئے زیور ہے۔

۳:۔ جو انسان لطفِ شعر و موسیقی سے بے بہرہ ہے بلاشبہ وہ بے دُم اور بے سینگ کا جانور ہے۔ گھاس نہیں کھاتا اور جیتا ہے یہ اُس کی خوش قسمتی ہے۔

۴:۔ داناؤں اور عارفوں کو حقیر مت جانو کیونکہ ان کو تمہاری زوال پذیر دولت قابو میں نہ لاسکے گی۔ اسی طرح جیسے ہاتھی کنول کی شاخ سے نہیں باندھا جاسکتا۔

۵:۔ قوتِ برداشت ہو تو زرہ بکتر، غصہ ہو تو مخالف، برادری ہو تو آگ، صاف دل دوست ہوں تو دوا، بدخواہ ہوں تو سانپ، علم ہو تو دولت، حیا ہو تو زیور اور شاعری میں کمال حاصل ہو تو بادشاہت کی کیا ضرورت ہے۔

(بھرتری ہری)

ترجمہ عاشق ہوشیارپوری

عابدِ شب زندہ دار سے

آاس طرف بھی عابدِ شب زندہ دار دیکھ
موجِ ہوا میں سلسلۂ زُلفِ یار دیکھ

بے بادہ کس نے پائے ہیں اسرارِ کائنات
آمیکدے میں رقصِ مئے خوشگوار دیکھ

کب تک رہیں جلوہ گہِ حور و سلسبیل
جنگل کی دیویوں کو لبِ جوئبار دیکھ

جن کی ہر ایک بُوند میں غلطاں ہے خُلدِ عیش
اُن بادلوں کا رقص سرِ کوہسار دیکھ

بے کیفیوں میں رُوح کی تابندگی کہاں
آچاندنی میں بہتے ہوئے آبشار دیکھ

ہر پھول میں ہے دفترِ عرفاں کھُلا ہُوا
رنگینیٔ بہار بقدرِ بہار دیکھ

تا چند صومعے میں یہ رحمت کی جُستجو
آمیکدے میں رحمتِ پروردگار دیکھ

کب تک اسیرِ سلسلۂ مُصحف و نماز
ساغر اُٹھا تجلّیٔ روئے نگار دیکھ

جوہر کی مے پرستیٔ ظاہر میں گم نہ ہو
پائی ہے آنکھ اگر تو دلِ بادہ خوار دیکھ

جوہر فریادی حیدرآباد دکن

سوشلسٹ

صبح نو بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بے طرح بجنے لگی۔ میں نے اپنے کان زور سے لحاف میں لپیٹ لئے۔ لیکن شاید ٹیلیفون کرنے والے نے بھی سوچ رکھا تھا کہ جواب لئے بغیر وہ بھی نہ ٹلے گا۔

آخر میں نے اپنے بستر سے اُچھل کر ریسیور اُٹھا لیا۔ "ہیلو۔ او۔ او۔۔۔"
کسی نے شائستگی سے پوچھا "آپ کہاں سے بول رہی ہیں؟"
"منہ سے بول رہی ہوں" میں نے بالکل سچ سچ عرض کر دیا۔
انہوں نے کچھ پریشان ہو کر کہا "میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔۔ یعنی آپ کس جگہ سے بول رہی ہیں؟"

میں نے جواب دیا "اپنے کمرے میں سے بول رہی ہوں"

"لاحول ولا قوۃ" کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

میں نے ایک انگڑائی لی اور تکیئے پر سر رکھ کر مسکرانے لگی۔

میری خادمہ نے پردے میں سے اپنا بھولا بھالا منہ اندر نکال کر کہا "غسل کا پانی تیار ہے"

میں نے سست آواز میں کہا "ہوں۔ اوں۔۔۔۔۔" اور پھر لحاف میں لپٹی لپٹائی پلنگ سے نیچے آ رہی۔

میں نے لحاف میں سے اپنے آپ کو آزاد کر کے اُٹھتے ہوئے کہا "صوفیہ تم چائے منگواؤ میں ابھی دس منٹ میں غسل کر کے آتی ہوں۔"

صوفیہ "بہت بہتر" کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں غسل سے واپس آ کر سنگار میز کے سامنے سٹول پر بیٹھ کر اپنے بالوں میں سے گھنگر ڈالنے والی پنیں نکالنے لگی۔

صوفیہ الماری کے سامنے کھڑے ہو کر میرے کپڑے نکال رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

"آج آپ کس رنگ کا لباس پہنیں گی؟"

میں اپنے بالوں پر او۔ ڈی۔ کولون چھڑکتے ہوئے بولی "سبز"

لیکن کل اور پرسوں بھی آپ نے سبز لباس ہی پہنا تھا۔

میں نے پلٹ کر آتشیں لہجے میں کہا "تم میرے حکم کی خلاف ورزی مت کیا کرو۔ میں جو دل چاہے پہنوں گی"

وہ سر جھکا کر عاجزی سے بولی "بہت اچھا"

میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا اور میرے دل کو کچھ دکھ سا ہوا۔ وہ غریب ہے اور پھر میری ملازمہ شاید اسی لئے

میں اُس سے دُرشت کلامی سے پیش آئی ہوں۔

صوفیہ میرا لباس تبدیل کرانے میں مصروف تھی میں نے ایک ناقدانہ نظر اپنے پلنگ کے قریب رکھی ہوئی میز پر ڈالی جس پر چائے کا سامان رکھا تھا۔ دفعتاً میں چونک کر بولی۔ "ہائیں! آج میرا مارملیڈ کیا ہوا؟"

صوفیہ ڈرتے ڈرتے بولی "جمال کہہ رہا تھا مارملیڈ رات پڈنگ میں ڈال دیا گیا تھا۔ صبح دکانیں بند تھیں اسلئے مل نہیں سکا۔"

میں غصے سے بولی "میں یہ نہیں جاننا چاہتی کہ مارملیڈ ملا یا نہیں۔ میں مارملیڈ چاہتی ہوں۔ سُنا؟ مارملیڈ۔ میں صبح کی چائے مارملیڈ کے بغیر نہیں پی سکتی۔ میں مارملیڈ کے بغیر یہ ٹوسٹ کیسے کھا سکوں گی" میں غیظ وغضب سے کمرے میں چکر لگا رہی تھی۔ آدھی ساڑھی میرے گرد لپٹی ہوئی تھی اور آدھی صوفیہ کے ہاتھ میں تھی جو اُسے تھامے میرے پیچھے پیچھے پھر رہی تھی۔

"ٹوسٹ پر سیب کا مُربّہ لگا لیجئے۔ لے آؤں جا کر؟"

"بکومت اگر تم سیب کا مُربّہ لائیں تو میں وہ تمہارے مُنہ پر مل دوں گی۔"

"تو جو آپ حکم دیں وہ تیار کر دیا جائے"

تم جا کر دیکھو کہ بیگم صاحبہ بیدار ہوئی ہیں یا نہیں۔ اور مجھے فوراً آکر اطلاع دو" میں بیڈ رُوم سلیپرز اُتارتے ہوئے بولی۔ آج میں امّی سے کہہ کر جمال کو نکلوا دینا چاہتی تھی۔ ملازم ہو کر اُس کی اتنی جرأت کہ صبح میری پسند کے مطابق مجھے چائے بھی نہ بھجوائے۔

صوفیہ چند ہی لمحوں میں واپس آکر بولی "بیگم صاحبہ اپنے کمرے ہی میں تشریف رکھتی ہیں"

میں امّی کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ آرام کرسی پر لیٹی صبح کا اخبار دیکھ رہی تھیں۔

میں ان پر جھکتے ہوئے بولی "آداب عرض امّی" انہوں نے جواب میں میری پیشانی کو چُوم لیا۔

میں رقّت آمیز لہجے میں بولی "آج مجھے چائے کے ساتھ مارملیڈ نہیں ملا"

امّی نے خشمگیں ہو کر کہا کیوں نہیں ملا۔ کیا وجہ ہے؟" "بلاؤ جمال کو" "حضور میں حاضر ہوں" (وہ پہلے ہی دروازے میں کھڑا تھا)

"آج چھوٹی خانم کو ٹوسٹوں کے ساتھ مارملیڈ کیوں نہیں بھیجا گیا"

"حضور مارملیڈ رات ختم ہو گیا تھا۔ صبح دُکان بند ہونے کی وجہ سے مل نہیں سکا۔ آج شام کی چائے پر ضرور حاضر ہوگا" وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جھپکا رہا تھا اور اُس کی لمبی لمبی ہیبت ناک مونچھیں کانوں کے قریب پہنچی ہوئی تھیں۔

میں نے اُس کی مونچھوں کو حقارت سے دیکھتے ہوئے تنک کر کہا "اور اگر شام کو بھی نہ ہوا تو؟"

"تو حضور جو دل چاہے سزا دیجئے گا" وہ پھر معصومیت سے آنکھیں جھپکنے لگا۔

"سزا یہ ہوگی کہ تمہیں اپنی مونچھوں سے میرے کمرے میں جھاڑو دینی ہوگی"

وُہ گھبرا کر بولا "مونچھوں سے جھاڑو حضور؟"

میں نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا "بالکل"

صوفیہ دیوار کی طرف مُنہ کر کے ہنسنے لگی۔ وُہ اپنی مونچھوں سمیت کمرے سے باہر چلا گیا اور امّی چیں بجبیں ہو کر بولیں "ہیں ہیں تہذیب سے بات کیا کرو"

کمرے میں واپس آئی تو ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ رِسیور اُٹھا لیا "جی! میں خُود زرمینا ہی بول رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ اوہ ہیلو نلنی ۔ ۔ ۔ ۔ آج شام کو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ہاں مجھے بھی انویٹیشن آیا ہُوا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا تو ارادہ نہیں جانے کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بات یہ ہے کہ میری کنور صاحب سے بالکل سرسری ملاقات ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا؟ ہاں وُہ غالباً مجھے اچھی طرح جانتے ہوں گے ۔ ۔ ۔ بھائی جان ایک ہفتہ سے بمبئی گئے ہوئے ہیں۔ وُہ یہاں ہوتے تو اُن کے ساتھ چلی جاتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُن کے تو گہرے دوست ہیں۔ آہا تو آج تم لوگوں کو مل کر وُہ پارٹی بنانی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بھئی مجھے تو معاف ہی رکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بات یہ ہے کہ میں ذرا بچپن ہی سے نازک مزاج واقع ہوئی ہوں اور یہ پابندیاں میں نہیں برداشت کر سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھئی کون کہتا ہے کہ میں اب تمام پُرانے ساتھیوں سے الگ رہنا چاہتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہائیں کیا کہا؟ ریحانہ بھی تم لوگوں میں شامل ہونے لگی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جمیلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ہُوا وہی میرے ہم خیال نکلے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا بھئی آجاؤں گی ۔ ۔ ۔ ۔ کنور صاحب سے تو میں نے معذرت کر دی تھی۔ خیر اب اُنہیں ٹیلیفون کئے دیتی ہوں کہ آجاؤں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جمیلی کا تم فکر مت کرو میں جو کہوں گی وُہ مان لے گا ۔ ۔ ۔ ۔ چچا جان آج کل کار لے کر شکار کے لئے گئے ہوئے ہیں اس لئے جمیلی اور ریحانہ کو میں ساتھ لیتی آؤں گی راستے میں سے انہیں "پک آپ" کر لوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وقت کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آٹھ بجے شام؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (جھنجھلا کر) کہہ تو دیا ہے آجاؤں گی اب فون بند بھی کرو گی یا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ بھائی جان غالباً چھ سات روز تک آئیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چیریو"

میں ٹیلیفون بند کر کے صوفے پر لیٹ کر ایک نظموں کی کتاب پڑھنے لگی۔ مگر پڑھنے میں دل نہ لگا۔ ستار بجانی چاہی مگر دو دن سے مضراب ہی گم تھی۔ اس لئے یہ ارادہ بھی ترک کر کے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی تو کھڑکی میں کھڑی ہو کر سیٹی بجانے لگی۔ پھر خیال آیا چلو جمیلی کو ٹیلیفون کر دیں۔

"کون بول رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو جمیلی صاحب سے ہم بات کریں گے انہیں بلا دو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوہ! ہیلو جمیلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں زرمینا بول رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شکریہ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موسم تو واقعی بہت دلفریب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شام کو کنور صاحب

کے ہاں ڈنر پر جاؤ گے یا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں میں تو جا رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ضرور چلنا پڑے گا تمہیں جمیلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس حکم ہی سمجھ لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سُنو میں اکیلی ہوں اس لئے اکٹھے چلیں گے ۔ میں تمہیں اور ریحانہ کو راستے میں سے لیتی چلوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ کیا چچا جان شکار سے واپس آ گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو اس وقت بالکل فارغ بیٹھی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوں ہوں کوئی خاص کام نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا تو میں آدھ گھنٹے تک آتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امّی اب بخیریت ہیں معمولی زکام کی تکلیف تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا تو ریحانہ کو بھی بتا دو کہ میں آ رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

فون سے فراغت پا کر میں نے صوفیہ سے کہا کہ شوفر سے کار باہر نکالنے کے لئے کہے اور خود امّی سے اجازت لینے چلی گئی۔ ایک دفعہ پھر کمرے میں واپس آ کر میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا لباس اور بال درست کئے اور پھر روانہ ہو گئی۔ کار سے اُترتے ہی سیدھی میں ریحانہ کے کمرے کی طرف گئی۔ اور دروازہ کھٹکھٹایا" آجاؤ" ریحانہ کی آواز آئی۔

میں نے پردہ اُٹھایا تو سامنے جمیلی صاحب نظر آئے۔ جو ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے قالین پر لیٹے فلوٹ بجا رہے تھے۔ ریحانہ بیٹھی کسی کو خط لکھنے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی جمیلی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں بھی دیوار کا سہارا لگا کر قالین پر بیٹھ گئی۔ "تو آج شام آپ لوگ دعوت اُڑائیں گے"، جمیلی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا"

ریحانہ قلم نیچے رکھتے ہوئے بولی" اور آپ کو بھی چلنا ہوگا"

"جناب میں تو دست بستہ معافی چاہتا ہوں بندے کو پہلے ہی بہت کام اور فکر گھیرے رہتے ہیں۔"

میں نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا" تمہیں کام اور فکر گھیرے رہتے ہیں۔ کسی ایک فکر اور کام کا نام تو لو۔ شاید آج کل کوئی نئی شرارت نہ سوجھتی ہو گی۔"

جمیلی آہ بھر کر بولا" نام لینے سے کیا فائدہ؟ آج کل لڑائی خوب زوروں پر ہے۔ نہ معلوم کیا انجام ہوگا یہی کیا کم فکر ہے"

ریحانہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا" اور کام کیا کیا ہیں آپ کو؟"

"کوئی ایک ہو تو کہوں"

میں نے کہا" مثلاً"؟

ریحانہ ہنستے ہوئے بولی" مثلاً یہی کہ روز صبح اُٹھ کر شیو کرنا اور رات کو سوتے وقت پاجامے میں ازار بند ڈالنا" میں بھی ہنسنے لگی۔

میں فیصلہ کُن لہجے میں بولی" خیر ان کاموں کو تو چھوڑو۔ اب تمہیں میرے کہنے کا تو ضرور احترام کرنا پڑے گا"

"خیر اگر یہی حکم ہے تو بندہ سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ مگر بی زرینا یہ سب ان لوگوں کے خالی ڈھکوسلے ہیں۔ عمل کرنے کا جذبہ کسی میں موجود نہیں۔"

"اچھا اب تم دونوں پونے آٹھ بجے تیار رہنا۔ میں وقت پر پہنچ جاؤں گی۔ میں اب اجازت چاہتی ہوں امی نے کہا تھا کہ کھانے کے وقت پر ضرور گھر پہنچ جانا۔"

پورے آٹھ بجے شام جمیلی۔ ریحانہ اور میں کنور صاحب کے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے۔ کمرے میں بڑے بڑے شیشے کے فانوسوں میں سے روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ صوفوں کے پاس چھوٹی چھوٹی تپائیاں پڑی تھیں جن پر چوکلیٹ اور خشک میوے وغیرہ رکھے تھے۔ سنگ مرمر کے بڑے سے لیمپ کے نیچے مصباح اپنے آپ میں مگن بیٹھی تھی آتشدان کے قریب۔ نلنی۔ کامران اور کنور صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نلنی نے خلافِ معمول آج کھدر کی ساری پہن رکھی تھی اور کامران صاحب ایک نہایت قیمتی اور اعلیٰ سوٹ میں ملبوس سر پر گاندھی کیپ رکھے [redacted] معلوم ہو رہے تھے اُن کا یہ حلیہ دیکھ کر ریحانہ کو اور مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور جمیلی تو انہیں ٹکٹکی باندھ کر ایسے دیکھنے لگا [redacted] کر کنور صاحب کے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا ہے۔ مصباح آرام کرسی پر بیٹھا اپنی ڈائری میں غالباً اپنی موٹر کے پٹرول کا خرچ دیکھ رہا تھا۔ منصور اور بیگم منصور ایک ہی صوفے پر جلوہ افروز تھے۔ منصور صاحب تو حسبِ معمول اپنا سر کھجانے میں مصروف تھے اور بیگم منصور اپنے جُوڑے کی پنیں درست کر رہی تھیں۔ سبز روشنی کے نیچے اُن کے رسٹ شیڈ میں رنگے ہوئے ناخن ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ کنور رانی ایک ڈھیلی ڈھالی نیلی پتلون اور سفید جیکٹ پہنے مہمانوں کی تواضع میں مصروف تھیں۔

ہم تینوں نے بلند آواز سے کہا "آداب عرض"

کنور صاحب چونک کر بوکھلاتے ہوئے بولے "آیئے آیئے۔ آداب عرض" "آپ اِدھر بیٹھیئے ریحانہ خانم" کنور صاحب نے کامران کی ساتھ والی کرسی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ (ریحانہ ناک بھوں چڑھاتی ہوئی کامران کے پاس جا بیٹھی۔

"زرمینا خانم آپ اِدھر تشریف رکھیئے۔ مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے میرے ہاں آنے کے لئے وقت نکال لیا"

مجھے مصباح کے پاس جگہ ملی جو مجھے دیکھ کر فوراً اپنی ڈائری بند کرتے ہوئے بہت زیادہ مہذب بننے کی کوشش کرنے لگا۔ جمیلی اپنے دونوں ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے باندھ کر منصور صاحب کے قریب ایک سٹول پر بیٹھ گیا اور شرارت بھری نظروں سے کامران کو دیکھنے لگا۔

ہمارے بیٹھتے ہی مہذب ملازموں نے چاندی کی تشتریوں میں رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے شیشے کے گلاسوں میں انار اور سنگترے کا رس پیش کیا۔

کنور صاحب ہمیں مخاطب کر کے کہنے لگے۔

"میرا ارادہ ایک سوشلسٹ پارٹی بنانے کا ہے۔ اُن سرمایہ داروں کے خلاف جو غریبوں کا خون چوس کر اُن ہی

کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے عیش کرتے ہیں"

جمیلی سنجیدہ انداز میں بولا" جیل جانے کے لئے شاید تمہاری طبیعت مچل رہی ہے"

کنور صاحب بگڑ کر بولے" تم نے عمر بھر کبھی کوئی سیدھی بات کی ہے؟ اُلو کہیں کا!"

صباح نے آہستہ سے کہا" ہش۔ لیڈیز بیٹھی ہیں!"

کنور صاحب جھینپ کر بولے" اوہو۔ معاف کیجئے" تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ سرمایہ داری کے خلاف بغاوت کر کے ہمیں تمام لوگوں میں مساوات قائم کرنی چاہیئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کے سب لوگ درجے میں برابر ہو جائیں اور ہم سب نوجوانوں کو چاہیئے کہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک غریبوں اور مزدوروں کی حالت بہتر کرنے کی کوشش میں بہانے سے دریغ نہ کریں۔ (جوش سے) کس قدر ظلم کی بات ہے کہ ایک ہی جیسے انسان ہو کر کچھ لوگ تو عالیشان کوٹھیوں اور محلوں میں رہیں اور اُن کے بھائیوں کو ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی تو کیا تن ڈھانکنے کو کپڑا بھی نصیب نہ ہو"

کنور صاحب نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور خاموش ہو گئے ہیں نے دل ہی دل میں کہا" کتنے زرّیں خیالات ہیں" جمیلی نے کامران کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری۔

مصباح نے بھی اپنی ریشمی ساڑھی سنبھالتے ہوئے ایک لمبی چوڑی تقریر میں کنور صاحب کی بہت زور و شور سے تائید کی پھر کھانے کی اطلاع پاتے ہی سب کھانے کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ میں غریبوں کے طرفدار اور سوشلسٹوں کے لیڈر کے کھانے کے کمرے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کھانے کی سیاہ پولشڈ میز، چاندی کے بیش قیمت سامان سے لدی ہوئی تھی تقریباً نصف درجن ملازم صاف ستھرے لباس میں خدمت کے لئے کھڑے تھے کھانے کی میز پر کامران کیساتھ اپنی سیٹ دیکھ کر میرا دل ڈوب سا گیا۔ ریحانہ فتح مندانہ انداز سے میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی کنور صاحب کے پاس جا بیٹھی۔ مصباح جو ایک پُر غرور انداز سے منصور صاحب کے ساتھ آکر بیٹھی تو اُس بیچارے نے گھبرا کر اپنا سر کھجانا بند کر دیا۔ جمیلی کنور رانی اور نلنی کے درمیان بیٹھا اور دونوں کو اپنی پُر مذاق سنجیدگی سے خوش کرنے لگا۔ کامران میرے قریب بیٹھا بہ آواز بلند چمچے سے سُوپ پی رہا تھا۔ میرے لئے اُس کی بدتمیزی کو برداشت کرنا مُشکل ہو گیا۔ میں اپنا چمچہ مُنہ تک لے جاتی مگر کامران کی "سُر سُر" سن کر دل خراب ہو جاتا۔ ٹھنڈی سانس لے کر جمیلی کی طرف دیکھا۔ جس نے جواب میں مسکرا کر شرارت سے اپنی بائیں آنکھ کا کونہ دبا دیا اور ریحانہ کو تو اپنی بے بسی پر ہنستے دیکھ کر میرا دل جل کر خاک ہو گیا۔

کھانے کی میز پر بھی وہی سوشلزم پر بحث ہوتی رہی۔

جمیلی نے ایک دم طنزیہ لہجے میں کنور صاحب سے سوال کیا" لیکن آپ اور مسٹر کامران کی جو ذاتی تین تین۔ چار چار کاریں ہیں وُہ کب غریبوں کے کام آئیں گی؟"

"میں ک .... کل انہیں ایک دم بیچ دوں گا"

کامران نیپکن سے مُنہ پونچھتے ہوئے تیزی سے بولا "میں آئندہ عام لوگوں کی طرح بائیسکل کی سواری کیا کروں گا۔"

جمیلی پھر مسکراتے ہوا بولا "لیکن آپ کے لباسوں، آپ کے پُر تکلف کھانے اور ان کمروں کی مُکلّف آرائش سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ واقعی غریبوں اور مزدوروں کے حامی ہیں۔ اور اپنی سکیموں پر ضرور ہی عمل کریں گے۔"

کنور صاحب چڑ کر بولے "جمیلی تم تو غریبوں سے بالکل باغی معلوم ہوتے ہو۔ کیا غریبوں کو بھوکا اور ننگا دیکھ کر تمہارا دل نہیں کڑھتا۔ کڑاکے کی دھوپ اور تیز سردی میں وہ دن رات محنت کر کے بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکتے۔ غربت نے اُن کے لطیف احساسات کو بُری طرح کچل دیا ہے۔ اور بہت سے شریف النفس انسانوں کو اسی غربت نے بھیک مانگنے پر مجبور کر کے سوسائٹی میں ذلیل کر دیا ہے۔ امیر لوگ تو روپے کے انباروں میں بیٹھ کر ایسی باتوں کو معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ اگر ہم آج کل کے نوجوان ان باتوں پر غور کرنے کی کوشش نہ کریں گے تو اَور کون کرے گا۔ ہم سب کو مل کر اب عملی قدم اُٹھانے چاہئیں ہمیں اب بغاوت کرنی چاہئے۔ حکومت کے خلاف، سرمایہ داروں کے خلاف۔ ہم خوشی سے قید ہونا قبول کریں گے لیکن اپنے اس بلند ارادے سے ہرگز نہ پھریں گے۔ (جوش سے) بتائیے کون میرا ساتھ دے گا"

جمیلی اور میرے سوا سب چیخ اُٹھے "ہم خوشی سے تمہارا ساتھ دیں گے" جمیلی کے لبوں پر ایک لطیف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

کنور صاحب کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو رہا تھا۔ کمرہ تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ ایک منٹ۔ دو منٹ۔ تین منٹ مگر تالیوں کا شور ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ کامران کو دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے تالی بجانا کوئی مہلک بیماری ہے اَور اُس بیماری نے یک دم کامران پر حملہ کر دیا ہے میں نے دل میں کہا۔ کاش ریل کے ڈبوّں کی طرح اِس کمرے میں بھی خطرے کی کوئی زنجیر ہوتی تو میں کھینچ لیتی۔

تالیوں کا شور بند ہو گیا اَور میں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ کھانے کے بعد سب ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ اور ہنسی مذاق کی باتیں ہونے لگیں۔ سوشلزم کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کے متعلق عملی تدابیر اگلے اجلاس کے لئے ملتوی کر دی گئیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے جانے کی اجازت چاہی۔ کنور اور کنورانی ہمیں باہر کار تک پہچانے آئے۔

"اوہ ......" باہر اندھیرے میں مجھے کسی کا دھکا لگا اور جمیلی کے بازوؤں میں گر پڑی۔

جمیلی گھبراہٹ سے مجھے سنبھالتے ہوئے بولا "کیا ہوا زرمینا؟" کنورانی نے فوراً پورچ کی بجلی جلادی۔ ہمارے قریب ہی ایک بھکاری کھڑا تھا۔ پھٹے پُرانے کپڑے۔ تھکی ہوئی سُرخ آنکھیں تیز سردی میں اُس کا کمزور جسم کانپ رہا

تھا۔ اُس کے ہاتھ میں وہ سیب کے چھلکے تھے جو ملازموں نے باہر پھینک دے تھے اور وہ انہیں کھا رہا تھا۔

کنور صاحب اُس کی دُبلی پتلی ٹانگوں پر اپنے پاؤں سے ٹھوکر مارتے ہوئے بولے "تم اندھے ہو گئے ہو۔ دیکھ کر کھڑا نہیں ہُوا جاتا۔ اور یہاں تم اس وقت کیا کرنے آئے ہو"

میں کانپ کر بولی۔ اُف کنور صاحب۔" ایسا نہ کیجئے۔"

اُس نے نحیف آواز میں کہا "میں بھوکا ہوں" تین دن سے بُھوکا ہوں۔ غربت اور بے چارگی سے مجبور ہو کر آج میں بھیک مانگنے آیا ہوں۔ میں نے بھی اچھے دن دیکھے ہیں۔ مگر گردشِ فلک نے اس حالت پر پہنچا دیا ہے۔ میں کچھ نہیں چاہتا صرف ایک وقت کا کھانا دے دیجئے"۔

کنور صاحب غصے سے دیوانے ہو رہے۔ انہوں نے ملازم کو بُلا کر حکم دیا کہ اُسے دھکّے دے کر باہر نکال دیا جائے۔ ایسے بھک منگوں کا کوٹھی میں کیا کام۔

جمیلی نے خشمگیں لہجے میں ملازم سے کہا " ٹھہر جاؤ" اور پھر ایک روپیہ اور اپنا کوٹ اُتار کر اُس کی طرف پھینکتے ہوئے بولا " جاؤ اس کا جا کر کھانا کھا لو۔ اور یہ کوٹ پہن لو۔ بہت سردی ہے۔"

اُس نے جھک کر وہ کوٹ اُٹھایا اور روپیہ اپنی مُٹھّی میں دبا لیا۔ اُس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سُرخ ہو گئیں اور لب کانپنے لگے۔ اُس نے ہم سب کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کوئی خوفناک ارادہ کر رہا ہو۔ اُس نے اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے روپے کو غور سے دیکھا۔ معاً اُس کی نظریں جمیلی کی طرف اُٹھیں۔ دو آنسو ڈھلک کر نیچے گر گئے اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

جمیلی نے کنور سے ہاتھ ملا کر مسکراتے ہوئے کہا " بہت بہت شکریہ کنور صاحب! اب اجازت دیجئے خدا آپ کو اپنے بلند ارادوں میں کامیاب کرے" وہ نظریں جھکائے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔

میں کار کا شیشہ اوپر چڑھاتے ہوئے بولی " تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی ہے جمیلی"

جمیلی میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر گرم جوشی سے دباتے ہوئے بولا " بالکل نہیں" تم نے دیکھ لیا زرمینا سوشلسٹوں کے لیڈر کو۔ یہ سب باتیں نام پیدا کرنے کے لئے کی جاتی ہیں۔ غریبوں کی مدد کرنے کا صحیح جذبہ کبھی ان لوگوں میں نہیں ہوتا۔ اور آج کل کے رئیس زادوں کو جب تعلیم سے فارغ ہو کر مقابلے کے امتحانوں میں بھی پے بہ پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ سوشلسٹ بن کر نام پیدا کرنا اپنے لئے فخر سمجھتے ہیں۔ سوشلزم کی آڑ میں ڈنر، لنچ اور ڈرنک پارٹیز دے کر اپنا دل بہلانا ان کا شیوہ ہے۔ میں دیکھوں گا جب یہ نلنی، مصباح، بیگم منصور اور ہماری بہن ریحانہ صاحبہ اپنے قیمتی لباس،

زیور، ٹوئیلٹ اور "میک اپ" کے قیمتی سامان کا استعمال کرنا بند کردیں گی اور ہمارے کنور صاحب اور اُن کے ساتھی اپنے عیش و عشرت کے سب سامان چھوڑ دیں گے۔

ریحانہ موٹر کی کھڑکی سے مُنہ نکال کر خاموش بیٹھی رہی۔ میں کار سے اُترتے ہی سیدھی اپنے کمرے میں گئی۔ کمرے میں رات کی ہلکی سبز روشنی جل رہی تھی۔ میرے پلنگ کے قریب نیچے فرش پر صوفیہ لیٹی ہوئی تھی۔

میں نرمی سے بولی "صوفیہ تم ابھی تک سونے کے لئے کیوں نہیں گئیں۔ نہیں معلوم ہے گیارہ بجنے والے ہیں"

وُہ میرا کوٹ اُتارتے ہوئے بولی "آپ کا لباس تبدیل کرانا تھا۔ اسی انتظار میں بیٹھی تھی" اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل معلوم ہو رہی تھیں۔ پھر وہ جھک کر میرا جوتا اتارنے لگی۔ اُس کی ٹھنڈی اور نازک اُنگلیاں میرے ننگے پاؤں سے چھو گئیں۔ میں کانپ اُٹھی۔

"میں خود اپنے کپڑے تبدیل کرلوں گی۔ جاؤ تم جا کر سو جاؤ"

"جی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو تکلیف ہو گی" وہ سر جھکا کر بولی۔

"صوفیہ میری بہن۔ میں اپنا کام خود کرلوں گی۔ جاؤ اب جا کر سو جاؤ۔ پھر میں اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر بولی جاؤ!"

بے چاری لڑکی! اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ خاموشی سے باہر چلی گئی۔

میرا جسم تھکان سے چُور ہو رہا تھا۔ میں صوفے پر گر گئی۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ بارہ، ایک، دو، رات کے تین بج گئے۔ میری بے خواب آنکھیں چھت پر گڑی ہوئی تھیں مجھے صبح اپنے مارملیڈ نہ ملنے پر مچل جانے کا قصہ یاد آگیا اور پھر میں نے کتنی بری طرح جمال اور صوفیہ کو جھڑکا تھا۔ اس لئے کہ مجھے ایک دن مارملیڈ کھانے کو نہ ملا اور اُن غریبوں نے شاید کبھی چکھا بھی نہ ہو اور پھر صوفیہ کتنی پیاری اور غریب لڑکی ہے لیکن میں سارا دن اُسے جھڑکتی رہتی ہوں۔ اس لئے کہ وہ غریب ہے اور میری خادمہ ہے۔ ہم دونوں ایک ہی جیسی لڑکیاں ہیں مگر ہمارے درجوں میں اتنا فرق کیوں ہے؟ معاً مجھے اُس بھکاری کی انگاروں کی طرح سُرخ آنکھیں یاد آگئیں۔ وہ ہمیں اس قدر خوفناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ وہ کیا سوچ کر ایک دم باہر بھاگ گیا تھا۔ ہمیں جیسا اِنسان ہو کر وُہ کیوں اس قدر مفلوک الحال تھا۔ اُس نے کیا گُناہ کیا ہے جو وہ اس قدر سردی میں ٹھٹھرتا پھرتا ہے اور ہم گرم کپڑوں اور گرم لحافوں میں آتش دانوں کے قریب دبکے پڑے رہتے ہیں۔

آہ اس بھکاری کے دل میں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ وُہ اِس دنیا کو آگ لگا دے ۔ ۔ ۔ ایسی آگ جس سے یہ ساری دُنیا جل کر بھسم ہو جائے!

"اے خُدا تو کہاں ہے؟" میں نے ایک سسکی لے کر کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

نجمہ رحمت اللہ بی۔اے
(لاہور)

ساقی سے

(سانیٹ)

اُٹھا ساغر، کہ دل ہر بیم سے ہو پاک، اے ساقی
کہ میں ٹکر "سماجِ" خوگرِ بیداد سے لے لوں
عدوئے عدل سے، جلّاد سے، صیّاد سے نپٹوں۔
پلا وہ مے کہ دل ہو طاہر و بیباک، اے ساقی!

ہر اِک جُرعے میں جرأت ہو ہر اِک قطرے میں قدرت ہو
کہ حرصِ مخفیٔ مُلّا و پنڈت کو کروں عُریاں
اور اِن کے مُنہ پہ کہہ دوں، سانپ ہو تم صورتِ اِنساں،
شرابِ معرفت میں وُہ طہارت ہو، وُہ ہمّت ہو۔

فضائے دہر میں اُٹھا کریں گو سینکڑوں طوفاں،
نہ چھوڑوں مَیں کسی صورت میں بھی اِخلاص کا دامن
بچوں اُن سے ہے جن کا تزویر و ریا و مکر و حسن کا فن،
مجھے دے جوہرِ اِنسانیت اے ساقیٔ عرفاں!
جہاں میں پرچمِ اِنسانیت لہرا سکوں ساقی!
جہاں کو عظمتِ اِنسانیت دکھلا سکوں ساقی!

منوہر لال ہادی

اصغر کی یادیں

اصغر کی کتنی چیزیں میرے پاس پڑی ہیں۔ معمولی بھی ہیں تو مجھے غیر معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ چیزوں کو دیکھتا ہوں کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہوں، خطوں کو پڑھتا ہوں۔ اُس کے موتی بھرے خطوں پر پھر نظر ڈالوں گا اس وقت کاغذات میں سے ایک خط حفیظ ہوشیارپوری کا نکل آیا ہے جو اُنہوں نے ۲۴ مارچ ۱۹۳۸ء کو اصغر کے ولایت جانے سے آٹھ نو روز پہلے مجھے لکھا۔ لکھتے ہیں:۔ "اس موقع پر مجھے صرف میاں اصغر کے متعلق کچھ ذکر کرنا ہے، آج سے کچھ روز پہلے میں نے جب اُن کے عزمِ انگلستان" کی خبر سُنی تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور آپ کے ارشاد کی تعمیل کے طور پر میں نے پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ میں پہلے ہی اُن کے اخلاق سے کافی متاثر ہو چکا تھا، اب اُن سے ملنے کا زیادہ موقع ملا۔ تعلیم دینے کے سلسلے میں مجھے بڑے بڑے خاندانوں کے اکثر نوجوانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے اصغر سا کسی کو نہ پایا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اُن کا ذاتی وصف ہے یا آپ کی تربیت کا اثر۔ غالباً دونوں باتیں ہوں گی۔ بعض دفعہ فرصت کے اوقات میں وہ میرے ساتھ بے انتہا ہمدردی کا اظہار کرتے اور مستقبل کے متعلق مجھے مفید مشورے دیتے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اُنہوں نے مجھ سے کیا کچھ سیکھا، البتہ میں اس بات کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے اُن سے بہت کچھ حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ساتھ اُن کے "شاگردانہ تعلقات" تقریباً "دوستانہ تعلقات" کی حد تک جا ملے تھے۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ "میں انگلستان جا رہا ہوں۔ آپ میرے اُستاد ہیں، کچھ نصیحت کیجئے"۔ اس فقرے کے جواب میں فارسی کی ایک نظم ارسال کر رہا ہوں جو خوشی اور افسوس کے اُن متضاد جذبات کی آئینہ دار ہے جو اُن کی روانگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ میں نے آج تک کسی کی ذات کی تعریف میں کوئی نظم نہیں لکھی ۔ ۔ ۔ ۔ آپ اسے جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ میں اسے کاتب سے لکھوا کر فریم میں لگوا کر اصغر کو دُوں گا تاکہ وُہ اسے میری یادگار کے طور پر اپنے ساتھ لے جائیں۔ نظم فارسی میں اس لئے کہی کہ کچھ تو جذبات نے خود بخود فارسی الفاظ مہیّا کر دیئے اَور کچھ اس لئے بھی کہ میں اصغر کو فارسی پڑھایا کرتا تھا۔ اس موقع پر مجھے نظم لکھنا اس لئے بھی ضروری معلوم ہوا کہ اصغر صاحب تین سال کے لئے جا رہے ہیں۔ میں خدا جانے اُس وقت کہاں ہوں گا۔ میرا یہ فرض تھا کہ اُن کی روانگی سے پیشتر اُن کی موجودگی میں اپنے جذبات کا اظہار کر دوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کے ساتھ کام کرنے میں مجھے بے حد مسرّت حاصل ہوتی رہی اور آپ کے تمام بچے بھی اس خلوص اور محبت سے پیش آتے رہے کہ میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ یہ ماحول جس میں میں رہتا اور کام کرتا ہوں میرا اپنا گھر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آپ میرا خط اور یہ نظم دونوں چیزیں اُنہیں دکھا سکتے ہیں۔"

خط موجود ہے۔ فریم کی ہوئی نظم ایک ٹوٹے ہوئے فریم میں لگی ہوئی انگلستان سے اصغر کی واپس آئی ہوئی چیزوں میں

سے نکلی: "امتیاز" لاہور میں ہیں ماں باپ بھی بہن بھائی بھی لیکن خود اصغر کہاں؟ وہ فریم ٹوٹ گیا اب صرف کچھ تصویریں باقی ہیں کچھ دیواروں پر کچھ دل میں۔ اب اس نظم کی خوبی اور قیمت یہ ہے کہ وطن سے ہزاروں کوس دُور آکسفورڈ کی علمی فضا میں اصغر کی نظریں گاہے گاہے اِس خوبصورتی سے لکھی ہوئی "نذرِ محبت" پر پڑتی ہوں گی! یہ نظم اُس کے جیتے جی شائع نہ ہوئی۔ اب شائع ہوتی ہے کہ اب اس کے معنی کچھ اور ہیں:-

نذرِ محبت

عزیز محترم میاں اصغر بشیر صاحب (عازم انگلستان) کے نام

شادم از رفتنِ تو سوئے فرنگ اے اصغر — گرچہ ایں رسم وفا نیست کہ بے ما باشی
فرصتم دہ کہ دو سہ حرفِ دعا می گویم — کاش ازیں ہا تو ہم آغوشِ تمنا باشی
زندگی نیست بجز حسنِ یقیں "ذوقِ عمل" — زیں صفت ہا تو سرافراز بہ دنیا باشی
پست گردد بہ نگاہِ تو ہر آں اوج کہ ہست — ہمسرِ اوجِ مہ و مہر و ثریا باشی
حُسنِ خُلق تو بود دامِ وفا بہر عدو — دوست را روشنیٔ دیدۂ بینا باشی
چارہ سازی ز نظر قلبِ جگر ریشاں را — خستگاں را بہ جہاں راحتِ دلہا باشی
گرمیٔ صحبتِ یاراں نہ فراموش کنی — چوں در آں شہرِ خنک انجمن آرا باشی
یادِ احباب وطن یادِ انیسِ تو مدام — کہ تو در غربتِ افرنگ نہ تنہا باشی
یادِ شیرینِ تو از دل نرود تا باشم — تو نہ غافل شوی یک لمحہ ز من تا باشی

نغمۂ حافظ و خیام شنیدی از من
نیست ایں شرطِ مروت کہ رمیدی از من

آخری شعر کے متعلق نیچے ایک نوٹ لکھا ہے کہ "اصغر مجھ سے فارسی پڑھا کرتے تھے"؛ اس سے بھی نیچے ہاتھ سے یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

صفحۂ دل پہ جو مقصود تھا گہرا نقشہ — دیر تک شکل تمہاری دمِ رخصت دیکھی (بدش)

وہ جنہوں نے اصغر کو دیکھا وہ جو اُس سے ملے اور وہ جو جانتے ہیں کہ اُنتیس برس کی عمر میں اس نے کیا کچھ سیکھا کیا کچھ کیا اور پھر کس طرح وُہ چل دیا شاید صرف وہی اِس "حُسنِ خُلق"، اور "روشنیٔ دیدہ" اس "ذوقِ عمل" اور "راحتِ دل" اس "غربتِ افرنگ"، و "شرطِ مروت"، اور اِس "ہمسرِ اوجِ مہ و مہر و ثریا" کے پورے معنی سمجھ سکتے ہیں!

بشیر احمد

چند غزلیں اور چند نظمیں

غزل

وُہ آئے اِس طرح شانِ خودی سے بے خبر ہو کر — چمن کا ذرّہ ذرّہ جھوم اُٹھا برگ و بر ہو کر
خدا جانے شعاعِ حُسن و برقِ طور کیا شے ہے — وُہ آتے ہیں مگر اِک جلوۂ شام و سحر ہو کر
اگر اے جذبۂ مشتاق! منزل تک رسائی ہو — یہ کہنا "رہ گیا ہوں راہ میں گردِ سفر ہو کر"
عنایت گر یہی ہے اُس نگاہِ شعلہ ساماں کی — بھڑک اُٹھے نہ اِک دن ہر نفس برق و شرر ہو کر

نکل سکتا ہے سینے سے کہیں تیرِ خلش حرماں
یہ مدت سے نہاں ہے مرہمِ زخمِ جگر ہو کر

حرماں خیر آبادی

بہشتِ بریں

غریبوں کی دُنیا نشاط آفریں ہے — یہ دُنیا کدورت کی دُنیا نہیں ہے
یہ دُنیا نہیں ہے عداوت کی دُنیا — یہ دُنیا ہے یکسر محبّت کی دُنیا
یہ دُنیا پراؤں کا غم کھانے والی — یہ دُنیا ہے دُنیا کے کام آنے والی
یہ دُنیا ہے خالی فریب و دغا سے — یہ دُنیا ہے معمور صدق و صفا سے
یہ دُنیا ہے وُہ جس میں مہر و وفا ہے — یہ دُنیا ہے وُہ جس میں خوفِ خدا ہے
یہ دُنیا ہے لاریب کینوں سے خالی — یہ دُنیا رذیلوں، کمینوں سے خالی

یہ ایماں ہے میرا، یہ میرا یقیں ہے
غریبوں کی دُنیا بہشت بریں ہے

امر چند قیس

غزل

مرتے ہیں تو کچھ موت کی پروا نہیں کرتے — جب تو نے دیا درد، مداوا نہیں کرتے،
اٹکھیلیاں اَور۔ بادِ صبا سامنے میرے؛ — مرغانِ قفس کو تو ستایا نہیں کرتے
صیاد یقیں تجھ کو نہ آئے تو کروں کیا — ہم اب گُل و گلشن کی تمنّا نہیں کرتے
ہاں کاتبِ تقدیر سے بیشک ہے شکایت — ہم اُس بُتِ عیار کا شکوہ نہیں کرتے
گر جانتے ہے اس میں زیاں، سود کے بدلے — ہم جنسِ وفا کا کبھی سودا نہیں کرتے

بیٹھے ہیں کنور گوشۂ تنہائی میں خاموش
ہم اُس کی جفاؤں کو بھی رسوا نہیں کرتے

کنور کول کنور

مسائلِ لطیف

مے میں ڈوبے ہوئے جذبات کی بُو آتی ہے — میرے شعروں سے خرابات کی بُو آتی ہے
رہبروں کو مرے رستے سے ہٹا دو یک لخت — ان سے فرسودہ روایات کی بُو آتی ہے
شمع کی لَو پہ گرا ہو گا پتنگا کوئی — بزم سے گرمیٔ جذبات کی بُو آتی ہے
ابر اُفق سے ابھی اُٹھا بھی نہیں اے ساقی — یہ کہاں سے مجھے برسات کی بُو آتی ہے
تیری مہکی ہوئی زلفوں کے سہانے پن سے — ایک افسانہ سرارات کی بُو آتی ہے
عشق سے جتنا برستا ہے محبت کا سرور — عقل سے اُتنی فسادات کی بُو آتی ہے

یہ نہیں علمِ محبت کسے کہتے عدم!
ہاں مگر دل سے کسی بات کی بُو آتی ہے

عبد الحمید عدم

غزل

ابتدا ہوتی ہے دل کی ایک ٹھنڈی آہ سے — مبتدی لیتا ہے پہلے درس بسم اللہ سے
روشنی آتی ہے سیدھی مرکزِ انوار سے — شمع سے دل اخذ کرتا ہے نہ مہر و ماہ سے
راہ کے جھگڑے ہیں ورنہ ایک ہی مقصود تک — سب پہنچنا چاہتے ہیں اپنی اپنی راہ سے
راہِ الفت میں امیدِ رہبری احباب سے! — یہ بھی اک سر پھوڑنا ہے سنگ ہائے راہ سے

راہ اپنی سب بنا لیتے ہیں حاجی عشق میں
شمع تک جاتا ہے پروانہ خود اپنی راہ سے

عبد الکریم حاجی

علامہ اقبالؒ

اے کہ تیرے دم سے تھی آرائشِ بزمِ سخن — گرم تھا تیرے سبب سے عرصۂ رزمِ سخن
تُو نے کھولے دہر پر اسرارِ آئینِ حیات — ملک و ملت کے لئے تھی ابرِ رحمت تیری ذات
شاعری میں تُو نے برپا کر دیا اِک انقلاب — تیرا اک اک شعر ہے اسرارِ فطرت کی کتاب
تیری شمعِ شعر کو دُنیا بجھا سکتی نہیں — اے مسیحِ وقت تجھ کو موت آسکتی نہیں
تجھ کو قدرت کی طرف سے دی گئی فکرِ جمیل — شاعری تیری حقیقت میں تھی پیغامِ خلیل
زندگی میں تو نے اک ہیجان پیدا کر دیا — دل کے داغوں کو خیالوں میں ہویدا کر دیا

مشرقی انداز بھی ہے مغربی انداز بھی — شاعری میں تیری پنہاں سوز بھی ہے ساز بھی
ہے رجائیت کا حامل تیرا پاکیزہ کلام — شاعری اور فلسفے کا واقعی تُو ہے امام
ہائے اے اقبال! تیری ذات تھی فخرِ وطن — تجھ سے زندہ تھا گلستانِ ادب باغِ سخن

نقشِ عظمت کو ترے دُنیا مٹا سکتی نہیں
بھُولنے پر بھی تجھے ملّت بھُلا سکتی نہیں

عظیم حیدرآبادی (عثمانیہ)

غزل

ترے جلووں کی محویت کا راز افشا کرے کوئی — جدھر دیکھے تُو، پھر وں کیوں اُدھر دیکھا کرے کوئی
نجات اب عمر بھر قیدِ قفس سے مل نہیں سکتی — تصوّر ہی میں شاخِ آشیاں دیکھا کرے کوئی
حجاب اندر حجاب اُن کی تجلّی دیکھ سکتا ہے — مگر اُس وقت جب اتنی نظر پیدا کرے کوئی
نہ جینا اپنے بس کا ہے۔ نہ مرنا اپنے بس کا ہے — تمہیں بتلاؤ، ان مجبوریوں میں کیا کرے کوئی
مجھے کرنا پڑے گا خونِ جذباتِ محبّت کا — وُہ نظریں کہہ رہی ہیں کیوں ہمیں رسوا کرے کوئی
یہی جوہر وفا کے ہیں۔ یہی شانِ جوانمردی — زمانے کے ستم ہنستے ہوئے جھیلا کرے کوئی
میں بندہ ہوں جنونِ بندگی کم ہو نہیں سکتا — مرے سجدوں کو استغنا سے ٹھکرایا کرے کوئی

میں دیوانہ نہیں کمتر۔ میں دیوانہ نہیں کمتر
سمجھتا ہے تو دیوانہ مجھے سمجھا کرے کوئی

کمتر صدیقی اوجینی

سپاہی

سوگیا بانکا سپاہی سوگیا۔ نیند کی مدہوشیوں میں کھوگیا
روحِ پژمردہ کو بہلاتا ہُوا
زندگی کی راگنی گاتا ہُوا
اِک سرورِ دائمی پاتا ہُوا
سوگیا بانکا سپاہی سوگیا۔ نیند کی مدہوشیوں میں کھوگیا
دیکھ کر یہ لہلہاتے سبزہ زار
زعفراں زاروں کو بہجت در کنار
دیکھ کر بادِ صبا کو نغمہ بار
سوگیا بانکا سپاہی سوگیا۔ نیند کی مدہوشیوں میں کھوگیا

ملگجی شب میں چمکتی کہکشاں
چاند تاروں کا فلک پر کارواں
دیکھ کر دُنیا کو پھر سے نوجواں
سوگیا بانکا سپاہی سوگیا۔ نیند کی مدہوشیوں میں کھوگیا
ساقیٔ فطرت کی تقسیم خودی
میکدہ بردوش بکھری چاندنی
دیکھ کر یوں زندگی میں زندگی
سوگیا بانکا سپاہی سوگیا۔ نیند کی مدہوشیوں میں کھوگیا
خواب کی پریوں سے ہم مجلس ہُوا
خُلد کی حُوروں سے ہنستا بولتا
ہو کے اختر بےخود و مدہوش سا
سوگیا بانکا سپاہی سوگیا۔ نیند کی مدہوشیوں میں کھوگیا

عزیز اختر سرحدی (کوہاٹی)

غزل

چشمِ سحر آمیز کی باتیں کریں — ساغرِ لبریز کی باتیں کریں
مُشک سے وارفتۂ گیسو کو کیا! — زلفِ عنبر بیز کی باتیں کریں
دل سے جو گذرے جگر کے پار ہو — اُس نگاہِ تیز کی باتیں کریں
چاہتا ہے پھر دلِ ایذا طلب — دردِ غم انگیز کی باتیں کریں
آؤ پی پی کر مئے کہنہ ظہیرؔ
شاہدِ نوخیز کی باتیں کریں

ظہیر الدین حیدر

قطعات

کبھی مایوسیاں بڑھ کر یہ مجھ کو رائے دیتی ہیں — کہ ایسے حال میں تو خودکشی کرنا ہی اچھا ہے
یہ دھڑکا ہے کہ میرے بعد تجھ پر حرف آئے گا — وگرنہ اس طرح جینے سے تو مرنا ہی اچھا ہے

گھٹا چھائی ہوئی ہے آسماں پر — صدا رم جھم کی بڑھتی جا رہی ہے
مجھے رہ رہ کے یہ ہوتا ہے محسوس — کہ تو جھولے پہ بیٹھی گا رہی ہے

اختر بریلوی

محفلِ ادب

شاہجہاں بادشاہ کا "کافر" بیٹا داراشکوہ

اورنگ زیب بے شک ایک پُرجوش مسلم، ایک عظیم فرمانروا اور ایک بہادر سپہ سالار تھا، لیکن جو کچھ اس نے اپنے ضعیف باپ اور نیک بھائیوں کے ساتھ کیا، اسے انصاف پسند اور دُور از تعصب نگاہ کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ اس نے اسلام کے نام پر تلوار اٹھائی اور اخلاق کو قتل کر ڈالا۔ اسلام کی حقیقی تعلیم کے مطابق دولت کو ٹھکرانا چاہا مگر سلطنت کی ہوس کا شکار ہوگیا۔

بوڑھا باپ قید خانے میں زندہ تھا۔ اس کے سامنے اس کے پیارے بیٹے داراشکوہ کا سر اتار لیا گیا۔ اس لئے کہ عوام کو اس سے محبت تھی۔ اس الزام پر کہ وہ کافر تھا مگر کس کی نگاہوں میں؟ اس کے حق میں کفر کا فتویٰ دینے والے کون تھے؟ وہی "علمائے دین" تھے جو ہر زمانے میں اسلام کے لئے سانپ کے زہر سے زیادہ مہلک ثابت ہوتے رہے ہیں۔ اور آج بھی اپنی طویل داڑھیوں کی طرح حرام وحلال کی فہرست کو طویل کرتے جا رہے ہیں۔

مگر دارا کی خطا کیا تھی؟ کیا اس نے اللہ کے پیغمبر کو پیغمبر نہیں مانا؟ کیا اس نے تعلیم نبوی پر حرف بحرف عمل نہیں کیا؟ کیا وہ اسلام سے منحرف ہوگیا تھا؟ یا اُس نے اسلام کی خدائی تعلیم کو چھوڑ کر دنیا کا اور کوئی مذہب اختیار کیا تھا؟ اگر یہ نہیں تو اس کا جرم کیا تھا؟ — صرف یہی کہ وہ مذہب وحقیقت کو اپنے طور پر سمجھنا چاہتا تھا تاکہ اس سے اپنی زندگی کا فلسفہ تعمیر کرے۔

داراشکوہ زبانِ سنسکرت کا عالم اور علومِ اسلامی کا ماہر تھا۔ اس نے فلسفۂ ہنود کو دقیق نگاہوں سے دیکھا "اپنشد" پڑھے۔ پھر انہیں فارسی میں ترجمہ کر ڈالا۔ وہ حقیقت کا شیدائی تھا۔ وہ ہر مذہب کا عمیق نظروں سے مطالعہ کرتا تاکہ اسلام اور دیگر مذاہب کا فرق آئینہ ہوجائے وہ جنگل جنگل پھرتا گوشہ نشین صوفیوں اور سادھوؤں کے سامنے اپنے خیالات ظاہر کرتا۔ ان کے اقوال پر آزادی سے نکتہ چینی کرتا۔ پھر دونوں فرقوں کی تعلیم اسلامی کسوٹی پر کستا۔ اس کی بےچین روح اسے لئے لئے پھرتی۔ وہ مذاہب کے رنگین پردوں میں اپنا دلی اطمینان ڈھونڈتا۔ یہاں تک کہ مذہب کی حقیقت اس پر ظاہر ہوگئی اور اب شاید وہ مطمئن تھا۔ لیکن اس کا یہ اطمینان اوروں کے لئے راس نہ تھا۔ اس کی گفتگو راس نہ تھی، اس کے خیالات راس نہ تھے۔ اپنے وقت کے علمائے مذہب کے ساتھ وہ گھنٹوں بحث کرتا، انجام یہ ہوتا کہ وہ سب اپنا منہ پھلائے اور اسے بُرا بھلا کہتے ہوئے واپس جاتے۔ وہ اپنی رائے میں انتہا درجہ کا آزاد تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ کے نام نہاد صوفی اور مُلا اس سے متنفر تھے۔

درحقیقت وہ اسلام کا شیدائی تھا۔ عوام گمراہ کرنے گئے تھے۔ مفتی فتویٰ فروخت کرتے تھے۔ علماء خودغرض تھے۔ اُن کی تعلیم وعبادت اسے اطمینان پہنچانے سے قاصر تھی۔ وہ اسلام کو خدا کی آخری تعلیم سمجھتا تھا۔ اور اس لئے وہ اسے رنگ برنگ نقابوں میں مستور دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

اسے اور مذہبوں سے نفرت نہ تھی۔ اس کی رائے میں ہر مذہب کا مقصدِ اصلاح ایک تھا۔ کیونکہ دنیا کا کوئی مذہب نہیں کہتا " تم جھوٹ بولو یا چوری کرو یا معصوم لڑکیوں کی زندگی خراب کرو۔ تمام مذاہب کی نیکیاں اور بدیاں ایک ہیں۔ اچھائیاں جو ہم میں ہیں وہ اوروں میں بھی ہیں۔" (داراشکوہ)

کافر و مومن کے الفاظ اس کے لئے بے اہمیت تھے۔ وہ ملاؤں کی عام تعلیم کے خلاف پُر زور آواز میں کہتا ہے

" یہ ضروری نہیں کہ ہر کلمہ پڑھنے والا مومن ہو یا ہر غیر مذہب کا پیرو کافر۔ وہ کافر یقیناً مومن ہے جس نے خدا کو سمجھا ہے اس کی خدمت کی ہے۔ اسے دیکھا ہے یا دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ مومن یقیناً کافر ہے جس نے خدا کو نہیں سمجھا۔ اس کی خدمت نہیں کی اسے نہیں دیکھا یا دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔" (داراشکوہ سپرچویل ہسٹری)

اسے تعجب تھا کہ کوئی غیر مسلم اس لئے کیونکر کافر ہو سکتا ہے کہ صرف اس نے کلمہ شہادت نہیں پڑھا۔ حالانکہ اس میں وہ کل اوصاف ہیں جو ایک حقیقی پیروِ اسلام میں موجود ہونے چاہئیں؟ کیا وہ کلمہ پڑھنے والا جو شراب پیتا ہے اور جوا کھیلتا ہے اور بدی کرتا ہے اس غیر مسلم کے برابر ہے جو شراب نہیں پیتا اور جوا نہیں کھیلتا اور بدی نہیں کرتا۔ بلکہ غریبوں کی مدد کرنے کے ساتھ قناعت سے بسر کرتا ہے؟

محبت کرنے والے باپ کا سب سے لاڈلا بیٹا ہوتے ہوئے بھی اس کی نگاہوں میں دنیوی تکالیف بے حقیقت تھیں۔ اس کے لئے وہ زندگی بے کار تھی جس میں کوئی غم نہ ہو اور وہ غم بے حقیقت تھے جو بے حقیقت خوشیوں کے بعد پیدا ہوئے ہوں ایک واقعہ مثال ہے:۔

" باپ کے ساتھ قید تھا۔ جانتا تھا بے بسی سے قتل کیا جائے گا۔ جسونت سنگھ سپہ سالار اورنگ زیب سے شکست کھانے کے بعد قید خانے میں آیا اور بولا " اے جانِ عالم! قسمت ہمارے خلاف ہے۔ آپ اور بادشاہ قید ہیں جس سے عوام میں بے چینی پھیل گئی ہے چند پٹھان افسر باغی ہو گئے ہیں حالات نازک ہو گئے ہیں "۔ اس پر دارا نے کہا لیکن جسونت اگر اس قسم کے حادثے نہ ہوں تو زندگی بے لطف ہو جائیگی۔" مغل ہیرلڈ سمتھ!

خود بہت بڑا عالم تھا۔ کئی کتابیں لکھیں جو اس کے زرّیں خیالات سے معمور ہیں۔ ایک جگہ لکھتا ہے:۔

خدا اور حقیقت بے سود سجدوں اور بے روح نمازوں میں نہیں ملتے۔ اس قسم کی عبادتیں سب سے بڑا گناہ ہیں گناہگار ان نمازیوں سے بدرجہا بہتر ہیں جو صرف اس لئے نمازیں پڑھتے ہیں کہ اس کی عادت پڑ گئی ہے۔ یا اس لئے کہ دنیا پر اپنے تقدس کا سکہ جما سکیں۔ کیونکہ ایک گناہگار اپنے گناہوں کے چھپانے کی کوشش نہیں کرتا۔ مگر یہ نمازی اپنی تاریک فطرت پر عبادت کی چادر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی تلاش میں اگر خدا کو ڈھونڈ لیا تو عبادت کامیاب ہے۔" یہ تھا داراشکوہ کا فلسفہ!

سالک لکھنوی

"دین دنیا"

پرتگالی کا اثر اُردو پر

یورپ میں پرتگال ایک جمہوری سلطنت ہے جس کے شمال و مشرق میں ہسپانیہ اور جنوب و مغرب میں بحر اطلانتک ہے اس کا دارالسلطنت لزبن ہے پرتگالیوں کو قومی انفرادیت گیارھویں صدی کے بعد حاصل ہوئی۔ بارھویں صدی میں یہ اہلِ مراکش سے برسرِ پیکار رہے۔

ہندوستان سے اہلِ پرتگال کے تعلقات پندرھویں صدی میں قائم ہوئے۔ یہ وُہ زمانہ ہے جب ان کا بحری اقتدار عروج پر تھا۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما عربوں کی رہنمائی میں مالابار آیا، اور کالی کٹ پہنچا جہاں وہ زمورن سے ملا یہاں سے اُنہوں نے تجارت کا سلسلہ شروع کیا اور "جواہر اور مسالے" لے جانے لگے آہستہ آہستہ اُنہوں نے اپنے قدم ہندوستان میں جما لئے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں اُنہوں نے ایک صلح نامہ کیا اور حاجیوں کے جہاز لے جانے لگے۔ عہدِ جہانگیری میں بھی ان کے حقوق قائم رہے اور دربار میں رسوخ بھی رہا۔ "بنگال کے حکمرانوں کی اجازت سے پرتگال والے ہگلی میں آباد ہو گئے تھے[۵۲]"۔ یہاں ان کے فوجی اقتدار میں بہت اضافہ ہوا وُہ تجارتی مال پر چنگی لگانے لگے اور لوگوں کو زبردستی عیسائی بنانے لگے۔ ان کی زیادتیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ اُنہوں نے ایک مرتبہ دو شاہی کنیزوں کو گرفتار کر لیا آخر شاہجہاں نے ان کو سخت سزا دی اور ان کی نوآبادی برباد کر دی گئی۔

باشندگانِ پرتگال کی مادری زبان پرتگالی ہے جو "رومانس" کے لسانی خاندان کی ایک شاخ سے نکلی ہے[۵۳] لیکن بعد میں عربی حملہ آوروں کے زیرِ اثر بہت سے عربی عناصر اس میں شامل ہو گئے۔ اس زبان کا سب سے بڑا ادیب کیموئس (Camoeus) ۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۴ء تھا۔

اس مختصر تاریخی خاکے کو پیشِ نظر رکھ کر اگر ہم غور کریں تو یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ پرتگالیوں کو اپنے دورانِ اقتدار میں ہندوستانیوں سے تجارتی، مذہبی اور سیاسی حیثیت سے برابر سابقہ پڑتا رہا ایسی صورتوں میں لامحالہ ان کو اسی ملک کی زبان بولنی پڑتی ہو گی اور وہ پرتگالی الفاظ ملا جُلا کر اپنا مفہوم ادا کرتے ہوں گے۔

آج اُردو زبان میں جو پرتگالی الفاظ مستعمل ہیں وُہ اسی دَور کی یادگار ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی کے بعد پرتگالی الفاظ کی تعداد اُردو میں خاصی ہے حالانکہ ہماری زبان نے اپنے دامن میں دیگر یورپین زبانوں کے الفاظ کو بھی جگہ دی مثلاً فرانسیسی، اطالوی روسی وغیرہ[۵۴]

آزاد مرحوم آبِ حیات میں فرماتے ہیں "دو قوموں کے ارتباط سے ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے اور اس کے کئی سبب ہیں۔ اکثر نئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں"۔ پرتگالی بعض پھلوں کے پودے یا بیج اپنے ساتھ لائے۔ ان کے پرتگالی نام کچھ تغیّر کے ساتھ رائج ہو گئے اور آج بھی عام ہیں۔ مثلاً

اُردو	پرتگالی
اننّاس	Anannas

---

۵۱ پائنیرس ان انڈیا صفحہ ۱۱۸

۵۲ مسلم رول ان انڈیا صفحہ ۵۴۸

۵۳ چیمبرز انسائیکلوپیڈیا

۵۴ سماوار Samowaru (روسی) قرابین Crabine (فرانسیسی)

اردو	پرتگالی
سنترہ	Cintra [1]
موسمبی	Mozambique

ایک مورخ کہتا ہے کہ "اکبر کی وفات کے بعد زراعت میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ تمباکو کی کاشت شروع ہو گئی جس کا علم ہندوستان کو پرتگالیوں سے ہوا" [2] تمباکو اور ساگو دانہ دونوں الفاظ پرتگالی ہیں۔

تمباکو Tobacco، ساگو دانہ Sago،

لباس اور اس کی ضروریات کے لحاظ سے بھی چند پرتگالی الفاظ ہماری زبان میں داخل ہو گئے۔

سایا Saia ٹبن Boutam فیتہ Fita

بعض ایسی اشیاء بھی ہیں جو عموماً ہندوستانی گھروں میں ہوتی ہیں لیکن ان کے نام پرتگالی ہیں۔

بالٹی Baldi، بوتل Bottle

الماری Almario، میز Meza

پرتگالی الفاظ ہماری زبان کا جزوِ لاینفک بن گئے ہیں ہم اگر ان کے بجائے عربی، فارسی یا سنسکرت کے الفاظ استعمال کریں تو صرف فصاحت ہی کا خون نہ ہوگا بلکہ سمجھنا بھی مشکل ہو جائے گا

اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں جو پرتگالی الفاظ مستعمل ہیں ان کا تلفظ بہت کچھ بدل گیا ہے اور بدل جانا لازمی بھی تھا ورنہ ان کی غرابت و اجنبیت نہ زائل ہوتی۔ یہی سبب ہے کہ ہم ان کو اپنے الفاظ سمجھتے ہیں۔

یہ فہرست ملاحظہ ہو

اُردو	پرتگالی	اردو	پرتگالی	اُردو	پرتگالی
مارتول	Martel	کارتوس	Cartoucho	نیلام	Lelam
پادری	Padre	گنڈا	Gandaia	انگریز	Ingrez

یہ الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اُردو نے بحیثیت ایک زندہ زبان کے مشرق ہی نہیں بلکہ مغرب کی زبانوں کے الفاظ بھی کس حسن و خوبی سے اپنا لئے اس کی یہ بلند نظری بتا رہی ہے کہ اس میں بین الاقوامی زبان بننے کی کتنی صلاحیت پوشیدہ ہے۔

مرزا احمد بشیر ایم اے

"عالمگیر"

---

[1] پرتگال کے شہر سنٹرے Cintra سے اس کا بیج لایا گیا تھا

[2] "ہند کے مغل راج" از ایڈورڈز اینڈ گیرٹ صفحہ ۲۹۲

مطبوعات

ہماری زبان۔ یہ چھوٹی سی کتاب "سلسلۂ اُردو لائبریری" میں چھپی ہے اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی تصنیف ہے۔ کتاب کی دلچسپی سودمندی اور خوبی کے لئے مولوی صاحب کا نام کافی ضمانت ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۷۰ صفحات پر کتاب ختم ہوتی ہے اور صرف ایک گھنٹے میں پڑھی جاسکتی ہے۔ ہر اُردو دان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ قیمت صرف ۸ر ہے۔ جیسا کہ ناشرین نے سرورق پر لکھا ہے اس "سلسلۂ اُردو لائبریری" میں مختلف موضوع ادب، آرٹ، فلسفہ، سائنس، تاریخ، سوانح، بین الاقوامی سیاست، ممالکِ اسلامی قصے کہانیاں وغیرہ پُرمفید پُراز معلومات دلچسپ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ہر کتاب مکمل مختصر مستند اور سلیس زبان میں لکھی ہوئی ہوتی ہے۔" فی الحال صرف دو کتابیں چھپی ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ مفید سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ ملنے کا پتہ:۔ نیا سنسار، کتاب گھر، بانکی پور، پٹنہ

معارف القرآن:۔ یعنی تفسیرِ قرآن مجید مصنفہ چودھری غلام احمد صاحب پرویز شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام دہلی۔ یہ تفسیر اِس اصول پر مرتب کی گئی ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ اِس تفسیر کی جلد اوّل جو اب شائع کی گئی ہے "اللہ" سے متعلق ہے۔ بقیہ جلدیں "رسالت" "کتب" "کائنات" اور "آخرت" سے متعلق ہوں گی۔

کتاب کا دیباچہ مولانا محمد اسلم جیراج پوری نے لکھا ہے۔ شروع میں ایک مفصل فہرستِ مطالب ہے۔

اس تفسیر میں یہ کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کے مفہوم کو عقل و بصیرت کے نقطۂ نظر سے سمجھا جائے۔ اندازِ بیان سادہ اور لطیف ہے اور کتاب کی ظاہری صورت بھی دلفریب ہے۔ جابجا جدید عقل پرستوں سے تخاطب کیا ہے اسی لئے انگریزی الفاظ کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ ہم چودھری صاحب کو اِس تصنیف پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ہر اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان کو اِس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ قیمت چھ روپے آٹھ آنے مجلد۔ پانچ روپے غیر مجلد۔

ب

کمپنی کی حکومت:۔ اُردو دنیا حضرتِ باری علیگ کی ممنون ہے کہ اُنہوں نے یہ مختصر لیکن جامع کتاب لکھ کر ہماری زبان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارناموں اور ہندوستان کی تباہی کی داستان سے مناسب پیرایہ میں آشنا کیا۔ حجم ۳۰۴ صفحات کاغذ کتابت طباعت نفیس قیمت مجلد دو روپے۔ پتہ مکتبۂ اُردو لاہور

کلیاتِ میر:۔ نولکشور پریس لکھنؤ کے اُردو زبان و ادب پر اس قدر احسانات ہیں کہ اُن کے تذکرے کے لئے ایک مبسوط کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ پریس سالہا سال سے اُردو کتابوں کے ارزاں ایڈیشن شائع کر رہا ہے اور اس کی مطبوعات کے طفیل ہمارے بہت سے قدیم ادبی نوادر ضائع ہونے سے بچ گئے ہیں ہمیں مسرت ہے کہ منشی نولکشور مرحوم کے بعد اُن کے جانشینوں نے نہ صرف اُن کی یادگار کو قائم رکھا بلکہ اُس ادبی ذوق کے طفیل جو انہیں ورثے میں ملا ہے خدمتِ زبان کی نئی راہیں بھی پیدا کیں۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر کلیاتِ میر ہے جسے نولکشور پریس نے بڑی تقطیع کے ایک ہزار سے زاید صفحات پر نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس نسخے کے مرتب عبدالباری

عہ آسی ہیں جو ایک صحیح الذوق شاعر اور نقاد ہیں۔ آسی صاحب نے موجودہ نسخے کی تصحیح میں بہت اہتمام کیا ہے یعنی اس غرض سے کلامِ میر کے متعدد نسخوں کو کھنگالا ہے اور مقابلہ کر کے اشعار کی تصحیح کی ہے۔ شروع میں آسی صاحب نے میر کے متعلق تقریباً ساٹھ صفحات کا ایک دلچسپ اور پُراز معلومات مقدمہ لکھا ہے۔ آخری ۲۷ صفحات میں کلامِ میر کے بعض الفاظ کے معنی درج کئے گئے ہیں۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اچھا ہے اور جلد خوبصورت ہے۔ قیمت درج نہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اہلِ ذوق اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ خرید کر مطبع نولکشور کی اِس خدمتِ ادب کی قدر افزائی کریں گے۔ پتہ:۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔